تحریک خلافت عثمانیہ کے روح رواں اور آزادی ہند کے
عظیم مجاہد کی ایمان افروز سوانح عمری

مجاہدِ تحریکِ خلافت

مولانا محمد علی جوہر

”وہ عظیم مجاہد جس کی بدولت آج بھی ترک قوم
ہندوستانی مسلمانوں کی شکرگزار اور احسان مند ہے“

مرتبہ
سیّد رئیس احمد جعفری ندوی

دار المصحف
ہادیہ حلیمہ سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
042-37360596 0300-4611953

جملہ حقوق برائے ترتیب وتدوین بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: مولانا محمد علی جوہر

مصنف: سید رئیس احمد جعفری ندوی

پروف ریڈنگ: محمد فائز المرام

سرورق: عدنان علی

ڈیزائننگ: سعید قاسم

ناشر: محمد فہیم عالم

تاریخ اشاعت: جون 2020ء

قیمت: -/1100 روپے

دارالمصحف

ہادیہ حلیمہ سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور 042-37300590 0300-4611953

www.facebook.com/darulmushafpublisher darulmushaf786@gmail.com

عرضِ ناشر

دارالمصحف کا مقصد ایسی کتب شائع کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع کی جاتی ہیں اُن کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔

جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔

اللہ کے فضل وکرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہِ کرم! مطلع فرمادیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں ازالہ کر دیا جائے گا۔ شکریہ!

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
دیباچہ	40	اشارات	47
نزاعی مسائل کی ناگزیری	48	تمہید	52
غدر کے بعد عام حالت	54	سرسیّد	55
سرسیّد کی پالیسی	55	سرسیّد کے بعد	56
گورنمنٹ کی پالیسی	56	مسلمانوں میں حرکت	56
ایک لیڈر کی ضرورت	56	محمد علی کا ظہور	57
محمد علی میدانِ عمل میں	57		

(باب ۱) ابتدائی حالات

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
خاندان کا مختصر تذکرہ	59	مرز بوم	60
پیدائش اور بھائی بہنوں کی تفصیل	60	یتیمی	60
تعلیم	60	بریلی	60
ذہین لیکن کم محنت	61	بھائی کا احترام	61
لیڈری	61		

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ایچ۔جی۔ویلز	75	برنارڈ شا کی قدردانی	75
مکتوب برنارڈ شا بنام عبدالماجد	76	سر مائیکل اڈوائر کی قدردانی	76
مسٹر گوکھلے کا اعتراف	77	بمبئی کرانیکل	77
سرعتِ تحریر	78	رفتار کار	78

(باب ۵) ذوقِ تفحص اور وسعتِ مطالعہ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
قتل مرتد	79	سار دابل	80
واقعات دیوبند	80	براق شریف	81
اُردو انسائیکلو پیڈیا	82	مکتوب سید سلیمان	83

(باب ٦) قیادت کا رعب و اعتراف

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
مولانا کا خط	85	مولانا ابوالکلام کا خط	85
ہمہ گیر اختلاف	86	پنجاب کا ایک واقعہ	86
دوسرا واقعہ	87	ایک اور واقعہ	88
جواہر لال کا اعتراف	88	گاندھی جی کا اعتراف	89
ایک ہوم ممبر کا بیان	89	ایک ممبر اسمبلی کی فرمائش	90
ایک دوست کا خط	90	دوسری مثال	91
ایک اخبار کا خراجِ تحسین	91	پریم چند کا خط	91
سوویت روس کی دعوت	92	علی رضی اللہ عنہ اور محمد علی	92
مکتوبِ ماجد	93		

(باب۲) علی گڑھ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
علی گڑھ کی عام فضا	62	محمد علی کا داخلہ	62
کم محنتی	63	سر یعقوب کا بیان	63
میر محفوظ کا بیان	63	سجاد حیدر کا بیان	63
محمد علی سے تعارف	64	انگریزی قابلیت	65
ذہانت	65	مولانا شبلی کا امتحان لینا	65
شاعری	66	بی اے کا امتحان	67
میر محفوظ علی کا بیان	67		

(باب۳) آکسفورڈ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
سجاد حیدر کا بیان	68	الوداعی نظم	68
شوکت کا ایثار	69	اخلاقی حالت	69
داخلہ اور سول سروس میں ناکامی	70	شوکت پر اثر	70
بی اے کا امتحان	71		

(باب۴) انگریزی قابلیت

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ماریسن کا خراجِ تحسین	72	شیکسپیئر پر عبور	73
لارڈ منٹو کا اعتراف	73	میر محفوظ کا بیان	73
میکڈانلڈ کا خیال	74	ٹائمز آف انڈیا کا خیال	75

(باب ۷) حق گوئی

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
صدارت کانگریس کا واقعہ	94	مرشد سے اختلاف	95
جمعیۃ العلماء میں اُمی کی تقریر	95	سوراج پارٹی پر تنقید	98
ابن سعود کے سامنے	99	وائسرائے کے سامنے	99
رنگون میں گاندھی جی سے ملاقات	100	گول میز کانفرنس	101
کراچی میں	101		

(باب ۸) تدبر

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ایک خط	102	کتاب راجپال	103
ہنگامہ نجد وحجاز	104	قتل مرتد	104
مسئلہ اقلیت	105	دوسرا طریقہ	105
پہلے کیا؟	106		

(باب ۹) کردار

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
خواجہ حسن نظامی کا واقعہ	108	دوسرا واقعہ	109
ڈاکٹر کچلو کا ایک واقعہ	110	ڈاکٹر عالم کا ایک واقعہ	111
ایک اور دُعا	111	مہاراجہ بڑودہ کی حمایت	112
واقعہ بمبئی	112		

(باب۱۰) عزم واستقلال

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ایک سخت مضمون	114	چھنڈواڑہ کا ایک واقعہ	115
رحمت اللہ کمیشن	115	نواب صاحب اور ارکانِ کمیشن کی خواہش	115
علی گڑھ جوبلی	116	احسان صاحب کا خط	116

(باب۱۱) مذہبیت

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
سر یعقوب کا بیان	117	محمد علی کا بیان	117
مولانا عبدالماجد کا بیان	118	کراچی جیل کا داخلہ	118
مفتی فلسطین کا انکشاف	119	کتاب راجپال پر تاثرات	120
پارلیمنٹ کی گیلری میں نماز	121	ایک مذہبی اصلاحی تحریک	122
تنازعۂ دیوبند	122	دعا	123

(باب۱۲) شوخیٔ طبع، نفاستِ ذوق، نکتہ رسی اوا قوالِ نادِرہ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ضیاء الدین برنی کا بیان	125	ایک اور لطیفہ	126
''پینے'' کی دیر	126	بلندی و پستی	127
قانونی مغالطہ	127	آل مسلم پارٹیز کا ایک لطیفہ	127
ایک اور لطیفہ	128	ایک پر لطف واقعہ	129
مالوی جی سے ایک لطیفہ	129	ایک دوسرا واقعہ	129

ایک دلچسپ تنقید	130	کراچی کا ایک واقعہ	130
تحریفِ اسماء	131	ترجمہ اسماء	132
نفاستِ ذوق	132	نکتہ رسی	133
اقوال وحکم	134	جدید طریقہ علاج	134
سوراج کی تشریح	134	تشدد اور عدم تشدد	134
وزیر ہند کے نام مکتوب	135	ایک اہم تقریر	135
اچھا وکیل	135		

(باب ۱۳) قومیت اور ملیت

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
خلافت کانفرنس میں تقریر	137	گول میز کانفرنس میں اظہارِ خیال	137
انڈین نیشنل یونین پر تنقید	137		

(باب ۱۴) وطن پروری

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
سائمن کمیشن	139	افغانستان کا حملہ	140
جنگِ چین	140	دہلی کا ایک جلسہ	140
ایک جسارت انگیز تجویز	140	ایک خط	141

(باب ۱۵) جمہوریت بہ حیثیت عقیدہ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
مہاراجہ الور کا ایک ڈنر	142	ابن سعود کی مخالفت	143
احیائے خلافتِ راشدہ کی کوشش	143	ابن سعود کی ایک اور مخالفت	144

(باب ۱۶) شاعری

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
مکتوب بنام عبدالماجد	145	مولانا عبدالماجد کی رائے	146
انتخابِ کلام	147		

(باب ۱۷) طول نویسی

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
محمد علی کا ''بیان''	159		

(باب ۱۸) رفق ومحبت اور ''جذباتیت''

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
بچوں سے محبت	161	جامعہ ملیہ کے بچے	162
ایک اور واقعہ	162	بی اماں سے محبت	162
میر محفوظ علی کا بیان	163	مکتوبِ محمد علی	163
ایک اور واقعہ	163	مولانا عبدالماجد کے ساتھ ایک واقعہ	164
جذباتیت	164	ہرکرن ناتھ کے ساتھ ایک واقعہ	165
امان اللہ خاں کے ساتھ	166		

(باب ۱۹) اخلاق ورواداری

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
سر یعقوب کا بیان	167	سجاد حیدر سے تعلقات	167
مسٹر جناح کے ساتھ ایک واقعہ	168	مسٹر داس کا ایک واقعہ	168
ایک دلچسپ ''مقابلہ''	169	لاجپت رائے سے	170

مالوی جی کا واقعہ	170	سر عبدالقیوم کا واقعہ	171

(باب۲۰) ایثار واستغناء

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
بیگم غلام حسین سے سلوک	173	زمیندار کی امداد	173
خلافت کمیٹی کا سب سے پہلا چندہ	174	چاندی کا سیٹ	175
ندوہ کو چندہ دینا	175	ایک اور واقعہ	175

(باب۲۱) رائے عامہ پر رائے

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
رائے عامہ پر نظریہ	177	لاہور کا ایک واقعہ	177
مولانا احمد سعید کی تقریر	178	بخاری صاحب کی تقریر	178
محمد علی کا ''وعظ''	178		

(باب۲۲) مایوسی

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
محمد علی کا بیان	180	ایک دوسرا بیان	181
مدیر ''انقلاب'' کی روایت	182		

(باب۲۳) ہندوؤں سے دل برداشتگی کے اسباب

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
گاندھی جی کا بیان	184	صوبہ متحدہ کی سیاسی کانفرنس	185
موتی لال کا تغیر	186	جے رام داس کا اختلاف	187

گاندھی جی اور دوسرے کانگریسیوں کا اختلاف	187		

(باب ۲۴) علالت

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
دہلی میں	189	وائسرائے کا طبیبِ خاص	190
ہنگامۂ اختلاف	190	ایک اخبار کا طنز	190
سر یعقوب کا مشاہدہ	190	گول میز کانفرنس	191
ایک شاہد عینی	192	مولانا عبدالماجد ایونی کا سوال	192
پیرس	192	مکتوب بنام عرفان	193
تقریر کا تذکرہ	193	علالت کی تفصیل	194

(باب ۲۵) وفات

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
تقریر کے بعد	195	ہندو مسلم اسکیم	195
وفات	196		

(باب ۲۶) قابل رشک کشمکش

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
خبر وفات	197	مہاراجہ الور کی حالت	197
التوا	197	ہندوستان سے طلبی	197
رامپور	198	لکھنؤ	198
اجمیر	198	کلکتہ	198

علی گڑھ	199	دلی	199
بیت المقدس	199		

(باب ۲۷) تکفین وتدفین

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
بیت المقدس کی دعوت منظور	200	نماز جنازہ	200
بیت المقدس میں	201	مولانا سید سلیمان ندوی کا تاثر	202

(باب ۲۸) جلوس اور جلسے

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
عام حالت	203	کابل میں ماتم	203
ہندوستان میں ماتم	203	لکھنؤ کا جلسہ	204
مولانا ظفر الملک کا تاثر	204	جلسہ کے انتظامات	204
ایک دوسرا جلسہ	204	اصل وجہ	205
شرکاء	205	مولانا صفی کی نظم	206

(باب ۲۹) عام اظہار آراء (۱)

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
اخبارات	207	المآء	207
المقطم	208	ڈیلی ایکسپریس	208
ٹائمز آف انڈیا	209		

(باب ۳۰) عام اظہار آراء (۲)

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر

اقوالِ مشاہیر	210	مولانا شوکت علی	210
مولانا حسرت موہانی	210	مولانا حسین احمد	210
سبھاش چندر بوس (میر کلکتہ کارپوریشن	210	فیڈرل سب کمیٹی کے ارکان	211
مسٹر جیکر	211	سرسی۔راماسوامی آئر	211
لارڈ ریڈنگ	211	سر جارج رینے، رکن حکومتِ ہند	212
مسٹر آرتھر مور	212	سرہری سنگھ گوڑ	212
سر تیج بہادر سپرو	212	سر اکبر حیدری	212
مشہور مصنف ایچ۔جی۔ویلز	212	مسٹر بن وزیر ہند	213
لارڈ پیل سابق وزیر ہند	213	مسٹر فز براکوے، ممبر پارلیمنٹ	213
لارڈ سینکے	213	سر محمد شفیع	213
پنڈت موتی لال نہرو	213	کلکتہ کارپوریشن کے ارکان	213
امین الحسینی مفتی فلسطین	213	مہاراجہ بیکانیر	214
مسٹر بھروچہ	214	مدیر ٹائمز (لندن)	214
مولانا سید سلیمان ندوی	214	مسٹر برملوی، ایڈیٹر ''بمبئی کرانیکل''	215
مسٹر جی۔کے۔نریمان	215	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی	215

(باب ۳۱) نذرِ عقیدت، مرثیوں کی صورت میں!

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
اقبال	216	مرگِ غربت (از مولانا صفی لکھنوی)	217
جوش	217	سر پھر املاح (از حفیظ جالندھری)	218

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
امیر الشعراء مصر کا مرثیہ	220		

(باب ۳۲) لختے چند

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
احمد زکی پاشا	222	شہزادہ محمد علی پاشا	223

(باب ۳۳) یادگار کی تجویزیں

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
مجسمہ کی تجویز	224	دائرہ سیاسیہ	224
جامعہ ملیہ	224	متفرق یادگاریں	225
دہلی میونسپلٹی	225	بمبئی کارپوریشن	225
آلہ آباد میونسپلٹی	225	محمد علی میموریل ہائی اسکول	225
علی گڑھ میں یادگار	225	تبصرہ	226

(حصہ دوم)

جہد و عمل

(باب ۱) ملازمت

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
انگلستان سے واپسی	228	انسپکٹر جنرل تعلیمات رامپور	228
سازش	229	نواب ناصر علی سے تعلقات	229
دل برداشتگی	230	شوکت کی طلبی	230
نواب صاحب سے ملاقات	230	شوکت صاحب کا مشورہ	230
کنور فتح سنگھ سے تعلقات	231	برودہ میں تقرر	231

حیرت انگیز ذہانت	231	کارگزاری	231
نوساری کی کمشنری	232	دیانت وامانت	232
پرسنل اسسٹنٹ	233	مشغلۂ تحریر	233
گپ	233	ملازمت سے بیزاری	233
مکتوب بنام محفوظ علی	234	اجرائے ''کامریڈ'' کا خیال	235
جاؤرہ کی وزارت	235	سر مائیکل اوڈوائر کا اصرار	235
بڑودہ سے علیحدگی	235	صلۂ کارگزاری	236
مدیر ''سچ'' کی رائے	236		

(باب۲) کامریڈ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
میر محفوظ علی کا بیان	237	ہرایکسی لینسی کا اضطراب	237
محمد علی کا بیان	238	لیڈی ہارڈنگ کی خریداری	238
ولی عہد جرمنی کی خریداری	238	گورنر کی قدر دانی	238
مسٹر میکڈانلڈ کی قدر دانی	238	ہدیہ	239
نشاۃِ ثانیہ	239	ذاتی کوششیں	240
بی اماں کی وفات	241	التوا	241

(باب۳) مسلم یونیورسٹی

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
سرسید کے بعد	242	انگریز اسٹاف	242
مسٹر آرچ بولڈ	243	خودسری	243

اندرونی حالات	243	اولڈ بوائز ایسوسی ایشن	244
ٹرسٹیوں کی حالت	244	محمد علی کی دلچسپی	245
پیش کش	245	مسٹر ماریسن کی مخالفت	245
اصل اختلاف	246	ایام ملازمت کی کوششیں	246
مکتوب بنام محفوظ علی	246	دوسرا مکتوب	247
ملازمت کے بعد	248	کورٹ کی ممبری	249
دوبارہ امیدواری	249	ایک اولڈ بوائے کا مراسلہ	249
اساتذہ کی تنخواہیں	251	یونیورسٹی کی اسکیم	252
جسٹس محمود کی اسکیم	252	یونیورسٹی کی تحریک	252
شوکت صاحب کو آمادہ کرنا	253	اختلاف	253
مہاراجہ محمود آباد کی رہنمائیاں	253	محمد علی کی ''نرمی''	254
اسباب	254	نتیجہ	255
جنگ عظیم	255	دوبارہ تحریک	255
گورنمنٹ کی آمادگی	255	محمد علی کی مخالفت	256
مکتوب بنام محمود آباد	256	دوسری کوششیں	260
''صلۂ کارگزاری''	260		

(باب ۴) مسلم لیگ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
حالات میں تغیر	262	مسلم لیگ کی تاسیس	262
محمد علی کا حصہ	263	میر محفوظ علی کا بیان	263

سر یعقوب کی رائے	263	لیگ کا نصب العین	263
محمد علی کی عملی شرکت	264	سیلف گورنمنٹ	264

(باب ۵) طبی وفد

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
جنگِ بلقان	265	مسٹر ممتاز حسن کا واقعہ	266
مولانا شبلی کی نظم	266	ڈاکٹر انصاری کا ارادہ	266
محمد علی کی حمایت	266	مشکلاتِ راہ	267
ہلالِ احمر کا وعدہ	267	وعدہ خلافی	267
حیرت انگیز عزم	267		

(باب ۶) ٹرنر ماریسن کمپنی اور دوسرے واقعات

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ترکوں کا قرضہ	269	مقدونیہ آؤ	269
ٹرنر ماریسن کمپنی	270		

(باب ۷) ہمدرد

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
کلکتہ سے دہلی	271	تعویق	271
حکیم اجمل خاں کی رائے	271	ہمدرد کا اسٹاف	272
محمد علی کی ادارتی رہنمائیاں	272	دفتر ہمدرد کی فضا	273
محمد علی کا نظریہ صحافت	273	نظریہ کیسا تھا؟	275
حکیم برہم کا خط	276	اعلیٰ انتظامات	276

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
اشاعت	276	گورنمنٹ کا خراجِ تحسین	277
سنسر	277	التواء	277
درمیانی وقفہ	277	نشاۃِ ثانیہ	278
خواجہ حسن نظامی کی رائے	279	مہاراجہ اندور کا واقعہ	279
الور کی جوبلی	280	اشتہارات	281

(باب ۸) ہنگامۂ کانپور

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
اصل واقعہ	282	محمد علی کی کوششیں	283
مسٹر میکڈانلڈ کو تار	283	انگلستان بہ ہمراہی وزیر حسن	284
کامیابی	284	محمد علی کی واپسی	284

(باب ۹) ''چوائس آف دی ٹرکس''

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
محمد علی کا بیان	285	ضمانت کی ضبطی	286
پیروی	286	تفصیل	286

(باب ۱۰) نظر بندی

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ڈاکٹر انصاری اور اجمل خاں کا مشورہ	287	رام پور میں نظر بندی	287
قاضی عبدالغفار کا بیان	288	مہرولی کی روانگی	289
عبدالغفار صاحب کا مشاہدہ	289	مہرولی کی پابندیاں	289
زائرین کا ہجوم	289	مہرولی سے لینڈون	290

جرم کیا تھا؟	290	آنریبل رضا علی کا سوال	290
مسٹر مظہر الحق اور مسٹر جناح کے سوالات	291	لینڈون سے چھنڈواڑہ	291
مکتوب بنام عبد الغفار	291	الٰہ آباد کے اسٹیشن پر قدغن	293
پولیس افسر کی ناروا حرکت	294	کشمکش	294
جھڑپ	295	دوسرے افسر پولیس کا دخل	296
روانگی	296		

(باب ۱۱) چھنڈواڑہ کے ایام اسیری

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
تعمیر مسجد	297	رہائی کی کوششیں	297
مہاراجہ محمود آباد کی کوششیں	297	مسلم لیگ کی صدارت	298
مسٹر تلک کا ریزولیوشن	298	مسٹر مانٹیگو ہندوستان میں	299
مسلمانوں کا وفد	299	عہد نامہ کی کوشش	300
سر چارلس سے محمد علی کے تعلقات	300	مسٹر گھاٹے کا خط مسٹر بیسنٹ کے نام	301
سرکاری کمیشن	301	علی برادران کے بیانات	301
کمیشن کی سفارشات	302	مسز بیسنٹ کی رہائی	302
مسز بیسنٹ کی کوششیں	302	مسٹر بیسنٹ کی وائسرائے سے ملاقات	303
مسٹر بیسنٹ کا بیان	303	اسباب	303
پروفیسر الیاس برنی کا خط	304	مکتوبِ عبد الحق	305
چھنڈواڑہ سے "رہائی"	305	تقریر	306

(باب۱۲) چھندواڑہ سے بیتول

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
شوکت کی ڈائری	307	گرفتاری	308
تلاشی	309	مہر مادری	309
پولیس آفسر کی گستاخی	310	استقامت کا ثبوت	310
روانگی کے وقت تاثرات	310	روانگی	311

(باب۱۳) بیتول سے امرتسر

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
رہائی	312	رہائی کیوں ہوئی؟	312
حادثہ جلیانوالہ باغ	312	امرتسر	313
عدیم النظیر استقبال	313	کانگریس میں استقبال	313
اُس وقت کا منظر	314	پنڈت موتی لال کا حاضرین سے تعارف	314
مالوی جی کا ڈیلی گیٹ بنانا	314	کانگریس میں تقریر	314

(باب۱۴) دہلی

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
دہلی کا استقبال	315	آزادی کا جہاز	315
اجمل خاں کی تحریر	316	ایڈریس	316

(باب۱۵) وائسرائے کے ہاں وفد

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر

تجویز	317	ارکانِ وفد	317
ایڈریس	318		

(باب ۱۶) وفدِ خلافت یورپ میں

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
قرارداد	319	ارکان	319
وفد کی کوششیں	319	محمد علی کا بیان	320
خبر وحشت اثر	320	مسٹر میکڈ انلڈ سے دائمی اختلاف	320
کنگز وے ہال میں جلسہ	321	مسٹر میکڈ انلڈ کی خفگی	321
خفگی کا اصل سبب	321	لینسبری کی کوشش	322
فرانس میں تقریریں	322	پاپائے رومہ سے ملاقات	323
مسٹر لائڈ جارج سے ملاقات	323	ناکامی	323
تشنگی معلومات	323	لوحِ سلیمان	324
اعتراضِ جواب	324	ترتیبِ حساب کے مشکلات	326
وفدِ خلافت کی عظمت واہمیت	329	وفد کے ارکان کارکن اور عملہ	332
یورپ کی نگرانی	333	دوسرے تبلیغی مصارف	335
ڈنر	338	مقاماتِ سفر	340
مصارف کی کل میزان	341	مصارف کا موازنہ	341
تفصیل آمد و خرچ	342	تبصرہ	343
واپسی	344	استقبال	344
ناکامی کا اثر	344	مقاطعہ	345

(باب ۱۷) جامعہ ملیہ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
علی گڑھ کو دعوتِ خیر	346	کورٹ میں تقریر	347
ملامت کا ووٹ	347	یونین میں تقریر	348
عمل کا وقت	348	اولڈ بوائز لاج میں قیام	348
نکل جاؤ	348	انکار	349
پولیس کا داخلہ	350	اصغر صاحب کا بیان	350
خیام میں قیام	351	بعد کے انتظامات	352
محمد علی کی ''پرنسپل شپ''	352	جامعہ ملکہ کی اسکیم	352
فلسفہ کی پروفیسر شپ	353	جامعہ سے بے تعلقی اور تعلق	354

(باب ۱۸) ناگپور کانگریس

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ناگپور کانگریس	355	خلافت کانفرنس	355
اختلاف	356	سی۔آر۔داس	356
محمد علی کی کوششیں	356	سی آر داس کی رضامندی	356
نتیجہ	357	تحریک کا آغاز	357
ویلنٹائن شرل کا خیال	358		

(باب ۱۹) تحریکِ خلافت

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
دورہ	359	جوش و خروش	359

شوقِ گرفتاری	360	چندہ	360
ترکِ ملازمت	361	ترکِ تعلیم	361
اتفاق واتحاد	362		

(باب ۲۰) معافی کا افسانہ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
علی برادران کی ''معافی''	363	مقصد	363
اثر	363	محمد علی کا بیان	364
گاندھی جی کی لارڈ ریڈنگ سے ملاقات	364	سازش کا الزام	364
''انڈی پینڈنٹ'' کے نمائندہ کے سوالات	364	شبہ مالوی اور سپرو کو تھا	364
لارڈ ریڈنگ کا مواد	365	وائسرائے کا انکار	366
بیان دینے سے انکار	366	وائسرائے کے لیے نہیں	366
وائسرائے کی گاندھی جی سے گفتگو	367	گاندھی جی کا جواب	367
مقدمہ چلانے کا ذکر	367	لارڈ ریڈنگ کی عیاری	368
حسرت کا خط	369	تقریر سے تاثر	369
لارڈ ریڈنگ کی تحریک	370	سر سپرو کی ''مساعی حسنہ''	370
گاندھی جی کی وائسرائے کے نام تحریر	370		

(باب ۲۱) کراچی خلافت کانفرنس اور گرفتاری

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
علماء کا فتویٰ	372	خلافت کانفرنس	372
شرکاء	372	صدارت کی طرف سے تجویز	373

تقریر صدارت	373	تائید	374

(باب۲۲) مقدمۂ کراچی

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
منظرِ عدالت	375	ملزن کی آمد	375
آمد کا انتظار	376	مجسٹریٹ کا خطاب	376
استغاثہ کا ثبوت	376	مجسٹریٹ کا سوال	377
سشن سپرد	378	محمد علی کا بیان	378
فیصلہ عدالت	379	عدالت کے اندر جرأت و بے باکی	380
سزا کا اثر	380	احباب پر اثر	381
ایک یادگار واقعہ	381	تاثراتِ ماجد	381

(باب۲۳) سزا کے بعد

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ملک کی عام حالت	384	گاندھی جی کا اعادہ	384
سول نافرمانی کا ارادہ	384	واقعۂ چوری چورا	385
مالوی جی کی کوششیں	385	پروگرام کا التواء	385
التواء کا اثر	386	تحقیقاتی کمیٹی	386
گاندھی جی کی گرفتاری	386	سوامی شردھانند کی رہائی	386
فسادات ملابار	387	ملکانہ راجپوتوں کی شدھی	387
اثر	388	تبلیغ	388
انقلاب	388	سرمایہ خلافت کیا ہوا؟	389

(باب۲۴) رہائی اور کانگریس کی صدارت!

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
آمنہ بیگم کی علالت	390	رہائی کے بعد بیان	390
صدارت کے لیے نامزدگی	391	عہدِ صدارت	391
گاندھی جی کی رہائی	392	محمد علی کی روش	392
گاندھی آشرم میں بوچھاڑ	392	کارنامہ	393
ممبر ہو سکتے تھے	393		

(باب۲۵) عہدِ تعطل یا ردِّ عمل

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
عام حالت	394	اصل علت	394
استقامت	394	رفقاء کی علیحدگی	395
محمد علی کے تاثرات	395	رائے	397

(باب۲٦) کانگریس سے وفاداری

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
تبلیغی جماعتوں کی دعوت	399	یہ ایک حل طلب سوال ہے	399
جمعیت تبلیغ انبالہ	400	بلگام خلافت کانفرنس	400
محمد علی کی اصلاح	401	بلگام کانگرس	401
فساداتِ کوہاٹ	402	کانگریس کا وفد	402
محمد علی کا نظریہ	402	دھرم شالہ چھیدی لال کا جلسہ	403
موتی لال سے اختلاف کی وجہ	404	ایک غیر مسلم اخبار کا اعتراف	404

ایک اہم اختلاف	405	تاریخی تمثیل	405
راہِ عمل کیا ہو	407	دشمن منتخب	407
الدالخصام کون ہے	408	بمبئی تحقیقاتی کمیٹی	409
مسٹر پٹیل کی ٹوپی	410		

(باب ۲۷) "یونٹی کانفرنس"

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ملک کی عام حالت	411	سنگٹھن	411
مسلمانوں میں جوش	412	نتیجہ	412
لکھنؤ کا فساد	412	اسبابِ فساد	412
یونٹی کانفرنس	413	محمد علی کا قصہ	413
التواء کے بعد	414	محمد علی کا طرزِ عمل	414
شملہ یونٹی کانفرنس	414	قاصدِ امن	414
کانفرنس شروع ہوگئی	415	بیگم بھوپال کا تار	415
محمد علی کی کوششیں	415	شاہد کی علالت	416
پھر التواء	416		

(باب ۲۸) مسئلہ حج وحجاز

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
شریف حسین کی غداری	417	حملے کے ارادے	417
گورنمنٹ کا طرزِ عمل	418	التواءِ حج کی تجویز	418
محمد علی کا ردِّ عمل	418	سر حبیب اللہ سے خط کتابت	419

''مسلمانوں'' کی مخالفت	419	فرار	419
کامیابی	420	خیر و عافیت	420

(باب ۲۹) آویزشِ نجد و حجاز

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
شریف کی بدکرداریاں	421	شریف کے حامی	421
رضا خانی جماعت کا اختلاف	422	محمد علی کا نظریہ	422
آزمائش	423	افواہیں	424
خلافت کمیٹی کی تجویزیں	425	خدام الحرمین کا قیام	426
رفع نزاع کی کوششیں	426	لکھنؤ کے معاونین	426
ایک جلسہ	427	اشتعال	427
محمد علی کی دعوت	427	محمد علی کا ارادہ	428
جلسہ کے حالات	428	توفیق شریف کی تقریر	428
خلل اندازی	428	برخاستگی کا اثر	429
اثرات	429	محمد علی کی روانگی	430
دو اور جلسے	430	خدام الحرمین کے انتظامات	430
جلسہ کا منظر	430	محمد علی کی آمد	431
دوسرا جلسہ	431	غیر معمولی کامیابی	432
خلافت کمیٹی کی مستعدی	432	ابن سعود کا اعلانِ ملوکیت	432
محمد علی کی مخالفت	433		

غبن	465	تنقیح	465
درگزر	465	محمد علی کا بیان	465
کتنا روپیہ چھوڑا تھا	466	ذمہ دار کون ہے؟	466

(باب ۳۶) کتاب راجپال

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
زعمائے اسلام کی حالت	468	ہندو زعماء کی کیفیت	469
گاندھی جی اور موتی لال کی خاموشی	469	یہ سکوت کس لیے تھا؟	469
محمد علی کی رہنمائی	470	نظریہ	470
اثرات	471	ایک دلچسپ خط	471
جواب لاجواب	471	سرگرمیاں	472
لکھنؤ کا ایک جلسہ	473	مولانا ظفر الملک کی تقریر	473
محمد علی کا تدبر	473	قانون	474
تشریح	474	اسمبلی میں	475
خصوصیت ممیزہ	475		

(باب ۳۷) آل پارٹیز کانفرنس

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
محمد علی کی تگاپوئے دمادم	476	آل پارٹیز کانفرنس	477
پہلے اجلاس	477	محمد علی پر حملہ	477
محمد علی کا جواب	478	طرزِ عمل	478
گاندھی جی	478	پھر التواء	479

(باب ۳۸) چودہ نکات

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
دہلی پرپوزل	480	خلاصہ	480
محمد علی کوششیں	481	کانگریس کی تصدیق	481
محمد علی کا اظہارِ خیال	481	ہندوؤں کی مخالفت	482
علی گڑھ کا ایک جلسہ	482	محمد علی کی تقریر	483
مالوی جی کی تائید	483	پھر بھی مخالفت	483
دلائل	484	ایک اور مضمون	484
مسلمانوں کا افہام تفہیم	485	مسلم لیگ	485
ایک لمحۂ فکریہ	485	مخالفت کا اثر	486

(باب ۳۹) سائمن کمیشن

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
سائمن کمیشن کی ہیئت ترکیبی	487	طوفانِ اختلاف	487
مجالس قانون ساز میں	488	تالیف قلب	488
مسلمانوں کی روش	488	محمد علی کی رائے	489
سر شفیع کا "پیام"	489	لیگ کے دو ٹکڑے	490
محمد علی کی جدوجہد	490	مسٹر جناح کی مخالفت	490
کامیابی	491	سر شفیع کو چیلنج	491
پھر طلبی	492	لکھنؤ میں جلسہ	493
مخالفت	493	مضامین	494

(باب ۴۲) کلکتہ کانگرس

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
کلکتہ کا انتخاب	509	خلافت کانفرنس	509
مسلم لیگ	509	کنونشن	510
محمد علی کی شرکت	510	فضا	510
مباحثہ کا آغاز	510	مسٹر سین گپتا کی تقریر	511
محمد علی کی مخالفت	511	ہنگامہ	511
مغرب کی نماز	512	خلافت کانفرنس	512
خطبۂ صدارت	512	اسباب وعلل	513
مجمع پر اثر	513	دوسرے حالات	514
ایک اعتراض	514	مسلم لیگ کی شرکت	515
مسٹر جناح کی تقریر	515	جیکر کی تقریر	516
مسٹر چھاگلہ کا بیان	516	محمد علی کا بیان	517

(باب ۴۳) آل مسلم پارٹیز کانفرنس دہلی

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
سزا	520	انتظامات	521
صدارت	521	شرکاء	521
سر شفیع کا دعویٰ	521	بڑا مرحلہ	521
حکمت عملی	522	کارروائی	522
تجویز	522	محمد علی کی تائید	526

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ایک مضمون	494	نتیجہ	494

(باب ۴۰) سفر یورپ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
''مردے از غیب''	496	عزم روانگی	497
پیرس	497	بستر علالت	498
مایوسی	498	نمازِ جنازہ کا طریقہ	498
صحت	499	ہندوستان میں تلاطم	499
انگلستان	499	روانگی	500
ممالک اسلامی	500		

(باب ۴۱) نہرو رپورٹ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
آل پارٹیز کے بعد	501	بمبئی جلسہ	501
گاندھی جی کی تجویز	502	شوکت کی تائید	502
تشکیل	502	آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ	503
کانفرنس کا اجلاس	503	رپورٹ میں کیا تھا	504
علی برادران کا اختلاف	504	دباؤ	504
طوفانِ افتراق	505	صفائی	505
ترمیم کی صورت	506	نتائج	506
مقابلہ	506	گاندھی جی کی حمایت	507
ہندوؤں کا سکوت	507	محمد علی کا اختلاف	507

مفتی صاحب کی تائید	527		

(باب ۴۴) وائسرائے کا بیان

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
لارڈ اردن کا تدبر	528	زعماء کانگریس کا اجتماع	528
کانگریس کا بیان	528	وائسرائے کا اعلان	529
محمد علی کی روش	529	بیان کا اثر	529
''برہانِ قاطع''	530	''قاطع برہان''	530
مدارس کانگریس	531	مالوی جی کے اعتراضات	531

(باب ۴۵) جنوبی افریقہ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
دعوت	533	شوکت کی روانگی	533
اہانت آمیز حکم	533	انکار	534
تار	534	جواب	535
جدوجہد	535	آخری تار	535
کانگرس کی تجویز	535	توقعات	536
اسپیشل ٹرین کا انتظام	536		

(باب ۴۶) ساردا ایکٹ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ساردا بل کیا تھا؟	538	ساردا بل محدود تھا	538
محمد علی کا اختلاف	538	مسلمانوں میں خاموشی	539

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
مولانا احمد سعید کی شہادت	539	محمد علی میدانِ عمل میں	539
خوانگی ختم	540	منظوری کے بعد	540
محمد علی کو دوگونہ آفتیں	540	قائم مقام وائسرائے کے نام خط	540
دلائل	541	وائسرائے کا جواب	541
لارڈ اردن سے ملاقات	542	وائسرائے کا جواب	542
محمد علی کا جوشِ ایمانی	542	لارڈ اردن کی ''درخواست''	542
محمد علی کا جواب	543		

(باب ۴۷) علماء کانفرنس

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
علماء پر محمد علی کے احسانات	544	سر یعقوب کا خیال	545
جمعیت العلماء بہ حیثیت متبع کے	545	سیاست کیا تھی؟	545
انکشافِ راز	546	''آزادہ روی'' کا فیصلہ	546
بنائے اختلاف	547	مرادآباد کا جلسہ	547
محمد علی کا روّیہ	547	ایک دل شکن حملہ	548
محمد علی کے رفقاء	548	کانپور علماء کانفرنس	548
اجلاس	549	حاضرین	549
تحریک وتائید	549	خطبہ صدارت	550

(باب ۴۸) لاہور کا قومی ہفتہ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
گاندھی جی سے گفتگو	552	گاندھی جی کا جواب	552

محمد علی پر اثر	553	خلیج اختلاف	553
مسلمانوں میں اختلاف	553		

(باب۴۹) گول میز کانفرنس

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
دعوت کیوں قبول کی	555	مظاہرہ کا اندیشہ	556
تبادلہ خیالات	556	مکتوب بنام مولانا عرفان	556

(باب۵۰) تقریر

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ڈیلی ہیرلڈ کا جواب	558	لارڈ پیل پر تنقید	559
ضرورت ہے ایک انسان کی	559	آزادی یا موت	560
کھوئی ہوئی ڈومنیین	561	ہندوستان کا نامرد بنا دیا	562
لڑاؤ اور حکومت کرو	563	ہندو مسلم مسئلہ	564
فیڈرل نظام حکومت	564		

(باب۵۱) خراجِ تحسین

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
ایک خط	566	ایک نظر	566

(باب۵۲) محمد علی بہ حیثیت قائد کے

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
منفلوطی کا نظریۂ عظمت	568	تطابق	569
محمد علی کی شخصیت	570	ہمہ گیر اختلاف	571

مسلسل پروپیگنڈا	571	تہمت تراشیاں	572
قیادت کا اعتراف	573	کانگریس کی صدارت	574
لیڈر گر محمد علی	575	دشمنوں کا نرغہ	575
پھر بھی عام مقبولیت	575		

عرض ناشر

شہیدِ ملت مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح حالات کا ایک مختصر خاکہ ناظرین کی خدمت میں پیش ہے۔

انسان کی زندگی کائنات کا سب سے پوشیدہ راز ہے اور انسانی شخصیت کو سمجھنا اور سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا اسی نسبت سے دشوار، پھر جب یہ شخصیت محمد علی جیسی جامع حیثیات ہو تو اس دشواری کا کیا ٹھکانا ہے!

محمد علی کی زندگی کا بیان دراصل ایک قوم اور ایک ملت کی حال واستقبال کی تفسیر کرنا ہے کہ محمد علی اسلامی ملت اور ہندی قوم کا قائد تھا اور نمائندہ بھی۔ ایک بیدار ہونے والے ملک، ایک خوابِ گراں سے جاگنے والی ملت کی ساری بے تابی، سارا وفورِ شوق، ساری سرگرمی، ساری خودفراموشی اس ایک پیکر خاکی میں جلوہ گر تھی۔ یہی نہیں اُس کی ذات آغاز کار کی تمام تکلیفوں اور پریشانیوں، بےترتیبیوں اور ہنگاموں کا مظہر بھی تھی۔ نامساعد حالات سے جنگ پیہم، بے سروسامانی، بے یاری و بے مددگاری، ہمراہوں کی خفتہ پائی، ہم نواؤں کی کج فہمی، غرض کون سی چوٹ تھی جس نے اس کی روح کے گوشتہ گوشہ کو گھائل نہ کر دیا ہو۔ وہ ہماری قومی اور ملی زندگی کی اجمالی تصویر تھا۔ ان صفحات میں اس تصویر کا ایک عکس ضرور ہے مگر بس ایک خاکہ، دھندلا سا اور نامکمل... اِس کی تکمیل کا پورا حق بیسویں صدی میں اسلام اور ہندوستان کی سرگزشت لکھنے والا مؤرخ ادا کر سکے تو کر سکے۔

مگر اس نمائندہ اور قائد کے سینہ میں ایک آگ تھی جس کی چنگاری سے خفتہ ملتیں بیدار اور مردہ قومیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ وہ آگ جو کبھی باطل دوستوں کے لیے بہت ناگوار شعلہ نوائی کی شکل میں ظاہر

ہوتی، کبھی آنسو بن کر اس کی سرشار محبت آنکھوں سے ڈھلتی تھی، اپنے سینہ کے اس دفینہ آتشیں سے وہ اپنی قوم کے نوجوانوں کے سینوں میں کچھ چنگاریاں منتقل کر گیا ہے جو اُس کے اُن خوابوں کی تعبیر کی ضمانت ہیں جنہیں نادان سمجھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ختم ہو گئے۔ اس سیرت کے مرتب مولوی رئیس احمد صاحب جعفری انہیں نوجوانوں میں ہیں۔ انہیں اپنے موضوع سے محبت ہے، عشق ہے اور اس لیے کیا عجب کہ یہ اس کیمیا اثر چنگاری کو دوسرے سینوں تک منتقل کرنے میں کامیاب ہوں۔ اگر یہ ہو تو ہم اپنی سعی کو مشکور سمجھیں گے۔

ناشر

دیباچہ

ازمولانا عبدالماجد صاحب بی،اے، مدیر ''سچ''

ماضی قریب میں اسلامی ہند کی سرزمین نے جو چوٹی کے اکابر ومشاہیر پیدا کیے اگر یہ سوال ہو کہ بہ لحاظِ جامعیت اِن میں سرفہرست کس کو بنایا جائے اور کون ایک ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانح حیات کے اندر اجمالاً پوری عصر حاضرہ کی تاریخ آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جاسکتا ہے اور وہ نام امت کے محبوب ترین ناموں ''محمد'' اور ''علی'' کا مجموعہ ہوگا!

اُس دور نے یقیناً بعض بڑے اور جلیل القدر علماء دین پیدا کیے، لیکن اُن کی ناموری صرف دینداروں کے طبقہ تک محدود رہی۔ بعض نامی وگرامی مشائخ طریقت پیدا کیے لیکن اُن کا نام بس مریدوں اور معتقدوں ہی کی زبان تک رہا۔ بعض مشہور ریفارمر پیدا کیے لیکن اُن کی اور اُن کے ''ریفارم'' دونوں کی شہرت انگریزی تعلیم یافتہ گروہ کے حدود سے آگے نہ بڑھی، بعض زبردست خطیب اور لیڈر پیدا کیے، لیکن اُنہیں کانفرنسوں کے پلیٹ فارم اور کانگریسوں کے ڈائس کے باہر کسی نے نہ جانا۔ یہ چیدہ مشاہیر اور اکابر کا حال ہوا۔

دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر نکلیں اور اُن سے بھی تنگ تر دائروں میں گونج گونج کر رہیں۔ ملک کے طول وعرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز مشرق نے بھی سنی اور مغرب نے بھی، شمال نے بھی اور جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی لہروں نے بھی، پڑھے لکھوں نے بھی اور اَن پڑھوں نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی، بڑوں نے بھی چھوٹوں نے بھی، ردا روں نے بھی اور خاکساروں نے بھی، شہرت کے مہذبوں نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے ی۔ وائسرائگل لاج کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی برجیوں نے بھی اور جیل خانہ کی تنگ وتاریک کال

کوٹھریوں نے بھی، راجوں مہاراجوں کے قصر ایوان نے بھی اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی!

اُس کا کلام سن کرڈرائنگ روم کے کوچ اور صوفے کھلکھلا کھلکھلا کر ہنسے، اُس کا پیام سن سن کر مسجد کے محراب و منبر بلبلا بلبلا کر روئے۔ خانقاہیں اور مدرسے، پارک اور نشاط خانے، کھنڈر اور ویرانے، قوم پروروں کی کانگرس اور فرقہ پروروں کی کانفرنس، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل اور علی گڑھ، جمعیت العلماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، سب کے چپہ چپہ پر اس کے نقش قدم کے نشان، سب کا ذرّہ ذرّہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز!

معاصر اور حریف بہت سے تھے پر قبول خداداد اور مرجعت تام کی دولت سے وہی ایک ممتاز یہ سعادت ''زور بازو'' کا نتیجہ نہیں، ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کا ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے یقیناً صحیح ہوگا لیکن آنکھوں کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ جو اللہ کے بندوں کا ہو گیا تھا، اللہ کے بندے اس کے ہو گئے تھے۔ محمد علی نے اپنے کو اللہ کی خاطر، اللہ کے دین کی خاطر، خدمت خلق کے لیے وقف کر دیا تھا، خلق نے بھی اپنے تئیں محمد علی کے لیے وقف کر دیا، وعدہ ربانی کہ

ان الذین امنوا وعملوا الصلحت سیجعل لھم الرحمن ودا، (مریم ع ۹)

''یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ہیں، خدائے رحمٰن اُن کے لیے (خلق کے دل میں) محبت پیدا کر دے گا!'' کی تفسیریں لفظ و عبارت میں بہت دیکھی تھیں، گوشت و پوست میں مجسم تفسیر محمد علی کی زندگی میں نظر آئی!

❁

اس دل و دماغ کا، ایسا جامع الصفات سردار کسی قوم کی خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے۔ جنہیں یہ نعمت ملی انہوں نے قدر نہ کی، وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے؟ دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا رکنے والی تھی؟ ایک آنی دولت اور فانی نعمت تھی، آئی اور گئی۔

تو نظیری زفلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نہ نشناخت دریغ

اور پھر مسلمان! انہوں نے اپنی تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہے؟ شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی؟ خلیفہ رسول عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی؟ جوانانِ جنت کے سردار حسین رضی اللہ عنہ کی؟ جب اپنی شورہ بختیوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر نہ پہچانی تو اسے کیا غم و ماتم کہ ان کے غلاموں کے غلام، محمد علی کی ناقدری رہی؟ اور اسے خواہ مخواہ شورہ بختی ہی کیوں قرار دیجیے؟ صناع کامل کی مصلحتوں کی تھاہ، اور حکیم علی الاطلاق کی حکمتوں کے بھید کون پا سکا ہے؟

کم تھے جنہوں نے محمد علی کو پہچاننے کی کوشش کی، کمتر تھے جو اس کی کوشش میں کامیاب رہے۔ ادب و سیاست، خطابت و صحافت، قیادت اور انشا پردازی، طرح طرح کے گہرے گہرے نقاب کچھ اس طرح تہ بہ تہ پڑے ہوئے تھے کہ چہرے کے اصل خد و خال اور بشرہ کے حقیقی حسن و جمال کا مشاہدہ دشوار ہو گیا تھا۔ مبارک تھے وہ جنہوں نے قریب آ کر دیکھ لیا، مبارک تر تھے وہ جنہوں نے دور ہی سے فراستِ ایمانی کی روشنی میں بھانپ لیا اور جیتے جی نہ سہی، مرنے کے بعد یوں فاش و برملا کہہ دیا (اشارہ ہے مولانا مناظر احسن صاحب (عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد) کی طرف یہ اشعار صاحب موصوف نے مولانا محمد علی کے انتقال پر کہے تھے، مؤلف۔)

به دین مصطفیٰ دیوانه بودی — فدائے ملت جانانه بودی
به بزمِ ما رئیس عشق بازاں — به رزمِ دُشمناں فرزانه بودی
به دِل بودی فقیر بے نوائی — به قالب پیکر شاہانه بودی
سیاست را نقاب چہرہ کر دی — وگرنه عاشق مستانه بودی
سیاست تہمتے بر حسن پاکت — ز آئین خرد بے گانه بودی
چه دانستی کجا سوزم، نه سوزم — تو شمع دین را پروانه بودی
بایمانہا ز تو زورے و شوارے — بجا نہا ہمت مردانه بودی

رمیدی ازرہِ اغیار تاتار عجب مستے، عجب دیوانہ بودی

محمد علی کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں، لیکن صحیح ترین مرقع یہی ہے۔ محمد علی پہلے جو کچھ بھی رہے ہوں علی گڑھ کے ایک مشہور "کھلنڈرے" آکسفورڈ کے ایک بہترین طالب علم، انگریزی کے ایک اعلیٰ انشاپرداز، ایک بہترین ایڈیٹر، شیکسپیئر کے ایک ماہر نقاد، اوتھیلو، میکبتھ وغیرہ کے ایک اعلیٰ مبصر، ایک سحر بیان مقرر، ایک بلند پایہ شاعر، ملک کے ایک نامور رہنما، ایک ممتاز ترین سیاسی سردار، لیکن آخر میں؟ آخر میں یہ ساری حیثیات سمٹ سمٹا کر صرف ایک ہی حیثیت میں جمع ہوگئی تھیں۔ جو کبھی اپنی عقل و فرزانگی کے لیے مشہور تھا، وہ اپنے خبط و دیوانگی کے لیے بدنام ہو کر رہ گیا! مرنے پر کانوں میں آوازیں آئیں کہ ملک وملت کا سیاسی رہنما چل بسا لیکن دِل سے صدا اُٹھی تو بس یہی کہ آج "محمد ﷺ" کا دیوانہ دنیا سے رخصت ہو گیا!

ہاں! وہ محمد ﷺ کا شیدائی، دین مصطفیٰ ﷺ کا دیوانہ اور اُمتِ محمدی ﷺ کا بن داموں کا غلام تھا۔ ہندوستان ہی میں نہیں عالم اسلام میں کہیں کسی کلمہ گو کے پھانس چبھتی اور اس کی چبھن محمد علی کے ہونے لگتی۔ مصیبت کسی مسلمان پر بھی آئے اور درد سے بے تاب محمد علی۔ اسلام پر، قانونِ اسلام پر، شعائر اسلام پر کہیں کوئی حملہ ہوا اور تڑپ محمد علی کے دل وجگر میں پیدا! مقابلہ انگریزوں سے آپڑے، ہندوؤں سے پڑ جائے، حکومت سے ہو، خود اپنے مسلمانوں سے ہو، محمد علی کا سینہ ہر وار کے لیے سپر بنا ہوا! 1926ء میں حج اور شرکت مؤتمر اسلامیہ کے لیے جب جانے لگے، اور سلطان ابن مسعود کی حکومت ابھی نئی نئی ہوئی تھی تو "ہمدرد" میں اپنے قلم سے خود لکھا:

"اب نہ بنی اُمیہ کا دور ہو سکتا ہے نہ بنو عباس کا، نہ خاندانِ عثمان کا۔ اب حکومت اسلام ابن اسلام کی ہوگی۔"

دن رات اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یہی دھن تھی اور اسی کا کلمہ آخری سفر پر جب بمبئی سے روانہ ہونے لگے جو سفر آخرت کا پیش خیمہ تھا، تو اس وقت بھی اسلام کے تحفظ ناموس پر کچھ ایسے ہی الفاظ زبان سے کہے۔ حق تھا کہ ایسے شخص کی جب موت آئے تو سارا عالم اسلام شرق سے غرب تک اس کی عزاداری

میں سیہ پوش ہو جائے اور شمال سے جنوب تک ایک ماتم سرا بن جائے، اور یہی ہوا۔ پھر غریب الوطنی کی موت کے بعد جگہ بھی ملی تو کہاں؟ وہاں جہاں کے لیے آرزو اور تمنا بڑے بڑے صدیقوں اور شہیدوں نے کی ہے، خود بعض انبیاء کرام تک نے کی ہے! سلیمانؑ و داؤدؑ کا قبلہ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا قبلہ، خود نبی القبلتین کا پہلا قبلہ! بقولِ اقبالؒ:

خاکِ قدس او رابہ آغوشِ تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفتازاں را ہے کہ پیغمبر گزشتہ

''جسم'' کو جو عروج نصیب ہوا سب نے دیکھا، ''روح'' کو جو مقام حاصل ہوا ہو گا اس کا اندازہ کریں۔ جسے آدمی کاندھوں پر اٹھا کر لائے، اسے سب نے دیکھا۔ جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے، اس کے درجہ اور مرتبہ کو کون ہے؟

ایک ایسا شخص جو ایک طرف وزیر ہند (مسٹر مانٹیگو) اور وزیر اعظم برطانیہ (مسٹر لائڈ جارج) کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلہ خلافت پر آزادانہ تقریر کر سکتا ہو، جو عین ہیجانِ مخالفت کے وقت لندن اور پیرس کی بڑی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں مدلل اور مفصل، شستہ و برجستہ اظہار خیال کر سکتا ہو، جو وائسرائے اور گورنروں کے سامنے، سارڈا ایکٹ اور دوسرے قوانین کے سلسلہ میں مخالفانہ بحثیں کر کر کے اُنہیں قائل و معقول کر سکتا ہو، کامریڈ میں سیاستِ حاضرہ اور مذہب پر دس دس بیس بیس کالم کے مضامین بہترین ادب و انشاء کے ساتھ سپردِ قلم کر سکتا ہو۔ انگریزوں کی کلب لائف میں شریک ہو تو ایسا گھل مل جائے کہ انہیں میں سے ایک معلوم ہونے لگے، دوسری طرف مسجد کے منبر پر وعظ کہنے کھڑا ہو تو روتے روتے اپنی داڑھی بھگو لے، اور سننے والوں کی تو ہچکیاں بندھ بندھ جائیں۔ محفل سماع میں بیٹھتے تو اس کا وجد و حال دیکھ کر دوسروں کو وجد آ جائے، مسئلہ قتل مرتد پر جب استشہاد و استنباط شروع کرے تو اچھے اچھے فقہاء اس کا لوہا مان جائیں۔ آزاد خیال اتنا کہ ہر کلمہ گو کو اپنا حقیقی بھائی سمجھ لے، متقشف ایسا کہ مصطفےٰ کمال، امان اللہ خاں اور سلطان ابن مسعود کو آخر تک معاف نہ کرے۔ نماز کا پابند اتنا کہ ایوانِ پارلیمنٹ کے برآمدہ میں بھی جاء نماز بچھا کر کھڑا ہو جائے اور اس عمارت میں شاید بالکل ہی

پہلی بار رکوع وسجود کی ایک نظیر قائم کر جائے۔ دلیر اتنا کہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے مجمع میں گھس جائے، سلطان ابن سعود کے منہ پر بھرے مجمع میں سب کچھ کہہ سن کر رکھ دے۔ ادیبوں کی محفل میں ادیب، شاعروں کی مجلس میں غزل گو، اہل سیاست کی صف میں ممتاز، عوام وخواص دونوں کے اعتماد وعقیدت سے سرفراز، ایسی ہمہ گیر، ایسی ''عامۃ الورود'' ہستی کی سوانح حیات مرتب کرنا کوئی آسان بات ہے؟

مذہب، سیاست، علم، ادب، تعلیم، صحافت، کانفرنسیں اور جلسے اس پچیس تیس سال کے اندر اسلامی ہند بلکہ ایک حد تک مملکت ہند اور عالم اسلامی میں، جو بھی تحریک کسی بھی ادارے میں ہوئی محمد علی کی شخصیت اس کے اندر کارفرما اور محمد علی کا اثر براہ راست نہ سہی، بالواسطہ سہی۔ اس میں موجود ایسے شخص کی سیرۃ نگاری ایک شخص کی سیرۃ لکھنا نہیں، وقت کی پوری تاریخ مرتب کر ڈالنا ہے۔ کس پہلو کو لیا جائے، کس کو چھوڑا جائے، کون کون سے رُخ نمایاں کیے جائیں اور کون سے مدہم ہی رہنے دیے جائیں، کیا کیا پھیلایا جائے اور کیا کیا سمیٹ لیا جائے؟ ہر ہر موضوع ایک مفصل اور مبسوط گفتگو کا طالب، ہر ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی۔

ضرورت تھی کہ اچھے جید اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی ایک پوری جماعت، ترتیب سوانح کا کام ہاتھ میں لیتی اور وہ بھی فی الفور نہیں۔ ایک عرصہ تک تلاش وتفحص جاری رکھنے کے بعد اپنی فکر وکاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم مجلدات میں مرتب کر کے شائع کرتی، لیکن حالات مساعد نہ ہونے تھے نہ ہوئے۔ تفصیلات کو چھوڑیئے، ان اسباب کی شرح اگر کی جائے تو خود ایک مستقل رسالہ ''شرحِ اسباب'' تیار ہو جائے۔ جمود اور افسردگی کے اس منظر کو دیکھ کر جامعہ ملیہ کا ایک نوعمر ونوخیز ہونہار اہل قلم آگے بڑھا اور اپنی عمر وتجربہ کی کمی کو ہمت کی فراوانی سے پورا کر کے بلا تکلف اور بے دھڑک اس بارِ عظیم کے لیے اپنے سروشانہ کو پیش کر دیا جس کے سنبھالنے کے لیے کئی کئی قومی الجثہ اور تنومند پہلوان کشتیاں نکالے ہوئے اور اکھاڑے جیتے ہوئے درکار تھی۔ آفرین ورحمت اس کی ہمت پر، آفرین ورحمت جامعہ کی مستعدی وکارگزاری پر! جامعہ... ہاں! وہی محمد علی کی یادگار جامعہ ملیہ...وہ پودا جسے محمد علی نے اپنے ہاتھ سے زمین میں لگایا، بڑھایا، سینچا، پالا۔

منازلِ سفر کی دوریوں اور راہ کی دشواریوں، زادِ سفر کی بے سروسامانیوں اور یارانِ طریق کی کج اَدائیوں کی حکایت کیا اور کس سے کیجیے؟ اور کیجیے بھی تو سننے والوں سے امید کیا رکھیے، خود جوہر ہی کے الفاظ میں:

خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے!

بہر کیف و بہر حال چند ماہ کی مختصر مدت میں، شوق وعقیدت کے جذبات اپنے نقوش جو کچھ کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے، وہ حاضر خدمت ہیں۔ یہ ''سخت دل'' ہیں ان پر ''مال وتجارت'' کا دھوکا نہ ہو۔

آگے بڑھنے سے قبل معروضاتِ ذیل کو ذہن نشین فرمالیا جائے۔

صاحب سیرۃ کی زندگی سپاہی کی زندگی تھی، ساری عمر دشمنوں سے اور کبھی کبھی دوستوں سے بھی لڑتے اور مقابلہ کرتے ہی گزری۔ ممکن نہیں کہ محمد علی کی سیرۃ دیانت کے ساتھ لکھی جائے اور محض بزم آرائیوں کی داستان پر ختم ہو جائے۔ ''خالد جانباز'' کے وقائع اور کارنامے کوئی ''حافظ شیراز کی زبان میں'' آخر کیونکر بیان کرے؟ بعض نازک دلوں کے جذبات کو جابجا صدمہ یقیناً پہنچے گا، اس کے لیے شروع ہی سے تیار رہنا چاہیے۔ مؤلف نے سنبھل سنبھل کر اور بہتوں کے جذبات کی رعایت کر کر کے قلم اُٹھایا ہے، پھر بھی واقعات میں تحریف کے مجرم تو نہیں ہو سکتے تھے، علی مرتضٰی کے سیرۃ نگار کے لیے جنگ صفین اور حسین بن علی کے سوانح نویس کے لیے میدانِ کربلا کا ذکر زبانِ قلم پر نہ لانا کیونکر ممکن ہے؟

بس یہ اور اسی قبیل کی چند جزئی فروگزاشتوں کو چھوڑ کر کتاب بحیثیتِ مجموعی قابل داد ہے اور ہونہار مصنف کی سعی وکاوش مستحق ستائش، بلکہ جب یہ یاد ہوتا ہے کہ اُن کی یہ بالکل پہلی تصنیفی کوشش ہے تو حیرت کے ساتھ اُن پر رشک کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ متعدد عبارتیں ایسی ادیبانہ ہیں کہ اچھے اچھے کہنہ مشق اور پختہ کار ادیبوں کے لیے باعث فخر ہو سکتی ہیں۔

یہ نقش اوّل ہے، آئندہ ایڈیشن نقش ثانی ہوگا۔ جو اہم واقعات اس میں درج ہونے رہ گئے ہیں یا محض سرسری اور ناتمام درج ہوئے ہیں، خدا کرے اُس وقت پوری طرح مفصل ومشرح ہوں اور اللہ وہ وقت جلد لائے۔

بسم اللہ

اشارات!

محمد علی جیسے زعیم ملت کی سوانح عمری کسی بڑے آدمی ہی کو لکھنی چاہیے تھی نہ کہ اس کے لیے انتخاب ہوا ایک گمنام، کم علم، ہیچ میرز شخص کا! میر انیسؔ کی زبان میں 'مورِ ضعیف و مدحِ سلیمانِ ذی حشم!' بہر حال جیسا کچھ بن آیا، حاضر ہے۔ مفصل اور مطول ایڈیشن تو بعد کو نکلے گا۔

چند باتیں بغیر کسی تمہید کے ضروری طور سے قابل گزارش ہیں:

① اس کی کوشش کی گئی ہے کہ عبارت آرائی کو ذرا بھی دخل نہ دیا جائے۔ جہاں تک ہو سکے، واقعات اور مواد پیش کیا جائے کہ سوانح نگاری کا اصل اصول یہی ہے!

② کسی عبارت یا جملہ پر اگر زور دینا مقصود ہو تو اُس پر خطوط کھینچ دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے دو حصے کر دیے گئے ہیں، پہلے حصہ میں صاحب سیرت کے اخلاق و عادات اور عام حالاتِ زندگی سے بحث کی گئی ہے، اور دوسرے حصے میں اُن کے کارنامہ ہائے حیات پر گفتگو ہے اور اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کارنامے ترتیب اور تاریخ سے بیان ہوں۔

اس سلسلہ میں ایک بات قابل لحاظ یہ ہے کہ عنوان کا آغاز ترتیب تاریخی کے ماتحت کیا گیا ہے اور پھر اس عنوان کے جتنے ادوار قائم ہو سکتے تھے، وہ اسی عنوان کے ماتحت ذکر کر دیے گئے ہیں، تا کہ واقعات کا تسلسل قائم رہے۔

مثلاً ''ہمدرد'' پر جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ شروع تو اس وقت سے کیا گیا ہے جب وہ دہلی سے پہلی بار

شائع ہوا، پھر اس سلسلہ میں ''ہمدرد'' کے تمام ادوار حیات پر (مضمون کا تسلسل قائم رکھنے کی غرض سے) بحث کی گئی ہے مثلاً اشاعت، خصوصیات وغیرہ۔

شاید ایک عنوان ایسا بھی ملے گا جس میں تاریخی ترتیب میں ذرا فصل ہو گیا ہے، وہ بھی تسلسل ہی قائم رکھنے کی وجہ سے ہوا۔

کسی کسی عنوان میں شاید یہ خیال ہو کہ بعض باتیں غیر ضروری یا غیر متعلق ہیں، لیکن آگے چل کر معلوم ہو گا کہ ایسا کرنا ناگریز تھا۔ اس کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے کہ محمد علی کے کارنامہ ہائے حیات کے ساتھ ہی ساتھ اگر ممکن ہو سکے تو ان کی خصوصیات ممیّزۂ قیادت کو اُجاگر کرنے کے لیے اس فضاء اور ماحول کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جس میں محمد علی نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تاکہ ان کے کارناموں کی صحیح قدر و قیمت ذہن نشین ہو سکے۔

نزاعی مسائل کی ناگزیری:

محمد علی کی زندگی کا اکثر حصہ جنگ وجدل میں صرف ہوا، اپنے خیال میں انہوں نے جسے برسر غلط سمجھا اس کے مقابلہ میں انہوں نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی۔ ایسے مسائل پر نہایت تکلیف کے ساتھ قلم اٹھایا گیا ہے اور ان سے جلد از جلد گزرنے کی کوشش کی گئی ہے، صرف نفس واقعہ کو ملائم سے ملائم الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ان مختلف فیہ مسائل سے اعراض کیا جا سکتا تھا، یا ایسا انداز بیان اختیار کیا جاتا کہ محمد علی کے متعلق سب کچھ ہوتا مگر ان مسائل پر کچھ نہ ہوتا۔ لیکن شاید سوانح نگاری کا یہ کوئی عمدہ اصول نہ ہوتا کہ بعض باتوں کو جو محمد علی کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتی ہیں بالکل نظر انداز کر دیا جاتا، اسی لیے بادل ناخواستہ ایسے عنوانات پر نہایت حزم واحتیاط اور ایہام وابہام کے ساتھ عرض مطلب کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کی ترتیب وتالیف کے وقت وہ تمام مواد پیش نظر رہا ہے جو محمد علی پر مطبوعہ صورت میں موجود ہے، پھر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی عنایت سے بعض اخبارات کے محمد علی نمبر اور خاص خاص تراشے بھی حاصل ہو گئے جن سے بہت قیمتی مدد ملی اور جو خاص مواقع پر کام آئے۔

اس کتاب کی اشاعت کا ایک اہم مقصد یہ سمجھنا چاہیے کہ محمد علی کے عقیدت مند بددل نہ ہو جائیں یعنی یہ نہ سمجھ لیں کہ کام نہیں ہو رہا ہے۔

ان اوراق سے یہ تو بہر حال ثابت ہو گیا کہ کام ہو رہا ہے، لیکن نوعیت کار کو بہتر سے بہتر اس وقت بنایا جا سکتا ہے جب محمد علی کے احباب و اعزہ اپنے معلومات سے ہمیں مستفید فرمائیں۔ مولانا شوکت علی سلسلہ شروع فرما چکے ہیں اور مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ عنقریب سلسلہ مضامین شروع فرمانے والے ہیں۔ آئندہ ایڈیشن میں ان چیزوں سے بھی بہت کافی مواد حاصل ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ اگر محمد علی کے خلوت اور جلوت کے رفیق، بے تکلف دوست، عزیز اور شناسا اپنے اپنے معلومات شائع فرما دیں تو بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ہمارے مخاطب بالخصوص جناب ڈاکٹر انصاری صاحب، جناب شعیب قریشی جناب، مولوی ذوالفقار علی خاں صاحب (برادر اکبر مولانائے مرحوم)، جناب معظم علی صاحب چیف جج رامپور اسٹیٹ (برادر نسبتی حضرت مرحوم)، جناب احسان الحق صاحب سیشن جج (پنجاب)، جناب ظفر عمر صاحب، جناب اصغر یار جنگ صاحب جج ہائیکورٹ حیدر آباد، میاں سر فضل حسین صاحب، مولانا محمد عرفان صاحب، جناب ڈاکٹر سیّد محمود صاحب، سر وزیر حسن چیف جسٹس لکھنؤ چیف کورٹ، عبدالمجید خواجہ صاحب بیرسٹر الٰہ آباد، مسٹر تصدق احمد خاں شروانی، مولانا سیّد سلیمان صاحب ندوی، چودھری خلیق الزماں صاحب، جناب حسن محمد حیات صاحب سیکرٹری لیجسلیٹو کونسل بھوپال، مسٹر سعید محمد خان کسٹم آفیسر بھوپال، جناب شاہ عزت حسن صاحب ایڈوکیٹ (بنارس)، سر جوزف بھور، جناب قاضی عبدالغفار صاحب اور دوسرے احباب علی گڑھ اور سیاسی رفقاء کار ہیں۔ اگر یہ حضرات ذرا بھی توجہ فرما دیں تو سیرۃ کا آئندہ ایڈیشن نہایت کامیاب ہو سکتا ہے۔

اُردو کے مشہور ادیب میر محفوظ علی صاحب اور سیّد سجاد حیدر صاحب یلدرم کا شکر یہ واجب ہے کہ ان بزرگوں کے مقالات سے سیرۃ کے اس نسخہ کی ترتیب و تالیف میں کافی مدد ملی۔

خوش قسمتی سے ہمیں محمد علی کی ڈائریاں اور شوکت صاحب کی ڈائریاں (بتیول جیل) اور اُن کے

پرائیویٹ کاغذات وخطوط اور ''ہمدرد'' کے مقالات ومضامین بھی مل گئے۔ ان کے مطالعہ سے ہم نے کافی فائدہ اٹھایا اور ایسی چیزیں پیش کر سکے جو اب تک منظر عام پر نہیں آسکی تھیں۔

لیکن اس سلسلہ کو ابھی ختم نہ سمجھ لینا چاہیے، ابھی اور بہت کافی مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر برودہ کوئی شخص جائے اور دو چار مہینے وہاں قیام کرے تو بہت معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، اس لیے کہ وہاں سات سال تک محمد علی نے نہایت نیک نامی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی۔ ایک ثقہ اور معتبر دوست کا بیان ہے کہ بڑودہ میں ابھی ایسے متعدد اشخاص ہیں جو محمد علی کے کارناموں سے واقف ہیں اور انہیں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، اس لیے اگر وہاں تک کوئی پہنچ سکے تو نادر معلومات کا نہایت گراں بہا ذخیرہ حاصل ہو سکتا ہے۔

اِسی طرح اگر گاندھی جی، ڈاکٹر انصاری، بیگم صاحبہ محمد علی وغیرہ کے پیچھے کوئی لگ جائے تو ان بزرگوں سے بھی نہایت گراں قدر امداد مل سکتی ہے۔ کثرتِ مشاغل کے باعث ان بزرگوں سے اس کی توقع عبث ہے کہ اپنے معلومات وتاثرات یہ خود قلمبند بھی فرماسکیں گے، یہی غنیمت ہے کہ ان سے کسی واقعہ کی روایت سن لی جائے اور پھر خود ہی اسے لکھ لیا جائے۔

مولانا شوکت علی کے پاس بمبئی میں بہت سے کاغذات وخطوط ہیں جن کے لیے مولانا یہ شرط پیش فرماتے ہیں کہ کوئی بمبئی آئے اور وہاں کچھ روز رہے، پھر ان میں سے ضروری کاغذات چھانٹ لے اور ان سے فائدہ اٹھائے۔ ظاہر ہے یہ صورت بھی بہت فائدہ مند ہے، اگر اس پر عمل ہو سکے تو پھر بہت نادر اور نایاب مسالہ فراہم ہو سکتا ہے۔

اس متوقع مواد کے علاوہ ''ہمدرد'' کی پوری جلدوں کی ورق گردانی، ہزاروں خطوط وکاغذات کی ایک ایک سطر پڑھنے اور مطبوعہ مواد سامنے رکھنے کے بعد جو کچھ ہو سکا، وہ پیش خدمتِ عالی ہے۔ خامیوں اور غلطیوں سے نہ انکار ہے نہ انکار پر اصرار۔ اگر ان خامیوں سے مطلع کر دیا گیا تو آئندہ ایڈیشن میں ان کی تصحیح کا لحاظ رکھا جائے گا۔

امید ہے کہ یہ چند اشارات اصل کتاب کے مطالبہ میں ممد ومعاون ثابت ہوں گے۔

نیز جن بزرگوں کے اسمائے گرامی لکھ کر اُمید ظاہر کی گئی ہے کہ وہ توجہ فرمائیں گے، یقین ہے کہ یہ آواز صدا بہ صحرا نہیں ثابت ہوگی۔ مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ (مدیر سچ) کا شکریہ واجب ہے کہ موصوف نے اپنا بہت سا قیمتی وقت مسودہ کی نظر ثانی پر صرف فرمایا اور مسودہ کی ایک ایک سطر کو ملاحظہ فرمایا۔ بعض غیر ضروری چیزوں کو حذف فرمایا اور بعض ضروری چیزوں کو جو رہ گئی تھیں، درج کرنے کی ہدایت فرمائی۔ لب ولہجہ میں اگر کسی جگہ سختی آ گئی تھی وہ بھی مولانا کے نشان زدہ اور عطا کردہ ہدایات اور یادداشت کی بنا پر قلم زد کر دی گئی! ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب شیخ الجامعہ نے بھی مسودہ کو شروع سے آخر تک ملاحظہ فرمایا۔

رئیس احمد جعفری

محمد علی میوزیم

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی

26 اکتوبر 1932ء

بسم اللہ الرَّحمٰن الرَّحیم

حصہ اوّل

تمہید

یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ انسان از آدم تا انیدم حریص حکومت ہے، اپنی خداوندی چاہتا ہے اور اگر موقعہ مل جائے تو اپنی خدائی کا اعلان کرنے سے بھی باک نہیں کرتا، وہ ''زبون شہریاری'' ہے اس لیے وہ یکسر خواہش اقتدار ہے اور بس! پھر اپنا اقتدار، اپنی حکومت، اپنی شہریاری وہ چاہتا کس پر ہے؟ اپنی ہی جنس پر، اپنے ہی جیسے لوگوں پر... اسی لیے اقبال کو کہنا پڑا:

تعجب ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے!

حیاتِ انسانی کی تاریخ کا مطالعہ کرو، جو ورق الٹو گے وہ اسی ''داستانِ قیصریت'' سے رنگین ہوگا، تختِ حکومت ملا اور انسان نے خداوندی سے خدائی کے خواب دیکھنے شروع کیے!

یہی جذبۂ فاسد کبھی فرعون کی صورت میں رونما ہوا کبھی شداد کی، کبھی نیرو کے روپ میں جلوہ گر ہوا کبھی نمرود کے، کبھی زار کے دہشت انگیز نام سے دنیا میں آیا کبھی قیصر جرمنی کے، کبھی سکندر کی ہیئت میں اس نے جنم لیا کبھی جولیس سیزر کی، کبھی سیل تاتار بن کر اُمڈا کبھی نادر شاہ کا لشکر بن کر، کبھی ہلاکو خاں کے زلزلہ فگن نام سے متعارف ہوا کبھی حجاج بن یوسف کے۔

لیکن اس سیلاب اقتدار کا مقابلہ کس نے کیا؟ ہندی تلواریں کند ہو گئیں، یونانیوں کے دِل بیٹھ گئے، رومہ کا پتہ پانی ہو گیا، ایران کے سورماؤں نے قرار پر قرار کیا، قوم مطیع و منقاد ہو گئی، ملک میں غلامی کی فضا قائم ہو گئی۔

اس اقتدار کے بت نے ان جواں ہمت، قوی بازو، شیر دل انسانوں کو آستانہ حواجگی پر جبیں سائی کے لیے مجبور کیا، تبھی صرف اپنے خالق کی بارگاہِ بے نیاز میں نیاز و عقیدت کی گردن جھکائی تھی۔

بت خانہ شہریاری کی اس تزئین و آرائش کے باوجود ہمیشہ ایسے مردانِ حق آگاہ و حق شناس پیدا ہوتے رہے جنھوں نے ظلم وعدوان، طغیانی و تمرد اور نفس خود پرست کے قصر فلک بوس کو ہمیشہ ڈھایا۔ کبھی جمال الدین نے، کبھی مصطفےٰ کامل نے، کبھی عبدالکریم مجاہد ریف نے، کبھی سعد پاشا زاغلول نے اور کبھی محمود الحسن نے، کبھی محمد علی نے... رضی اللہ عنہم۔

ان مجاہدین استقلال و حریت کے پاس نہ اژ دردم توپیں تھیں نہ عقاب پرواز ''ایروپلین''، نہ مور و ملخ سا لشکر نہ اعوان و انصار کی فوج۔ یہ داعیانِ حق و صداقت جب میدانِ عمل میں گام فرسا ہوئے تو یمین ویسار، متبعین و مریدین کی کوئی جماعت بھی نہیں تھی۔ لیکن جب اُن کا نعرۂ حق شیر کی گرج بن کر فضائے عدوان و تمرد میں زلزلہ انداز ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ قصر ملوکیت کی دیواریں لرزنے لگیں، بت خانہ شہر یاری کے بت سرنگوں ہو گئے، ''بکنگھم پیلس'' میں زلزلہ آ گیا۔

ابھی تم نے انہیں بے یار و مددگار دیکھا تھا، اب نظر اٹھاؤ تو جاں نثاروں اور فدا کاروں کی فوج نظر آئے گی، تم نے انہیں تہی دست و بے نوا پایا تھا۔ لیکن غور کرو تو معلوم ہوگا کہ سیم و زر کے انباران کے قدم چوم رہے ہیں، عرصۂ حریت میں تمہیں یہ تن تنہا نظر آئے تھے لیکن دیکھنا! ان کے گرد تو ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا ہوا ہے! جس کے سینے نوک سنگین کھانے کے لیے کھلے ہوئے ہیں، جس کے دلوں میں تمنائے شہادت ہے اور جس کے سروں میں سودائے جہاد!

ان غازیانِ راہِ آزادی کے تیور دیکھو! لوگ سجن و زندان کے نام سے لرزتے ہیں لیکن یہ ہیں کہ پروانہ وار اپنے تئیں قید و بند کے مصائب کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ ''دار و رسن کا افسانہ کہن'' لوگوں کے حافظے سے محو ہو چکا ہے، لیکن ان شہیدان حق و صداقت کے چمکتے ہوئے، مسکراتے ہوئے منور چہروں کو دیکھ لو، کس خوشی سے تختۂ دار پر جلوہ فرما ہیں؟ ''لال پگڑی'' بڑے بڑے امیروں اور رئیسوں کے لیے کتنی لرزہ انداز ہوتی ہے لیکن ذرا ان قیدیوں کے بے خوف چہروں کو دیکھو، جن کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے

پاؤں میں بیڑی ہے، عدالت کے کٹہرہ میں فوج اور پولیس کے جلو میں کھڑے ہیں، کس بے خوفی سے ''صاحب'' سے ہم کلام ہیں۔ کس بے باکی سے ان کا نعرۂ صداقت عدالت کے کمرہ میں گونج رہا ہے، اور کس بے پروائی سے اپنا حکم سزا سن رہے ہیں۔

دیکھتے دیکھتے یہ انقلاب کیسے پیدا ہو گیا؟ جو بزدل تھے وہ شیر دل کیسے بن گئے؟ جن کو پر تکلف مسہریوں پر اور ''بالش کمخواب'' پر گرانئ سر کی شکایت ہوتی تھی، وہ آج جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں میلے کچیلے کپڑوں میں، تانبے کے بد قلعی برتنوں میں، سڑے گلے کھانے میں کتنے مگن ہیں؟ کتنے خوش ہیں؟

حق و صداق کی چوٹ دیکھی؟ نعرۂ حیرت کا اثر دیکھا؟ جب کبھی بھی کسی ''یاجوج'' وقت نے اپنی خواجگی اور قیصریت کا پٹہ دوسروں کے گلوں میں ڈالنا چاہا تو ایک جماعت پیدا ہوئی جس نے اس بڑھتے ہوئے سیلابِ اقتدار کا مقابلہ کیا اور اپنی بے مائیگی اور تہی دامنی کے باوجود بالآخر کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئی!

اسی قسم کے داعیانِ استقلال و آزادی کے ایک بہت بڑے بطل حریت محمد علی کا تذکرہ ان صفحات کا موضوع ہے۔

غدر کے بعد عام حالت:

1857ء کے عالم آشوب غدر کے بعد ہندوستان کی حالت حد درجہ سقیم ہو گئی تھی۔ غدر کے شریک کار ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں قوموں کے افراد تھے اور ہر شریکِ غدر نے بقدر استعداد ظرف اس ''کار ثواب'' میں اہم ترین حصہ لیا تھا، اس لیے کہ سور کی چربی میں ہاتھ لگانا مسلمانوں کے لیے ناممکن تھا اور گائے کی چربی میں ہندو ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے، لیکن غدر کے فرد ہونے کے بعد ہندوستان کی حالت بلکہ ذہنیت میں عظیم الشان تغیر ہو گیا۔ برادرانِ وطن نے تلافیٔ مافات کے طور پر گورنمنٹ سے پورے طور سے تعاون کیا۔ انگریزی تعلیم انہوں نے حاصل کی، سرکاری اسامیوں پر انہوں نے قبضہ کیا، گورنمنٹ کے ظل عاطفت کو انہوں نے سایۂ ہما سمجھا۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت ہی نکل گئی تھی (گو

وہ لاکھ کم مایہ سہی لیکن نام تو تھا کہ ''خسروِ ہندوستان'' یہی قوم ہے) اس لیے قدرتاً اُن کے دل انگریزوں کی طرف سے صاف نہیں تھے۔ پھر اُس وقت کے علماء کی ایک بہت بڑی جماعت انگریزوں کی تعلیم وتربیت، تہذیب وتمدن، معاشرت وخیالات، غرض ہر چیز کو پورے طور سے ''نجس العین'' سمجھتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان انگریزوں کی ہر چیز سے بھڑ کنے لگے۔

سرسیّد:

اِن حالات میں سیّد احمد خاں علم اصلاح وتغیر لے کے اٹھے۔ انہوں نے بتلایا کہ حکومت تو بہر حال تمہارے ہاتھ سے جاچکی، تمہیں اپنی زندگی اب اس حکومت کے سایہ میں بسر کرنی ہے۔ ہندو تم سے بازی لے جاچکے، تعلیم انہوں نے تم سے زیادہ حاصل کر لی، انگریزوں کی نظر میں اپنی ''بے قصوری'' انہوں نے ثابت کر دی، سرکاری اسامیوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے برعکس گورنمنٹ کی نظروں میں ''بغاوت'' کے مجرم صرف تم ثابت ہوئے۔ تعلیم انگریزی تم نے نہیں حاصل کی، انگریزوں کی نوکری تم نے حرام سمجھی۔ تو اب اگر حقیقتاً زندہ رہنا چاہتے ہو تو کمر ہمت چست کرو اور بسم اللہ کر کے اٹھ کھڑے ہو۔ جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا، جو تلافی کر سکتے ہو کرو۔ اگر باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو انگریزی تعلیم حاصل کرو، گورنمنٹ کو اپنا ہمدرد اور مربی سمجھو اور پورے امن وسکون کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرو۔

سرسید کی پالیسی:

لیکن اس نسخہ کے ساتھ ہی اس حکیم وقت نے ایک سخت ترین ''پرہیز'' بھی بتایا اور وہ تھا، سیاسیات سے الگ رہنا۔ اس کی شرط یہ تھی کہ جب تک تم اپنی تعلیمی خامیاں نہ پوری کرلو، اس وقت تک سیاسیات کو شجر ممنوعہ سمجھتے رہو۔ اگرچہ مسلمانوں میں ان کی عام مخالفت ہوئی، تکفیر کے فتوے شائع ہوئے، ہر ہر طرح سے ان کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں، لیکن اس مردِ حق آگاہ نے ان تمام موانع کا نہایت خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی عام مخالفت کے باوجود اس کی رہنمائی قبول کی اور اس کے بتائے ہوئے اصول پر عمل کیا۔

سر سیّد کے بعد:

سر سیّد کے انتقال کے بعد اُن کے جانشین نواب محسن الملک مرحوم نے بھی سر سیّد کے نقش قدم پر قوم کو چلایا لیکن اب رفتہ رفتہ حالات بدلنے لگے۔ اِدھر مسلمانوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بھی خاصی ہوگئی، اُدھر گورنمنٹ کے طرز عمل میں فرق آنے لگا۔

گورنمنٹ کی پالیسی:

اب گورنمنٹ کی پالیسی علیٰ الاعلان ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے اصول پر جاری تھی۔ پہلے اُردو ہندی کا قضیہ پیدا کیا گیا اور اس طرح سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات کی خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، پھر شملہ میں ایک وفد طلب کیا گیا جس میں ازراہِ ''مراحم خسروانہ'' اس انعام سرمدی کا اعلان ہوا کہ جداگانہ انتخاب جب تک تم چاہو گے، برقرار رکھا جائے گا۔ پھر انہیں نامحمود حرکتوں پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ عالم اسلامی پر بھی برطانیہ کے دندانِ حرص وآز تیز ہونے لگے۔ پیہم وعدہ خلافیاں کی گئیں اور مسلسل دروغ بیانیوں سے مسلمانوں میں ایک ہیجان عظیم پیدا ہوگیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملکۂ وکٹوریہ کے اس تاریخی اعلان کو ٹھکرایا گیا جس میں مسلمانوں کی مذہبی معاملات میں ''مکمل آزادی'' تسلیم کی گئی تھی۔ کانپور کی مسجد کا سانحۂ خوں چکاں ایسا نہیں ہے جو کبھی فراموش ہوسکے۔

مسلمانوں میں حرکت:

ادھر خلافتِ عظمیٰ عثمانیہ پر طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کی گئیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے جذبات میں ہیجان وتوج پیدا ہوا اور وہ اپنے گوشۂ عافیت سے باہر نکلے، اس عزم صمیم کے ساتھ کہ یا تو وہ ان دراز دستیوں کا استیصال کریں گے یا خود فنا ہو جائیں گے۔

ایک لیڈر کی ضرورت:

لیکن اُس وقت زیادہ ضرورت ایک ایسے راہ نما کی تھی جو دولِ فرنگ کی ہوسِ استعمار سے واقف ہو، جو اُن کے عادات واطوار، طینت وذہنیت کا رمز شناس ہو اور جو اُن کی سیاسی فریب کاریوں کا ماہر

خصوصی ہو اور ساتھ ہی ساتھ جس کا دل مضبوط ہو، جس کا دماغ اپنا ہو اور جس میں ہوسِ قیادت نہ ہو بلکہ جذبہ خدمت ہو۔

محمد علی کا ظہور:

یہ ہمیشہ سے سنت اللہ چلی آتی ہے کہ ایسے نازک مواقع پر کوئی نہ کوئی مردِ مجاہد پیدا ہو جاتا ہے جو باطل کے تمام عزائم مشئومہ اور تدابیر سیہ کا قلع قمع کر کے رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ اُس وقت بھی جو ملت اسلامیہ کے لیے حد درجہ نازک بلکہ ہلاکت آفریں عہد تھا، ایک مردِ مجاہد اپنی تمام گہرائیوں اور خصوصیتوں، اپنی قابل رشک قابلیتوں اور اپنی لائق فخر صلاحیتوں کے ساتھ نمودار ہوا جسے دنیا نے محمد علی کے نام سے یاد کیا۔

محمد علی میدانِ عمل میں:

میدانِ عمل میں اُس نے قدم رکھتے ہی یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک بے نظیر مقرر، ایک بہترین مدبر، اور ایک سحر نگار انشاء پرداز ہی نہیں ہے بلکہ خدمتِ اسلام کا ایسا بے پناہ جذبہ اس کے سینہ میں کارفرما ہے جو مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر سکتا ہے اور باطل کو غائب و خاسر کر سکتا ہے۔

پھر دُنیا نے چند ہی دِنوں میں دیکھ لیا کہ جو اُمیدیں اُس سے قائم کی گئی تھیں، وہ غلط نہیں ثابت ہوئیں۔ اُس نے اُمتِ اسلامیہ میں ایک حیاتِ تازہ پیدا کر دی، اس نے خدمت گزارانِ قوم کی ایک جماعت کو میدانِ عمل میں لا کھڑا کیا اور اس نے ملتِ اسلامیہ بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں عالم اسلام کے ایسے گراں بہا خدمات انجام دیے جو رہتی دنیا تک اس کا نام باقی رکھیں گے۔

لوگ اعزام و احترام سے اُس کے کارنامے سنیں گے اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ جن لوگوں نے اس مبارک ہستی کو نہیں دیکھا ہے، وہ حسرت کریں گے کہ کاش! اُن کی آنکھوں نے محمد علی کی نہیں، مجاہد اعظم کی زیارت کی ہوتی۔ جو آنکھیں شرفِ زیارت سے ممتاز ہو چکی ہیں، اُن کی آرزو ہو گی کہ کاش! اُنہیں فخر تکلم حاصل ہوتا اور جو خوبیٔ بخت سے اِس سے بھی مستفیض ہو چکے ہیں، اُن کو تمنا ہو

گی کہ کاش! یہ نعمتِ عظمیٰ ہم سے ابھی اور نہ چھینی جاتی۔ لیکن مشیتِ ایزدی پوری ہو کر رہی، وہ گراں مایہ ہستی ہم سے جدا ہو کر رہی۔ اب اُس کے روشن اور زرّیں کارنامے ہیں جو ہمارے تسکین و رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

باب ا

ابتدائی حالات

سلام!

گل حدیقہ بوبکر و شمع بزم علی　　چراغِ انجمن مصطفیٰ سلام علیک
امامِ خلق، سعید ازل، عزیز وطن　　قتیل عشق، شہید وفا سلام علیک
امیر حلقہ خدام کعبہ یزداں　　رئیس عسکر دین خدا سلام علیک
دیارِ ہند ز تو یافت عظمت ابدی　　زعیم مملکت ایشیا سلام علیک
بہ اُوجِ عشق تو روحِ بلال می نازد　　حبیب قلب رسولِ خدا ﷺ سلام علیک

خاندان کا مختصر تذکرہ:

محمد علی کا خاندان ہمیشہ سے اپنے اقران و اماثل میں ممتاز چلا آ رہا ہے۔ محمد علی کے دادا علی بخش صاحب نے ہنگامہ غدر میں غیر معمولی شرافت و شجاعت سے کام لے کر متعدد انگریزوں کی جان بچائی اور بالآخر اس صلہ میں مراد آباد کے علاقہ میں ایک ممتاز جاگیر بطور بخشیش ملی۔ محمد علی کے والد عبدالعلی خاں صاحب کو نواب یوسف علی خاں ناظم فرماں روائے رامپور نے باصرارِ رامپور بلا کر اپنے مقربین و معتمدین کے زمرہ میں شامل کر موصوف اپنی زندگی بھر نواب صاحب کے منظور نظر رہے اور ہر اعتبار سے اپنے ہمعصر میں ممتاز۔

تھے۔ان بڑوں میں ایک موٹا تازہ، چست چالاک، بھولا بھالا لڑکا محمد علی بھی تھا۔وہ اس وقت چھوٹا تھا، لیکن بعد کو سب سے بڑھ گیا!

ذہین لیکن کم محنت:

میر محفوظ علی صاحب جو اس زمانہ میں خود بھی بریلی ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے،فرماتے ہیں:

''(محمد علی) بریلی میں بلا کے ذہین مگر کم محنت تھے،استاد سب خوش رہتے تھے،مزاج میں تیزی اور حاضر جوابی بہت تھی۔''

بھائی کا احترام:

میر صاحب موصوف کا بیان ہے:

''شوکت خوش گپ اور یار باش ہونے کے ساتھ کاہل اور خوگر حکمرانی ہو چلے تھے۔ طالب علموں کے مجمع میں بیٹھے ''محمد علی! پانی پلاؤ، پان لاؤ، کتاب اُٹھاؤ، چکن رکھ آؤ'' کہا کرتے تھے۔ایک دن خطیب جی نے مولوی سخاوت حسین (مرحوم اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس) محمد علی کو سگ باش بردار خورد مباش کے معنی سمجھائے۔میں نے کہا ایک دوسرا جملہ بھی ہے،خر باش برادر بزرگ مباش۔خطیب جی نے اس کے معنی بھی سمجھا کر کہا،''تو محمد علی! تم سگ ہوئے اور شوکت خر۔''محمد علی نے فوراً جواب دیا:''جناب! میں خود تو سگ بننا پسند کروں گا مگر شوکت بھائی کا خر بننا پسند نہ کروں گا''، خطیب جی نے کہا''شاباش''۔''

لیڈری:

قیادت کا جوہر بچپن ہی سے فطرت میں پوشیدہ تھا۔ بریلی میں اُن کی بساط ہی کیا تھی۔ایک بچہ ابتدائی جماعت کا طالب علم لیکن یہاں بھی اُنہوں نے بچوں ہی کی ٹولی میں اپنے سردار ہونے کا لوہا منوا لیا اور اپنی چھوٹی موٹی جماعت کے وہ ''لیڈر''،تسلیم کر لیے گئے۔

مرز بوم:

محمد علی کا اصلی وطن کیا ہے؟ اس میں محمد علی کے واقف کاروں اور شناساؤں کا خفیف سا اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ ان کا اصلی وطن مراد آباد ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ بجنور کی طرف کے تھے، لیکن ترجیح آخری قول کی ہے۔ خود مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں ضمناً اپنے وطن کا تذکرہ کیا ہے اور اسے تسلیم کیا ہے کہ وہ نجیب آباد (بجنور) سے وطنی خصوصیت رکھتے ہیں۔

پیدائش اور بھائی بہنوں کی تفصیل:

پیدائش 1878ء کے اواخر کی ہے۔ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے محمد علی تھے۔ بڑے بھائی شوکت علی تھے، ان سے بڑے ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر۔

یتیمی:

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ جتنے اعاظم رجال گزرے ہیں، اُن میں اکثر اپنے ایام طفولیت ہی میں کم از کم سایۂ پدری سے محروم ہو گئے ہیں۔ محمد علی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے، انہوں نے ابھی اپنے بچپن کی دو بہاریں دیکھی تھیں کہ داغِ یتیمی برداشت کرنا پڑا۔

تعلیم:

لیکن خوبی قسمت سے آغوشِ مادر سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ ''بی اماں'' مرحومہ نے جس بے نظیر استقلال وایثار سے کام لے کر اپنے صاحبزادوں کو انگریزی تعلیم دلائی، وہ یقیناً تاریخ نسائیات کا ایک اہم باب ہے۔ پہلے معمولی اُردو، فارسی کی تعلیم تو مکان ہی پر ہوئی۔

بریلی:

پھر بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دیئے گئے اور وہیں بورڈنگ ہاؤس میں قیام کا انتظام ہوا۔ اُس وقت بریلی کے ہائی اسکول کی اونچی جماعتوں میں شوکت علی، میر محفوظ علی وغیرہ تعلیم حاصل کر رہے

باب ۲

علی گڑھ

علی گڑھ کی عام فضا:

سر سیّد کے ''مدرستہ العلوم'' کا اُس زمانے میں گھر گھر نیا نیا شہرہ تھا۔ چند ہی دِنوں میں اس ''مدرستہ العلوم'' نے مسلمانوں میں اپنی دھاک بٹھال لی تھی۔ عام مخالفت کے باوجود ہر شخص اس کے خصوصیات کا معترف تھا، حقیقت بھی یہ ہے کہ اس زمانہ میں علی گڑھ کی دنیا ایک دوسری دنیا تھی۔ بورڈنگ کا طرز معاشرت، طلبہ کا شوق تعلیم، کھیلوں اور ورزشوں میں طلبہ کا امتیاز، تحریر وتقریر میں ان کا کمال، گھریلو زندگی میں ان کی دلچسپیاں، یہ وہ چیزیں تھیں جو علی گڑھ کے احاطے سے نکل کر دور دور پہنچ چکی تھیں۔ اب علی گڑھ کی طرف میلان عام ہو رہا تھا۔ جسے ''صاحب'' بننے کی ہوس تھی، وہیں جانا چاہتا تھا اور وہیں کی خصوصیات کا اپنے تیئں حامل بنانا ہر شخص کا انتہائے نظر تھا۔

اس زمانہ میں عجیب سحر آفریں فضا علی گڑھ نے قائم کر دی تھی۔ سیکڑوں ''مرزا پھویا'' علی گڑھ میں داخل ہوئے لیکن جب وہاں سے نکلے تو تیز وطرار بن کر۔ بات بات میں شوخی، چال ڈھال میں رنگینی، کسی سادہ لوح کو دیکھا ایک فقرہ چست کر دیا۔ ریل میں سوار ہوئے تو آفت مچا دی۔ ڈپٹی کلکٹری اور اس قسم کے سرکاری عہدے تو اس زمانہ میں گویا ایک ''علیگ'' کے لیے نہایت سہل الحصول ملازمت تھی، جب چاہتا تھا وہ ان پر قبضہ کر سکتا تھا۔

محمد علی کا داخلہ:

یہ فضا تھی جس میں محمد علی علی گڑھ میں اپنے برادر بزرگ مولانا شوکت علی کی نگرانی میں داخل ہوئے

اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ معلوم ہو گیا کہ علی گڑھ کے خصوصیات کو چاند چاند لگانے میں، علی گڑھ کی دلچسپیوں میں اضافہ کرنے میں محمد علی کا غیر معمولی حصہ ہے۔

کم محنتی:

علی گڑھ میں آنے کے بعد بھی محمد علی کے اوضاع واطوار میں فرق نہیں آیا۔ جس طرح بریلی میں وہ سب سے زیادہ ذہین اور سب سے کم پڑھنے والے تھے، یہاں بھی اُن کی خصوصیت قائم رہی۔

سر یعقوب کا بیان:

سر محمد یعقوب سابق پریذیڈنٹ لیجیسلیٹو اسمبلی جو محمد علی کے رفیق درس رہ چکے ہیں، فرماتے ہیں:

> ''سال کا بہت بڑا حصہ تفریحات اور کھیل کود میں گزرتا تھا، کورس کی تمام کتابیں کبھی مشکل سے محمد علی کے پاس جمع ہوتی ہوں گی، مگر مبداء فیاض نے ان کو غضب کا حافظہ اور ذہن عطا کیا تھا۔ امتحان سے دو مہینے پیشتر کتابیں اِدھر اُدھر سے جمع کر کے وہ پڑھائی پر پل جاتے تھے اور چند روز کی محنت سے وہ ہمیشہ اچھی طرح پاس ہوتے تھے۔''

میر محفوظ کا بیان:

میر محفوظ علی صاحب اُن کی کم محنتی کا یہاں بھی اعتراف فرماتے ہیں، لیکن یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں:

> ''محمد علی قابل رشک اہلیت کے ساتھ کلاس میں لیکچر سنتے، فیلڈ میں کرکٹ کھیلتے اور یونین میں تقریریں کرتے تھے۔''

سجاد حیدر کا بیان:

سیّد سجاد حیدر صاحب یلدرم، سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو محمد علی کے کلاس فیلو اور نہایت

عزیز دوست ہیں، اُن کے بیان کا ایک اہم اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اس میں سیّد صاحب نے اپنے قلم اعجاز رقم سے علی گڑھ کی زندگی اور محمد علی کی حالت کا پورا دلفریب نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے:

''خواجہ غلام الثقلین، ظفر علی خاں، چودھری خوشی محمد ناظر، حمید الدین افراہی کالج کی کلاسوں میں پڑھ رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی علمی زندگی سے طلبہ اور اساتذہ کے محبوب بنے ہوئے ہیں۔ شوکت علی خاں کرکٹ کے کپتان ہیں اور کرکٹ کا کپتان اُس وقت کے علی گڑھ میں اپنی قلمرو (بورڈنگ) کا مسولینی ہے۔ طلبہ اُس کے تابع فرمان، پروفیسر اُس کے اقتدار کو ماننے والے اور بڑھانے والے۔ کپتانی اَوروں نے بھی کی اور کر رہے ہیں، لیکن شوکت علی کی کپتانی یادگار زمانہ ہے۔ اسی نے کپتان کے کمرہ کو ایک دربار کی حیثیت دے دی تھی، وہ کمرہ ایک ہی وقت میں دربارِ شاہانہ اور بزم احباب بنا رہتا تھا۔ جونیئر طلبہ کے استغاثے وہاں سنے جاتے تھے اور فیصل ہوتے تھے، ان استغاثوں کی سماعت کے وقت کمرہ میں اور شام کو کمرہ کے باہر صحن میں احباب کا جمگھٹا رہتا تھا جو کبھی کبھی اس لیے کہ مسولینی ہر وقت اُن سے یہ کام نہیں لیتا تھا، جیوری کے فرائض بھی ادا کرتے تھے۔''

محمد علی سے تعارف:

''جب میں علی گڑھ کالج کے اسکول کی نویں جماعت میں داخل ہوا تو شوکت علی کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی محمد علی بھی رہتا تھا۔ یہ لڑکا کلاس میں ذہین، کلاس سے باہر لڑاکا اور ہر فن مولا تھا۔ محمد علی اپنی بہت ہی مختصر دنیا اپنے ہم عمر لڑکوں کی سرداری کرتا تھا، مگر نہ اس طنطنے کے ساتھ جو اس کے بڑے بھائی شوکت علی کو نصیب تھی اور پھر غضب یہ کہ اس چھوٹے سے سردار کی بڑا بھائی سب کے سامنے ایسی ذلت کر دیتا تھا کہ سردار کی محدود سرداری دھری رہ جاتی تھی۔

بار ہا ہم نے دیکھا کہ بڑے بھائی نے محمد علی کو ڈانٹ کر اپنے حضور میں بلایا اور اس

بزم احباب و دربارِ عام میں جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، دو ایک سوال جواب کے بعد رخساروں پر تھپڑ مار کر سزا دی گئی۔"

انگریزی قابلیت:

سجاد حیدر صاحب ہی کا بیان یہ بھی ہے:

"اپنی انگریزی قابلیت کے لیے وہ اب بھی ممتاز تھے کہ ہم دونوں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج کی کلاسوں میں آئے۔ یہاں پہنچ کر اُن کے کردار کی وہ خصوصیت نمایاں ہوئی جس نے دنیا میں محمد علی کو اپنے اقران و ہمعصروں میں سب سے علحدہ کر دیا (یعنی) محمد علی کی آزادی رائے وآزادی عملَ وہ اکثر اپنے پروفیسروں سے اختلاف کرتے تھے، یونین میں ایسے مباحث پر تقریر کرتے تھے جس جانب تقریر کرنا اکثر پروفیسروں کی چیں بہ جبیں کا باعث ہوتا تھا۔ تقریریں اُن کی زوردار، زبان شستہ اور اپنے سن و سال کے لحاظ سے نہایت مؤثر ہوتی تھیں۔"

ذہانت:

محمد علی کی ذہانت علی گڑھ میں بھی ممتاز رہی۔ اگر چہ اُن کی کم محنتی کی ہر شخص شکایت کرتا ہے لیکن اُن کی غیر معمولی ذہانت اور قوتِ حافظہ کا بھی ہر شخص معترف ہے۔

مولانا شبلی کا امتحان لینا:

اتفاقاً ہمیں اس باب میں ایک پرلطف واقع مولانا شبلی کے امتحان لینے کا مل گیا اور خوش قسمتی سے وہ واقعہ خود صاحبِ واقعہ بیان کر رہا ہے۔ مولانا مرحوم اپنے ایک مکتوبِ گرامی میں مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ (مدیر سچ) کے ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"گیارہ برس کی عمر میں علی گڑھ گیا، ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی (مولانا شبلی مرحوم اس زمانہ میں علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر

تھے، مؤلف) سے کیا، دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کہ امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا میں نے ایک عربی کا شعر پڑھا تو (محمد علی) نے مجھے ترجمہ سنا دیا، حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اُس کا شجرہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعہ طرح اُسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو، چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اِسی لچر پوچ کا تھا۔"

شاعری:

بچپن ہی سے محمد علی کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی اور جب اُنہیں موقعہ ملتا تھا تو اُن کے افکا[ر] موزوں دِل کی خلوت سے نکل کر احباب کی جلوت میں آ جاتے تھے۔ اپنی شاعری کے متعلق انہوں [نے] مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے نام ایک خط میں بسط و تذکرہ کیا ہے جس کا ایک حصہ ہم یہاں در[ج] کرتے ہیں اور اہم ترین حصہ اس سلسلہ میں درج کریں گے جب محمد علی پر ایک شعر گوئی حیثیت [سے] گفتگو کی جائے گی۔ بہر حال اس مکتوب میں اپنی کالج کی شاعری کے متعلق انہوں نے جو کچھ فرمایا ہ[ے] وہ یہ ہے:

"کالج میں آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا، پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم تین شعرا نے حاجی اسمٰعیل خاں صاحب کے شکریہ میں تیار کی تھی۔ ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا، ایک سجاد حیدر اور ایک سیّد وزیر حسن صاحب۔ "آنریبل" و "آزمودہ کار" سیکریٹری مسلم لیگ کے برادر "اصغر" (سیّد اصغر حسین صاحب بی اے، ایل ایل بی (علیگ) سیشن جج، مؤلف)"...وہ مشاعرہ جسے بعد کو حسرت نے رونق بخشی، ہم ہی لوگوں کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور ایک شمع پیش کی جاتی تھی، کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو

بارش ہوگئی تو تین چار دِن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر مشاعرہ ڈائننگ ہال میں کیا گیا، اُس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح غزل میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا:

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں
لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

بی اے کا امتحان:

1896ء میں علی گڑھ سے بی اے کا امتحان دیا۔صوبہ متحدہ کے کامیاب طلبہ میں محمد علی کا نمبر اوّل تھا۔لوگوں نے اسے حیرت کے ساتھ سنا کہ علی گڑھ کا یہ کھلنڈرا، یونیورسٹی میں سب سے اوّل کس طرح آ گیا؟ لیکن جو لوگ اس کی غیر معمولی فہم و ذکاوت سے واقف تھے، اُن کے نزدیک یہ کوئی تعجب خیز واقعہ نہ تھا۔

میر محفوظ علی کا بیان:

میر محفوظ علی صاحب اپنے مخصوص انداز میں محمد علی کا واقعہ کامیابی محمد علی ہی کی زبان سے بیان فرماتے ہیں:

''مسٹر گوکھلے کی وفات پر دہلی کے ٹاؤن ہال کے میدان میں جلسہ ہوا تو پنڈت مدن موہن مالوی یا سر یندر ناتھ بنر جی نے بیان کیا کہ گوکھلے نے اکیس سال کی عمر میں بی اے کیا اور یونیورسٹی میں امتیازی جگہ حاصل کی، محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ گوکھلے علم و قابلیت کا مجسمہ تھے، ان کے لیے یہ امور باعث فخر نہیں۔آپ کا یہ نیاز مند جو گوکھلے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، بیس سال کی عمر میں یونیورسٹی میں اوّل آ چکا ہے، یہ سن کر حاضرین منہ تکنے لگے۔''

❁❁❁

باب ۳

آکسفورڈ

علی گڑھ میں محمد علی اپنی لائق رشک زندگی ختم کر کے عازم انگلستان ہوئے۔ علی گڑھ سے کس طرح رخصت ہوئے، ولایت جانے کا انتظام کیونکر ہوا!؟ احباب پر کیا تاثرات قائم ہوئے اور اساتذہ نے کیا کیا؟ اس کے متعلق بہترین بیان محمد علی کے کلاس فیلو سیّد سجاد حیدر صاحب ہی دے سکتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

سجاد حیدر کا بیان:

''علی گڑھ کی طالب علمی اس چمک دمک کے ساتھ ختم کرنے کے بعد محمد علی علی گڑھ سے رخصت ہوئے، مگر کس طرح؟ پرنسپل خوش تھے کہ ایک جھگڑالو طالب علم جا رہا ہے، عام طلبہ کو رنج تھا کہ ایسا خوش گپیاں کرنے والا، بذلہ سنج، مگر ساتھ ہی موقعہ پڑنے پر لڑائی بھڑائی میں اُن کی سرداری کرنے والا اور اُن کے لیے پروفیسروں سے بے دھڑک اور بے جھجک لڑنے والا جا رہا ہے۔ علم دوست اور لائق طالب علم حیران تھے کہ محمد علی اُن سے کیوں دُور رہتا تھا بلکہ وہ کیوں اُن کی ہنسی اُڑاتا تھا؟ انگلینڈ روانہ ہونے سے قبل وہ علی گڑھ آئے اور احباب نے اُنہیں ایک رخصتی ڈنر دیا۔''

الوداعی نظم:

اس الوداعی ڈنر میں ایک الوداعی نظم بھی پیش کی گئی جو اُن کے یارِ عزیز سجاد حیدر یلدرم کے ترشح

افکار کا نتیجہ تھی، نظم یہ ہے:

اے خلعتِ سروری کے شایاں اے عازم مصر، فخر کنعاں
سی۔ ایس۔ کی مصر کر لو تسخیر ایسی کرو جا کے کوئی تدبیر
یہ عزم سفر تمہیں مبارک یہ بابِ ظفر تمہیں مبارک
ایں نقد بہ کیسہ درمیاں کن زیں بعد ہر آنچہ خواہی آں کن

سیّد صاحب موصوف فرماتے ہیں:

''اُس وقت یہ دُعا دِل سے نکلی تھی، مگر شکر ہے یہ دعا قبول نہ ہوئی۔ خدا کو اُن سے زیادہ شاندار، زیادہ اہم اور زیادہ نتیجہ خیز کام لینے تھے۔''

شوکت کا ایثار:

اِدھر تو یہ انتظامات ہو رہے تھے، اُدھر ایک خاص دِقت بھی تھی یعنی قیام انگلستان کے مصارف کا انتظام۔ جائیداد اگرچہ کافی تھی لیکن ایک تو وہ خود عبدالعلی خاں صاحب مرحوم ہی کے زمانہ سے مقروض تھی، دوسرے علی گڑھ کے زمانۂ تعلیم میں اور زیادہ مقروض ہو چکی تھی۔ لیکن اُس وقت کو محمد علی کے عاشق زار بھائی شوکت علی نے جو اُس زمانہ میں محکمۂ افیون کے افسر تھے، اِس طرح حل کیا کہ خود تو دورے کے سفر خرچ میں اپنا گزر کریں اور اپنی تنخواہ محمد علی کو دیں۔ اِس طرح ''بڑے بھائی'' کو لوٹ کر محمد علی ولایت روانہ ہوئے۔ یلدرم صاحب نے سچ فرمایا:

''شوکت نے اپنے بھائی کے ساتھ وہ کام کیا جو کم لوگ اپنی اولاد کے لیے بھی کرتے ہیں۔''

اخلاقی حالت:

محمد علی بڑے شوق و ولولہ کے ساتھ سفر یورپ پر روانہ ہوئے تھے جس کا انہیں خود بھی اعتراف ہے۔ انگلستان کی محیر العقول کرشمہ سازیاں سن سن کر اُن کے دِل میں طرح طرح کے جذبات موجیں

مارتے تھے۔ پھر جب خدا نے یہ موقع فراہم کر دیا اور وہ بہ صد مسرت و نشاط روانہ بھی ہو گئے تو اُن کو کھل کھیلنے کے کافی مواقع تھے، اور پھر جب جیب میں دام بھی ہوں۔ لیکن محمد علی کے علاوہ اُن کا ہر دوست اور دشمن اِس کا معترف ہے کہ محمد علی کی زندگی انگلستان کی ہوش رُبا اور غارت گر شکیب فضا میں بھی اتنی پاکباز، اتنی بے زنگ اور اتنی صاف رہی کہ ہر شخص انگشت بہ دنداں رہ گیا۔ اپنی ''پاکیٔ دامن'' کا خود محمد علی کو بھی اعتراف تھا، چنانچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس کا تذکرہ کیا ہے:

''کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدانِ اصلی کی کمی نہیں تھی مگر ذوقِ نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلافِ دستورِ عام زہد و تورع کی طرف تھا۔''

داخلہ اور سول سروس میں ناکامی:

محمد علی آکسفرڈ کے لنکن کالج میں داخل ہوئے اور چونکہ طبیعت پر عملی ذوق غالب تھا، اس لیے اُن مضامین سے دلچسپی لیتے رہے جو اُن کی اُفتادِ طبع کے موافق تھے اور جن مضامین سے طبیعت نفور تھی، اُن کی طرف مطلق التفات نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس مقصد یعنی IES کا امتحان دینے گئے تھے، اُس میں ناکام ہوئے۔

شوکت پر اثر:

مولانا شوکت علی نے جب اِس خبر وحشت اثر کو ''پانیر'' میں پڑھا تو اُن کا چہرہ وفورِ تاثر سے زرد ہو گیا۔ لیکن بی اماں پاس بیٹھی ہوئی تھیں، اُنہوں نے اپنی جواں ہمتی سے نہ صرف یہ کہ خود اپنے اوپر کوئی اثر نہیں ظاہر ہونے دیا بلکہ مولانا شوکت علی کو بھی ڈھارس دی اور فرمایا:

''اُسے بلا لو۔ منگیتر بیٹھی ہوئی ہے، شادی کر دو۔ پھر دیکھا جائے گا۔''

چنانچہ محمد علی واپس آئے اور شادی کر دی گئی۔

بی اے کا امتحان:

اب محمد علی انگلستان اس ارادے سے گئے کہ بی اے کا امتحان دیں۔ چنانچہ اِس میں اُنہوں نے تیاری بھی کی اور چونکہ مضامین طبیعت سے مناسبت رکھتے تھے اس لیے کامیابی ''آنرز میں گریجویٹ'' کی حیثیت سے حاصل کی۔ اس نمایاں کامیابی کے بعد وہ ہندوستان واپس آئے۔

❀❀❀

باب ۴

انگریزی قابلیت

محمد علی کے تمام شناسا اس پر متفق ہیں کہ محمد علی اپنی انگریزی استعداد و قابلیت کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں ہمیشہ نہایت ممتاز رہے۔ بریلی میں وہ ایک کمسن بچہ کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن اپنی جماعت میں انگریزی سب سے اچھی جانتے تھے۔ علی گڑھ آئے تو گو باقاعدہ ''کھلنڈروں'' کی صف میں داخل ہوئے اور وہاں کی تمام تر شہرت اُن کی اِسی حیثیت سے ہے، وہ سب سے کم محنت کرنے والے، کرکٹ کھیلنے والے، یونین میں تقریر کرنے والے، اپنے اساتذہ سے لڑنے والے اور کتابیں تک اپنے پاس نہ رکھنے والے طالب علم تھے، لیکن اِس کا بھی سب کو اعتراف ہے کہ وہ اپنی اِس مسلمہ ''کھلنڈریت'' کے باوجود سب سے اچھی انگریزی بولتے تھے اور سب سے اچھی لکھتے تھے۔ پھر جب'' آکسفرڈ گئے تو اُن کی استعداد میں اور غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ اب تک وہ ایک قادر الکلام انگلش نگار تھے لیکن انگلستان سے واپسی کے بعد وہ ایک مبصر ماہر زبان ہوگئے۔

ماریسن کا خراجِ تحسین:

علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں اُنہوں نے ''علی گڑھ منتھلی'' میں ایک مضمون سپردِ قلم کیا تھا،'' مضمون بے حد پسند کیا گیا اور طلبہ سے گزر کر اساتذہ نے بھی اس کی بہت تعریف کی۔ علی گڑھ کالج کے مشہور پرنسپل مسٹر ماریسن نے تو وفورِ مسرت میں یہاں تک کہہ دیا:

''تم ایک زمانہ میں انگریزی کے بے مثل ادیب ہوگے۔''

اور کون کہہ سکتا ہے کہ مسٹر ماریسن کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی؟

شیکسپیئر پر عبور:

محمد علی کے ایک دوسرے ''حالات'' نگار کا بیان ہے:

''تصانیفِ شیکسپیئر کے جیسے محمد علی ماہر ہیں، اِس صنف میں ہندوستان میں اُن کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ چنانچہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی میں مسٹر موصوف نے ''میکمکس (رسالہ میں ''میکمکس'' لکھا ہے لیکن غالباً یہ ''میکبتھ'' ہے، مؤلف)'' پر ایک نہایت قابلانہ اور شاندار مضمون لکھا جس کے صلہ میں آپ ''آکسفورڈ سوسائٹی'' کے پہلے ہندوستانی سیکریٹری مقرر ہوئے جو ایک ہندوستانی کے لیے اعلیٰ ترین علمی اعزاز کہا جا سکتا ہے۔''

لارڈ منٹو کا اعتراف:

آگے چل کر لارڈ منٹو کا ایک دلچسپ اعتراف بھی ہمیں اُسی ''حالات'' نگار سے معلوم ہوتا ہے:

''(Thaught) اس قدر مقبول ہوا کہ نہ صرف ہندوستان میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا بلکہ لارڈ منٹو جو اس زمانہ میں وائسرائے تھے اور اُن کے چیف سیکریٹری نے مولانا ممدوح کی اعلیٰ قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کی کوششوں کو بہت سراہا۔''

میر محفوظ کا بیان:

میر محفوظ علی صاحب جنہوں نے محمد علی کو بچپن بھی دیکھا ہے اور شیب وشباب کے حالات سے بھی واقف ہیں، نیز محمد علی کے ساتھ اُن کی عملی زندگی میں ایک عرصہ تک حق رفاقت ادا کر چکے ہیں، اُردو کے ایک بے نظیر انشاء پرداز اور انگریزی کے صاحبِ ذوق مبصر ہیں، محمد علی کی انگریزی انشاء پردازی کے متعلق فرماتے ہیں:

''(محمد علی) کی ہمہ گیر ذہانت نے انگریزی ادب انشاء، مصطلحات ومحاورات، طرزِ ادا وطریقۂ بیان پر اِس درجہ عبور وتبحر حاصل کیا کہ اُن کے قلم وزبان دونوں کو جاہلوں

سے لے کر عالموں، گنواروں سے لے کر شہریوں، فقیروں سے لے کر امیروں اور مزدوروں سے لے کر وزیروں تک کے الفاظ وعبارات ادا کرنے پر یکساں کامل قدرت ومہارت حاصل تھی۔ ملاحوں کے سرود اُنہیں یاد تھے، اناؤں کی لوریاں اُنہیں یاد تھیں، لیمرک (Limerick) اُنہیں یاد تھیں، لندن کے مشرقی حصہ (East end) کے آوارہ گرد چھوکروں کی بستیاں اُنہیں یاد تھیں۔ بل (Buil) اُنہیں یاد تھے، معمے اور چیستان اُنہیں یاد تھے۔ اِس کے ساتھ انگریزی کے متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعرا اور مصنفین کے بہترین علمی وادبی جواہر پارے اُن کی زبان پر یا اُن کی نظر میں تھے۔ انجیل کی کتبِ عتیق وجدید پر اُن کی نگاہ تھی۔ سیکڑوں علمی لطیفے اُن کے نوکِ زبان تھے۔ طبیعت پر چونکہ بذلہ سنجی، ظرافت اور شوخ نگاری کا رنگ غالب تھا، لہٰذا اِس صنف میں ایسا بے ساختہ اور تنا بہتر لکھ سکتے تھے کہ بسا اوقات اُن میں اور 'لندن پنچ' کی ظرافت میں مشکل سے امتیاز ہو سکتا تھا۔ یہ ایک جاہل اور ہیچ مدان ہندی کا خیال نہیں ہے، بلکہ بڑے بڑے انگریز ادیبوں کی غیر جانبدارانہ رائے ہے۔''

میکڈانلڈ کا خیال:

مسٹر میکڈانلڈ جو اَب وزیر اعظم ہیں، اُن سے بھی محمد علی کے بہت کافی تعلقات تھے۔ تعلقات پر گفتگو تو آئندہ کسی موضوع کے ماتحت کی جائے گی، یہاں صرف اُن کی رائے محمد علی کی انگریزی انشاء پردازی کے متعلق لکھنی ہے۔

1913ء میں لارڈ اسلنگٹن کا پبلک سروس کمیشن جب ہندوستان میں دورہ کر رہا تھا تو اُس کے ایک رکن مسٹر میکڈانلڈ بھی تھے، مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سے محمد علی کے تعلقات کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ کمیشن جب لکھنؤ گیا ہے تو محمد علی بھی اس کے سامنے شہادت دینے گئے تھے۔ دورانِ گفتگو محمد علی سے ''مسٹر میکڈانلڈ نے بالالتزام اپنے ''کامریڈ'' پڑھنے کا ذکر کیا اور میری (محمد علی کی) شوخی تحریر کی بہت

کچھ تعریف فرمائی۔"

ٹائمنر آف انڈیا کا خیال:

"ٹائمنر آف انڈیا" کا لندنی وقائع نگار جو اس کا کوئی سابق ایڈیٹر ہے، محمد علی کی وفات پر اُن کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے اُن کی انگریزی لیاقت کے متعلق کہتا ہے:

"مجھے افسوس ہے کہ اُن کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا اُس میں اُن کی یہ خوبی نظر انداز کر دی گئی ہے کہ وہ انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے۔ کوئی ہندوستانی اِس میں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور انگریزوں میں شاید بہت ہی کم اُن سے بہتر لکھ سکتے تھے۔ مرحوم نے صحافت کی زندگی شروع کرنے سے پیشتر مجھ سے بہت طویل مشورے کیے تھے۔"

ایچ۔ جی۔ ویلز:

مشہور مصنف ایچ۔ جی۔ ویلز نے بھی مولانا محمد علی کی انگریزی قابلیت کا اعتراف کیا ہے اور نہایت شاندار الفاظ میں، محمد علی کا جب انتقال ہوا تو اُس نے کہا:

"محمد علی کا دِل نپولین کا دِل تھا، اُس کا قلم میکالے کا قلم تھا، اُس کی زبان برک کی زبان تھی۔"

مصنف موصوف نے اپنے ایک خط میں جو اُس نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو لکھا ہے، محمد علی سے اپنی شناسائی اور ملاقاتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

برنارڈ شا کی قدر دانی:

برنارڈ شا سے بھی محمد علی کے تعلقات تھے، شا بھی اُن کی غیر معمولی قابلیت اور دیگر خصوصیات کی بنا پر اُن کا خاص طور سے گرویدہ تھا۔ چنانچہ 1928ء میں جب محمد علی بہ سلسلہ علاج انگلستان گئے تھے تو شا سے بھی ملاقات کی۔ گول میز کانفرنس کی شرکت کے لیے جب وہ پھر انگلستان گئے ہیں تو اب کے پھر اس

سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔

مکتوب برنارڈ شا بنام عبدالماجد:

حال میں جارج برنارڈ شا کا ایک خط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام آیا، درج ذیل ہے:

''میری محمد علی سے صرف ایک ملاقات میرے ہی مکان پر ہوئی تھی جس میں موضوعِ گفتگو یہ تھا کہ جس طرح اصلاحِ کلیسا مارٹن لوتھر نے کی تھی، آیا اِس قسم کی اصلاح کی اسلام کے اندر گنجایش ہے؟ ہم دونوں اِس نتیجہ پر متفق ہو گئے تھے کہ اسلام جن پستیوں میں صدیوں سے گرا ہوا چلا آتا ہے، اُن سے اسے نکالنے کی صورت یہی ہے کہ محمد والے اسلام کی تحریک و دعوت از سرِ نو پیش کی جائے، محمد علی کی ملاقات میرے لیے بہت ہی پر لطف تھی اور آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ میں بھی اُن کے لیے بار خاطر میں ثابت ہوا۔ میں اِس پر فخر کرتا ہوں کہ ساری ملاقات اس قدر دوستانہ رہی۔ محمد علی کی شخصیت کا نقش میرے قلب پر ایسا پڑا تھا کہ جب میں نے اُن کی وفات کی خبر سنی تو میں نے محسوس کیا کہ اسلام کا ایک بڑا زبردست و پر جوش خادم اُٹھ گیا۔''

سر مائیکل اڈوائر کی قدر دانی:

پنجاب کا مشہور گورنر سر مائیکل اوڈائر بھی محمد علی کا خاص قدر دان اور بہت مخلص دوست تھا۔ جاؤرہ کی وزارت کے لیے وہی زور دے رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا، لیکن جب محمد علی نے انکار کر دیا اور ''کامریڈ'' نکالنے کا عزم مصمم ظاہر کیا تو اُس نے ہر قسم کی اخلاقی امداد کی، لیکن آخر میں محمد علی سے اسے تجربہ نہایت ''تلخ'' ہوا۔ سیّد زبیر صاحب ہزاروی ایم اے لکھتے ہیں:

''سر مائیکل اوڈائر اپنی کتاب ''Indian as I know'' میں لکھتے ہیں کہ مسٹر محمد علی نے اس اخبار کے اجرا سے پہلے مجھ سے مشورہ لیا، میں نے اُن کی حوصلہ افزائی

کی، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں خود ہی سب سے زیادہ اس اخبار کا تختۂ مشق بنا رہا۔"

مسٹر گوکھلے کا اعتراف:

مدیر "انقلاب" کا بیان ہے:

"(محمد علی) نے اپنی ادبی وسیاسی قابلیت کے تقاضے سے بعض انگریزی اخبارات میں نہایت ہنگامہ خیز مقالات لکھے۔ "ٹائمز آف انڈیا"، "انڈین اسپیکٹیٹر" اور "ہندوستان ریویو" وغیرہ کے فائل اس کے گواہ ہیں۔ منٹو مارلے اصلاحات پر آپ کے اور مسٹر گوکھلے کے درمیان ایک تحریری مباحثہ چھڑ گیا جس میں آپ نے انتہائی قابلیت کا ثبوت دیا۔ یہاں تک کہ مسٹر گوکھلے بھی آپ کی قوتِ استدلال اور زورِ بیان کے قائل ہو گئے اور لارڈ منٹو نے بھی آپ کی قابلیت کا لوہا مانا۔"

بمبئی کرانیکل:

ایک زمانہ میں بمبئی کرانیکل کا ایک دہلی ایڈیشن بھی نکلتا تھا۔ ایک بار اس کے عملہ ادارت کے ایک رکن ایم۔ این۔ ٹی۔ نے ایک نہایت دلچسپ، پرلطف اور مفصل مضمون محمد علی کے متعلق لکھا تھا، اس کا ایک اہم حصہ یہ ہے:

"جس شخص نے "کامریڈ" کے اوراق کا بغور مطالعہ نہیں کیا، اُس نے محمد علی کی شخصیت کے اسرار کو سمجھا ہی نہیں۔ مولانا محمد علی نے جو ملک کے سب سے زیادہ روشن دماغ اخبار نویس ہیں، اپنے قلم کے ذریعہ سے اپنا دِل اخبار میں ٹپکا دیا ہے اور اس کے ساتھ انہوں نے ظرافت، مذاق اور تعریض کا ایک ایسا بے پایاں دریا بہا دیا ہے جو مدتوں تک آئندہ اخبار نویس کے لیے وجہ رشک رہے گا۔ آدمیوں کی سیاسیات، ان کے طریق کار اور تحریکوں کا نقشہ کھینچنے میں محمد علی لاثانی ہیں، اور غالباً لاثانی رہیں

گے۔"

سرعتِ تحریر:

اس غیر معمولی مہارت اور بصارت کے باوجود محمد علی میں ایک دوسرا وصف بھی تھا یعنی سرعت تحریر۔ اہم اہم مضامین کی انہوں نے کم سے کم وقت میں تکمیل کر دی ہے۔ اپنا مشہور و معروف مضمون "چوائس آف دی ٹرکس" محمد علی نے ایک نشست میں جو مسلسل ۳۴ گھنٹے تک قائم رہی تھی، لکھا تھا اور صرف یہی مضمون نہیں، اکثر و بیشتر وہ اسی طرح لکھتے تھے اور لکھنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ کثرتِ مشاغل، کثرتِ احباب اور کثرتِ کار سے اُن کے پاس اتنا وقت بچتا ہی نہیں تھا کہ وہ سکونِ قلب اور اطمینانِ خاطر سے مضمون لکھ سکیں۔

رفتارِ کار:

میر محفوظ علی اپنے زمانۂ قیام دفتر "ہمدرد" و "کامریڈ" کا ایک دلچسپ واقعہ بتاتے ہیں:

"محمد علی بالطبع سست نہ تھے مگر کاہل ضرور تھے، منٹوں کا کام دِنوں بلکہ ہفتوں نہیں کرتے تھے، مگر جب کرنے پر آجاتے تھے تو ہفتوں کا کام منٹوں میں نہیں تو گھنٹوں میں ضرور کر ڈالتے تھے۔ دہلی آکر "کامریڈ" کبھی وقت پر نہ نکلا۔ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد مضمون لکھنے بیٹھے ہی تھے کہ فلاں صاحب تشریف لائے۔ اب مجلس گرم ہوئی، (پھر) باہر جانے کا وقت ہوا، تشریف لے گئے۔ کھانے کے وقت واپس آئے، ہمارے ضبط کا پیالہ چھلک گیا اور جو کچھ منہ میں آیا بکنا شروع کیا۔ صبح کو ناشتہ پر بلائے گئے، "بھائی جان! کچھ غصہ کم ہوا؟ خفا کیوں ہوتے ہو، یا تو مضمون لو گے یا کسی کی جان؟" یہ کہہ کر ایک پلندا پھینک دیا، دیکھا تو "کامریڈ" کے لیے گپ کا ایک نہایت ہی لچھے دار مضمون تھا۔"

❀❀❀

باب ۵

ذوقِ تفحص اور وسعتِ مطالعہ

محمد علی کو قدرت نے غیر معمولی قوت ذہانت، بلکہ فہم وتدبر اور قوت حافظہ عطا فرمائی تھی لیکن قدرت کے اس عطیہ پر وہ قانع نہیں تھے، بلکہ اپنی ذہنی ودماغی قوتوں کو برابر استعمال کر کے ان میں جلا دیتے رہتے تھے۔

بارہا ایسا اتفاق پیش آیا ہے کہ اُنہوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے اور اختلاف بھی کیسا؟ مذہبی! اگرچہ عربی سے تقریباً وہ نابلد تھے، اس لیے بظاہر اُن کی مذہبی استعداد کو بھی بس یوں ہی سا ہونا چاہیے تھا لیکن واقعہ ایسا نہیں تھا۔

قتل مرتد:

غازی امان اللہ کے عہد حکومت میں ایک قادیانی نعمت اللہ کو سنگ سار کیا گیا، اس پر قادیانیوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ ہندوستان میں جلسے ہوئے، ریزولیوشن پاس ہوئے، وائسرائے اور ملک معظم سے فریاد کی گئی، یہاں تک کہ ''جمعیت اُمم'' تک اس معاملہ کو پہنچایا گیا اور انسانیت کے نام پر اپیل کی گئی۔

دوسری طرف علمائے ہندوستان نے ایک ''قیامتِ صغریٰ'' برپا کر دی اور ہر ہر طریقہ سے اُنہوں نے امان اللہ کے اس فعل کو مستحسن قرار دیا، اور ''شریعت حقہ اسلامیہ'' کی اہم ترین دفعہ کی حیثیت سے اس کو پیش کیا اور ثابت کیا کہ یہ ایک نہایت اہم ترین اصولِ اسلامی ہے۔

محمد علی کی رائے کی صداقت وصحت سے اس جگہ بحث نہیں، یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ محمد علی نے ان

دونوں جماعتوں کے افکار وآرا کا مطالعہ کیا اور پھر اپنا نظریہ یہ پیش کیا کہ اسلام میں قتل مرتد جائز نہیں، ہاں قتل مفسد نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔

یہ رائے محمد علی نے پیش کی، حسب توقع اس کی مخالفت بھی ہوئی۔ لیکن محمد علی اس اختلاف ومخالفت سے متاثر نہیں ہوئے اس لیے کہ اُنہوں نے اس مسئلہ پر جو رائے قائم کی تھی، وہ علیٰ وجہ البصیرۃ تھی۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ ''لا اکراہ فی الدین '' کی رو سے قتل مرتد ناجائز ہے اور ''الفتنۃ اکبر من القتل '' کے اعتبار سے قتل مفسد نہ صرف جائز بلکہ بعض صورتوں میں فرض ہے۔

اس مسئلہ پر انہوں نے آیاتِ قرآنی، احادیثِ رسول اللہ ﷺ، اقوالِ فقہا، خیالاتِ ائمہ، اذکارِ مجتہدین کا اتنا نادر ذخیرہ جمع کر لیا کہ ایک شخص پوری بصیرت کے ساتھ اس مسئلہ پر ''ریسرچ'' کر سکتا ہے۔ اس ذخیرہ سے متمتع ہونے کے بعد اُنہوں نے اپنی بصیرت کے مطابق ایک رائے قائم کی اور اُس پر آخر وقت تک مصر رہے۔

ساردا بل:

ساردا بل کی مخالفت سب سے پہلے محمد علی نے کی اور اپنے متعدد پرزور مقالات سے اس مسئلہ کی سیاسی اور مذہبی اہمیت سمجھائی، لیکن حسب عادت اس مسئلہ پر بھی محمد علی نے مخالف اور موافق ہر گروہ کے دلائل کا استقصا کیا، مذہبی حیثیت سے معلومات فراہم کیے۔ عہد رسالت، عہد صحابہ، عہد تابعین کے حالات وواقعات کی جستجو کی، فقہ واحادیث کا ذخیرہ اپنے سامنے رکھا اور اس کے بعد بیانگ دہل اس کی مخالفت کی، ہر شخص سے مناظرہ کیا، مقالات لکھے لوگوں کو اپنی رائے سے موافق بنانا چاہا اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

واقعات دیوبند:

ایک اخبار نویس کے لیے سب سے زیادہ دلچسپ چیز یہ ہوتی ہے کہ ملک میں کوئی ہنگامہ ہوا اور اُس کا قلم پوری روانی کے ساتھ بڑی بڑی ''سنسنی خیز'' سرخیاں دے کر اپنے ''ہمدرد قوم'' ہونے کا لوہا منوا

لے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی مشہور اسٹرائک میں تقریباً تمام اخبارات نے اپنی اپنی راہِ عمل متعین کر لی، یا تو انہوں نے ارباب دیوبند کی حمایت کی اور یا انہوں نے پھر مہتمم صاحب کو سب دشتم کا ہدف بنا لیا۔ لیکن محمد علی نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا اور وہ خود اپنی اہم ترین مصروفیتوں اور مشغولیتوں کے باوجود بہ نفس نفیس دیوبند تشریف لے گئے۔ وہاں کے حالات کا مطالعہ کیا، موافق اور مخالف ہر گروہ کے افکار و آرا سے واقفیت حاصل کی۔ دونوں جماعتوں کا جو تحریری مواد تیار ہو چکا تھا، اسے حاصل کیا اور اسے پڑھا، تب جا کر انہوں نے ''ہمدرد'' کو اظہار رائے کی اجازت دی۔ آج تک محمد علی کے دفتر میں تمام کاغذات اُن تمام مسائل کے متعلق موجود ہیں اور ہر شخص اُنہیں دیکھ کر اس دعوے کی تصدیق کر سکتا ہے۔

یہ تو تھا اُن کا شوقِ تفحص اور ذوقِ طلب! اب اُن کی وسعتِ نظر پر ایک نظر ڈالیے تو اور زیادہ وہ کامیاب ثابت ہوں گے۔ اپنے مخصوص مضامین، تاریخ، صحافت اور انگریزی میں تو ضرور فردِ فرید تھے ہی، لیکن جن چیزوں سے اُن کا کوئی خاص تعلق نہ ہونا چاہیے تھا یا جن چیزوں پر اُنہوں نے خاص طور سے تیاری نہیں کی تھی، اُن میں بھی وہ سب سے آگے تھے۔

غالبؔ پر تو اُن کی خاص نظر تھی، اُس کا فارسی و اُردو ہر قسم کا کلام اُنہیں زبانی یاد تھا، یہاں تک کہ اُس کے غیر مطبوعہ کلام پر بھی اُن کی وسیع نظر تھی۔

براق شریف:

غالباً 1928ء میں فلسطین کے مسلمانوں اور یہودیوں میں ''دیوارِ گریہ'' اور ''براق شریف'' کے مسئلہ پر نہایت سخت تنازعہ رونما ہوا۔ محمد علی اُس زمانہ میں علیل تھے، بمبئی گئے ہوئے تھے شاید بغرض علاج، لیکن اخبار والے بھلا کسی مشہور لیڈر کو ''انٹرویو'' لیے بغیر کب چھوڑتے ہیں؟ اچھی طرح یاد نہیں، شاید ''ٹائمز آف انڈیا'' کا نامہ نگار پہنچا کہ اِس اہم مسئلہ پر اپنے خیالات لکھوائے۔ محمد علی نے اپنے خیالات تو بعد کو لکھوائے، لیکن ''دیوارِ گریہ'' اور براق شریف'' کی تاریخی حیثیت پر اتنا پر مغز، اتنا مدلل اور اتنا تاریخی بیان دیا جو غالباً ہمیشہ یاد رہے گا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ محمد علیل تھے، بیان دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن جب اِس مسئلہ پر لب

کشائی کی تو پھر حقائق و معلومات کا ایک دریا بہا دیا۔ افسوس ہے کہ جستجوئے بسیار کے باوجود بیان نہ مل سکا ورنہ ناظرین کی خدمت میں اس کے ضروری حصص پیش کر دیئے جاتے۔

محمد علی کی اس خصوصیت کا اُن کے حلقہ تعارف میں ہر شخص معترف تھا اور بوقتِ ضرورت اُنہیں کسی نہ کسی علمی کام میں شریک کرنے کی کوشش ضرور کی جاتی تھی۔

اُردو انسائیکلو پیڈیا:

ایک زمانہ میں راجہ صاحب محمود آباد کی عنانِ توجہ علمی سر پرستیوں کی طرف مبذول ہوئی تھی، چنانچہ موصوف نے اپنی جیبِ خاص سے ایک لاکھ روپیہ اِس مد پر صرف کر دینے کی آمادگی ظاہر کی اور اُردو انسائیکلو پیڈیا کی تدوین وتبویب کے مبادی گویا شروع بھی ہو چکے تھے۔ مولانا سیّد سلیمان صاحب ندوی اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی اور اُمید بندھ چلی تھی کہ یہ کام انجام پا سکے گا، لیکن بعد کو مسلمانوں کے عام منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی ناکام ہی رہ گیا۔

بہر حال اس اُردو انسائیکلو پیڈیا کی مجلس شوریٰ میں نواب عماد الملک جسٹس (اب سر)، عبدالرحیم، ڈاکٹر (اب سر) سپرو، ڈاکٹر (اب سر) اقبال اور راس مسعود وغیرہ جیسی بلند پایہ شخصیتوں کے ساتھ محمد علی کا نام بھی رکھا گیا اور صرف نام ہی نہیں رکھا گیا بلکہ کام کی دعوت بھی دی گئی، چنانچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ اپنے ایک مکتوب میں محمد علی کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''اُردو انسائیکلو پیڈیا کا اعلان اپنے اخبارات میں پڑھا ہوگا، یہ فرمایئے! آپ کا اس میں کیا حصہ ہوگا؟ آپ کا نام اس کی مجلس شوریٰ میں تو رکھ بھی دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جس چیز کی بابت آپ لکھنا پسند فرمائیں، ہم لوگ بہ کمالِ اشتیاق آپ کے خیر مقدم کے لیے تیار ہیں۔ آپ کی شرکت محض مجلس شوریٰ میں کافی نہیں، آپ کو اس سے بہت زیادہ حصہ لینا چاہیے۔ تاریخ، لٹریچر، جرنلزم، غرض جس شے کے متعلق آپ چاہیں تحریر فرما سکتے ہیں۔''

مکتوب سیّد سلیمان:

اِسی طرح مولانا سیّد سلیمان صاحب ندوی بھی اپنے ایک مکتوب میں اُن سے علمی خدمت کا نہایت اصرار سے ''تقاضا'' کر رہے ہیں:

''میں اس وقت ایک خود غرضی سے حاضر ہوا ہوں۔ یہ فرمایئے کہ ایام نظر بندی میں کوئی علمی کام بھی آپ کے پیش نظر رہا؟ اس سوال کا جواب مجھے ضرور دیجیے، ایک ضرورتِ خاص ہے۔ ''سیرۃ نبوی'' ملاحظہ سے گزری ہوگی، کہیے! کیا خیال قائم کیا؟ کیا امور قابل اصلاح ہیں؟''

❁❁❁

باب ٦

قیادت کا رعب و اعتراف

محمد علی کی ہمہ گیر خوبیوں اور دلفریب خصلتوں کے ساتھ ہر شخص کے دِل میں عام اس سے کہ وہ مخالف ہو یا موافق، اُن کی رہنمائی کا اعتراف عزت و احترام کے ساتھ موجود تھا۔ ہر شخص اُن کی زعیمانہ خوبیوں کا معترف تھا اور خوب سمجھتا تھا کہ محمد علی کی ناخدائی کے بغیر بیڑا پار نہیں لگ سکتا۔ اتنا عام اعتراف و احساس تو خیر بعد کو ہوا، لیکن شروع شروع میں جب محمد علی نے علمی زندگی میں قدم رکھا اور ''کامریڈ'' کے ذریعہ سے اپنے افکار و خیالات کی نشر و اشاعت شروع کی تو تاڑنے والی نظریں تاڑ گئیں کہ یہ ''جوہر قابل'' آسمانِ سیاست و صحافت پر مہر و ماہ بن کر چمکے گا، چنانچہ اُسی وقت سے محمد علی کا دفتر فریادیوں کا مرکز بن گیا تھا اور یہی نہیں کہ ''عوام کالانعام'' اسے قبلۂ آرزو سمجھ رہے ہوں، بلکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ خواص کی نظروں کا تارا تھا۔

عوام تک تو ابھی نہ اُس کی رسائی ہوئی تھی نہ عوام اُسے پہچانتے تھے۔ علی گڑھ کی بقا و ترقی کے معاملہ میں اور مسلم لیگ کے قیام و استحکام کے زمانہ میں مرحوم نواب وقار الملک نے اُسے اپنا دست راست سمجھا۔ ''مدینہ یونیورسٹی'' کی تحریک ایک خاص علمی حلقہ سے جب فروغ پذیر ہوئی تو محمد علی کو ترتیب نصاب وضع دستور العمل اور تسویہ اسکیم کے لیے ہر طرف سے بلایا جا رہا تھا۔ کبھی مولانا شبلی اپنے اس عزیز شاگرد کو اپنا مافی الضمیر سمجھا رہے ہیں اور کبھی اس کا نقطۂ نظر سمجھ رہے ہیں، کبھی مولانا حمید الدین فراہی مرحوم ''ہمہ وقت حاضری'' کو مستعد ہیں، کبھی ڈاکٹر اقبال ''ہر طرح سے آمادہ'' ہیں اور ''کامریڈ'' کا یہ جوان عمر و جواں سال ایڈیٹر، ان سب پیشوایانِ قوم کا مرکز آرزو بنا ہوا ہے۔

مولانا کا خط:

اس مقام پر مولانا حالی مرحوم کے ایک مکتوب بنام محمد علی کا حوالہ دینا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ محمد علی سے بزرگانِ قوم نے کیا توقعات وابستہ کر رکھی تھی:

''عزیزی وحبیبی!

میں اب بہت کمزور ہو گیا ہوں، لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ گیا ہے، لیکن بعض ضرورتیں مجبور کر دیتی ہیں اور اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ میں اِس وقت آپ کو اِس معاملہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو آگرہ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں مسلمانوں کے برخلاف درپیش ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اصل واقعات پر روشنی ڈال کر سچ کی مدد کریں گے اور نہایت متانت، سنجیدگی اور تہذیب کے ساتھ اپنا فرض ادا کریں گے۔''

مولانا ابوالکلام کا خط:

مولانا ابوالکلام صاحب آزاد جن کا ہاتھ ہمیشہ ''زمانہ کی نبض'' پر رہتا تھا اور وقوعِ واقعہ سے کہیں پیشتر مولانا اپنی مخصوص ومنفرد بصیرت کی بنا پر آنے والے واقعہ کی حقیقت و ماہیت سے واقف ہو جایا کرتے ہیں، وہ اپنے مکتوب بنام محمد علی میں اس ''وقت کے سب سے اہم مسئلہ'' یعنی مسلم لیگ پر اظہار خیال فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''خدا نے آپ کے اندر ایک کامیاب اخبار نویس سے زیادہ طاقتیں رکھی ہیں، ظلم ہے کہ اگر آپ اپنی قوتوں سے کام نہ لیں۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ لوگ آپ کو جبراً پریذیڈنٹ بنالیں اور میں اس کو پوری تفصیل سے لکھنے والا ہوں۔ مسلمانوں کی نئی سیاسی زندگی کی تشکیل کے لیے آپ کی غیبت میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ آپ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں۔''

اور ''بالآخر'' واقعات نے ثابت کر دیا کہ مولانا موصوف کی رائے کس قدر قرین صواب تھی۔

ہمہ گیر اختلاف:

یہ تو اُس زمانے کے واقعات ہیں جب محمد علی لوگوں کی نظر میں چڑھے ہوئے تھے لیکن اس عہد سے قطع نظر کر کے اُس زمانہ پر نظر ڈالیے جب بیجاپور جیل سے رہائی کے بعد محمد علی مخالفتوں اور سازشوں کے شکار ہو رہے تھے۔ ہندوستان میں تبلیغ و تنظیم اور شدھی و سنگھٹن کی کارفرمائی تھی اور پھر اسے بھی چھوڑ یئے۔ جب ابن سعود کی موافقت نے احناف میں اُنہیں غیر ہر دلعزیز بنا دیا تھا اور پھر مخالفت نے حضرات اہل حدیث کو اُن کا دشمن کر دیا تھا، یا پھر کتاب راجپال کے زمانہ پر نظر ڈالیے جب محمد علی نے اپنا جدید لیکن قابل قبول نظریہ پیش کر کے سارے اسلامی ہند کی مخالفت مول لے لی تھی، یا پھر سب سے آخر میں جب وہ کانگریس کے مخالف ہوئے ہیں اور علی الاعلان اُنہوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور اپنے دوستوں، رفیقوں اور نہ معلوم کتنے ''تابع مہمل'' ساتھیوں کی مخالفت کا نشانہ بنے ہیں، اُس تمام عہد انتشار و شورش میں نہ صرف یہ کہ محمد علی کے استقامت کو جنبش نہیں ہوئی اور نہ صرف یہ کہ اُنہوں نے سارے مسلم پریس، ہندو پریس اور اینگلو انڈین پریس کی مخالفت کا تن تنہا مقابلہ کیا، بلکہ یہ بھی ہوا کہ مخالفوں نے، اُن کو بدنام کرنے والوں نے، اُن کی قبائے قیادت کی دھجیاں اُڑانے والوں نے جب وقت پڑا تو محمد علی کی طرف ہی رجوع کیا، اُنہیں کے سایۂ قیادت میں پناہ ڈھونڈھی اور پائی۔

یہ تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے، لیکن ہے واقعہ کہ ایسا ہوا۔ لوگوں نے اُن کی مخالفت بھی کی، اُن کی نیت پر حملے بھی کیے، اُن کے وجود کو قوم و ملک کے لیے باعثِ ہلاکت بھی سمجھا، پھر بھی محمد علی کی ناخدائی سے وہ بے نیاز نہ ہو سکے۔

پنجاب کا ایک واقعہ:

کتاب راجپال کے زمانہ میں زعمائے پنجاب نے سب سے پہلے ''دلیپ سنگھ مستعفی ہو جاؤ'' کا نعرہ لگایا تھا اور جب اس پر ''مسلم آؤٹ لک'' کے ایڈیٹر صاحب گرفتار ہوئے تو سارا پنجاب جوش و ہیجان سے بے قرار ہو گیا۔ پنجاب کے ایک لیڈر نے اس آگ پر تیل کا کام دیا تھا، اتفاق ایسا پیش آیا کہ

مسٹر اوگلوی کی حکومت نے انہیں بھی گرفتار کرلیا۔ گرفتار ہوتے ہی سارا جوشِ قیادت کم ہوگیا اور اُن کی جانب سے اُن کے صاحبزادہ نے لاہور سے محمد علی کو ٹیلیفون دینا شروع کیا اور التجا کرنا شروع کی کہ آپ تشریف لائیں اور ہم سب کی رہنمائی کیجیے اور ''والد محترم'' کی گرفتاری کے مسئلہ پر بھی اپنی رہنمائی سے مستفید کیجیے، حالانکہ اس استمداد سے پیشتر ''والد محترم'' اور اُن کا ''اخبار'' سب کے سب مسلسل اور پیہم یہ پروپیگنڈا کر چکے تھے کہ محمد علی کا دماغ ذیابیطس نے خراب کردیا ہے۔

اِسی طرح سائمن کمیشن کے زمانہ میں محمد علی سے اپنی مسلمہ مخالفت کے باوجود اس کی امداد سے احرار پنجاب بے نیاز نہ رہ سکے۔ سر شفیع نے لاہور میں بیٹھ کر جو احرار پنجاب کا مرکز ہے، مسلم لیگ کے دو ٹکڑے کیے۔ لاہور ہی میں مسلم لیگ کا جلسہ طلب کیا، خود ہی اس کے صدر ہوئے اور سائمن کمیشن سے تعاون کی تجویزیں پاس کرائیں، اور سوائے ''اظہارِ بیزاری'' کے ان کا کوئی کچھ نہ کرسکا۔

لیکن محمد علی کے لغت میں ''بیزاری'' اور ''علیحدگی'' کے الفاظ تھے ہی نہیں، اس لیے علی الاعلان سر شفیع کو چیلنج دیا۔ پنجاب کے دوسرے ''سروں'' کو دعوتِ مبارزت دی اور پنجاب میں دورہ کیا، اور سائمن کمیشن کے خلاف اپنے دلائل پیش کیے اور لوگوں سے منوائے، حالانکہ پنجاب کی ایک جماعت کی نظروں میں محمد علی اُس زمانہ میں آبرو باختہ تھا، مجنون تھا اور اُس کا دل و دماغ سے جواب دے چکا تھا۔

دوسرا واقعہ:

اسی طرح ایک اور اہم موقعہ پر بھی محمد علی سے استمداد کی گئی تھی۔ راجپال کے قاتل علم الدین شہید کو میانوالی جیل میں پھانسی دی گئی اور وہیں اس کی تدفین بھی کردی گئی۔ مسلمانانِ لاہور اسے لاہور میں لا کر باقاعدہ نمازِ جنازہ ادا کر کے جلوس کے ساتھ دفن کرنا چاہتے تھے۔ پنجاب گورنمنٹ نے ہندو مسلم فساد کے اندیشہ کے سبب مسلمانوں کے مطالبات کو ٹھکرا دیا، مسلمانوں نے لاکھ کوششیں کیں مگر اس کی اجازت نہ ملی۔ اس انکار سے مسلمانوں میں بہت زیادہ ہیجان پیدا ہوگیا اور وہ ہر طرح سے اپنے مطالبات پر ایثار و قربانی، سرفروشی و جاں نثاری کے لیے تیار ہوگئے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ اس گروہ عوام کی قیادت کون کرے؟

سوال بہت دلچسپ تھا، حالانکہ لاہور تو لیڈروں کا مرکز تھا۔ بہر حال نظر انتخاب محمد علی پر پڑی اور ان سب مخالفوں نے جو اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے، اس کے دماغ وعقل پر حملے کرتے تھے، بلا چون وچرا اس کی رہنمائی پر صاد کر دیا۔ اسے مقتدا بنانا چاہا اور خود مقتدی بننے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ایک صاحب جو کبھی محمد علی کی مخالفت میں ''مہر وماہ'' کی طرح روشن ہو چکے تھے اور جن کی رائے میں اب ''انقلاب'' ہو چکا ہے، محمد علی کو لکھتے ہیں:

''یہاں حالات بے حد نازک ہیں، تمام ذی اثر اور ذی حیثیت کارکنوں کی رائے ہے کہ اس باب میں وہ آپ کے مشوروں سے مستفید ہوں۔ آپ کی رائے کے مطابق پروگرام وضع کریں اور آپ کی قیادت ورہنمائی میں اس مہم کو اتمام تک پہنچائیں۔''

ایک اور واقعہ:

اِسی طرح الٰہ آباد کے ایک بیرسٹر صاحب جو''ہار بنی روڈ'' کے ''گدے دار کوچوں'' پر بڑی گہری تنقیدیں فرمایا کرتے ہیں، گزشتہ تحریک کے آغاز کے وقت بے تاب ہو کے محمد علی کو لکھتے ہیں:

''میں نے اس وقت تک وکالت نہیں چھوڑی اور ضمنی حصہ تحریک میں لے رہا ہوں، مگر اگر آپ سامنے آئیں تو میں وکالت وغیرہ چھوڑ کر کھلم کھلا میدان میں آنے کو تیار ہوں۔''

جواہر لال کا اعتراف:

اِسی طرح گزشتہ تحریک کے موقع پر جب محمد علی نے کانگرس کے جلوس اور مظاہروں میں مسلمانوں کو شریک ہونے سے روکا تو پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک بیان میں اپنے تاثراتِ قلب کا اِن الفاظ میں اظہار کیا:

''میں اس بہادر لیڈر کا بہت زیادہ احترام کرتا ہوں۔ اس نے آزادی کی جدوجہد میں

جو قربانیاں کی ہیں اور جو کام سرانجام دیا ہے، وہ تاریخ آزادی میں جلی حروف سے لکھا جائے گا اور سب سے نمایاں جگہ پائے گا۔"

گاندھی جی کا اعتراف:

اسی طرح گاندھی جی نے جب قانون تک کی خلاف ورزی کا ارادہ کیا ہے تو اُن کے ایک معتقد نے "ینگ انڈیا" میں اس سے استفسار کیا تھا:

"کیا حقیقتاً علی برادران کی شرکت سے بے نیازی آپ مفید سمجھتے ہیں؟"

اِس کا اُنہوں نے جواب دیا:

"نہیں! علی برادران اگر آج ہم سے اشتراکِ عمل کر سکیں تو ہماری تحریک میں کہیں زیادہ استحکام پیدا ہو جائے۔"

اور شوکت صاحب کے متعلق تو متعدد بار اُنہوں نے حسرت کی کہ کاش وہ انہیں اپنی "جیب" سے نہ نکال پھینکتے۔

یہ بیان تو تھا اُن لوگوں کا جو سرکار پرست نہیں تھے، بلکہ کسی نہ کسی زمانہ میں محمد علی کے رفیق و شریک کار رہ چکے تھے۔ لیکن ایک دفعہ سرکاری حلقہ پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو وہاں بھی محمد علی کی ہمہ گیر شخصیت سب پر اثر انداز ہو رہی ہوگی۔ وہاں بھی اُس کی خصوصیتوں اور صلاحیتوں کا اعتراف ہو رہا ہوگا۔ کوئی سب جج صاحب اپنے چیف جسٹس کی فرقہ داری کا استغاثہ محمد علی کے حضور میں پیش کر رہے ہوں گے اور کوئی کلکٹر صاحب اپنی عقیدت و نیازمندی کے پھول۔

ایک ہوم ممبر کا بیان:

محمد علی جب گول میز کانفرنس کے ممبر مقرر ہوئے تو ایک صوبہ کے ہوم ممبر صاحب محمد علی کو بایں الفاظ مبارکباد دیتے ہیں:

"آپ کی ذات کے ساتھ مسلم قوم کی توقعات ہمیشہ وابستہ رہی ہیں اور خدا کا شکر ہے

کہ اس اہم اجتماع کے موقعہ پر بھی آپ کی قوم آپ جیسی عظیم اور با اثر شخصیت کی راہ نمائی سے محروم نہ رہے گی۔"

اِسی طرح ایک اور اہم موقعہ پر وہی "ہوم ممبر صاحب" محمد علی کو مخاطب کرتے ہیں:

"لارڈ ارون کے پاس ایک وفد لے جانے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ کام بدون مشورہ کے طے ہونا مشکل ہے، اس لیے گزارش ہے کہ جس طرح ممکن ہو، تشریف لائیے۔"

ایک ممبر اسمبلی کی فرمائش:

اسمبلی کے ایک مشہور ممبر صاحب "انسدادِ توہین انبیاء و بزرگانِ دین" کے متعلق اسمبلی میں کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ سوالات محمد علی بتائیں:

"میں اسمبلی کے آئندہ سیشن میں اس بارہ میں چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ جو جو سوالات کیے جانے مناسب تصور فرمائیں، اُن کا مسوّدہ بنا کر میرے پاس جلد سے جلد ارسال فرمادیں تا کہ میں اُن کو بھیج دوں۔"

ایک دوست کا خط:

یہ تو تھا رعبِ قیادت اور اعترافِ سیادت عام و خاص طبقوں پر، لیکن وہ لوگ جو اُن کے دوست تھے، بے تکلف تھے، اُن کے اسرار و رموز سے واقف تھے، وہ بھی اور وہ بھی جو گروہِ عوام میں شامل تھے اور اپنی فہم سیاست کا کوئی ثبوت نہ پیش کر سکے تھے، محمد علی پر فدا تھے اور فدا ہونے کو ہر وقت تیار... دونوں قسموں سے ایک ایک مثال۔

قاسم حسن صاحب مرحوم تعلق دار پر بھنی حیدر آباد، وہ تھے جنہوں نے تحریک خلافت کے شروع ہوتے ہی محمد علی کے ارشاد پر ڈپٹی کلکٹری پر لات ماری اور حیدر آباد میں مقیم ہو گئے، اور پھر رفتہ رفتہ وہاں خاصی ترقی کی، وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تمہاری صحت کیسی ہے؟ خدا علیم ہے تم مجھے اتنے عزیز ہو کہ اپنی صحت قربان کرنے

کو تیار ہوں۔“

دوسری مثال:

اب دوسری مثال گروہِ عوام سے لیجیے، کوئی شخص ''میر'' نامی تھا۔ پڑھائی کچھ یوں ہی سے ہوئی تھی، معمولی ملازمت کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا لیکن محمد علی کے عاشق زار اور ''ہمدرد'' کا قدردان تھا۔ وہ اپنے بستر علالت پر بلکہ بستر مرگ پر دراز تھا کہ ''ہمدرد'' بند ہونے کی اطلاع پہنچی۔ اس بیماری کے عالم میں اس خبر سے وہ کافی متاثر ہوا اور اِسی حالت میں اُس نے محمد علی کو خط لکھا، وہ خط ابھی ڈاک بھی نہیں گیا تھا کہ مریض کا انتقال ہو گیا۔ اِس سارے واقعہ کی تفصیل مرحوم کے والد نے اپنے ٹوٹے پھوٹے انداز بیان میں مولانا کو لکھی تھی جس سے یہ اقتباس اپنے الفاظ میں لیا گیا۔ وہ خط اپنی بے نمکی کے باوجود حد درجہ تاثر انگیز ہے۔

ایک اخبار کا خراجِ تحسین:

ایک ہفتہ وار غیر مسلم اخبار (دہلی) جو آخر زمانہ میں مولانا کا ایک بدتہذیب دشمن تھا، ''ہمدرد'' جب بند ہوا ہے تو ساری مخالفت کے باوجود یہ الفاظ اُس کی زبانِ قلم پر آ ہی گئے:

> ''مولانا محمد علی کا اخبار 'ہمدرد' روپیہ کی کمی کے باعث آخری لمحوں پر ہے، ہم تمام ہندوستان کے رہنے والوں کے لیے شرم کا باعث ہے۔ مولانا محمد علی اگر حریت و آزادی کی راہ اختیار نہ کرتے تو بلاشبہ آج وہ وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کے ممبر یا کسی صوبہ کے وزیر ہوتے اور اگر یہی محمد علی کسی ایسے ملک میں پیدا ہوتے جو آزادی و حریت سے لذت آشنا ہوتا تو آج محمد علی کی پوزیشن مصر کے زاغلوں، جرمنی کے ہیڈنبرگ سے کم نہ تھی۔“

پریم چند کا خط:

محمد علی کی عقیدت سے صرف مسلمانوں ہی کے دِل نہیں لبریز تھے بلکہ سمجھ دار اور معاملہ فہم ہندو بھی

اُن کے ویسے ہی قدر دان اور اُن کے اعزاز واحترام میں ویسے ہی پیش پیش تھے جیسے مسلمان۔

اِس سلسلہ میں ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار، منشی پریم چند کا ایک خط دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ فرماتے ہیں:

''اگر آپ کے خیالات کی مزید اشاعت کے لیے میں یہاں سے ایک ہفتہ دار ''ہندی ہمدرد'' کے نام سے شائع کروں تو آپ اسے پسند فرمائیں گے؟ مہاتما گاندھی کے بعد میرے دل میں آپ ہی کی عزت ہے اور اس کا اظہار کر چکا ہوں۔''

سوویت روس کی دعوت:

یہ تو تھی ہندوستان کی قدر افزائی اور سیادت وقیادت کی ستائش وتعریف، لیکن اس محبوب شخصیت کے اثرات باہر بھی پہنچ چکے تھے اور ہر شخص اسیر دام محبت ہو رہا تھا، چنانچہ سوویت روس کی دسویں سال گرہ کے موقعہ پر حسب ذیل بحری پیام محمد علی کے پاس آیا:

''روس اور دیگر مما لک کے مابین تعلقاتِ مدنیت کو ترقی دینے والی انجمن آپ کو روس آکر سوویت کی دسویں سالگرہ میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ انجمن مذکور ۳۰/ اکتوبر کو ماسکو میں بطور مہمان کے آپ کا خیر مقدم کرے گی اور اگر آپ پسند کریں گے تو وہ آپ کے قیام ماسکو کے تمام اخراجات بھی ادا کرے گی۔ آپ اسے سرکاری دعوت تصور کریں۔ توقع ہے کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے۔''

علی رضی اللہ عنہ اور محمد علی:

ایک طرف تو محمد علی کی قدر دانی اور عزت افزائی، اعترافِ سیادت اور رعبِ قیادت کا یہ عالم تھا، دوسری طرف محمد علی تھا اور اُس کے رفقاء کے دل کو کچوکے دینے والے فقرے، اُس کی ہر تحریک کی مخالفت کی گئی، اُس کے ہر نظریہ سے شدومد کی بیزاری کا اظہار کیا گیا، اُس کے ہر قدم کو ملک وملت کے لیے ہلاکت آفریں کہا گیا، اُس کے خلاف اِس شدومد، اِس زور وشور اور اِس بلند آہنگی اور تسلسل سے کیا گیا

کہ یقیناً ہندوستان میں اِس سے زیادہ کسی کے خلاف اتنا متفقہ پروپیگنڈا ابھی نہیں ہوا اور نہ شاید ہو۔ قول وعمل کے اِس دلچسپ تضاد وتخالف کو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے اپنے مکتوب بنام محمد علی میں خوب واضح فرمایا ہے۔

مکتوبِ ماجد:

''جی میں آتا ہے کہ ایک مضمون ''علی اور محمد علی'' کے عنوان سے لکھوں جس میں یہ دکھاؤں کہ وہی ابتلا، وہی خانہ جنگیاں، وہی اندرونی شورشیں، وہی قدم قدم پر ناکامیاں جو علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنے دورِ خلافت میں پیش آئیں۔ ٹھیک انہیں کا اعادہ ایک چھوٹے پیمانہ پر آج محمد علی کے لیے ہو رہا ہے۔ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فضائل و کمالات سے فرداً فرداً کسی صاحب کو بھی انکار نہ تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص تک اپنے کو اُن سے بہتر نہیں کہتے تھے، اُن کے فضائل کا برابر اعتراف کرتے تھے، پھر بھی عملاً اُن کی ہر رائے، ہر تحریک، ہر ارادہ کی مخالفت ہی ہوتی رہتی تھی۔ ٹھیک یہی صورت آج محمد علی کے لیے بھی ہے۔''

مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ کی اس رائے گرامی کی صداقت میں کون شبہ کر سکتا ہے؟ کاش! مولانا حسبِ وعدہ اِس عنوان پر مقالہ سپردِ قلم فرما سکیں۔ اگر اس مسوّدہ کی کتابت تک مولانا نے وہ مقالہ تحریر فرما لیا تو انشاء اللہ اس کتاب کو اُس سے زینت دی جائے گی ورنہ پھر آئندہ ایڈیشن میں۔

❁❁❁

باب ۷

حق گوئی

دوسرے ملکات وفضائل کے ساتھ محمد علی کو سب سے بڑا ''جوہر'' جو فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا، وہ جذبۂ حق گوئی اور خوفِ غیر اللہ سے بے نیازی تھا۔

اپنی مدتِ حیات میں محمد علی کو بارہا صاحبانِ افسر واَورنگ کے حضور میں حاضر ہونا پڑا، متعدد بار اُسے کج کلاہوں اور شہر یاروں کے دربار میں حاضری دینی پڑی اور سیکڑوں مرتبہ اُسے بزرگوں اور دوستوں کے حلقے میں اپنی حق گوئی، بے باکی اور استقامت علیٰ الحق کا امتحان دینا پڑا، لیکن اُس کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہیں ہوئی۔ اُس کی گرج دار آواز قصرِ طاغوت ویاجوج میں بارہا گونجی، لیکن اُس کی زبان میں لکنت کبھی نہیں پیدا ہوئی۔ ہمیشہ اُس کا نعرۂ صداقت غلغلہ انداز اور لرزہ فگن ثابت ہوا۔ وائسرائگل لاج میں، وزیرِ ہند کے دفتر میں، سلطان ابن سعود کی موتمر میں...وہ ہمیشہ رعد کی طرح گرجا، بجلی کی طرح چمکا اور خاشاکِ غیر اللہ کو خاکستر کر کے رکھ دیا۔

صدارتِ کانگریس کا واقعہ:

بیجاپور جیل سے رہائی کے بعد بالاتفاق تمام صوبوں کی کانگریس کمیٹیوں نے محمد علی کو صدارت کے لیے نامزد کیا، محمد علی نے اپنے عقیدے کا کانگریس کی صدارت کے زمانے میں بہ بانگِ دہل اعلان کیا کہ وہ ایک فاسق وفاجر مسلمان کو بہ حیثیت مسلمان کے گاندھی جی سے کہیں اعلیٰ وارفع سمجھتا ہے! یہ اعلان تھا، یا ایک ہنگامۂ متحرک؟ ہندوستان کے اِس سرے سے اُس سرے تک ایک آفت برپا ہوئی۔

جلسے ہوئے، تجویزیں پاس ہوئیں، اخبارات میں پُر زور ''لیڈنگ آرٹیکل'' نکلے، سب ہی کچھ ہوا

مگر محمد علی اپنے خیال پر قائم تھا۔ اُس کا جواب صرف یہ تھا کہ بحیثیت مسلمان کے مجھے یہی کہنا چاہیے، اور اگر گاندھی جی پکے اور سچے ہندو ہیں تو انھیں میرے متعلق ایسا ہی سمجھنا چاہیے، سیاست میں اُن کی عظمت و بزرگی مسلم، لیکن مذہب کے معاملے میں میرے نقطۂ نظر سے اُن کی گمراہی بالکل غیر مشتبہ۔

صرف اِسی پر محمد علی نے اکتفا نہیں کیا بلکہ خلوت میں اور جلوت میں علی الاعلان اِس کا اظہار کیا کہ کاش! گاندھی جی مسلمان ہو جاتے۔

مرشد سے اختلاف:

ایک مرید کے لیے مرشد کی ہر بات آیت و حدیث کا درجہ رکھتی ہے۔

محمد علی کو فرنگی محل کے مشہور صاحبِ طریقت بزرگ مولانا عبدالباری مرحوم سے بیعت حاصل تھی۔ مولانا مرحوم، محمد علی پر بالخصوص اپنی نوازشات اور عنایات کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

تسلطِ سلطان ابن سعود کے سلسلے میں مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کا اُس گروہ سے تعلق تھا جو شروع ہی سے سلطان ابن سعود کا شدید مخالف چلا آرہا تھا، محمد علی اُس جماعت کے سردار تھے جو سلطان کی حامی تھی اور توقع رکھتی تھی کہ اگر اُن میں کچھ نقائص ہیں تو وہ دُور ہو جائیں گے۔

یہ اختلافِ خیال بدقسمتی سے بڑھتے بڑھتے مخالفت تک جا پہنچا، اس لیے کہ مولانا مرحوم کو علی برادران کے خلاف خوب بھڑکایا گیا۔ مولانا مرحوم بعض اگلے بزرگوں کی طرح حد درجہ سادی طبیعت کے مالک تھے، اس لیے اِن اندرونی سازشوں سے متاثر ہونا قدرتی تھا۔ لیکن محمد علی متاثر نہیں ہوئے، اُنھوں نے اپنے مرشد کا پورا ادب و احترام قائم رکھا، اِسی کے ساتھ نہ صرف یہ کہ اُن کی رائے کی مخالفت کی بلکہ اپنا نقطۂ نظر اپنی مشہور و قابلِ رشک سرگرمی کے ساتھ سارے ہندوستان کے سامنے پیش کیا اور منوایا۔ محض اس لیے کہ اُن کو یقین کامل تھا کہ حق اُنھیں کے ساتھ ہے۔

جمعیۃ العلماء میں ایک اُمی کی تقریر:

علماء کی جماعت پر محمد علی کے بے شمار احسانات ہیں۔ بعض برگزیدہ علمائے کرام کے علاوہ اکثر بزرگ صحیح دینی خدمت دینا بے زاری ہی سمجھتے تھے، لیکن محمد علی ہی کی جاذبِ اثر شخصیت تھی جس نے اُن

حضرات کو مسجد کے حجروں سے اور تصوف کی خانقاہوں سے نکالا تھا اور بتایا تھا کہ اسلام کی خدمت کا طریقہ صرف بوریہ قناعت پر بیٹھ ''الدنیا جیفه '' کی تعلیم دینا نہیں ہے، بلکہ موجودہ وقت میں اسلام کی اہم ترین خدمت سجن وزنداں کے مصائب ونوائب کا مقابلہ کرنا ہے۔

اور یہی نہیں کہ محمد علی نے اُنھیں محض خوش گو واعظ سے تبدیل کر کے ماہرین سیاست بنادیا ہو، بلکہ یہ بھی کیا کہ اُنھیں بتایا کہ علماء کے فرائض کیا ہیں، اُن کی ذمے داریاں کیا ہیں، اُن کے وظائفِ حیات میں کون چیز داخل ہونی چاہیے؟ اُنھوں نے اجتہاد و تفقہ فی الدین کا دروازہ بند سمجھ لیا ہے، لیکن ضروریاتِ جدیدہ کا دروازہ کھلا ہے، اور جب تک وہ کھلا ہے اُنھیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ اگر انھوں نے غفلت وسہل انگاری سے کام لیا تو ہم جیسے عامی وامی اس کام کو کریں گے۔

مراد آباد میں جمعیۃ العلماء کا سالانہ جلسہ ہوا، اطراف واکنافِ ہند کے تقریباً تمام مشہور علماء موجود تھے۔ محمد علی نے اُس مجمع علماء میں ایک تاریخی تقریر کی جو بہت طویل ہے، لیکن اُس کے چند اہم ترین اقتباسات یہ ہیں:

''میں علمائے کرام سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ حضرات اپنے منصبِ گرامی کی رفعت کو اور اہمیت کو پوری طرح ادا کرتے تو ناممکن تھا کہ قوم کی حالت اتنی خراب ہوتی۔ آپ حریمِ اسلام کے دربان ہیں! اگر عاقبت میں ہمارے درّے لگیں گے تو یہ نہ سمجھئے کہ آپ بچ جائیں گے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ہم 25 کے مستوجب ہوں گے تو شاید آپ 75 کے مستحق ٹھہریں گے، اس لیے کہ آپ پر ہم سے کہیں زیادہ ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ آپ کا کام فقط یہی نہیں ہے کہ لوگ داڑھی رکھتے ہیں یا نہیں، اِس سے بڑا اور اِس سے زیادہ عظیم الشان کام امراء سے لے کر غرباء تک مسلمانوں کے تزکیہ نفس کا ہے اور اُن کی اصلاحِ اخلاق کا۔ علماء کو دینی مدارس کی اصلاح کرنی چاہیے، اس طرح کہ ہم دینی علوم بھی حاصل کر سکیں اور دُنیا کے کاروبار کے لیے بھی تیار ہو جائیں، اس کے لیے اُن کو علوم دینی، نصابِ تعلیم اور

طریقۂ تعلیم کی از سرِ نو جانچ کرنا پڑے گی اور دیکھنا ہوگا کہ وہ کیا چیز ہے جس کو وہ دین کے نام سے سکھاتے ہیں۔ میں داڑھی کے رکھنے کے قائل ہوں اور خود دلیلیں کتروانا ہوں اور اس وضع قطع کو پسند کرتا ہوں، جو رسول اللہ ﷺ کی تھی لیکن ہمارے علماء کو لحی وشوارب ہی کے جھگڑوں میں نہ پھنس جانا چاہیے، ان کا کام فقط ظاہر کو دیکھنا نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ ضروری فکر باطن کی ہے۔

ہمارے باطن درست تو ہماری ظاہری شکل وصورت خود درست ہو جائے گی، میں علماء سے شکایت کرتا ہوں کہ اُنھوں نے ڈاڑھی منڈوں کو نیچری اور کافر سمجھ کر چھوڑ دیا، علماء کا کام فقط اچھوں کی صحبت میں رہنا نہیں ہے۔ اُن کو تو چکلوں اور شراب خانوں تک میں جا کر اُن کی اصلاح کرنی ہے، رسول اللہ ﷺ مسلمانوں میں مبعوث نہیں ہوئے تھے، بلکہ کفار میں مبعوث ہوئے تھے اور آپ ﷺ نے اُنھیں کا تزکیہ نفس کیا تھا۔ ہم چاہتے ہیں علماء سب سے پہلے اصلی سرچشمۂ ہدیٰ کی طرف جائیں۔ میں غیر مقلد نہیں ہوں، حنفی ہوں! لیکن ساتھ ہی ساتھ میرا یہ عقیدہ ہے کہ کسی مسئلہ میں مجھ جیسا جاہل بھی شاید صحیح ہو اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ اور عالم نے غلطی کی ہو۔ اس لیے میرے لیے ضروری ہے کہ میں خود بھی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف جاؤں۔ میں آپ سے جدت کا طالب نہیں ہوں، میں تو خود دین میں بدعت کو ضلالت سمجھتا ہوں اور اسی لیے کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی طرف نہ کہ صرف فقہ حنفی کی طرف، مسلمانوں کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

میں نئے تعلیم یافتوں کی دِلی حالت آپ سے چھپاؤں گا۔ اگر یہ نہ کہوں کہ آپ میں سے اکثر افراد کو یہ گروہ رحل کی ایک چوبِ خشک سمجھتا ہے، لیکن آپ وہ رحل ہیں جس پر خدا کا قرآن رکھا ہوا ہے، اس لیے ہم اُس رحل کو ٹھکراتے نہیں بلکہ عظمت کرتے ہیں۔ لیکن آپ کی عظمت ایک حامل شریعت جماعت کی حیثیت سے ہونا چاہیے اور

ہوگی، اگر آپ شریعت کی صحیح تعلیم دیں، خود اس پر چلیں اور ہم سب کو اس پر چلائیں۔"

حق وصداقت کی یہ آواز در و دیوار میں گونج رہی تھی، علماء کا ایک گروہ جھوم رہا تھا کہ آج ہماری راہنمائی کی گئی، لیکن علماء ہی کا ایک دوسرا گروہ بھی تھا جس کی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں!

سوراج پارٹی پر تنقید:

اپنی کانگریس کی صدارت کے زمانے میں محمد علی کی سوراج پارٹی کے ساتھ کیا روش رہی، اس کا ذکر کسی مناسب موقع پر ہے۔ اس جگہ محمد علی کی وہ صحیح اور بے باکانہ نکتہ چینی پیش کرنا مقصود ہے جو محمد علی نے سوراج پارٹی پر اُس زمانے میں کی تھی جب وہ پکے کانگریسی تھے اور مسلمانوں میں بدنام کہ ہندوؤں کے پٹھو ہیں۔

واقعہ یہ ہوا تھا کہ صوبۂ سرحد (اُس زمانے میں سرحد کو "سرزمین بے آئین" کہتے تھے، وہاں چیف کمشنر کو جملہ اختیارات حاصل تھے) کا، نیز تمام مسلمانانِ ہند کا یہ متفقہ مطالبہ تھا کہ سرحد کو بھی وہی آئینی حقوق حاصل ہوں جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں۔ کانگریس بھی اِس مطالبے کی حامی تھی لیکن ہندو مہاسبھا اس کی سخت مخالف تھی۔ چناں چہ فروری 1926ء میں جب یہ مسئلہ اسمبلی میں پیش ہوا تو لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مالویہ نے اس کی تند و ترش لہجے میں مخالفت کی اور تعجب کے ساتھ یہ دیکھا گیا کہ سوراج پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو نے نہ صرف یہ کہ مخالفت کی بلکہ اپنی پارٹی کو حکم دیا کہ وہ بھی اس مطالبہ کی مخالفت کرے۔

مسلمان ممبرانِ سوراج پارٹی کی دو جماعتیں ہوگئی تھیں، ایک وہ جس نے اس حکم کو تسلیم کیا اور صوبہ سرحد کے عطائے اصلاحات کے معاملہ میں مخالفت کی، دوسری وہ جماعت تھی جس نے سوراج پارٹی کی "مسولینی" کا یہ حکم تسلیم نہیں کیا اور اس سے مستعفی ہونے والوں میں قابلِ ذکر مولانا شفیع داودی (مشہور خلافتی کارکن) اور سیّد مرتضیٰ بہادر (مجلس خلافت کے صدر) ہیں، یہ دِل شکن سین دیکھنے اسمبلی ہال میں محمد علی بھی اپنی سخت علالت کے باوجود گئے تھے، واپسی پر تاثراتِ ذیل اُن کے قلم سے "ہمدرد" کے

صفحات پر منتقل ہوئے۔

''برادرانِ وطن کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ اُن کے تعصب نے اُن کے دُشمنوں کو نہیں بلکہ مجھ جیسے اُن کے دوستوں کو کس قدر صدمہ پہنچایا ہے، لیکن اگر پنڈت موتی لال یا سوراج پارٹی کے اور ارکان یہ تصور کرنے لگیں کہ (مسلمانوں کی) یہ مدد ہر حال میں جاری رہے گی، خواہ مسلمانوں کے ساتھ کتنی ہی ناانصافی کیوں نہ برتی جائے تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی امداد کے متعلق اُن کا تخمینہ کیا ہے؟''

ابن سعود کے سامنے:

موتمر کی شرکت کے لیے جب محمد علی مکہ معظّمہ گئے ہیں تو انھوں نے اس کی کوشش کی کہ سلطان ابن سعود کو اُن کے وعدے یاد دلا کر سمجھائیں کہ وہ اپنا اعلانِ ملوکیت واپس لے لیں، لیکن سلطان کو دوسرے لوگ اِس طرح متاثر کر چکے تھے کہ وہ اِس مشورے کو ماننے پر تیار نہیں ہوئے۔

محمد علی کے نزدیک ملوکیت اتنا سنگین جرم تھا کہ کبھی بھی معاف نہیں ہو سکتا تھا، اب بھلا وہ کیسے خاموش رہ سکتے تھے؟ موتمر کے بھرے جلسے میں ابن سعود کی موجودگی میں ایک گدائے بے نوا نے ایک سلطانِ وقت کو للکارا کہ تم محمد رسول اللہ ﷺ کے محترم جانشینوں کی پیروی نہیں کر رہے ہو بلکہ قیصر و کسریٰ کی سنت پر عمل کر رہے ہو۔

محمد علی کی اِس تقریر پر ہر شخص انگشت بدنداں تھا۔ اس پر خود سلطان کو ناگواری ہوئی اور وہ جلسے سے اُٹھ گئے، لیکن محمد علی نے اپنے اِس اعلان کو برابر جاری رکھا۔ موتمر کے اجلاس میں، مسجد حرام کے حدود کے اندر، غرض جب کہیں بھی اُنھیں موقعہ ملا، وہ اپنے اِس اعلان سے باز نہیں آئے کہ یہ قیصر و کسریٰ کی سنت ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی نہیں۔

وائسرائے کے سامنے:

ساردا بل کو مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت مداخلت فی الدین سمجھتی رہی، مولانا محمد علی اس جماعت کے قائد تھے۔ پہلے اس مسئلہ کو آئینی طور پر اُنھوں نے حل کرنا چاہا، یعنی وائسرائے (لارڈ ارون، جو

اَب لارڈ ہالی فیکس کے نام سے مشہور ہیں اور فی الحال امریکہ میں برطانیہ کے سفیر ہیں) کے پاس ایک وفد لے گئے۔ وفد میں علماء، وکلاء، گورنمنٹ کے خطاب یافتہ اور گورنمنٹ کے مخالف گروہ کے لوگ شامل تھے، اور مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ وائسرائے نے اِس بل سے مسلمانوں کو مستثنٰی کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ محمد علی نے اُسی وقت رئیس وفد کی حیثیت سے وائسرائے سے کہہ دیا:

''اب ہماری آپ کی جنگ ہوگی اور صلح وسلام کا خاتمہ ہے۔''

وائسرائے نے کہا:

''مجھے اُمید ہے کہ آپ کی جنگ آئینی ہوگی، اور حدودِ قانون کے اندر۔''

محمد علی نے بپھر کر جواب دیا:

''خدائی قانون کی اطاعت مجھ پر فرض ہے اور اُسی کی اطاعت میں کروں گا۔ اگر اُس کی بجا آوری میں لارڈ اروِن کی حکومت کے قوانین مانع آتے ہیں تو مجھے اُن کی کوئی پروانہیں ہے اور میں قطعاً اُن کا کوئی خیال نہیں کروں گا۔''

واپس آکر کئی بار اُنھوں نے اِس قانون کی خلاف ورزی حکومتِ ہند کے دارالسلطنت دہلی میں کی، لیکن حکومت کو ہمت نہ ہوئی کہ اُنھیں گرفتار کرتی یا اُن کے خلاف قانونی کارروائی کرتی۔

رنگون میں گاندھی جی سے ملاقات:

نہرو رپورٹ کے ہنگامے بعد جب 1929ء میں محمد علی تبادلہ آب وہوا کے لیے رنگون گئے تو خوبیٔ اتفاق سے گاندھی جی بھی وہاں کا دورہ کر رہے تھے۔ اتفاقاً ایک جگہ دونوں کو مشترکہ طور پر سپاسنامہ دیا گیا جس میں دونوں حضرات کے ملکی وملّی خدمات پر تبصرہ کیا گیا تھا۔

سپاسنامہ کے جواب میں گاندھی جی نے اپنی تقریر میں محمد علی کا تذکرہ بھی کیا، اور کہا کہ اب آپ لوگ پھر اکثر ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھا کریں گے۔ محمد علی نے اُسی وقت جوابی تقریر میں گاندھی جی کی اِس تقریر کا جواب دیا اور کہا کہ یہ غلط ہے کہ ہم دونوں ساتھ رہا کریں گے، یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک گاندھی جی اپنی روش نہ تبدیل کرلیں۔

گول میز کانفرنس:

گول میز کانفرنس میں محمد علی نے جیسی بصیرت افرا اور ایمان افز تقریر کی ہے، وہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ اُس تقریر پر علیحدہ بحث ہوگی، یہاں اُن کی تقریری کا صرف ایک مختصر ترین حصہ پیش کرنا مقصود ہے تا کہ وہ لوگ جو آخر میں محمد علی کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے کہ وہ برطانوی ''امپیریلزم'' کے حامیوں میں ہیں، غور کرسکیں کہ محمد علی کے حلق کے نیچے یہ لقمہ اُتر ہی نہیں سکتا تھا۔

محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا:

> ''میں طبعاً اور عقیدتاً جمہوریت پسند واقع ہوا ہوں، میرے نہاں خانۂ تصورات میں شاہوں اور شاہزادوں کا بالکل وجود نہیں ہے۔''

کراچی میں:

اِس عنوان کو ختم کرنے سے پیشتر اگر آپ کے سامنے محمد علی کی وہ تنبیہ بھی پیش کر دی جائے جو اُنھوں نے کراچی کے مجسٹریٹ کو کی تھی تو شاید غیر مناسب نہ ہوگا۔

> ''اگر گورنمنٹ اپنے موجودہ روّیہ پر مُصر رہی تو مجھے تو اِس کا وہی حشر معلوم ہوتا ہے جو اِس سے قبل بڑی بڑی باطل اور مصر جیسی عظیم الشان سلطنتوں کا ہو چکا ہے، جن کو خدا کی ہمسری کا دعویٰ کرنے پر ایک حقیر مچھر اور دریا کی موج کافی ہوئی۔''

❁❁❁

باب ۸

تدبر

ہندوستان کے زعماء کی نہایت آسانی کے ساتھ دو قسمیں کی جا سکتی ہیں، ایک تو وہ جو بس لیڈر ہو گئے اور دوسرے وہ افراد جنہوں نے اپنے ذہنی و دماغی خصوصیات، اخلاقی صفات اور عملی خدمات کے اعتبار سے ملک و قوم کے دل میں اپنی جگہ پیدا کی ہے۔ محمد علی کا شمار اسی دوسری قسم سے تھا، اُنہوں نے اپنے آپ کو کسی کا مقلد نہیں بنایا نہ گرمی بازار دیکھ کر وہ کسی تحریک میں شریک ہوئے۔ بلکہ جس تحریک میں وہ شریک ہوئے، اس میں گرمی بازار پیدا محمد علی کی ذات سے ہوئی۔

وہ اپنے دل و دماغ کے مالک تھے، اس لیے وقت کے ہر ''اہم'' اور ''غیر اہم'' مسئلہ پر وہ خود رائے قائم کرتے تھے اور اس کے بعد دوسروں کے سامنے اسے استقلال و ثبات عزم کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے ضمیر و بصیرت کے خلاف رائے عامہ کی پروا نہیں کی، نہ رائے عامہ سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی رائے میں کبھی تبدیلی کی، بلکہ ہمیشہ وہ اس کے کوشاں رہے کہ رائے عامہ میں وہ خود تبدیلی کریں اور رائے عامہ کو اپنا ہم خیال بنائیں۔

اس سلسلہ میں ان کو جتنی مخالفتوں اور شورشوں کا مقابلہ کرنا پڑا، وہ محمد علی ہی کا دل تھا کہ اس نے برداشت کیں، ورنہ اور کوئی ہوتا تو ایسے نازک مواقع پر گوشہ عافیت تلاش کرتا اور عزلت گزیں ہو جاتا یا اپنے تئیں ''چھٹا ہوا کارتوس'' کہتا اور ایک تماشائی کی حیثیت سے فضا کے درست ہونے کا انتظار کرتا۔

ایک خط:

چنانچہ محمد علی اپنے ایک خط میں جو پنجاب کے ایک لیڈر کو لکھا گیا تھا، لکھتے ہیں:

''میں نے نہیں دیکھا کہ تم نے ہمت وجرأت کے ساتھ کبھی بھی اس رائے سے اختلاف کیا ہو جو رائے عامہ سمجھی جاتی ہے، حالانکہ ایک مصلح کو یہ بھی کبھی کبھی کرنا پڑتا ہے۔''

محمد علی نے ایک ''مصلح'' کی حیثیت سے کبھی کبھی نہیں، اکثر وبیشتر ایسا کیا اور کامیاب بھی ہوئے۔

کتاب راجپال:

جسٹس دلیپ سنگھ نے اپریل 1927ء میں اپنے مشہور فیصلہ میں جب راجپال کو بری کر دیا تو پنجاب میں اِک آگ لگ گئی۔ ہر شخص اس سے متاثر تھا اور دلیپ سنگھ کی مذمت میں مصروف۔ چونکہ پنجاب ہی سے وہ کتاب شائع ہوئی تھی اور پنجاب ہائی کورٹ ہی سے وہ بری کیا گیا تھا، اس لیے قدرتاً پنجاب والے بہت برہم ہوئے۔ چنانچہ سب سے پہلے پنجاب کے ''مسلم آوٹ لک'' نے اِس فیصلہ پر شدید نکتہ چینی کی اور دلیپ سنگھ سے مطالبہ کیا کہ ''فوراً مستعفی ہو جاؤ''۔ گورنمنٹ پنجاب نے توہین عدالت کے الزام میں مدیر ''مسلم آوٹ لک'' پر مقدمہ چلایا اور مدیر، طابع، ناشر سب کو سزا دے دی۔

اِس فیصلہ نے اور زیادہ مسلمانوں میں اشتعال پیدا کیا۔ اب پنجاب کے اخبارات کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے اخبارات بھی اس مطالبہ کے ہمدرد ہو گئے اور یہی مطالبہ کرنے لگے کہ دلیپ سنگھ مستعفی ہو جاؤ۔ چنانچہ پنجاب سے باہر دوسرا اخبار ''مدینہ'' تھا جو اِس زد میں آیا۔ اب نوبت اخبارات تک نہیں بلکہ اشخاص پر بھی پہنچی اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، غازی عبدالرحمٰن اور بعض دوسرے احرار پنجاب بھی ماخوذ ہوئے اور آخر سزایاب بھی ہوئے۔

محمد علی نے اس نازک موقعہ پر رائے عامہ کی مخالفت کی اور اعلان کیا:

''قصور قاضی کا نہیں، قانون کا ہے۔''

اِس رائے کا ظاہر ہونا تھا کہ سارا اسلامی ہند آتش زیر پا کر دیا گیا کہ محمد علی اتنے مسلم آزار، ... پرست اور گورنمنٹ دوست ہیں کہ توہین رسولِ اکرم ﷺ پر بھی اپنی ذہنیت سے باز نہیں آتے۔ ... چلتی ہوئی تھی، عوام کے دل خوف وغصہ سے بھر دیئے گئے تھے اور بعض حریف تو خار کھائے محمد علی پر ...

ہوئے تھے۔ اُن کی اِس رائے کے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا گیا اور جتنے اتہامات لگائے جا سکتے تھے سب لگائے گئے لیکن محمد علی ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے اِن تمام مخالفتوں اور شورشوں کا جواں ہمتی کے ساتھ مقابلہ کیا اور یہی کہتے رہے کہ قصور قانون کا ہے قاضی کا نہیں، اس لیے کہ قانون حقیقتاً اتنی لچک موجود ہے کہ راجپال سا مجرم چھوٹ سکتا ہے، لہٰذا ہماری کوششوں کا منتہائے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک جدید قانون کا اضافہ کرائیں نہ یہ کہ دلیپ سنگھ کو مستعفی ہونے پر مجبور کریں۔ آج دلیپ سنگھ کو تم مستعفی ہونے پر مجبور بھی کر دو لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل اُن کی جگہ پر جو دوسرا جج آئے گا، وہ یہی فیصلہ نہیں دے گا جبکہ اس کی گنجایش قانون میں موجود ہے۔ لہٰذا اگر حقیقتاً تمہارے قلوب توہین رسول ﷺ سے متاثر ہیں تو قانون بدلواؤ تا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایسی گندہ ذہنیوں کا استیصال ہو جائے۔

شروع شروع میں محمد علی کی اس رائے کی سخت مخالفت ہوئی اور اُن کے بڑے بڑے رفقاء سخت برہم ہوئے، اور نہایت دل شکن خطوط لکھے۔ لیکن آخر میں سب نے محمد علی کی بارگاہِ سیادت میں گھٹنے ٹیکے۔ سب نے اُس کے نظریہ سے اتفاق کیا اور سب نے قانون بنوانے پر زور دیا۔

ہنگامہ نجد وحجاز:

اِسی طرح آویزشِ نجد و حجاز کے زمانہ میں اسلامی ہند فوراً دو ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک وہ جماعت تھی جو کہتی تھی ابن سعود قابل دار ہے اور دوسرا وہ گروہ تھا جو اسے تائید وحمایت کا سزاوار سمجھتا تھا۔ لیکن محمد علی نے اس فضائے عام کو بدلا اور کہا:

''مخالفت ہر وقت ہو سکتی ہے، لیکن اس موقعہ پر سلطان کی حمایت کر کے حجاز کو اور اسلامی مفاد کو جو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے، وہ پھر نہیں حاصل ہو سکتا، اور واقعات بتاتے ہیں کہ اگر کوئی ایک مشہور ''ٹولی'' نے ابن سعود کو جادۂ حق سے گمراہ کرنے کی سعی مسلسل نہ کی ہوتی تو بلاشبہ آج حجاز پر مؤتمر عالم اسلام کا پرچم لہرا رہا ہوتا اور ابن سعود بجائے ''ملک الحجاز ونجد وملحقاتہا'' کے، تمام عالم اسلام کے قلوب کا حکمراں ہوتا۔''

قتل مرتد:

قتل مرتد کے مسئلہ میں بھی محمد علی نے نہایت بصیرت اور تفقہہ وتدبر کے ساتھ صرف عوام ہی کی نہیں بلکہ علماء کرام کی مخالفت کی، چنانچہ اپنے ایک خط میں جو ''قیصر کے ایک مدح خواں'' کو لکھا گیا تھا، لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالباری صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب کو لکھ رہا ہوں کہ بجائے علماء کرام کی طرح سب وشتم کے اور تکفیر کے تمام احادیث کو جمع کیجیے، اور سب فقہا کے استدلال کو بھی پیش کیجیے۔ قرآن سب سے پہلے رکھیے، پھر تفاسیر، پھر احادیث، پھر فقہاء کی راؤں کو، پھر بحث فرما لیجیے۔ انشاء اللہ یہی رائے صحیح نکلے گی کہ قتل مرتد لا اکراہ فی الدین کے منافی اور حرام ہے، البتہ قتل محارب جائز اور بسا اوقات فرض ہے۔''

مسئلہ اقلیت:

ہندوستانی سیاسیات میں سب سے زیادہ مختلف فیہ مسئلہ اقلیتوں کا ہے۔ اکثریت ابھی تک اس پر آمادہ نہیں ہوئی کہ وہ اقلیتوں کی حفاظت وصیانتِ حقوق کا کوئی تسلی بخش فیصلہ کر سکے، لیکن محمد علی نے اس مسئلہ پر بھی اپنے غور وفکر سے ایک نئی راہ نکالی۔ ایک تو اُنہوں نے انتخابات کے لیے ہر فریق کے افراد کو جو اُمیدوار ہوں، اِس کا پابند بنانا چاہا کہ وہ اُس وقت تک منتخب نہ سمجھے جائیں جب تک دوسری ملت کی ایک چوتھائی رائے نہ حاصل کر لیں۔ اِس طرح سے گویا محمد علی نے اِس کا فیصلہ کر دیا کہ کسی مجلس قانون ساز میں کوئی ایسا شخص جا ہی نہیں سکتا ہے جو ہر دو اقوام ہند کا معتمد علیہ نہ ہو۔ اِس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمیشہ ایسے افراد منتخب ہوں گے جو صحیح سیاسی ذہنیت رکھتی ہوں گے اور ایسے لوگ جنہوں نے فرقہ بندی کی آگ کو ہوا دی ہے، اُن کو ہمیشہ ناکام ونامراد رکھنا پڑے گا۔

دوسرا طریقہ:

اس قابل اطمینان تجویز کے بعد اُنہوں نے اقلیتوں کی حفاظت کا ایک نہایت مفید طریقہ پیش کیا،

یعنی ہندوستان کے کسی ایک مقام پر مسلمان مجموعاً اور مجتمعاً آباد نہیں ہیں بلکہ تمام صوبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کسی صوبہ میں وہ 4 فیصدی ہیں، کسی میں 10 فیصدی ہیں اور کسی صوبہ میں وہ 90 فیصدی ہیں اور کسی صوبہ میں 58 فیصدی۔ یعنی بعض صوبوں میں اقلیت کی اکثریت ہے اور اکثر میں اکثریت کی۔ تو اگر ہندوستان میں درحقیقت صلح وسلام کی فضا پیدا کرنا ہے تو بہترین لائحۂ عمل یہ ہے:

''ایک ہی ملت ہر جگہ اقلیت میں نہ رہے، کہیں ایک کی اقلیت ہو تو کہیں دوسری کی۔''

یہ صورت ایسی ہے کہ ہر صاحبِ اکثریت مجلس قانون ساز مجبوراً اور فطرتاً دوسری اقلیت کا لحاظ کرے گی اور اگر نہیں کرے گی تو دوسرے صوبوں میں اُس کی ہم قوم اقلیت کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو وہ دوسری قوم کی اقلیت کے ساتھ کر رہی ہے۔

محمد علی کی یہ اسکیم اگر عمل پذیر ہوسکتی تو یقیناً ایک بہترین ضمانت اور دستاویز صلح کا کام دے سکتی تھی لیکن افسوس ہے کہ مخصوص مصالح کی بنا پر نہ کانگرس اسے تسلیم کر سکی اور نہ مسلم کانفرنس اور نہ خلافت کانفرنس نے اسے مطالبہ کی صورت میں پیش کیا۔

پہلے کیا؟

1928ء میں ایک بار پھر استرادادنہرو رپورٹ کے بعد اسلامی ہند میں یہ سوال بڑے زور شور سے گشت لگاتا رہا:

''تم پہلے کیا ہو، ہندوستانی یا مسلمان؟''

جن میں مذہبیت کے اثرات زیادہ تھے اُنہوں نے اعلان کرنا شروع کیا:

''ہم پہلے مسلمان ہیں، پھر ہندوستانی۔''

جو لوگ کانگرس کی وطنی تحریک سے دلچسپی و ہمدردی رکھتے تھے، اُن میں سے اکثر نے کہا:

''ہم پہلے ہندوستانی ہیں، پھر مسلمان۔''

بعض مصلحت شناس حضرات ایسے تھے کہ خاموش رہے، لیکن محمد علی نہ خاموش رہا اور نہ اُس نے مقدم الذکر دونوں جماعتوں کی ہم آہنگی کی۔ اُس نے کہا:

''میں مذہبی معاملات میں اوّل و آخر مسلمان ہوں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں، اور ہندوستانی معاملات میں اوّل و آخر ہندوستانی ہوں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''

بلاشبہ یہ الفاظ اُسی شخص کی زبانِ حق ترجمان سے نکل سکتے تھے جس کا عمل بھی قول سے ہم آہنگ ہو، جس کا دِل ہندوستان کے معاملات پر بھی سب سے زیادہ بے قرار ہو جاتا ہو اور جس کی روح عالم اسلام کے حادثات پر بھی تڑپنے لگتی ہو، اور کم از کم ہندوستان میں ایسا جامع الصفات صرف محمد علی تھا اور کوئی نہیں۔ اُس نے جو کچھ کہا اُسے کر کے دکھایا۔ اُسے ہندوستان سے عشق تھا اس لیے ہندوستان کے لیے اُس نے ہر مصیبت اور ہر تکلیف کا بہ خندہ پیشانی مقابلہ کیا۔ اسے عالم اسلام سے الفت تھی، اس لیے دُنیائے اسلام کے ہر حادثہ پر محمد علی کے تمام قوائے عمل میں ایک لہر دوڑ دوڑ گئی۔

❁❁❁

باب ۹

کردار

ہندوستان میں محمد علی سے زیادہ کوئی جنگ جو زعیم مشکل سے پیدا ہوا ہوگا۔ جب کبھی اُنہوں نے یہ دیکھا کہ باطل حق سے ٹکرا رہا ہے تو اُنہوں نے ذاتی تعلقات، خاندانی تعلقات اور سیاسی تعلقات کی مطلق پروا نہیں کی اور شمشیر بے نیام بن کر ہمیشہ وہ باطل کے سر پر صاعقۂ جانسوز بن کر چمکتے رہے۔ اُن کی زندگی تمام تر ''الحبّ للہ ، والبغض للہ'' کا ایک مکمل نمونہ تھی۔

لیکن باایں ہمہ اسلامی اخلاق و محبت کا سرچشمہ بھی اس کے سینہ میں لہریں لے رہا تھا۔ گو وہ مخالفت سے کبھی باز نہیں آئے لیکن دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ اپنی زبردست اور مسلمہ مخالفت کے باوجود اپنے بڑے سے بڑے مخالف کی بھی موقعہ پر اُنہوں نے ہمدردی کی، غمگساری کی اور حمایت کی۔

خواجہ حسن نظامی کا واقعہ:

خواجہ حسن نظامی صاحب اور محمد علی کی مشہور عالم مخالفت اور سخت ترین مخالفت سے ایک زمانہ واقف ہے۔ محمد علی نے اُن کی سیاسی اور تبلیغی زندگی پر سخت سے سخت نکتہ چینی کی لیکن جب خواجہ صاحب پر ایک وقت ایسا پڑا کہ اپنے بیگانے ہو گئے، خواجہ صاحب کے رسوخ اور اثر کے باوجود حکام اور گورنمنٹ نے نظریں پھیر لیں تو وہ محمد علی ہی تھا جو خواجہ صاحب کا حامی بن کر میدان میں آیا۔ اجمال کی تفصیل یوں ہے:

خواجہ حسن نظامی صاحب اپنے موٹر پر شام کو دہلی سے نظام الدین واپس آ رہے تھے جب اپنے مکان کے پاس پہنچے تو کسی شخص نے مسلسل پستول سے فائر کرنا شروع کیے۔ حسن اتفاق سے خواجہ صاحب

تو بچ گئے لیکن ان کے خسر صادق صاحب یا ''بھائی سنولیا'' پر گولیاں پڑیں اور بالآخر وہ انتقال فرما گئے۔

محمد علی اس وقوعہ کے روز تنازعاتِ دیوبند کے سلسلہ میں دیوبند تشریف رکھتے تھے، وہیں اُنہوں نے اِس واقعہ کو سنا اور فوراً ایک تار خواجہ صاحب کو دیا جس میں اپنی عمیق قلبی ہمدردی کا اظہار کیا۔ دوسرے روز واپسی پر وہ بہ نفس نفیس خواجہ صاحب کے دولت کدہ پر گئے اور اُن سے زبانی تعزیت کی رسم ادا کی اور اُنہیں تسکین و تسلی دی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب بھی اُن کی اِس روش سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنے روز نامچہ میں ''مسٹر'' محمد علی کو ''مولانا'' لکھ کر اُنہوں نے اپنی دِلی شکر گزاری کا اظہار کیا۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا ہے، بلکہ آگے بڑھتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اِس معاملہ کی تفتیش کرانی چاہی اور جس شخص پر شبہ تھا، اُسے گرفتار کرا کے قانونی کارروائی کرانی چاہی۔ لیکن نہ معلوم کیوں پولیس نے تغافل اور تساہل سے کام لینا شروع کیا؟ خواجہ صاحب پولیس کی اِس روش سے سخت ملول اور رنجیدہ تھے، اُنہیں اپنی جان کا بجا طور سے خطرہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن پولیس تھی کہ وہ کوئی اقدام کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتی تھی۔

اِس حالت میں محمد علی اگر چہ اُس وقت تک پکے ''نوچنیجو'' تھے، لیکن پھر بھی اُنہوں نے ٹیلیفون پر گھنٹوں دہلی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو سرزنش کی اور اِس معاملہ میں پولیس کے تغافل کی سخت شکایت کی اور اُس کے اِس طرزِ عمل سے جو عواقب و نتائج پیدا ہونے والے تھے، اُن سے اُسے آگاہ کیا۔ محمد علی کی اِس بروقت تنبیہ سے پھر پولیس میں کچھ عرصہ کے لیے ایک حرکت پیدا ہو گئی۔

دوسرا واقعہ:

اِسی طرح سوامی شردھانند کو دسمبر 1926ء میں جب ایک مسلمان نے قتل کر ڈالا تو سارے ہندو پریس نے اس فعل کو شخصی نہیں بلکہ کسی گہری ''سازش'' کا نتیجہ بتایا اور اِس گہری سازش کا اصلی کارکن سوامی جی کے مشہور حریف خواجہ حسن نظامی صاحب سے بڑھ کر اور کون ثابت کیا جا سکتا تھا؟ چنانچہ تمام ہندو اخبارات نے خواجہ حسن نظامی صاحب پر طرح طرح کی نکتہ آفرینیاں شروع کر دیں۔ یہ وقت بھی بہت نازک تھا اور چونکہ سوامی جی کا زخم ہندوؤں کے دِلوں پر ابھی تازہ تھا، اس لیے پورا اندیشہ تھا کہ کہیں

خواجہ صاحب پر بھی اس قسم کی کوئی ''خفیہ گہری سازش'' نہ شروع ہو جائے۔ اُس وقت بھی محمد علی کا ''ہمدرد'' تھا جس نے خواجہ صاحب کی حمایت کی اور کہا:

''یہ محض ظن باطل ہے کہ خواجہ صاحب کو اِس قسم کی مفسدانہ تحریکوں میں شریک سمجھا جائے۔''

ڈاکٹر کچلو کا ایک واقعہ:

1927ء کے اِندور کے مشہور فساد کے بعد مسلمان جس طرح بے دردی سے ہدفِ بغض و حسد بنائے جارہے تھے، ایک دُنیا کو اِس کا علم ہے۔ دہلی کے مشہور بیرسٹر مسٹر آصف علی ایک گرانقدر معاوضہ پر مسلمانانِ دہلی کی طرف سے اِندور بھیجے گئے تھے یا شاید بھیجے جانے کی تجویز تھی اور معاملات ''طے'' ہو رہے تھے۔ اُسی زمانہ میں ڈاکٹر کچلو صاحب مسلمان ملزمین کی پیروی اور صفائی کے لیے اِندور تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے جانے سے مسلمانوں کو بڑی تسکین ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ماخوذین و ملزمین سے ملاقات کی، بیانات سنے، شاہدوں پر جرح کی اور مقدمہ کی تیاری و ترتیب میں مشغول ہو گئے کہ دفعتاً بغتتاً اِندور کے ''مہاراجہ ہُلکر'' کا یہ حکم ڈاکٹر کچلو کو پہنچا کہ چوبیس گھنٹہ کے اندر اِندور خالی کر دیجیے۔

اب ڈاکٹر صاحب نے چاہا کہ اِندور سے نکل کر حدودِ ریذیڈنسی میں قیام فرما ہو کر اپنا کام جاری رکھیں، مگر یہاں بھی اُنہیں قیام کی اجازت نہیں ملی۔ مجبوراً وہ دہلی تشریف لائے اور محمد علی کو اپنی داستانِ درد سنائی۔ محمد علی اگرچہ تعلقات کی زنجیروں سے وابستہ تھے، یعنی اِندور سے اُن کے خاندانی تعلقات تھے اور پھر اُسی زمانہ میں اُن کے برادرِ نسبتی مسٹر معظم علی بیرسٹر ایٹ لاء، سابق پرنسپل ڈھاکہ لاء کالج، اُس ''ٹریبونل'' کے ایک رکن تھے جو ماخوذین کے انفصالِ مقدمات کے لیے بیٹھا تھا، لیکن اُن تمام تعلقات کی اُنھوں نے کوئی پروا نہیں کی اور اُسی وقت ایک ضمیمہ ''ہمدرد'' کا شائع کیا اور اُس میں ڈاکٹر کچلو کی حمایت کی اور حکومتِ اِندور کی حکمتِ عملی اور روش پر سخت نکتہ چینی کی۔ حالانکہ یہی محمد علی اُس زمانہ میں بھی ڈاکٹر کچلو کے سخت ترین مخالف تھے اور ڈاکٹر صاحب کی تحریک و تنظیم سے سخت بیزار اور اُن کی روش کو ہندوستان کے لیے سخت تباہ کن سمجھنے والے لیکن جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ حق ڈاکٹر کچلو کے ساتھ ہے تو

اپنی گزشتہ اور موجودہ اور آئندہ کسی مخالفت کی پروا نہیں کی، اُن کی حمایت کی اور حکومتِ اندور کی سخت مذمت۔

ڈاکٹر عالم کا ایک واقعہ:

ڈاکٹر محمد عالم اور اُن کی پارٹی سے صحیح معنوں میں ہم آہنگی تو محمد علی کو شاید کبھی بھی نہیں ہوئی، لیکن نہرو رپورٹ کے بعد سے اختلاف بہت زیادہ بڑھ گیا تھا اور بعض مرتبہ تو ناگوار صورتیں بھی پیش آجاتی تھیں۔

ایک بار ڈاکٹر عالم لاہور سے کسی اور جگہ ایک تقریب کے سلسلہ میں مع اپنے اہل وعیال ۔کے موٹر میں تشریف لے جارہے تھے۔ سوئے اتفاق کہ موٹر راستہ میں اُلٹ گئی۔ ڈاکٹر صاحب، اُن کی اہلیہ اور اُن کے صاحبزادہ سخت زخمی ہوئے اور اُن کے صاحبزادہ کے اتالیق صاحب تو اتنے زخمی ہوئے کہ جاں بر نہ ہو سکے۔ اُس حادثہ فاجعہ کا علم جب محمد علی کو ہوا تو وہ بے تاب ہو گئے اور اُسی روز مغرب کی نماز کے بعد ڈاکٹر عالم اور اُن کے متعلقین کے لیے جامع مسجد میں خود دُعا مانگی اور حاضرین سے آمین کہلوائی۔

ایک اور دعا:

پنجاب کے ایک دوسرے مشہور لیڈر کے لیے بھی محمد علی نے اپنی مجلس میں دعائیں مانگی تھیں کہ اُن کی اصلاحِ حال ہو سکے، چنانچہ محمد علی اپنے ایک مکتوب میں اُنہیں لکھتے ہیں:

> ’’میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے مولانا ابوالکلام کے لیے اور تمہارے لیے اور ایڈیٹر ’’سیاست‘‘ کے لیے جیل خانہ میں اکثر دُعا مانگی ہے اور جہاں اپنے لیے اصلاح کی دُعا کی ہے، وہاں تمہارے لیے اور اُن دونوں کے لیے بھی کہ خدا کرے آئندہ سب کے ساتھ مل کر کام کر سکیں۔ کسی کے کہنی مار کر آگے بڑھنے کا خیال دِل میں نہ لائیں، کسی کی پگڑی اچھالنے کی فکر نہ کریں۔ اپنے ہی کام سے اپنا نام چاہیں، دوسروں کی رسوائی سے اپنی شہرت کے خواستگار نہ ہوں۔‘‘

مہاراجہ بڑودہ کی حمایت:

ایک بہت نازک موقعہ پر محمد علی نے مہاراجہ بڑودہ کی حمایت کی تھی اور اُنہیں ایک نہایت سخت خطرہ سے نجات دلائی تھی۔ بہتر ہو کہ یہ داستان محمد علی کی زبان ہی سے سنئے:

''دہلی دربار کے موقعہ پر ایک نہایت سنگین اور خطرناک الزام مہاراجہ صاحب بڑودہ پر بادشاہ اور ملکہ کی اہانت کا لگایا گیا تھا۔ ملک بھر کے ایک اخبار نے بھی حق کی حمایت کی ہمت نہ کی اور تعجب ہے کہ کسی ہندو اخبار نے بھی آواز بلند نہ کی، مگر نہ حق نمک کے خیال سے بلکہ صرف حقِ حق کے خیال سے میں نے ہندوستان اور ولایت کے انگریزی اخباروں کا مقابلہ کیا اور لارڈ ہارڈنگ کے طرزِ عمل کو بھی ایک حد تک ذاتی غم وغصہ کا نتیجہ بتایا اور کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار نے بھی میرے ہی کہنے پر مہاراجہ گیکواڑ کی تائید کی۔ اِس کے صلہ میں مہاراجہ سے کچھ لینا تو درکنار، میں نے اُسی وقت اُن کی نوکری سے (اس لیے کہ میں دو سال سے بلا تنخواہ رخصت پر تھا اور مہاراجہ صاحب کسی طرح استعفیٰ قبول نہ کرتے تھے) مستعفی ہو گیا اور یہ کہہ کر اُن کو اِس کی منظوری پر بالآخر راضی کر لیا کہ حکومت کے افراد کہیں گے کہ ایسے شخص کی رائے کی کیا وقعت ہے جو خود ریاست کا ملازم ہو۔''

اس سلسلہ میں سب سے آخری واقعہ فساداتِ بمبئی کا ہے۔

واقعہ بمبئی:

اِس واقعہ کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ محمد علی کو ذیابیطس کی سخت شکایت تھی۔ بعض احباب کے مشورہ اور شوکت صاحب کے اصرار سے محمد علی بمبئی کے ایک ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹروں کی سخت تاکید یہ تھی کہ بستر سے ہلنا بھی خطرناک ہے، جم کر علاج اگر نہیں کیا تو پیر کی ہڈیاں سڑ جائیں گی اور پھر لامحالہ کاٹی جائیں گی۔

یہ واقعہ فروری 1929ء کا ہے جب محمد علی کانگرس کے مخالف ہو چکے تھے اور ہندوؤں میں اور کانگریسی حلقوں میں پورے طور سے غیر ہردلعزیز۔

محمد علی ہسپتال میں بستر علالت پر دراز ہیں، فساد کی اطلاع آتی ہے اور تھوڑی دیر میں لاشیں آ رہی ہیں، زخمی آ رہے ہیں۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا ہوا ہے، کسی کا پیر جھول رہا ہے۔ غرض تھوڑی ہی دیر میں ہسپتال کے اندر ایک ہنگامہ وار و گیر برپا ہو گیا۔ ہندوستان کے مردِ مجاہد سے کون یہ توقع کر سکتا تھا کہ وہ اپنی صحت کے خیال سے چارپائی پر پڑا رہے گا؟ وہ اُٹھا، اپنی اِسی حالت میں اُٹھا اور موقعۂ واردات پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر کیا ہوا؟ اسے خود اُس کی زبان سے سنئے:

''میں کماٹی پورہ میں گیا اور مسلمانوں کی ہر گلی میں جا کر خدا اور رسول ﷺ کا اُن کو واسطہ دیا اور اُن کو مِل والوں کے ظلم کی تقلید سے (بمبئی کے ملوں کے ہندو مزدوروں نے اُس فساد میں مسلمانوں کو جانی و مالی بہت سخت نقصانات پہنچائے تھے، موئف) روکا اور شرم دِلائی۔ میں وہاں سے نکل ہی رہا تھا کہ ہندوؤں کی ایک جماعت مسلمانوں کی طرف بڑھی۔ جب مسلمان اپنی گلیوں سے نکل کر اپنے ہم مذہبوں کی حمایت کے لیے آئے تو فوج کی طرف سے گولی چلنا شروع ہو گئی۔ گولی چل رہی تھی کہ سامنے سے ایک کچرے کی گاڑی والا اپنی گاڑی ہانکتا ہوا نکلا۔ اُس پر چند مسلمانوں نے حملہ کیا تو فوراً ٹیکسی سے کود پڑا اور اُن حملہ آوروں کے پیچھے بھاگا اور اُن کو خدا اور رسول ﷺ کا واسطہ دے کر منع کیا، اور اُس ناکردہ گناہ کو مارے جانے سے بچایا۔''

یہ تھا محمد علی کا وہ کردار جو اس کے بعد ہندوستان کے کسی لیڈر، کسی زعیم اور کسی ناخدا کے ہاں نہیں ملتا، اگرچہ لیڈروں اور ناخداؤں کی کوئی کمی نہیں۔

❀❀❀

باب ۱۰

عزم واستقلال

محمد علی کی طینت میں یہ بات بھی داخل تھی کہ جب وہ کسی بات کو طے کر لیتے تھے تو عزم واستقلال کی ایک چٹان بن جاتے تھے۔ جو کبھی بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتی، احباب واعزہ لاکر سمجھائیں، عواقب ونتائج ہزار بار اپنا بھیانک نقشہ پیش کریں اور مآل اندیشی اور مصلحت بینی جس طرح بھی اُنہیں باز رکھنا چاہیے، مگر وہ کبھی بھی اُن موانع سے متاثر نہیں ہوئے اور جو کچھ طے کرلیا، اُس پر اُس وقت تک قائم رہے جب تک کہ کر کے نہ دِکھا دیا۔

ایک سخت مضمون:

میر محفوظ علی صاحب کا بیان ہے:

''ارادے کی مضبوطی کا یہ حال تھا کہ جو بات غور وفکر کے بعد صحیح سمجھ کر طے کر لی، اُس سے تجاوز کرنا بعید از امکان۔ محمد علی نے ''چوائس آف دی ٹرکس'' کے عنوان سے وہ مضمون لکھا جو اُن کی زندگی کے دریا کا رخ بدل دینے والا ہوا، راجہ (غلام حسین) مرحوم نے مضمون دیکھ کر حکیم (اجمل خاں) صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے اس کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مضمون پر لکھ کر اور حکیم صاحب نے اس کا مطلب سن کر یہی رائے دی کہ مضمون اُس وقت ہرگز نہ شائع کیا جائے مگر محمد علی کب ماننے والے تھے۔ راجہ بیچارہ نے گھبراہٹ میں مجھے بدایوں تار دیا کہ فوراً آؤ، میں پہنچا اور نرم الفاظ میں اپنی ہیچ میرز رائے دی، مگر محمد علی نے ایک نہ سنی۔ جب میں نے زیادہ کہا تو کہنے لگے کہ میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کیے ہیں، مگر اب میں رائے قائم کر چکا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔''

چھنڈواڑہ کا ایک واقعہ:

مسز بیسنٹ وغیرہ کی رہائی کے بعد محمد علی کے نظر بندی کے خلاف ملک میں سخت ہیجان پیدا ہوا اور وائسرائے پر بہت زور ڈالا گیا کہ علی برادران بھی رہا ہو جائیں، مگر گورنمنٹ نے اس مطالبہ پر کوئی اقدام نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ شیخ عبدالمجید صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس خفیہ، محمد علی کے پاس پہنچے اور ایک ایسا بیان لینا چاہا جس سے گورنمنٹ مطمئن ہو جائے اور وعدہ کیا کہ اگر اُنہوں نے اس قسم کا بیان دے دیا تو گورنمنٹ اُن پر سے نظر بندی کے قیود و پابندیاں اُٹھا لے گی، مگر استقلال کے اس کوہِ وقار نے ایسا بیان دینے سے قطعاً انکار کر دیا۔

مختصراً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مسٹر جناح، مسٹر مظہر الحق، مہاراجہ صاحب محمود آباد اور دوسرے احباب نے لاکھ لاکھ کوششیں کیں مگر نہ گورنمنٹ بغیر اس مطلوبہ بیان کے نظر بندی سے رہا کر سکی اور نہ علی برادران نے کوئی ایسا بیان دیا جس سے اُن کی آزادئ قلب وضمیر مجروح ہوتی اور ہنسی خوشی سے قید و بند کے مصائب پورے پانچ سال تک برداشت کیے اور ماتھے پر شکن تک نہ آنے دی۔

رحمت اللہ کمیشن:

ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال نے جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نازک حالات دیکھ کر رحمت اللہ کمیشن کا تقرر کیا ہے تو محمد علی کے علی گڑھ سے ہمیشہ جو تعلقات رہے تھے، اُن کی بناء پر محمد علی کے ہر دوست نے اُنہیں مجبور کیا کہ وہ کمیشن کے سامنے شہادت ضرور دیں کہ اصلاحِ علی گڑھ کا اِس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بعض ''نوچینجر علیگ'' حضرات نے کمیشن کے سامنے شہادتیں دیں بھی، لیکن محمد علی نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس قسم کی چیزوں سے اپنے مسلک کے اعتبار سے تعاون نہیں کر سکتے، اس لیے کسی ترغیب اور تحریص سے وہ متاثر نہیں ہوئے۔

نواب صاحب اور ارکانِ کمیشن کی خواہش:

حالانکہ نواب صاحب بھوپال کی مرضی اور کمیشن کی رائے یہی تھی کہ محمد علی کمیشن کے سامنے رائے

ضرور دیں۔اس موقع پر ایک اہم خط کا اقتباس غیر دلچسپ نہ ہوگا:

''میرا خیال ہے کہ اگر آپ بھی مسلم یونیورسٹی کمیشن میں شہادت دینے جاتے تو بہت اچھا ہوتا۔ترکِ تعاون کی بحث سے قطع نظر کر کے محض تعلیمی اصول اور قانون کے نقائص پر آپ بحث کرتے۔یہ موقع یونیورسٹی کی تعلیمی واخلاقی اصلاح کا ہے،آپ کا علی گڑھ شہادت کے لیے جانا میرے خیال میں تو بہت ہی ضروری ہے۔ہز ہائنس نواب صاحب بہادر اور سر ابراہیم رحمت اللہ اور پروفیسر رحمٰن کا خیال ہے کہ اگر آپ شہادت دیں تو بہت ہی اچھا ہو۔''

اِن تمام تحریکوں اور التجاؤں کے باوجود محمد علی کے فیصلہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔

علی گڑھ جوبلی:

ایک موقع اور بھی ایسا ہی سخت آزمائش کا اُنہیں پیش آیا تھا،یعنی علی گڑھ کا پنجاہ سالہ جشن جوبلی۔ محمد علی کو علی گڑھ سے ہمیشہ سے جو اُلفت رہی تھی اُس کا اقتضا یہ تھا کہ محمد علی اپنی مادرِ تعلیمی کے اِس یادگار جشن میں شریک ہوتے،لیکن اصول کا معاملہ یہاں بھی بہت سخت تھا اور یہ وہ چیز تھی جو محمد علی کو بہت مشکل سے اُن کے عزم وارادہ سے پھیر سکتی تھی۔

احسان صاحب کا خط:

مسٹر احسان الحق بیرسٹر ایٹ لاء جج کیمبل پور،محمد علی کے بچپن کے ساتھی اور نہایت عزیز دوست تھے،اُنہیں جب محمد علی کے اِس عزم کی اطلاع ہوئی تو لکھتے ہیں:

''1915ء کے اولڈ بوائز ڈنر کے بعد میں علی گڑھ نہیں گیا،کچھ واقعات ہی ایسے پیش آتے رہے۔اب جوبلی میں شامل ہونے کا ارادہ ہے،معلوم ہوا ہے کہ تم علی گڑھ جانے پر رضامند نہیں۔یہ یاد رہے کہ اگر تم نہ گئے تو سیکڑوں اور بھی نہ جائیں گے،ہم گمراہ سہی لیکن آخر ہم تمہارے ہیں اور تم ہمارے ہو۔''

باب ۱۱

مذہبیت

محمد علی کی سیاسی اور عملی زندگی کا ایک اہم جزو اُن کی غیر معمولی مذہبیت ہے۔ مذہب کا رنگ صحیح طور سے اُن میں اتنا رچ گیا تھا اور اسلام کی تعلیمات نے اُن پر اپنا اتنا گہرا نقش قائم کر دیا تھا کہ وہ ایک مومن قانت کی طرح اپنی زندگی کا ہر پہلو اور سیاسی پیچیدگیوں کا ہر مسئلہ مذہب کی روشنی میں دیکھتے تھے، اور اِسی روشنی میں گام فرسا ہوتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے محمد علی اُن لوگوں میں نہیں تھے جو ایک عرصۂ دراز تک رند مئے آشام رہے ہوں اور پھر بعد کو سیاسی مصالح سے اُنہوں نے اپنے اوپر مذہبی رنگ چڑھا لیا ہو، بلکہ وہ بچپن سے مذہب کے والہ و شیدا تھے اور مذہبی احساس سے وہ کبھی بھی خالی نہیں رہے۔

سر یعقوب کا بیان:

سر یعقوب کا بیان ہے:

"علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانہ میں شوکت کے اثر اور ولایت جا کر وہاں کی فضا میں محمد علی پر ظاہری انگریزیت کا غلبہ تھا۔ سوٹ، بوٹ اور ہیٹ میں وہ بڑے چوکس رہتے تھے لیکن باوجود اِس کے مذہبی عقائد میں وہ ہمیشہ ہی مضبوط تھے اور ولایت میں بھی اُنہوں نے کبھی رمضان کے روزے قضا نہیں کیے۔"

محمد علی کا بیان:

محمد علی خود اپنی مذہبی استقامت پر مصر تھے چنانچہ فتنہ شریف و ابن سعود کے زمانہ میں جب اُنہوں

نے اپنے مرشد مولانا عبدالباری مرحوم سے اختلاف کیا تو اپنی مذہبیت پر اِن الفاظ میں اظہار خیال کیا:

''بحمد اللہ میں مولانا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پیشتر بھی مسلمان تھا، آج بھی مسلمان ہوں اور انشاء اللہ ہمیشہ مسلمان رہوں گا۔ جب آٹھ برس علی گڑھ اور چار برس آکسفورڈ میں رہ کر مجھ میں کفر والحاد نے سرایت نہ کی تو اب جبکہ اسلام کی خاطر میں نے علی گڑھ سے منہ موڑ لیا اور آکسفورڈ پر بھی لات ماردی، کیا خداوند کریم مجھے کفر والحاد کی طرف لے جائے گا؟ اب تو یہی دعا ہے کہ مجھ سے سب بیزار ہو جائیں مگر تو اور تیرا رسول ﷺ نہ بیزار ہوں۔ کسی سے نکثِ عہد ہو مگر تجھ سے اور تیرے رسول ﷺ سے نہ ہو۔ دُنیا بھر کی بیعتیں فسخ ہو جائیں مگر وہ بیعت فسخ نہ ہو جو سب سے پہلی بیعت ہے۔ خداوند! میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تجھ سے راضی ہوں اور تیرے رسول پاک ﷺ سے، تیرے قرآن سے اور تیرے رسول ﷺ کی سنت سے۔ اے کاش! تو اور تیرا رسول ﷺ بھی مجھ سے راضی ہو جائیں۔''

مولانا عبدالماجد کا بیان:

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے ایک ضمنی بیان سے بھی محمد علی کی مذہبیت پر کافی روشنی پڑتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''1916ء میں راقم سطور کا ایک فلسفیانہ رسالہ انگریزی زبان میں شائع ہوا، چھنڈواڑہ کے اسیر فرنگ نے اس پر اپنے عنایت ناموں میں نہایت تفصیلی تبصرہ کیا۔ راقم پر اُس وقت تک ''عقلیت'' کی لعنت مسلط تھی، اُسے یہ دیکھ کر حیرت پر حیرت ہوتی تھی کہ ''کامریڈ'' کے ایڈیٹر کی ایک ایک سطر عشق رسول ﷺ میں ڈوبی ہوئی ہے۔''

کراچی جیل میں داخلہ:

خوبیِ قسمت سے ہمیں محمد علی کی کراچی جیل کی ڈائری کے چند اوراق اور بعض دوسری ڈائریوں کے بھی چند اوراق مل گئے ہیں جو اگر چہ اس لیے تشنہ کہے جا سکتے ہیں کہ وہ بطور ڈائری ہی کے لکھے گئے تھے، کسی کو دکھانے کی غرض سے نہیں ضبط تحریر میں آئے تھے، اس لیے بہت بے ترتیبی، بے پروائی اور حد درجہ شکستہ خط میں پنسل سے گھسیٹے گئے ہیں تاہم کچھ نہ کچھ مواد حاصل ہی ہو گیا ہے۔ کراچی جیل میں جب محمد علی داخل ہوئے ہیں تو کہتے ہیں:

"7 بجے جیل میں داخل ہوا، ربّ ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعلنی من لدنک سلطاناً نصیرا پڑھ کر داخل ہوا۔ بستر وغیرہ جیل کا ہے، آتے ہی دو رکعت دوگانہ شکر پڑھی۔"

پھر آگے چل کر دوسرے ورق پر:

"نیند آ رہی تھی مگر عشاء کے خیال سے نہ سویا، عشاء سے فارغ ہو کر لیٹا۔ رات کو پہرے والے چلاتے تھے، آنکھ کھل کھل جاتی تھی۔ غلام مجدد صاحب بزرگ ہیں ہمت، حوصلہ، صبر، ضبط، سکون سب ہی کچھ ہے۔ شام کو ساڑھے پانچ بجے اُٹھا، تہجد کی توفیق عطا ہوئی۔"

سنتِ یوسفی کے پیروِ اعظم کی زندگی کا یہ صفحہ ابھی ختم نہیں ہوا، بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک واقعات سامنے آتے جا رہے ہیں۔

مفتی فلسطین کا انکشاف:

سب سے زیادہ قابل توجہ وہ واقعہ ہے جو مفتی فلسطین امین الحسینی صاحب، نے ظاہر فرمایا ہے، اصل ماخذ نہ مل سکنے کے سبب یادداشت کے بھروسہ پر جس کی تفصیل یہ ہے کہ محمد علی شرکت مؤتمر کے لیے جب حجاز تشریف لے گئے تو ایک روز رات کو بہت دیر کے بعد امین الحسینی صاحب کا مسجد حرام کے اندر خانہ کعبہ کے پاس گزر ہوا، تو دیکھتے کیا ہیں کہ رات کی اس تاریکی میں غلافِ کعبہ پکڑے ہوئے ایک شخص خانہ کعبہ میں صاحبِ خانہ سے مصروف راز و نیاز ہے۔ اس کی آواز بیٹھی ہوئی ہے، گریہ گلو گیر ہے، گردن

سجدہ میں جھکی ہوئی ہے اور وہ گڑگڑا کر، رورو کر، عرض کر رہا ہے کہ اے کارسازِ عالم! مجھے تو جہنم میں جھونک دے، میری کسی آرزو کو پورا نہ کر، لیکن ایک بار اِن آنکھوں کے سامنے احیائے خلافتِ راشدہ کر کے وہ مبارک و مسعود زمانہ پھر واپس لا دے جس کا کانوں نے سنا ہے مگر آنکھیں اب تک محروم ہیں، ہندوستان کو آزادی عطا فرما تا کہ وہ پنجہ اغیار سے آزاد ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔

مفتی صاحب کا بیان ہے کہ میں حیرت سے یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا جب اس شخص نے اپنی پیشانی سجدہ سے اٹھائی، تو دیکھتا کیا ہوں وہ تو زعیم شرق محمد علی ہے جس کا نورانی چہرہ آنسوؤں سے تر ہے!

کتاب راجپال پر تاثرات:

اِسی طرح جب وہ رُسوائے عالم کتاب راجپال منظرِ عام پر آئی، تو محمد علی بے قرار و مضطر ہو گئے اور اس قسم کی لغویتوں کے انسداد کے لیے جو آئینی و قانونی، معقول و سنجیدہ کوششیں وہ صرف کر سکتے تھے، وہ اُنہوں نے صرف کیں۔ لیکن اِس واقعہ سے اُن کے دِل و دماغ پر بہت زاید اثر پڑا تھا۔ چنانچہ ایک موقعہ پر اپنے تاثر کا اظہار اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''جہاں تک خود میرے تعلق ہے مجھے نہ قانون کی ضرورت ہے نہ عدالتوں کی حاجت۔ اگر کوئی ہندوستانی بھائی اس قدر شقی القلب ہے کہ مجھ سے تو ایک معمولی جانور کا تقدس منوا کر اس سے متمتع ہونے کے حق سے میری وست برداری کا طالب ہے لیکن انسان جو اشرف المخلوقات ہیں، اُن میں سے سب سے اشرف نبی سرورِ کونین اور باعثِ تکوین دو عالم ﷺ کا جو تقدس میرے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اس کا اتنا پاس بھی نہیں کرتا کہ اس برگزیدہ ہستی کی توہین کر کے میرے قلب کو چور چور کرنے سے احتراز کرے تو ہندوستان کی اس غلامی سے نکالنے کے لیے جس میں آج وہ مبتلا ہے اور جو گاؤ پرست ہندوؤں کے وجود سے کہیں زیادہ ہمارے مذہب اور ہماری ملت کی بے حرمتی کا سبب ہے۔ مجھ سے جہاں تک صبر ہو سکے گا، صبر

کروں گا اور جب صبر کا جام لبریز ہو جائے گا تو اُٹھوں گا اور یا تو اُس گندہ دل، گندہ دماغ، گندہ دہن کافر کی جان خود لے لوں گا یا اپنی جان اِس کوشش میں کھودوں گا۔''

اِس موقعہ پر یہ بات یادر کھنے کے قابل ہے کہ محمد علی اپنی قابل فخر ورشک مذہبیت اور صداقت کا اس وقت اعلان کر رہے ہیں جبکہ وہ پکے کانگریسی ہیں اور یہ وہ زمانہ ہے کہ اس فتنہ پر بڑے بڑے لوگوں کی زبانیں گنگ ہیں۔ محمد علی کے علاوہ اسلامی ہند کے سنجیدہ متین اور بہترین زعماء قفل خاموشی لگائے بیٹھے تھے، اسی طرح ہندوؤں کی بھی یہی حالت ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک بار اتفاقاً ایسوسی ایٹیڈ پریس کا نمائندہ پنڈت موتی لال نہرو کے پاس پہنچ گیا اور اُس نے اِس مسئلہ پر اُن کی رائے مانگی تو پنڈت جی نے اِس مسئلہ پر لب کشائی کرنے سے قطعاً انکار کر دیا۔

پارلیمنٹ کی گیلری میں نماز:

1928ء میں جب محمد علی بغرض علاج یورپ گئے تھے تو کچھ عرصہ تک علاج کرنے کے بعد وہ کچھ دِنوں کے لیے انگلینڈ بھی چلے گئے تھے۔ وہاں ایک بار پارلیمنٹ کی وزیٹرز گیلری میں بیٹھے ہوئے کارروائی کا مطالعہ کر رہے تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ اُسی وقت وہ محمد ﷺ کا ہم نام اور اللہ کا غلام اُٹھا، گیلری کے ایک گوشہ میں اپنی عباء بچھائی اور ماسوا اللہ سے، بے نیاز و مستغنی ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لوگوں نے اِس واقعہ کو بہت تعجب سے دیکھا۔ لندن کے ایک اخبار نے اِس واقعہ کو شائع کیا تھا کہ آج ایک آدمی سے یہ ''حرکت'' سرزد ہوئی۔ محمد علی کے شناسا سمجھ گئے کہ وہ ''آدمی'' محمد علی کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ واپسی پر ''سچ'' کے محترم ایڈیٹر نے اس کی تصدیق چاہی تو محمد علی نے اعتراف کیا کہ وہ ''آدمی'' وہی تھے!

خود ہندوستان میں اُن کے دیکھنے والوں نے اکثر دیکھا ہے کہ خلافت کانفرنس ہو رہی ہو یا کانگرس، مسلم لیگ ہو رہی ہو یا کوئی اور مجلس، نماز کا وقت آیا اور محمد علی نے ڈائس کے ایک گوشہ پر اپنی عباء بچھائی اور نماز پڑھ لی۔ ''خندۂ اہل جہاں'' اور ''انگشت نمائی احباب'' کا اس نے کبھی بھی خیال نہیں کیا۔

ایک مذہبی اصلاحی تحریک:

یہ تو تھا اُن کا ذاتی جذبہ عمل لیکن اگر کوئی تحریک مذہبی حیثیت سے یا کسی اور خاص حیثیت سے انہیں مفید نظر آتی تھی تو ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ'' کے صفحات اس کے لیے وقف کر دیتے تھے اور خود بھی جہاں تک ہوسکتا تھا، مدد کرتے تھے۔ ایک بار حسن نظامی صاحب نے ایک مفید اصلاحی کام شروع کیا یعنی انسداد آتش بازی۔ محمد علی کو اِس معاملہ میں مسلمانوں کی بے راہ ردی کا احساس تھا اور وہ جانتے تھے کہ ان لغو رسم کو مذہب کا جھوٹا نام دے کر کس طرح مسلمانوں کا لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیہ برباد ہوتا ہے، اس لیے وہ تن من دھن ہر طرح سے خواجہ صاحب کے معاون ثابت ہوئے۔ ''ہمدرد'' کے سب ایڈیٹر کو اُنہوں نے حکم دیا کہ خواجہ صاحب کے اِس قسم کے تمام اصلاحی اعلانات و اشتہارات اور پوسٹر ''ہمدرد'' میں بلا معاوضہ شائع ہوں، نیز دہلی خلافت کمیٹی کو خواجہ صاحب کے اس نیک کام کی حمایت کے لیے وقف کر دیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اگر دہلی خلافت کمیٹی کی امداد شامل نہ ہوتی تو خواجہ صاحب کو اتنی غیر معمولی کامیابی نہ حاصل ہوتی۔

اور پھر خواجہ صاحب کی دلچسپ اور جدت آفریں طبیعت نے ایک اور تجویز آتش بازی کے جنازہ کی پیش کی تو بقول خواجہ صاحب، محمد علی نے اِس کی بھی حمایت کی اور خود اُس جلسہ اور جلوس میں شریک ہوئے جو اُس جنازہ کو جمنا کے کنارے دفن کرنے گیا تھا۔

تنازعۂ دیوبند:

اِسی طرح اسلامی ہند کے مشہور دارالعلوم دیوبند میں جب اختلاف و شقاق پیدا ہوا تو محمد علی نے اپنی تمام سیاسی مشغولیتوں کے باوجود وقت نکالا اور خود دیوبند پہنچے، حالات کا معائنہ کیا اور صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور اِس سعی مسعود میں لگے رہے کہ ہوسکے تو جانبین میں صلح کرادی جائے۔

برلن کی مسجد 1928ء میں جب وہ یورپ گئے تھے تو اپنی علالت کے باوجود برلن کی مشہور مسجد کو دیکھنے تشریف لے گئے اور وہاں اسلام و ہندوستان پر لیکچر دیا، حالانکہ اُن کی حالت کا اقتضا یہ تھا کہ وہ

پورے طور سے سکون و اطمینان کے ساتھ آرام کریں لیکن اس قسم کے مواقع جب اُنہیں مل جاتے تو وہ کب چھوڑتے تھے۔

دُعا:

''ہمدرد'' کی نشاۃِ ثانیہ کے موقعہ پر محمد علی نے جو دُعا مانگی ہے وہ اُن کی خالص مذہبیت اور غیر معمولی خشیت باللہ کا نہایت کامیاب نمونہ ہے ادب وانشاء اور درد واثر کے اعتبار سے بھی اس دُعا کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ دُعا تو بہت طویل ہے اس لیے مجبوراً ''قاش ہائے دل'' میں سے بھی انتخاب کرنا پڑتا ہے، ملاحظہ ہو:

''اے ربّ ذوالجلال! اے وہ کہ تیری لطف فرمائی اور کرم گستری کے بغیر ارادے ناکام، حوصلے پست اور آرزوئیں صحرائے نامرادی میں تشنہ تکمیل رہتی ہیں۔ تیرا ایک عاجز وخطا کار بندہ محمد علی تیرے حضور میں حاضر ہوا ہے کہ دِل کی تڑپ اور روح کی بے چینی کے ساتھ دستِ دُعا دراز کرے۔ میں تو ایک گدائے بے نوا ہوں، ساز و سامان کی جگہ بے سروسامانی کے گرداب میں پھنسا ہوا ہوں، میرے پاس تو اگر کوئی پونجی ہے تو صرف اِس قدر کہ دل میں چند ارادے اور دماغ میں چند افکار ہیں۔ اس کے سوا نہ کوئی ساز رکھتا ہوں نہ سامان، پھر اے عطا بار وخطا پوش خدائے رحمٰن ورحیم! میرے لیے یہ کیونکر ممکن ہے کہ تجھ سے بے نیاز ہو جاؤں جبکہ ہر نیاز مند کا مرکز ناز تو ہی ہے۔ میرے سامنے کنعان کے مقدس ومحترم قیدی کی پوری تاریخ تھی اور جانتا تھا کہ تو قید وبند کی سختیوں کو بادشاہت کے جلال وجبروت سے بھی بدل سکتا ہے، اس لیے جب قیدِ فرنگ پر قیدِ تنہائی مستزاد کی گئی تو میں نے پورے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ عرض کیا تھا کیونکہ اس تاریک کوٹھری میں بھی تو ساتھ تھا۔

ہو مستزاد قید پہ تنہائی بھی، تو کیا ہے بات جب کہ یادِ خدا بھی نہ آ سکے
اگلا سا زور و شور جنوں میں نہ ہو، مگر اتنا تو ہے کہ عرش کو اب بھی ہلا سکے

میں اپنی چھوٹی سی پونجی لے کر بازار جہاں میں نکلا ہوں جو چند ارادوں اور چند افکار سے زیادہ نہیں۔ اس کے سوا میرے ہاتھ خالی ہیں۔ نہ تو میری جیب میں دولت ہے جس کا مجھے غرور ہو، نہ میرے پاس طاقت ہے جس کا مجھے گھمنڈ ہو، نہ اعوان وانصار کی کوئی فوج ہے جس کا بھروسہ ہو۔ باوجود اِن بے سروسامانیوں کے ایک تیرا وجود ہے جس پر مجھے بھروسہ اور ایک تیری ذات ہے، جس پر تکیہ اور سہارا ہے اور یہ اتنا بڑا بھروسہ اور سہارا ہے کہ اگر دُنیا کی ہر ایک چیز مجھ سے چھین لی جائے، میرا تمام ساز و سامان بے سروسامانیوں سے بدل دیا جائے۔"

❁❁❁

باب ۱۲

شوخیِ طبع، نفاستِ ذوق، نکتہ رسی اور اقوالِ نادرہ

محمد علی اپنی مسلمہ قیادت اور مشہور مذہبیت کے سبب ایک ''عبوسا قمطریرا'' بنے ہوئے ہر شخص کو نگاہ خشم آلود سے دیکھنے والے لیڈر نہیں تھے، بلکہ اُن کے پہلو میں ایک شوخ دِل تھا۔ وہ خود لطائف و ظرائف کے خوگر تھے اور دوسروں کی پرلطف باتوں سے محظوظ ہونا جانتے تھے۔ وہ ایک پاکیزہ ذوق کے مالک تھے، اس لیے آرٹ اور فنونِ لطیفہ کے قدر دان تھے۔ وہ چونکہ ایک بلندتر دل ودماغ کے مالک تھے اس لیے اُن کی زبان سے ایسے آب دار کلمے بھی نکل جاتے ہیں جو ضرب الامثال کا کام دے سکتے ہیں اور اپنی گیرائی مفہوم اور وسعتِ خیال کے اعتبار سے اِس قابل ہیں کہ اُن کو سمجھا جائے اور اُن کی وسعتوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہم کوشش کریں گے کہ محمد علی کی اِن خصوصیات پر بھی کچھ روشنی ڈال سکیں۔

ضیاءالدین برنی کا بیان:

مسٹر ضیاءالدین برنی، محمد علی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

''مسجد کانپور کی ایجی ٹیشن کے زمانہ میں ایک مرتبہ علامہ شبلی مرحوم دہلی تشریف لائے، مولانا محمد علی نے شب کی دعوت اُن کے اعزاز میں کی۔ بہت سے اصحاب مدعو تھے، سب کی فرمائش سے علامۂ موصوف نے اپنی چند رباعیات سنائیں جو سب کی سب کانپور کے واقعہ ہائلہ سے متعلق تھیں۔ اس کے بعد علامہ موصوف نے مولانا محمد علی کی مساعی کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا جو وہ کانپور کی مسجد کی بحالی کے لیے کر رہے

تھے، پھر چند تاریخی مثالیں پیش کر کے فرمایا کہ میں نے جن جن اشخاص کے ناموں میں محمد اور علی کا اجتماع دیکھا ہے انہیں ہمیشہ ممتاز پایا۔ محمد علی نہایت خاموشی سے پہلے تو اپنی تعریف کو سنا کیے اور پھر یوں گویا ہوئے کہ محمد علی، والئی ایران کو شاید آپ بھول گئے؟ اس پر قہقہہ بھی ہوا۔"

ایک اور لطیفہ:

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ایک اور حد درجہ دلچسپ لطیفہ کی روایت فرماتے ہیں:

"حکیم اجمل خاں مرحوم نے ایک بار خلافت کمیٹی کی مجلس مرکزیہ کے جلسہ کے موقع پر رہنمایانِ خلافت کو اپنے ہاں مدعو فرمایا۔ محمد علی بھی تھے، دوسرے رہنمایانِ خلافت بھی اور بعض احرارِ پنجاب بھی، حکیم صاحب نے مہمانوں کی تربوز سے بھی تواضع فرمائی تھی۔ تربوز تمام حاضرین نے بالاتفاق پسند کیا اور اُسی کی تعریف ہونے لگی۔ ایک صاحب نے فرمایا، دہلی کے تربوز بہت اچھے ہوتے ہیں۔ محمد علی نے اپنے ایک پنجابی دوست اور لیڈر کی طرف دیکھ کر کہا، لیکن پنجاب کے "خر" بوزہ بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔"

"پینے" کی دیر:

ایک مرتبہ ایک سخت نزاع کے موقع پر ایک مختصر جلسہ شوریٰ منعقد تھا، موضوعِ بحث ایسا مختلف فیہ مسئلہ تھا کہ گفتگو بڑھتی گئی۔ رات بڑھتی گئی، مگر اختلاف کم نہ ہوا۔ آخر ہندوستان کے ایک مشہور لیڈر کھڑے ہوئے اور اُنہوں نے تحریک فرمائی کہ چونکہ رات زیادہ ہو چکی ہے اور کھانے کو دیر بھی ہو رہی ہے، اس لیے اب جلسہ ملتوی کر دیا جائے۔ محمد علی نے تائید کی اور کہا کہ اب جلسہ ملتوی ہونا چاہیے کھانے کی دیر بھی ہو رہی ہے اور "پینے" کی دیر بھی ہو رہی ہے۔ آخر اس مصروفیت کے بعد کچھ اکل و "شرب" بھی تو ہونا چاہیے۔

بلندی و پستی:

محمد علی چونکہ ''نوچینجر'' تھے اس لیے وہ اسمبلی وغیرہ سے عملاً کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، لیکن چونکہ اخبار نویس بھی تھے اس لیے مجبوراً کبھی کبھی کسی اہم موقع پر ایک تماشائی کی اور ''ہمدرد'' کے رپورٹر کی حیثیت سے وہاں چلے بھی جاتے تھے۔

ایک بار وہ اُوپر گیلری میں بیٹھے ہوئے تھے کہ نیچے سے ایک سوراجی دوست نے محمد علی سے کہا:

''جب یہاں تک آئے ہو تو دو قدم اور سہی، ہماری جماعت میں باقاعدہ شریک نہ ہو جاؤ؟''

محمد علی نے کہا:

''میں آپ کی جماعت میں کیسے شریک ہو سکتا ہوں؟ میں تو اِس بلندی سے آپ کی پستی کا منظر دیکھ رہا ہوں۔''

جس نے بھی اس لطیفے کو سنا، پھڑک گیا۔

قانونی مغالطہ:

1927ء میں مدراس کانگریس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگریس کا نصب العین ''مکمل آزادی'' پاس کرانا چاہا۔ اُنہوں نے تجویز پیش کی اور محمد علی مرحوم نے اس کی تائید کی، پنڈت مدن موہن نے اس تجویز کی سبجیکٹ کمیٹی میں سخت مخالفت کی۔ محمد علی نے بارہا دورانِ تقریر اُن کے خیالات کی تردید کی۔ مالوہ جی، ملکِ معظم کا نام لے لے کر اپنی تجویز کو اور زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ محمد علی نے کہا:

''آپ 'ملکِ معظم، ملکِ معظم' کیا کہہ رہے ہیں، ملکِ معظم کی حیثیت ہی کیا ہے؟ وہ تو صرف ایک قانونی مغالطہ ہیں، اور بس!''

اس لطیفہ پر وہ اظہارِ پسندیدگی کیا گیا کہ مالوی جی کی آواز اس شور میں دب گئی۔

آل مسلم پارٹیز کا ایک لطیفہ:

امرتسر میں ڈاکٹر کچلو نے ایک آل مسلم پارٹیز کانفرنس نواب اسماعیل خاں کی صدارت میں منعقد

کی تھی تا کہ مسلمان رہنماؤں کا نفاق وشقاق دُور ہو سکے۔ اُس میں اسلامی ہند کے اکثر سر برآوردہ زعما نے شرکت کی تھی۔ علی برادران بھی رونق افروز تھے۔ دورانِ تقریر مولانا شوکت علی نے کہا:

''میں محمد علی کے متعلق کچھ نہیں کہتا، یہ تو بعض اوقات بدتمیزی کی بات بھی کر دیا کرتا ہے۔''

اس پر ایک صاحب نے جنابِ صدر کو توجہ دلائی، صدر نے حکم دیا کہ اپنے الفاظ واپس لیجیے۔ اس پر شوکت صاحب نے فرمایا:

''میں محمد علی سے معافی مانگتا ہوں۔''

آواز آئی:

''مولانا محمد علی کہیے۔''

مولانا شوکت علی نے پریشان ہو کر کہا:

''اچھا بھائی! میں مولانا محمد علی سے معافی مانگتا ہوں۔''

اس مزید ردّ وقدح نے اجلاس میں بہت پر لطف سماں پیدا کر دیا۔ مولانا محمد علی نے اُٹھ کر صاحب صدر کا شکریہ ادا کیا:

''حضرات! میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے کم از کم ایک آدمی کو تو مجھ پر سبّ وشتم کے تیر برسانے سے روک دیا۔''

ایک اور لطیفہ:

''ہمدرد'' کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد اُس کی پہلی سالگرہ کے موقع پر محمد علی نے مشاہیر دہلی اور اپنی صحافتی برادری کو ایک پر تکلف ڈنر دیا۔ عملہ ادارت کی طرف سے عارف ہسوی صاحب (اُردو زبان کے بلند پایہ ادیب تھے، اُصول کے بڑے پکے تھے، دق کے مرض میں انتقال ہوا) نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مہمانوں کی طرف میزبان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے حکیم اجمل خان مرحوم کھڑے ہوئے اور یوں گویا ہوئے:

''خدا کرے، ایسی سالگرہ ہر تیسرے مہینے آیا کرے۔''

اس پر مولانا صاحب بول اُٹھے:

''تو پھر اخبار کے سالانہ چندے بھی اسی حساب سے وصول کیے جائیں گے۔''

اس پر لطف جواب نے سب کو محظوظ کیا۔

ایک پر لطف واقعہ:

1928ء میں جب محمد علی بغرضِ علاج یورپ گئے تو اُس وقت ہندوستان میں بردولی کے کسانوں کا مسئلہ قوم و ملک کی توجہ اپنی طرف منعطف کیے ہوئے تھا اور ہر شخص کی آنکھیں گورنمنٹ کے استبدادو قہر مانیت اور بردولی کے کسانوں کی حیرت انگیز تنظیم، ہمت اور جرأت پر لگی ہوئی تھیں۔

محمد علی جب جہاز پر جانے لگے تو ڈاکٹر نے حسبِ قاعدہ نبض دیکھی اور پوچھا:

''آپ اچھے تو ہیں؟''

محمد علی نے فوراً جواب دیا:

''اگر اچھا ہوتا تو ولایت کیوں جاتا، بردولی نہ گیا ہوتا؟''

مالوی جی سے ایک لطیفہ:

محمد علی ایک بار عربی وضع اختیار کر کے اسمبلی تشریف لے گئے، اتفاقاً پنڈت مدن موہن مالوی سے ملاقات ہوگئی۔ مالوی جی نے دیکھا تو کہا:

''اخاہ مولانا محمد علی! آپ ہیں؟ میں تو اِس لباس سے سمجھا، بیگم صاحبہ بھوپال تشریف لا رہی ہیں۔''

محمد علی نے جواب دیا:

''بیگم صاحبہ بھوپال ایسی شیر دِل خاتون ہیں کہ اس ''زنانی'' مجلس میں آنا پسند نہیں کرتیں۔''

ایک دوسرا واقعہ:

آگے بڑھے تو مسٹر وٹھل بھائی (مسٹر ولبھ بھائی پٹیل، کانگریس کی مجلس عاملہ کے ممبر اور گاندھی جی کے معتمد خصوصی)، صدرِ جمعیۃ مقننہ سے ملاقات ہوگئی۔ اُنہوں نے اپنے کمرے میں لے جا کر ایک

بڑے انگریز سے محمد علی کا تعارف کرایا۔ اِس وضع میں دیکھ کر انگریز بھی اپنے اظہارِ خیال سے باز نہ رہ سکا،
اُس نے کہا:

''مولانا! آپ تو بالکل عرب معلوم ہوتے ہیں۔''

محمد علی نے کہا:

''اس حسن ظن کا شکریہ! لیکن جب بارہ برس تک میں بالکل انگریزی لباس استعمال کرتا رہا تو آپ میں سے کسی نے نہیں کہا کہ تم تو پورے انگریز معلوم ہوتے ہو، بلکہ 'کالا آدمی' ہی زبان پر رہا۔ اب کہ میں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے ہم وطنوں کا لباس اختیار کیا ہے تو آپ کو بالکل ''عرب'' معلوم ہوتا ہوں۔''

ایک دلچسپ تنقید:

اخبارات کی غیر ذمہ دارانہ صحافت پر تنقید کے سلسلے میں ایک بار محمد علی نے کتنی پرلطف بات کہی ہے:

''لوگوں کو وہ اخبارات پسند ہیں جن کا چندہ تو دیا جاتا ہے مگر اصولِ صحافت یہ ہے کہ 'ایک پیسہ لوں گا، ایک گالی دوں گا' یا جن کی آمدنی کا ایک ذریعہ اُن کے گندے اشتہارات ہیں جن کے ''پڑھنے'' ہی سے نہیں بلکہ چھاپنے سے بھی ''بہتوں کا بھلا'' ہوتا رہتا ہے۔''

''بہتوں کا بھلا'' والی تلمیح کچھ وہی حضرات خوب سمجھ سکتے ہیں جو ''اُردو مرکز'' کے اخبارات دیکھا کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں آگے چل کر ایک اور نہایت پرلطف لیکن اس سے زیادہ سچی بات فرماتے ہیں:

''یہ نیوز پیپر ہرگز نہیں ہوتے، حقیقتاً ویوز پیپر ہوتے ہیں اور جو خبریں (نیوز) ان اخبارات میں شائع ہوتی ہیں، وہ دراصل ایڈیٹروں کی ویوز (آراء) ہوتی ہیں۔''

کراچی کا ایک واقعہ:

کراچی میں جب محمد علی ماخوذ ہوئے اور عدالت میں اُن کا مقدمہ پیش ہوا تو استغاثہ (گورنمنٹ

کی جانب سے اُن کے خلاف گواہ گزر رہے تھے، محمد علی حسبِ مسلک خاموش تھے اور اس کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لے رہے تھے۔ ایک موقع پر عدالت نے استفسار کیا:

''آیا آپ گواہ پر کوئی ''جرح'' کرنا چاہتے ہیں؟''

محمد علی کھڑے ہوئے، سمجھا گیا کہ وہ گواہ پر جرح کریں گے لیکن اُنہوں نے گواہ پر جرح کے بجائے اس کی ''خیریت مزاج'' دریافت کی اور بیٹھ گئے۔ اس پر عدالت میں وہ قہقہہ پڑا کہ سارا ہال گونج گیا۔

زندہ دِلی اور شوخی اُن کی طبیعت میں اس قدر راسخ ہوگئی تھی کہ بڑی سے بڑی مصیبت کے موقع پر بھی اُن کے منہ سے کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل جاتی تھی جو اُن کی زندہ دِلی پر دلالت کرتی ہے۔ اپنی کراچی جیل کی ڈائری میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ایک اسیر اور آئے، وہی اہتمام! ایک لاری پر مسلح گورا فوج، ایک مسلح ہندوستانی پولیس اور بند موٹر میں اسیر... غالباً مولانا حسین احمد صاحب ہیں۔ مجسٹریٹ اُس وقت تک نہ آیا تھا اس لیے وہ روکے رکھے گئے۔ یہ عجیب عالم برزخ ہے، نہ جانے دیتے ہیں نہ آنے دیتے ہیں، دروازے پر بٹھا رکھتے ہیں۔
>
> تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے؟''

تحریفِ اسماء:

محمد علی کو نام کے معنی میں خفیف سا تغیر کر کے ایک عظیم انقلاب پیدا کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔

لارڈ برکن ہیڈ (وزیر خارجہ حکومتِ برطانیہ) کو وہ ''بروکن ہیڈ'' (شکستہ سر) فرمایا کرتے تھے۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ (مزدور لیڈر، برطانیہ کا وزیر اعظم) کو اُن کی ہندو نوازی کی وجہ سے وہ ''رام جی مکندامل'' فرمایا کرتے تھے۔

مولانا اشرف علی صاحب (تھانہ بھون) سے ''صدق'' کے محترم ایڈیٹر کو بھی بہت عقیدت تھی۔ محمد علی اس سے واقف تھے، اکثر اُن سے وہ دریافت فرمایا کرتے تھے:

''کہیے! ''تھانہ دار'' صاحب کا مزاج کیسا ہے؟''

احباب کی ایک صحبت میں بحث چھڑی کہ تم تین بھائی ہو، دو شاعر ہیں... ذوالفقار علی گوہؔر، محمد علی جوہؔر، اور شوکت علی کیا؟ محمد علی نے فوراً جواب دیا:

''شوہر بھی ایک ہم قافیہ تخلص ہے۔''

اِسی طرح کے اور بھی بہت سے نمونے پیش نظر ہیں لیکن مصلحتاً اِس وقت اُن کا پردۂ عدم سے سرا پردۂ ظہور پر آنا مناسب نہیں۔

ترجمہ اسماء:

میر محفوظ علی صاحب کا ارشاد ہے:

''احمد علی کی چلبلی، شوخ طبیعت... سادہ الفاظ اور آسان طرزِ ادا کی جگہ غالبؔ کی طرح کسی قدر پیچ دار طرزِ ادا کی دلدادہ تھی۔ وہ مذاق میں الفاظ اور اسماء کو اپنے رنگ میں کہنے کے عادی تھے۔ بمبئی کے محلے میں ایک ریلوے اسٹیشن (Churchgate) ہے جسے ''بابِ کلیسا'' کہتے تھے۔ اسی طرح Marin Lane جسے عوام ''مریم لین'' کہتے ہیں، وہ اسے ''صفوفِ بحریہ'' کہتے تھے۔ ''شارع عطیہ'' اس میں جو تلمیح و لطافت ہے، اس کے اظہار کا موقع نہیں مگر اکثر احباب مثلاً ڈاکٹر علامہ سر اقبال اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ Jacab Circle کا نام رکھا تھا ''دائرۂ یعقوبی''۔ اُن کے ایک ملاقاتی کا نام تھا ''چندر ہنس'' جسے وہ ''مہبط'' کہتے تھے (چندر بمعنی مہ اور ہنس بمعنی بط)۔''

نفاستِ ذوق:

یہ تو تھا محمد علی کی شوخی طبع اور زندہ دِلی کا نمونہ، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ محمد علی نہایت پاکیزہ ذوق کے مالک بھی تھے۔ میر محفوظ علی صاحب روایت فرماتے ہیں:

''بڑے بڑے ماہر اور مبصر اُن کے مذاق کی صحت کے قائل تھے۔ دِلّی کے ایک

شہزادے روغنی تصویر بناتے تھے، غالباً بے چارے کی معاش کا یہی ذریعہ تھا۔ محمد علی کو اُنھوں نے دِلّی کی جامع مسجد کی تصویر پیش کی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چونکہ گداگروں کی موجودگی بھی ایک لازمی بات ہے، لہٰذا مصور نے بھی نقل کو اصل کر دکھانے کی غرض سے ایک سیڑھی پر ایک عورت کی تصویر بنائی جو ایک پھٹا چیتھڑا برقع اوڑھے دو ننگے بچوں کی اُنگلی پکڑے کھڑی تھی۔ نیچے لکھا تھا،''جامع مسجد دہلی''۔ محمد علی نے تصویر دیکھ کر کہا، میں تصویر لینے اور ہدیہ دینے کو اپنی طرف سے حاضر ہوں بشرطیکہ الفاظ ''جامع مسجد دہلی'' مٹا کر جو فقرہ میں عرض کروں، اُسے درج فرمادیں۔ شہزادہ صاحب نے منظور کیا، محمد علی نے پنسل سے ایک کاغذ پر لکھ دیا۔

''اب وہ جامع مسجد کے معمولی نقشے کے بجائے آلِ تیمور کا ایک مرقع عبرت ہوگئی۔''

محمد علی کے ڈرائنگ روم میں جو صاحب نظر اُسے دیکھتا تھا، ممکن نہ تھا کہ ایک گرم آنسو یا ایک ٹھنڈی سانس اُسے بطورِ خراج نہ پیش کرتا۔''

نکتہ رسی:

محمد علی نے بہت نکتہ رس طبیعت پائی تھی۔ جس فن سے اُنہیں کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا تھا اُس میں بھی اپنی طبیعت کی رسائی کا اتنا نادر نمونہ پیش کرتے تھے کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے، مثلاً قانون میں اُنہیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن خواجہ حسن نظامی صاحب ایک دلچسپ روایت یہ کرتے ہیں:

''مولانا محمد علی نے ایک نہایت دلچسپ قانونی بات پیدا کی کہ یہ واقعہ شہادت (واقعہ یہ تھا کہ قلعہ کے پاس ایک مسجد تھی جسے ہندوؤں نے ''اپنالیا'' تھا۔ اُس کے کتبے کو مٹا کر دوسرا پتھر لگا دیا جس پر ''اوم'' لکھ دیا تھا۔ دہلی کے مسلمانوں میں اس سے بہت ہیجان پیدا ہوا تھا) کی دفعہ میں آتا ہے۔ مسجد کے اوپر لفظ ''اللہ'' اسلام کی شہادت دے رہا تھا، اُس کو مٹا کر ''اوم'' لکھا گیا، گویا ایک شہادت بدل کر دوسری شہادت پیش کی گئی... اس لیے اس پر شہادت بدلنے کا جرم عائد ہوتا ہے۔

حاضرین اس عجیب نکتہ آفرینی پر پھڑک گئے۔ میں نے کہا، ہم کو اسی واسطے آپ جیسے لیڈر کی ضرورت ہے۔ مولانا محمد علی کا دماغ کیسا لاجواب ہے، وہ آج کی باتوں سے معلوم ہوا۔"

اقوال و حکم:

محمد علی کی زبان سے بے ساختہ ایسے مختصر سے جملے نکل جاتے تھے جو ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور اپنے اختصار کے باوجود اتنا بلند مفہوم اور اتنی گیرائی و وسعت کہ اس قابل ہیں کہ اُنہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے۔

جدید طریقہ علاج:

سیشن سپرد ہونے سے پیشتر محمد علی نے مجسٹریٹ کے روبرو کتنی حکیمانہ بات فرمائی:

"ایک طریقۂ علاج یہ ہے کہ جو مرض ہو، اُس کا اُسی مرض سے علاج کرنا چاہیے۔ ہندوستان کو بدیسی سوت اور کپڑے نے غلام بنایا ہے، لہٰذا اگر ہم اپنے چرخے اور کرگھے سنبھال لیں تو ہماری آزادی کے لئے یہی کافی ہے۔"

سوراج کی تشریح:

مجسٹریٹ ہی کے روبرو اپنے بیان میں فرماتے ہیں:

"سوراج کا مقصد Servo No Raj ہے یعنی کسی حکومت کی تابعداری نہ کرنا۔"

تشدد اور عدم تشدد:

1923ء میں ایک موقعہ پر محمد علی نے فرمایا تھا:

"غضبناک مجمعوں کا تشدد ایک طرف رکھو اور اُن قوانین کو دوسری طرف رکھو جن سے قوم کو غلام بنایا جا رہا ہے تو میں کہوں گا کہ باوجود اِس کے کہ مجھے تشدد سے نفرت ہے، لیکن میں قیامت کے روز عرشِ الٰہی کے نیچے تشدد کے مجرم کی حیثیت سے کھڑا

ہونا پسند کروں گا، بہ نسبت اِس کے کہ نامردانہ اطاعت کے جرم کا ارتکاب کروں۔''

وزیر ہند کے نام مکتوب:

مسٹر ویجوڈ بن وزیر ہند کو اپنے خط میں فرماتے ہیں:

''میری گفت وشنید کی ناکامی کے بعد جنگ ممکن ہوسکتی ہے، لیکن جنگ کی سرگرمی ناکام رہے تو پھر صلح غیر ممکن ہو جاتی ہے۔''

ایک اہم تقریر:

20 اکتوبر 1920ء کو لاہور کے ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر فرماتے ہوئے محمد علی نے اپنی قوم کو نصیحت کی:

''اپنا جوش اِس قدر دریا دلی سے خرچ نہ کرو، ہمیں اتنا بڑا شعلہ نہیں چاہیے جو ایک ہی دفعہ بھڑک کر ختم ہو جائے۔ ہمیں تو وہ ٹمٹماتا ہوا چراغ چاہیے جو ساری اندھیری رات میں روشنی دے، تاوقتیکہ (سوراج) کا آفتاب نہ طلوع ہو جائے۔''

اچھا وکیل:

اپنی کراچی جیل کی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں:

''سپرنٹنڈنٹ آخر ایک تحریر سنا گیا کہ 26 کو مقدمہ ہے، تیار ہو جاؤ۔ الحمد للہ اس کی ضرورت ہی نہیں، ضرورت اُس کو ہو جو پیروی مقدمہ کرے۔ ہم کو تو اللہ سا ''نعم الوکیل'' چاہیے۔''

باب ۱۳

قومیت اور ملّیت

ہندوستانی سیاسیات میں قومیت اور ملّیت کا مسئلہ بے حد نازک ہے، عام طور پر سیاسیین ہند کے اس بارہ میں دو گروہ ہیں۔ ایک وہ ہے جو ملّیت کا حامی ہے اور اسے مدارجِ حیات کے ارتقاء و استحکام کے لیے بطور اساس کے تصور کرتا ہے،۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو ملّیت کے نام سے بیزار ہے اور وطنیت کا عاشق ہے۔ اُس کے نزدیک ملّیت ایک ایسا بے معنی، مہمل اور لغو مفہوم ہے جس کی متنور الفکر انسانوں کو ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو پست خیالی، دون ہمتی اور تنگ نظری کا حامل ہے، لہٰذا جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس لفظ کو ہندوستان کے سیاسی لغت سے خارج کر دینا چاہیے۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ ملّیت ایک ایسی چیز ہے جو ہر آن، ہر لمحہ اور ہر وقت تبدیل کر لی جاسکتی ہے، لیکن وطنیت ایک ایسا جوا ہے جو اگر انسان کی گردن میں پڑ گیا تو ایسا ''گلوگیر'' ہوتا ہے کہ کبھی بھی نہیں نکل سکتا، اس لیے ہمیں وطنیت کی تو پرستش کرنی چاہیے لیکن ملّیت کے بت کو چکنا چور کر دینا چاہیے۔

محمد علی پہلے گروہ کے ہمنوا تھے، وہ سمجھتے تھے کہ انسانی ترقی و تکمیل کے لیے یہی پابندی ایک اہم پابندی ہے، اور جغرافی حدود کا پابند ہو جانا اور محض اس لیے کہ ایک شخص کا ایک مخصوص خطۂ ارض سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے اُسے نا قابل معافی مجرم سمجھ لینا غلطی ہے۔ وطنیت کے جنون نے لوگوں کی آنکھوں پر ایک پردہ ڈال دیا ہے جس سے وہ حقائق کا مطالعہ اور معائنہ نہیں کر سکتے۔ اُن کا خیال تھا کہ ملّیت کی مخالفت کرنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص اِس کی مخالفت کرنے لگے کہ تم اپنے خاندان، اپنے کنبہ اور اپنے ''عائلہ'' سے دستبردار ہو جاؤ۔ یہ وطن پروری اور وطنیت نہیں ہوئی بلکہ ایک ایسا مراق جس کا

علاج نہ لقمان کے پاس تھا اور نہ موجودہ زمانہ کے کسی ''مسیح الملک'' یا ''شفاء الملک'' کے پاس۔

اپنے خیالات کا اظہار اِس بابِ خاص میں اُنہوں نے متعدد بار فرمایا ہے۔

خلافت کانفرنس میں تقریر:

خلافت کانفرنس کلکتہ کی صدارت کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا:

''میں انسانیت کا قائل ہوں، وطنیت کا نہیں۔ خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے انسان کو مختلف جماعتوں میں متفرق اور منقسم کر دیا۔''

گول میز کانفرنس میں اظہارِ خیال:

اِسی طرح گول میز کانفرنس میں اُنہوں نے بلا تامل اور بلا تذبذب اپنے خیال کا اِس باب میں اعلان فرما دیا:

''میں کہتا ہوں کہ خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے قوموں کو، قومیت (وطنیت) انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے، لیکن مذہب انسانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہے۔''

انڈین نیشنل یونین پر تنقید:

پنڈت موتی لال نہرو نے 1926ء میں ''انڈین نیشنل یونین'' کے نام سے ایک جدید انجمن کی تاسیس کرنا چاہی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام فرقہ وارانہ انجمنوں سے مستعفی ہو کر اُس کی ممبری کا فخر حاصل کیا جا سکتا ہے، محمد علی نے اس پر کتنی سچی تنقید کی ہے:

''بے سوچے سمجھے، کمالِ تعمیم کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ ''کمیونلزم'' یا ملّیت، ''نیشنلزم'' قومیت کے منافی ہے، اِس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ کوئی شخص قوم پروری کے جوش میں لوگوں کو اپنے کنبہ، خاندان کی پرورش اور اُن کی تنظیم سے منع کرتا پھرے، قومیت کو منتہائے نظر بنانا یورپ کی تقلیدِ جامد ہے اور وطنیت خود ''وثنیت'' یعنی بت

پرستی ہے، اسلام وطن پرور ہے مگر وطن پرست نہیں۔"

"اسلام وطن پرور ہے مگر وطن پرست نہیں" کتنا جامع اور کتنا صحیح خیال ہے اور یہی وہ مستقل نظریہ تھا جس کی محمد علی ہر وقت، ہر موقع اور ہر اسٹیج پر تبلیغ کیا کرتے تھے، خواہ وہ گول میز کانفرنس ہو، خواہ کانگرس کمیٹی کا اسٹیج، خواہ خلافت کانفرنس کا پنڈال ہو، خواہ مسلم لیگ کا ہال۔

باب ۱۴

وطن پروری

سطورِ بالا سے یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ محمد علی کا دِل اگر وطن پرستی سے خالی تھا تو وطن پروری بھی اُس کے جذبۂ عمل سے خارج تھی۔

محمد علی یقیناً وطن پرست کسی معنی میں بھی نہیں تھا، ہاں! وہ وطن پرور تھا اور اتنا صحیح الخیال وطن پرور کہ وطنیت کی قبا پہنے ہوئے اس وقت جو لوگ نظر آ رہے ہیں، اُن سے کسی حالت میں اور کسی درجہ میں بھی وہ کم نہ تھا۔ وطن کے لیے اُس کا دِل اِسی طرح کڑھتا تھا جس طرح ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے ''مہاتما'' کا کڑھ سکتا ہے، وطن کے لیے وہ اُسی طرح سر بکف تھا جس طرح کوئی بڑے سے بڑا وطن پرست ہر آن اپنا سر ہتھیلی پر لیے رہتا ہے اور وطنی خدمت اُس نے اِسی طرح کی جس طرح اُس جیسے بطل حریت سے توقع ہو سکتی تھی۔

سائمن کمیشن:

سائمن کمیشن کے زمانہ میں محمد علی نے جو اَنتھک کوششیں کیں وہ کبھی بھی فراموش نہیں ہو سکتیں۔ اُس نے سارے ملک کا دورہ کیا، مقالات و مضامین لکھے، دوستوں کی مخالفت اور ''ہم وطنوں'' کے سب و شتم کو برداشت کیا اور اپنی پوری کوشش صرف کر دی کہ سائمن کمیشن سے تعاون نہ ہونے پائے۔

افغانستان کا حملہ:

اپنی مسلمہ مذہبیت کے باوجود جب ''انڈی پینڈ ینٹ'' کے نمائندہ نے محمد علی سے استفسار کیا:

''اگر امیر کابل ہندوستان پر حملہ آور ہوں تو آپ کی روش کیا ہوگی؟''

اُس نے صاف جواب دیا:

''اگر امیر کابل ہندوستان پر اس لیے حملہ آور ہوں کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کی غلامی کی لعنت سے نجات دلائیں تو میں اُن کی مدد کروں گا، لیکن اگر اُن کی یہ نیت ہو کہ وہ ہندوستان کو اپنا غلام بنالیں اور یہاں اپنی حکومت قائم کریں تو میں اُن کی مدد نہیں کروں گا بلکہ اُن کے خلاف صف آرا ہو کر اُن کا مقابلہ کروں گا اور اپنے وطن کو کسی غیر کا غلام نہ ہونے دوں گا۔'

جنگِ چین:

اِسی طرح چند سال پیشتر 1926ء میں یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ برطانیہ اور چین میں جنگ ہوا چاہتی ہے اور برطانیہ نے کارروائی کا آغاز بھی کر دیا تھا، یعنی کچھ فوج روانہ کر دی تھی اور کچھ روانہ ہونے والی تھی تو محمد علی پھر اپنی پوری طاقت کے ساتھ رونما ہوا۔ کانگریس نے برطانیہ کی اِس روش کے خلاف جو تجویز پاس کی تھی، محمد علی نے اُس کی تائید کی، حمایت کی اور اپنی ساری طاقت اس پر صرف کر دی کہ ہندوستانی فوجیں برطانوی ''امپریلزم'' کا شکار ہونے چین کے میدان میں نہ جائیں۔

محمد علی نے خلافت کمیٹی کی طرف سے مسٹر شعیب قریشی کی اِس آمادگی کا خیر مقدم کیا جب وہ اپنی خدمات اس لیے پیش کر رہے تھے کہ چین تشریف لے جائیں اور مجروحین و مقتولین کی دیکھ بھال اور مدد کریں، گو پاسپورٹ نہ ملنے کی وجہ سے وہ وفد جا نہ سکا۔

دہلی کا ایک جلسہ:

اُسی زمانہ میں دہلی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا تا کہ گورنمنٹ کی اِس روش پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرے۔ جلسہ میں مسٹر سرینواس آئنگر صدرِ کانگریس، پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر سبھاش چندر بوس بھی موجود تھے۔

ایک جسارت انگیز تجویز:

محمد علی نے اُس جلسہ میں ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور گورنمنٹ کی روش پر بڑے سخت انداز میں تنقید کی، اور آخر میں یہ تجویز پیش کی:

''اگر گورنمنٹ اپنی حرکت سے باز نہ آئے اور برابر اپنی امن سوز اور ہندوستان آزار مساعی کا سلسلہ جاری رکھے تو ہمارا فرض ہوگا کہ ہم ریل کی اِن پٹریوں پر لیٹ جائیں اور اپنے آپ کو اُس گاڑی سے کٹوا دیں جس میں ہمارے ہندوستانی بھائیوں کو چین بھیجا جا رہا ہو کہ وہ دوسروں کا حق آزادی سلب کریں اور اپنی غلامی کا اتنا بھونڈا ثبوت دیں کہ ہر شخص کو اس سے شرم آئے۔''

محمد علی کو اس ولولہ انگیز تقریر کا کوئی اور دوسری تقریر مقابلہ نہیں کرسکی!

ایک خط:

اِن صفحات میں محمد علی کی مذہبی حمیت اور احساس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ ایک بار جب موصل میں جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ تھا اور فوجیں لامحالہ ہندوستان ہی سے بھیجی جانے والی تھیں تو اُس زمانہ میں محمد علی حج کا عزم کر رہے تھے، لیکن اِس ''عزم'' کے ساتھ کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو حج سے مقدم ہندوستان میں رہ کر کام کرنا ہوگا۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں مشہور ''یکے از اسیرانِ کراچی'' مولانا نثار احمد صاحب کو لکھتے ہیں:

''حج کے لیے جانے کی نیت رکھتا ہوں۔ ڈر موصل کا ہے، اگر وہاں جنگ چھڑ گئی تو ہندوستان میں رہ کر کام کرنا حج پر بھی مقدم ہوگا۔''

باب ۱۵

جمہوریت بہ حیثیت عقیدہ

بعض عقائد و خیالات انسان کی طبیعت میں اس طرح مرتسم ہو جاتے ہیں کہ کسی ترغیب و تحریص، کسی جاہ و جلال اور کسی فسوں گری اور سحر کاری سے وہ صفحہ قلب سے محو نہیں ہوتے اور ہمیشہ اظہار و اعلان کے لیے مضطر رہتے ہیں۔

ملوکیت وہ لفظ تھا جس کے محمد علی کسی حال میں روادار نہیں تھے اور اِس کے خلاف اظہارِ خیال میں وہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتے تھے، اور برابر ملوکیت کے نقائص و مفاسد کا اظہار کیا کرتے تھے، خواہ وہ حلقہ احباب ہو یا مجمع اعداء۔

مہاراجہ اُلور کا ایک ڈنر:

مہاراجہ اُلور محمد علی کے خاص کرم فرماؤں میں تھے۔ اُنہوں نے محمد علی کو بغرضِ علاج یورپ بھیجا، نواب صاحب رامپور سے دشمنی مول لی۔ محض اس لیے کہ نواب صاحب مرحوم محمد علی کے اوپر سے پابندیاں اُٹھانا نہیں چاہتے تھے جو وہ عائد کر چکے تھے اور جن کی مخالفت مہاراجہ صاحب اُلور کر رہے تھے۔ مہاراجہ صاحب ممدوح نے اپنی سالگرہ کے جشن میں ہندوستان کے سرکاری و نیم سرکاری حضرات کے علاوہ اپنی دوستوں کو بھی مدعو کیا تھا جس میں محمد علی بھی تھے۔

ڈِنر کے اختتام پر محمد علی نے بھی ایک دِل نشین اور دلچسپ تقریر کی، ضمناً اپنے اور مہاراجہ صاحب کے تعلقات کا بھی ذکر کیا اور پھر ملوکیت پر اظہارِ خیال! محمد علی نے کہا:

''مہاراجہ اُلور میرے گہرے دوست ہیں اور میں اُن کی ذہنی و دماغی خصوصیات کا قدردان ہوں''

لیکن ملوکیت میرے حلقہ اطاعت سے خارج ہے۔ میں ملوکیت کا دشمن ہوں اور اس کی حمایت نہیں کر سکتا۔ میرا اگر بس چلے تو میں مہاراجہ صاحب الور کو ''دولتِ متحدہ ہندوستان'' کا پریذیڈنٹ بنا دوں، میں انہیں ''جمہوریہ ہند'' کا صدر بنا دوں لیکن ''مہاراجہ'' نہیں۔''

محمد علی کی اُفتادِ طبع سے چونکہ مہاراجہ صاحب بھی واقف تھے، اس لیے اُن کی تقریر سے وہ بدمزہ نہیں ہوئے۔

ابن سعود کی مخالفت:

سلطان ابن مسعود سے جب تک محمد علی کی یہ توقعات وابستہ رہیں کہ اُن سے تطہیر حجاز ممکن ہے، اس وقت تک وہ برابر بن سعود کی حمایت کرتے رہے اور ذاتی طور پر اُنہوں نے ہر قسم کے شدائد و مصائب کا مقابلہ کیا۔ لیکن جب اُنہوں نے یہ دیکھا کہ توقعات پامال ہو رہی ہیں، اُمیدیں شکست ہو رہی ہیں اور مواعید کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے تو اُنہوں نے مخالفت کی اور سلطان ابن مسعود کو مخاطب کر کے کہہ دیا

''یہ قیصر و کسریٰ کی سنت ہے۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کی نہیں۔''

احیائے خلافتِ راشدہ کی کوشش:

چونکہ وہ ملوکیت سے حد درجہ بیزار اور متنفر تھے اور نظام خلافتِ راشدہ کو وہ بہترین اندازِ جہاں بانی وجہاں آرائی سمجھتے تھے، اس لیے وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی ملوکیت کے ہم آواز نہ ہوئے۔

جب محمد علی نے ابن سعود کی طلب کردہ شرکتِ مؤتمر کا دعوت نامہ قبول کر لیا اور عازم سفر ہوئے، تو اُنہوں نے ''ہمدرد'' میں روانگی سے پیشتر اِن خیالات کا اظہار کیا:

> ''میں نے نیت کر لی ہے کہ اِس سال حج بیت اللہ سے سعادت اندوز ہوں۔ تطہیر حجاز ہو چکی ہے، اگر اِس کے بعد حکومت غلط طریقہ پر تشکیل ہوئی تو نا معلوم مسلمان کتنے عرصہ دراز تک ایک آفت سے نکل کر دوسری میں مبتلا ہو جائیں۔ مسلمانوں نے واقعۂ کربلا کی اہمیت کو نہ سمجھا، ہمیں اِس واقعہ پر صرف سبطِ رسول اور جگر گوشہ بتول کی جانکاہ موت کا ماتم نہیں کرنا ہے، بلکہ نظام خلافتِ راشدہ کی موت پر بھی سینہ کوبی کرنا

ہے۔ تطہیر حجاز نے ایک مؤتمر کے انعقاد کا موقعہ بہم پہنچا دیا ہے اور اُمیدیں بندھ گئی ہیں کہ خلافتِ راشدہ کے منہاج پر ایک صحیح جمہوری حکومت کی تشکیل ہو سکے گی۔ آج ابن سعود کے کیے ہوئے انتظامات بہتر سے بہتر سہی لیکن ملوکیت میں جو نقائص مضمر ہیں، وہ اصلاح نہیں بلکہ افساد کے لازمی طور پر محرک ہوں گے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی غلطی کے باعث مسلمان تیرہ سو برس تک خراب اور پریشان حال رہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اِسی قسم کی ایک غلطی آج ہم سے ہو جائے اور پھر تیرہ سو برس تک ہم ذاتی اور خاندانی اغراض کے چکر میں گھومتے رہیں۔ اب نہ بنواُمیہ کا دور ہو سکتا ہے نہ بنوعباس کا نہ خاندانِ عثمان کا، اب حکومت اسلام ابن اسلام کی ہوگی۔''

گول میز کانفرنس میں محمد علی کا یہ اظہار خیال:

''میں اپنے نہاں خانہ تصورات میں شاہوں اور شاہزادوں کا تصور نہیں پاتا۔''

آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ شہنشاہیت پرستوں کے مجمع میں اس ''غلام'' نے کیونکر اپنی آزادیٔ رائے اور حریتِ قلب وضمیر کا ثبوت دیا۔

ابن سعود کی ایک اور مخالفت:

سلطان ابن سعود نے جب ایک ''بلاغ عام'' کے ذریعہ ہتھیاروں اور آتشیں اسلحہ کے لیے لائسنس کی شرط لگا دی تو محمد علی نے اِس استبداد کی مخالفت کی۔ اُن کا جمہوری احساس اِس کا مخالف تھا کہ عوام پر اس قسم کی مہمل اور لغو شرائط عائد کی جائیں اور اُنہیں رفتہ رفتہ بزدل اور نامرد بنا دیا جائے۔ ابن سعود کے اِس حکم پر وہ اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم اُس ابلاغِ عام پر کس طرح مطمئن ہو سکتے ہیں جو اہل حجاز کو بھی ہماری طرح بزدل بنا دے؟ خالد وضرار کی قوم کو ترکوں نے بھی اِس طرح بزدل بنانے کی کوشش نہیں کی۔''

بہرحال محمد علی کا یہ مستقل عقیدہ تھا کہ اسلام میں مسولینی کی گنجائش بالکل نہیں!

باب ۱۶

شاعری

آیئے! اس مختصر صحبت میں ایک سرسری نظر محمد علی جوہر کی شاعری پر بھی ڈال لیں۔

محمد علی کو شعر و شاعری سے بچپن ہی سے لگاؤ تھا، شاید یہ ماحول کا اثر ہو کہ رامپور تو اُس وقت مرکز شعر اُٹھا۔ پھر بریلی اور علی گڑھ میں بھی اِس قسم کے اثرات پیدا ہوتے رہے کہ اُن کی طبیعت میں تحریک پیدا ہو۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ محمد علی شعر کہتے تھے، اُنہیں شاعری سے دلچسپی تھی اور جب اُن کی طبیعت کھلتی تھی تو کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔

جوہر کی شاعری کے نشو و نما اور آغاز سے متعلق ہمیں دلچسپ معلومات خود جوہر ہی کے قلم سے معلوم ہو گئے ہیں۔

مکتوب بنام عبدالماجد:

شانِ نزول یہ ہے کہ مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کے ایک استفسار کے سلسلہ میں چھنڈواڑہ کے نظر بند نے خود اپنے قلم سے اپنی شاعری کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے، جس کے اہم اجزاء یہ ہیں:

> ''آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں؟ بچپن میں تو بہت سے ایسے سامان بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف وابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا ہوں۔ رامپور میں اُس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، جلال،

عروج دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا شوق ہوا۔ تین چار عزیز اُستاد داغؔ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہرؔ اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں ساحب اور اُن کے بھائی حافظ احمد علی صاحب شوقؔ شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا، پھر داغؔ کو نواب کلب علی خاں مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی، ازراہِ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کارِ بے کار اُن کی نذر نہ ہو۔ ذوالفقار روزانہ داغؔ کے گھر جاتے تھے اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔ داغؔ نے پہلے دن پوچھا، کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں؟ میری عمر بہت ہی کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیئے تھے جنہیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغؔ ہی کے چند شعر اُنہیں سنا دے، سن کر پھڑک گئے اور اِس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اِس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا! اِس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا، مگر میرا دعویٰ تو اِس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سنیے! میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اُس کی توند پر کودا ہوں، اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔''

مولانا عبدالماجد کی رائے:

یہ تو تھا خود جوہرؔ ہی کی زبان سے اپنی شاعری کے آغاز و ابتدا کا بیان، لیکن اُن کی شاعری کی خصوصیات کیا ہیں، رنگ کیا ہے، پیام کیا ہے، اندازِ بیان اور طریقۂ ادا کیسا ہے؟ اِسے جوہرؔ کے ایک بہت بڑے قدر شناس اور اِس سے زیادہ دوست اور اِس سے زیادہ نقادِ فن مولانا عبدالماجد صاحب کی زبان سے سنیے:

''جوہرؔ کی شاعری اُن کے قلب کی زبان، اُن کے جذبات کی ترجمان اور اُن کی

واردات کا بیان ہے۔ آورد، تصنع اور تکلف کا اُن کے ہاں گزر نہیں۔ اُن کے قلب پر جو کچھ گزرتی رہتی ہے، وہ بلا تکلف زبانِ قلم پر آ جاتی ہے۔ تاثیر اِس طرزِ سخن کا لازمی نتیجہ ہے اور یہ وصف اُن کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اُن کی شاعری گل و بلبل، زلف و کاکل، خط و عارض سے یکسر تہی ہے۔ اُن کا کلام ایک حقیقی مسلم کا کلام ہے، اُن کے جذبات تمام تر وہ ہیں جو ایک مسلم صادق کے ہونے چاہئیں۔ بے شبہ اُن کی شاعری بھی چاشنیٔ عشق سے بیگانہ نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ عشق کی کسک اُن کے ایک ایک مصرعہ میں موجود ہے، البتہ اُن کا معشوق نہ ایران کا ''سبز خط'' ہے نہ ہندوستان کا ''بتِ سیمیں بدن''۔ اُن کا معشوق مردہ نہیں زندہ ہے، فانی نہیں باقی ہے، سفاک و ستمگر نہیں رحمٰن و رحیم ہے۔ اُن کا محبوب وہ ہے جو ہر مسلم بلکہ ہر سلیم الفطرت کا ہوتا ہے۔''

اگر جوہر کی شاعری کی تحلیل کی جائے تو وہ اِسی مذکورۂ بالا اصول کے مطابق محدود ہو گی، اس سے باہر نہیں جا سکتی۔

انتخابِ کلام:

طوالت کے اندیشہ سے ہم خود جوہر کی شاعری پر کوئی اظہار نہیں کرتے، اس لیے کہ نہ وہ مذکورۂ بالا رائے سے بہتر ہو سکتی ہے نہ اِس سے زیادہ عمدہ پیرایۂ بیان میں ظاہر کی جا سکتی ہے۔ اس لیے اظہارِ رائے سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم اُن کے کلام کا عطر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب انتخاب کلام شروع ہوتا ہے:

غزل بہ زمانۂ طالب علمی علی گڑھ کالج 1897ء

کیوں مے پرست دیکھ کے مدہوش ہو گئے — شیشہ میں مے بھری تھی کہ اللہ کا نور تھا
کس زور کی لڑائی تھی، اللہ ری کشمکش — تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا
کیوں تابِ دید حضرتِ موسیٰ نہ لا سکے؟ — کیا پہلوئے عدو کی طرح کوہِ طور تھا؟

خوش قسمتی کے آگے جھکایا کبھی نہ سر اِس خانماں خراب کو کتنا غرور تھا
میں تیرا گھر سمجھا کے سر راہ گر پڑا دیکھا جو آنکھ اُٹھا کے تو دروازہ دُور تھا

ایضاً

ارادہ تھا یہ نالوں کا، ہلا دیں ربع سکوں کو مگر اے ہم نفس! دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے
یقیں آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں پر تری آنکھ اے بتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
حرم میں تو کرے اظہارِ ترکِ مے کشی جوہرؔ مگر کمبخت کی بوئے دہن کچھ اور کہتی ہے

رائے بریلی اپریل 1898ء

غیر کا خط ہے کہ دِل ہے کسی دِل دادہ کا کچھ تو ہے جو مٹھی میں چھپا رکھا ہے
یہ ستانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب ظلم کا نام ستم گر نے حیا رکھا ہے
آپ آ رہے ہیں عیادت کو دم نزع عبث جوہرؔ خستہ میں اب کہیے تو کیا رکھا ہے

بعد امتحان بی۔اے۔

جنوں باقی ہے اب تک گو تری محفل میں بیٹھا ہوں کہ رہ رہ کر خیال آتا ہے جوہرؔ کو بیاباں کا

....

خوف غماز، عدالت خطر، دار کا ڈر ہیں جہاں اتنے، وہاں خوفِ خدا اور سہی
ربّ عزت کیلئے بھی کوئی رہتے دو خطاب تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی

....

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے اِسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

....

نورِ حق وہ شمع انور ہے جو بجھ سکتی نہیں ہے خدا حافظ چراغِ رہ گزارِ باد کا

آج تک ہے ایک کنعانی سے شہرت مصر کی فیض سے حسرتؔ کے ہو گا نام فیض آباد کا
(مولانا حسرتؔ موہانی اُس زمانہ میں فیض آباد جیل میں اسیر تھے!)

....

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سردار دیکھ کر دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر
اس شانِ امتیاز کو دیکھو کہ اہل کفر مومن سمجھ رہے ہیں ہمیں خوار دیکھ کر
تیرِ نگہ نے کر دیا دونوں کا فیصلہ باہم دِل و جگر میں یہ تکرار دیکھ کر
ہم خاص گانِ اہل نظر اور یہ قتل عام جور و ستم بھی کر، تو ستم گار دیکھ کر
ہر سینہ آج ہے ترے پیکاں کا منتظر ہو انتخاب، اے نگہ یار دیکھ کر

....

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور
گر بوئے گل نہیں، نہ سہی یادِ گل تو ہے صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور
آساں نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا شیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہ کن سے دور
ہم تک جو دَورِ جام پھر آئے تو کیا عجب یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور
شاید کہ آج حسرتِ جوہرؔ نکل گئی اِک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور
ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ دُنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ
ہے سنتِ اربابِ وفا، صبر و توکل چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ
دشتِ رہِ غربت میں اکیلا تو نہیں تُو بطحا کے مہاجر کا تو نقشِ کفِ پا دیکھ
اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا اِس سادگی پر سرخیٔ خونِ شہداء دیکھ
یہ نور خدا کا ہے، بجھائے نہ بجھے گا کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ، تُو بھی بجھا دیکھ
ہوں لاکھ نظر بند، دُعا بند نہیں ہے اللہ کے بندوں کو نہ اِس درجہ ستا، دیکھ!
ہو حسنِ طلب لاکھ، مگر کچھ نہیں ملتا ہو صدقِ طلب، پھر اثر آہِ رسا دیکھ

سونے کا نہیں وقت یہ، ہشیار ہو غافل رنگِ فلک پیر، زمانہ کی ہوا دیکھ

....

تشنہ لب ہوں مدتوں سے دیکھئے کب درِ مے خانۂ کوثر کھلے
طاقتِ پرواز ہی جب کھو چکے پھر ہوا کیا، گر ہوئے بھی پر کھلے
چاک کر سینہ کو، پہلو چیر ڈال یوں ہی کچھ حالِ دلِ مضطر کھلے
لو وہ آ پہنچا جنوں کا قافلہ پاؤں زخمی، خاک منہ پر، سر کھلے
ہوں جو کثرت ہی کے قائل، اُن پہ کیا راز فتح سبط پیغمبر کھلے
رونمائی کے لیے لایا ہوں جان اب تو شاید چہرۂ انور کھلے
اب تو کشتی کے موافق ہے ہوا نا خدا کیا دیر ہے لنگر کھلے
یہ نظر بندی تو نکلی ردّ سحر دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم حق کے عقدے اب کہیں جا کر کھلے
اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ بال و پر نکلے، قفس کے در کھلے
جیتے جی تو کچھ نہ دِکھلایا مگر مر کے جوہؔر آپ کے جوہر کھلے

....

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی ہوس زیست ہے اس درجہ تو مرنا ہے یہی
قید گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد؟ تیری زلفوں کا جو شانوں پہ بکھرنا ہے یہی
نقدِ جاں نذر کرو، سوچتے کیا ہو جوہؔر کام کرنے کا یہی ہے، تمہیں کرنا ہے یہی

....

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا ہے جو حسین ابن علی کو خوش ہوں، وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے
میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے
سرخی میں نہیں دستِ حنا بستہ بھی کچھ کم پر شوخیِ خونِ شہداء میرے لیے ہے
اے شافع محشر! جو کرے تُو نہ شفاعت پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لیے ہے؟
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف کافی ہے، اگر ایک خدا میرے لیے ہے
ہیں یوں تو فدا ابرِ سیہ پر سبھی میکش پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لیے ہے

....

ہوں لائق تعزیر پہ الزام ہے جھوٹا مجرم تو ہوں بے شک پہ خطا اور ہی کچھ ہے
خود خضر کو شبیر کی اِس تشنہ لبی سے معلوم ہوا آبِ بقا اور ہی کچھ ہے
نے سائل دولت ہیں نہ عزت کے طلبگار اُس در کے فقیروں کی صدا اور ہی کچھ ہے
یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہو گی پر تیرے اَسیروں کی دُعا اور ہی کچھ ہے
یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہرؔ لیکن صلہ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

....

الوداع اے ماہِ رمضاں، الوداع بہترین غم گساراں الوداع
اِن دِنوں تھا بحر رحمت جوش پر اے زمانِ عفوِ عصیاں الوداع
قیدِ تنہائی کی رونق تجھ سے تھی اے شریکِ بزم زنداں الوداع
شدتِ غم سی زباں گر بند ہے تُو ہی کہہ دے چشم گریاں الوداع

....

کیا ڈھونڈھتے ہو فصل خزاں میں بہار کو؟ اب وہ چمن کہاں ہے، وہ رنگ چمن کہاں؟
سن لیجے خلوتوں میں انا الحق کا اَدعا سولی پہ چڑھ سنائے وہ اب نعرہ زن کہاں؟

فرصت کے خوشامد شمر و یزید سے اب ادعائے پیروی پہ پنجتن کہاں؟

....

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے ہر روز یہی چرچے، ہر روز یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت اک فاسق وفاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن، شاید وہ بلا بھیجیں بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں
بیٹھا ہوا توبہ کی تُو خیر منایا کر ٹلتیں نہیں یوں جوہؔر اس دیس کی برساتیں

....

پھر ہو رہا ہے شورِ صلائے نبردِ عشق ہاں اے دہانِ زخم، جواب 'الاماں' نہ ہو
سنتے ہی جس کے، خلق میں کہرام مچ گیا جوہؔر وہ یہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

....

بے خوف غیر دِل کی اگر ترجماں نہ ہو بہتر ہے یہ کہ ایک سرے سے زباں نہ ہو
اِک توجہ مہرباں ہو تو ہر اِک ہو مہرباں اور یوں نہ ہو، بلا سے کوئی مہرباں نہ ہو
ہمت نہ ہار دے کوئی منزل کے سامنے پروردگار! یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو

....

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی؟

....

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ
کیا عشق ناتمام کی بتلاؤں سرگزشت دار و رسن کا اور بھی انتظار دیکھ

....

قید ہے، قیدِ غلامی دو برس کی قید کیا دیکھو! کب ہو خاتمہ اِس قیدِ بے میعاد کا؟

....

رہے گا اُٹھ کے یہ اِک دِن نقاب دیکھو تو ہمارے ربّ ہو، ہمیں سے حجاب، دیکھو تو

....

اِس دردِ لا دوا کی دوا ہو تو جانیے دست ِ مسیح میں یہ شفا ہو تو جانیے
ہر شے کو لے کے شکر کِیا بھی تو کیا کِیا جان دیتے وقت شکر ادا ہو تو جانیے

....

مہمان قفس کیا ترے فریاد کریں گے اتنی بھی نہ اب خاطر صیاد کریں گے
وہ جس سے کہیں ہم تجھے دِل شاد کریں گے سمجھو کہ اسے اور بھی برباد کریں گے
جو دشت کہ آرام گہ سبط بنی ہے اُس دشت کو لاکھوں ابھی آباد کریں گے

....

گلہ اے دل ابھی سے کرتا ہے عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے
جان دیتا ہے عیش فانی پر بس، اسی زندگی پہ مرتا ہے
جس کو دنیا نے نامراد کہا وہی ناکام، کام کرتا ہے
آج کر لو جو کر سکو کل تک کون جیتا ہے، کون مرتا ہے
قلزم عشق میں گرا، سو گرا اس کا ڈوبا کہیں اُبھرتا ہے
اس قدر احتیاط اے صیاد کہ قفس میں بھی پر کترتا ہے
وہی دِن ہے ہماری عید کا دِن جو تری یاد میں گزرتا ہے

....

بے تاب کر رہی ہے تمنائے کربلا یاد آ رہا ہے بادیہ پیمائے کربلا
روزِ ازل سے ہے یہی اِک مقصدِ حیات جائے گا سر کے ہاتھ ہی سودائے کربلا
جوہر مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ چیز اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا

....

ہرگز نہ ہو اے دِل! غم جاناں کی شکایت کرتا ہے بھلا کوئی بھی مہماں کی شکایت
ہیں عشق کے بیمار بھی دُنیا سے نرالے ہے درد کے بدلے اُنہیں درماں کی شکایت

....

غافل خدا کے قہر سے دیتی نہیں پناہ سد سکندری ہو کہ دیوار چین کی

....

اگلی سی اب وہ زعم میں طغیانیاں کہاں شب بھر میں کیا بھری ہوئی ندی اُتر گئی
صیاد کیا ہوئی وہ تریا خوئے احتیاط مرغِ خیال کے نہ مرے پر کتر گئی
مانا کہ یاں تک آنے کی فرصت نہیں اُنہیں پوچھو تو آج موت کہاں جا کے مر گئی؟

....

ہیں یہ انداز آزمانے کے اور ہی ڈھنگ ہیں ستانے کے
کربلا ہے بہانۂ کوثر جایئے صدقے اس بہانے کے
گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے تھے نہ ہم اُس کے آستانے کے
ایک اِک کر کے سب کے سب تنکے کیے برباد آشیانے کے
دیکھئے اب یہ گردش تقدیر کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال ہم ہیں باشندے جیل خانے کے
قید میں اور اتنی بے باکی سب یہ لچھن ہیں مار کھانے کے

....

نعلین ہی پہ ہو نہ کہیں اکتفا کلیم اِس آستاں پہ آئے تو سر بھی اُتار دے
دے نقد جان تو بادۂ کوثر ابھی ملے ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ مے اُدھار دے
رہرو تھا راہِ عشق کا منزل کو پا لیا اب اور کیا فشاں مری لوحِ مزار دے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کو موت پر یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

....

ہے بات تو جب نزع میں تمکیں رہے قائم مقتل ہے ولا! رقص کی محفل تو نہیں یہ
نالے کی غنیمت ہے اب اتنی بھی رسائی وہ پوچھ رہے ہیں کوئی سائل تو نہیں یہ
آئی نہ ہو زنداں میں خبر، موسم گل کی سننا تو ذرا، شورِ عنا دِل تو نہیں یہ
یاں قافلہ لٹتا ہے بس اب یاں سے چل اے دِل تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں یہ
مجنوں ہے تو کیا عشق کا احساس بھی کھویا جس میں تری لیلیٰ ہو، وہ محمل تو نہیں یہ

....

چھوڑ میری فکر غافل، رو خود اپنی قید پر جس کو تُو زیور سمجھتا ہے وہی زنجیر ہے

....

نہ اُڑ جائیں کہیں قیدی قفس کے ذرا باندھنا صیاد گس کے
گراں ہو اب تو شاید سیر گل بھی کچھ ایسے ہو گئے خوگر قفس کے

....

قید اور قید بھی تنہائی کی شرم رہ جائے شکیبائی کی
سوجھتا کیا ہمیں اِن آنکھوں سے؟ شرط تھی قلب کی بینائی کی
عقل کو ہم نے کیا نذر جنوں عمر بھر میں یہی دانائی کی
کر گئی زندۂ جاوید ہمیں تیغ قاتل نے مسیحائی کی
کل کو ہے پھر وہی زنداں جوہر ٹھیک کیا، آپ سے سودائی کی

....

دعویٰ توحید کا تُو کرتا ہے نفس کو مت خدا بنا لینا
ہو اِدھر بھی کبھی نگاہِ کرم ہم غریبوں کی بھی دُعا لینا

ایک ہی جام اور یہ سرمستی ساقیا، دیکھ! میں چلا، لینا
تم کو زیبا نہ تھا دواع کے وقت آنکھ جوہؔر سے یوں چرا لینا

....

تجھے تسکینِ دِل پایا، تجھے آرامِ جاں پایا نہاں بھی ہے تو کیا، تجھ کو جہاں ڈھونڈا وہاں پایا
ہمیں ہر چیز میں آئی نظر، یا ربّ ادا تیری وہ کیسے ہوں گے جن لوگوں نے بخوبی نشاں پایا
ترا وہ مبتلا، ناکام سمجھا جس کو دُنیا نے اُسی کو سرخرو دیکھا، اُسی کو کامراں پایا
نہیں معلوم، کیا ہو حشر جوہؔر کا؟ پر اتنا ہے کہ ہاں نام محمدؐ مرتے دم وردِ زباں پایا
کبھی جوہؔر کے پہلو میں بھی اِک آتش فشاں دِل تھا پر اب کی بار جو دیکھا تو یونہی سادھواں پایا

....

عشق ہی باعثِ تکوینِ جہاں ہے غافل تو نے جانا کہ یہ اِک شغل ہے بے کاری کا

....

جوہؔر سا سیہ کار اور انجام شہادت اِس سے تو کسی کو بھی نہ تھا اِس کا گماں تک

....

جیل میں اپنی صاحبزادی آمنہ بیگم کی علالت کی خبر پاتے ہیں، بے بال و پری کے عالم میں صبایہ پیام اسیر متعلقین تک پہنچاتی ہے۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں تجھ سے میں دُور سہی، وہ تو مگر دُور نہیں
امتحاں سخت سہی پر دِل مومن ہے وہ کیا جو ہر ایک حال میں اُمید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلا اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

....

تتمہ:

جوہرؔ کی شاعری کا انتخاب آپ کے سامنے پیش کیا جا چکا۔ اربابِ نظر اور ماہرین فن سے ایک بزرگ کی رائے اُن کی شاعری سے متعلق اور خود جوہرؔ کا بیان اپنی شاعری کے محرکات وآغاز پر آپ کے سامنے ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جوہرؔ کی شاعری کس پایہ کی تھی، آمد اُن کی شاعری کا طغرائے امتیاز تھا یا آورد؟

یہاں انتخابِ کلام کے متعلق ایک بات عرض کرنی ہے، یہ کہ انتخابِ کلام متفرق سرخیوں میں منقسم کر کے پیش نہیں کیا گیا۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مقصود یہ تھا کہ اُن کا کلام شروع سے آخر تک جو مدارج اور مراحل طے کر چکا ہے اور اُن کے رنگ میں جس طرح تدریجی تغیر ہوا ہے، وہ بھی آپ کے سامنے رہے۔

دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ اِس کتاب کی مختصر ضخامت اِس کی متحمل نہیں ہوسکی کہ ایک طویل تبصرہ کے ساتھ اُن کا کلام پیش کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے جو اُن کے انتخابِ کلام میں بھی ایک حد تک بخل سے کام لیا گیا ہے اور اکثر اشعارِ آبدار محض قلتِ گنجائش کی وجہ سے چھوڑ دینے پڑے۔

انشاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں جس کو ہر اعتبار سے زیادہ مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی، اِن ناگزیر کوتاہیوں کی تلافی بھی کی جاسکے گی۔

❀❀❀

باب ١٧

طول نویسی

محمد علی اگرچہ ایک وسیع النظر ادیب اور زبان وادب سے خاص دلچسپی رکھنے والی طبیعت کے مالک تھے، اور اُن کا طرزِ انشا بھی اپنے اندر ایک مخصوص اسلوب رکھتا تھا۔ لیکن با ایں ہمہ اِس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ محمد علی کی تحریر خواہ وہ کتنی ہی دلچسپ اور جاذبِ توجہ ہو، ضرورت سے کہیں زیادہ طویل ہوتی تھی۔ مکرّرات کی تعداد بھی خاصی ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر ستم یہ تھا کہ گزشتہ روز جو مقالۂ افتتاحیہ وہ تحریر فرما چکے ہوتے تھے، اُسی کو بہ تغیر خفیف ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو کالم تک پھر بیان کرتے تھے اور اِس کے بعد اصل موضوع پر گفتگو کرتے تھے، اور اِس میں بھی گفتگو کرتے کرتے وہ دوسرے غیر متعلق لیکن نہایت مفید و کارآمد اور دلچسپ پہلوؤں پر بھی گفتگو کرنے لگتے تھے جس سے کم صبر پڑھنے والوں کو باوجود عقیدت اور دلچسپی کے بعض اوقات تکلیف ہوتی تھی۔

بات بھی کچھ ایسی ہے کہ موضوع چاہے جتنا دلچسپ اور شگفتہ ہو اور لکھنے والا بھی چاہے جس قدر شوخ اور دلچسپ اندازِ بیان رکھتا ہو، مگر ایک ہی موضوع پر زیادہ طوالت ناظرین کو عاجز کر دیتی ہے، اور پھر محمد علی کا سا غضب کا لکھنے والا کہ لکھنے بیٹھ گئے تو ''ہمدرد'' کی باریک کتابت میں آٹھ آٹھ، نو نو کالم کے مضامین لکھ ڈالے۔ لیکن کیا محمد علی کا ہمیشہ سے یہی اندازِ تحریر تھا؟ نہیں!

جب پہلے پہل اُنہوں نے میدانِ عمل میں قدم رکھا ہے اور اُن کی خداداد قابلیت اور ذہانت کا ہر طرف سے نعرۂ تحسین اور مرحبا کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا، جس وقت اُن کے ولولے تازہ تھے اور قوتِ عمل

جوان، اُس وقت محمد علی کا انداز یہ نہیں تھا۔ اُس وقت اُن کے مقالاتِ افتتاحیہ اور بیانات معیارِ عام کے موافق ہوتے تھے، لیکن آخر عمر میں جب وہ نرغۂ اعداء میں گھرے ہوئے تھے اور اُن کی ہر بات ٹھکرائی جا رہی تھی، اُن کے احباب و رفقاء ایک ایک کر کے اُن سے الگ ہو رہے تھے اور اُن کے متبعین اور مریدین اُن کی اطاعت سے منہ موڑ رہے تھے، اُن کی اچھی سے اچھی بات پر کان نہیں دھرے جاتے تھے اور اُن کی بہتر سے بہتر تجویز کی مخالفت ''آزادیٔ رائے''، ''حریتِ ضمیر'' اور ''عدم تقلید'' کا ثبوت تھی۔ اُس وقت اُن میں یہ نقص پیدا ہوا اور اُس وقت اُن کی تحریریں بارِ نظر ثابت ہونے لگیں۔

محمد علی بھی اپنی طول نگاری کے نقص سے ناواقف نہیں تھے، وہ خود بھی اسے محسوس کرتے تھے اور نہایت شدت کے ساتھ سمجھتے تھے کہ میں ایک ادبی جرم کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ معذور تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے خیالات و احساسات اور اپنے اعتقاد و نظریات کو قبول کرائیں کہ ایک ''زعیم'' کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ لیکن وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ اُن کی مخالفت بھی قدم قدم ہوتی تھی، اس لیے مجبوراً وہ طوالت سے کام لیتے تھے تاکہ اپنا مفہوم پڑھنے والے کے دِل میں پوری طرح اُتار دیں۔ ایک مرتبہ شدتِ تاثر میں اِس موضوع پر اُنہوں نے خود بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو اُن کی طرف سے بہترین صفائی ہو سکتی ہے۔

محمد علی کا ''بیان'':

> ''میرے مضامین کی طوالت کچھ اِس باعث ہوتی ہے کہ میں ملک وملت ہی کے اور کاموں میں اُلجھا رہتا ہوں اور مضمون نگاری کے لیے اِتنا وقت نہیں ملتا کہ سوچ کر ایسے الفاظ اور فقرے تلاش کروں جن سے مطلب بھی ادا ہو جائے اور اختصار بھی ہو جائے۔ ایک صاحب نے اپنے ایک دوست کو بالکل درست لکھا تھا کہ ''معاف کرنا، خط بہت طویل ہو گیا، مختصر لکھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکا۔'' جو میری طرح قلم برداشتہ لکھنے پر مجبور ہو، وہ بے چارہ کیا اختصار کر سکتا ہے؟ لیکن میرے مضامین اور میری تقریروں کی طوالت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میں چاہتا ہوں، اپنے

قارئین وسامعین کے دلوں میں بھی وہی خیالات بھر دوں جو میرے دل میں بھرے پڑے ہیں۔ یہی خواہش مجھے بے چین کیے رہتی ہے اور ہر وقت خوف دامن گیر رہتا ہے کہ شاید ابھی یہ میرا مفہوم نہیں سمجھے۔ ابھی یہ میرے دلائل و براہین سے قائل نہیں ہوئے، ابھی میرے دِلی احساسات نے اُن کے دِلوں میں وہی احساسات پیدا نہیں کیے۔ اُنہیں ادھ کچرا چھوڑنا جائز نہیں، دو فقرے اُن کو اور لکھ دوں۔ جو سبق اُن کو پڑھانا چاہتا ہوں، وہ ابھی اُنہیں یاد نہیں ہوا ہے، اُسے پھر ایک دفعہ آموختہ میں خود ہی نہ پھیر دوں؟ کاش! میرے بھائی اِسے مان لیں کہ میری ساری طوالت اور میری ساری علالت اسی لیے ہے کہ

من قاش فروش دِل صد پارۂ خویشم

یہ ہیں محمد علی کی ''طوالت اور علالت'' کے اسباب جنہیں اُن کی زندگی میں کسی نے نہیں سمجھا۔ جو شخص تار پر ''کامریڈ'' کا ''لیڈنگ آرٹیکل'' بھیجتا ہو، وہ اتنا وقت کہاں سے نکال سکتا ہے کہ سکونِ خاطر اور اطمینانِ قلب سے ''ہمدرد'' کے لیے مضامین لکھے اور جن کے الفاظ بالکل نپے تلے ہوں؟

باب ۱۸

رفق ومحبت اور ''جذباتیت''

جلوت میں محمد علی کا معائنہ کرو تو وہ ایک جنگجو، بپھر کر لڑنے والا، باطل کے لیے صاعقہ موت اور اشرار صفت احرار کے لیے پیام ہلاکت تھا۔

لیکن اگر خلوت کے آئینہ خانہ میں اس کی تصویر دیکھو تو اپنی آل اولاد، اپنے اعزاء واقرباء اور اپنے دوست احباب کے ساتھ وہ ایک محبت کرنے والا، اُن کی مصیبت پر خود بے قرار ہو جانے والا، اُن کی تکلیف کا احساس کرنے والا اور اُن کے ہر دُکھ درد کا شریک نظر آئے گا۔

وہ ایک سنجیدہ مدبر، وسیع النظر ادیب، بلند آہنگ خطیب اور سحر نگار انشا پرداز تھا۔ لیکن جب کبھی تھوڑی دیر کے لیے اُس کو یہ موقعہ مل جاتا کہ وہ سیاسی اور پبلک مشغولیتوں سے الگ ہو کر اپنی کچھ ساعتیں بسر کر سکے تو وہ ایک ہنس مکھ، بچوں کے ساتھ کھیلنے والا اور زندہ دِل آدمی تھا۔

اُسے اپنے بھائی سے عشق تھا، اپنی ماں پر وہ پروانہ وار نثار ہوتا تھا، اپنی بچیوں سے اُسے دیوانہ وار اُلفت تھی اور اپنے احباب سے نہایت گہرا تعلق تھا۔

بچوں سے محبت:

محمد علی کو چھوٹی عمر کے بچوں خصوصاً بچیوں سے بہت محبت تھی۔ جہاں اُن کے سامنے کوئی بچہ آ گیا، بس پھر وہ اپنے بے پناہ جذبہ مہر ومحبت کو ضبط نہیں کر سکتے تھے اور یہ جذبہ مہر ومحبت ''وطنیت اور ملّیت'' کے دائرہ میں محدود نہیں تھا۔ بچے ہوں اور محمد علی ہوں، پھر اُن کی محبت اور شفقت کا کوئی منظر دیکھ لے!

جامعہ ملیہ کے بچے:

محمد علی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے جو گہرا تعلق تھا، وہ سب کو معلوم ہے۔ کوچہ چیلاں سے جب قرول باغ میں اُنہوں نے قیام فرمایا ہے تو قربِ مکانی کے باعث جامعہ اکثر تشریف لاتے تھے اور جامعہ کی ہر تقریب میں وہ شریک ہوتے تھے، اور جب کبھی وہ چھوٹے بچوں کے ہوسٹل ''خاکستار منزل'' میں پہنچ جاتے تھے تو بس جاتے ہی وہ بھی ''بچہ'' بن جاتے تھے، اور فرمایا کرتے:

''کاش اپنے ''سینگ'' کٹا کر میں بھی اِن ''بچھڑوں'' کے ساتھ شامل ہو جاتا۔''

آخر عمر میں تو اکثر وہ اپنے اِس عزم کا اظہار فرمایا کرتے تھے کہ وہ سیاسی مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے بس جامعہ ہی کے ایک گوشہ میں عزلت گزین ہو جائیں گے۔ گو موت کے بے درد ہاتھوں نے اُن کی یہ تمنا اور جامعہ کی یہ خواہش دیرینہ پوری نہ ہونے دی!

ایک اور واقعہ:

مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ روایت فرماتے ہیں کہ وہ ایک بار محمد علی کے ہاں مقیم تھے، کسی سلسلہ میں نواب اسمٰعیل خاں بیرسٹرایٹ لاء (موجودہ خازن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے متعلقین بھی محمد علی کے ہاں فروکش تھے۔ کمرہ میں محمد علی بیٹھے ہوئے تھے، اِتنے میں نواب صاحب کی چھوٹی بچی آ گئی۔ محمد علی اُس کے ساتھ بالکل ''بچہ'' بن گئے اور کمرہ بھر میں کبھی محمد علی دوڑتے تھے تو وہ بچی اُن کا پیچھا کرتی تھی اور وہ بچی دوڑتی تھی تو محمد علی اُس کا تعاقب۔ کبھی محمد علی کسی طرف چھپ جاتے تھے اور وہ بچی اُنہیں ڈھونڈتی تھی اور کبھی وہ بچی چھپا چاہتی تھی تو محمد علی اُسے پکڑ لیتے تھے۔

مولانا ممدوح فرماتے ہیں کہ بڑی دیر تک یہ دلچسپ سلسلہ جاری رہا۔

بی اماں سے محبت:

یہ تو تھا بچوں سے اُن کی محبت کا حال لیکن اپنے بھائی، ماں اور دوسرے احباب سے بھی اُن کی غایت درجہ کی محبت تھی۔

میر محفوظ علی کا بیان:

میر محفوظ علی صاحب، مولانا شوکت علی صاحب کے نام ایک مکتوب میں ضمناً ایک بہت مؤثر واقعہ لکھتے ہیں۔ یعنی جب بی اماں سفر حج سے واپس تشریف لائی ہیں، اُس وقت محمد علی کی کیا کیفیت تھی؟ وہ فرماتے ہیں:

> ''مجھے اب تک یاد ہے کہ جب بی اماں مرحومہ حج بیت اللہ سے واپس آ رہی تھیں اور بمبئی میں محمد علی ایک لبادہ پوش ضعیفہ کو جہاز سے اُتارنے گئے تھے، تو وارفتگیٔ جنوں کی کیا کیفیت تھی!''

مکتوبِ محمد علی:

اتفاقاً ہمیں خود محمد علی کا ایک مکتوب مل گیا جو میر محفوظ علی کے نام ہے اور جس میں وہ خود اِن الفاظ میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔ یہ مکتوب اُس زمانہ کا ہے جب وہ بڑودہ میں ملازم تھے:

> ''رمضانِ گزشتہ سے دِل بیت اللہ کی طرف تھا اور نعوذ باللہ من ذلک نہ اِس وجہ سے کہ خدا کا گھر ہے بلکہ اِس خیال سے کہ میری ماں وہاں خدا کی مہمان ہے۔ ۲۰/ اپریل سے بمبئی میں تھا، اِس سے قبل دوڑا ہوا رامپور گیا تھا کہ کہیں وطن نہ پہنچ گئی ہو۔ ۵/اپریل کو جہاز آیا، کوئی عاشق اپنی معشوقہ سے ملنے کے لیے اتنا بے تاب نہ ہوا ہوگا جس قدر اس ضعیفہ سے میں گلے لپٹنے کے لیے بے تاب تھا۔''

ایک اور واقعہ:

میر محفوظ صاحب کے اِس بیان سے راقم الحروف کو بھی ایک واقعہ یاد آ گیا۔ کانپور میں محمد علی نے جب ''علماء کانفرنس'' اور ''مؤتمر اسلامی'' منعقد کرائی ہے تو ندوہ سے راقم سطور بھی اُس میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ شوکت صاحب اُس زمانہ میں جنوبی افریقہ میں تشریف رکھتے تھے، لیکن عین اُنہیں تاریخوں میں وہ ہندوستان واپس تشریف لائے تھے اور سیدھے کانپور پہنچے تھے۔ پنڈال میں شوکت صاحب آئے

تو محمد علی اتنے عرصہ کی مفارقت کے بعد جس بے تابی، محبت اور جوش کے ساتھ شوکت صاحب سے بغل گیر ہوئے ہیں، وہ منظر زبانِ قلم بیان نہیں کر سکتی نہ اُس کی اثر آفرینی الفاظ و عبارت کا جامہ پہن کر اِس صورت میں نمایاں ہو سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ سین دیکھنے والے کی نظر سے اب تک محو نہیں ہوا ہے۔

مولانا عبدالماجد کے ساتھ ایک واقعہ:

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ محمد علی لکھنؤ آئے، راجہ (پھر مہاراجہ) صاحب محمود آباد کے ہاں فروکش تھے۔ مولانا موصوف دریاباد سے صرف محمد علی کی ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔ ابھی پورے طور پر لطف ملاقات بھی نہ حاصل ہونے پایا تھا کہ مکان سے ایک آدمی آیا جس نے مولانا کی اہلیہ کی سخت اور خطرناک علالت کی اطلاع دی۔ قدرتاً مولانا ممدوح سخت پریشان و مضطر ہوئے۔

مہاراجہ صاحب محمود آباد اور دوسرے حاضرین مجلس نے ممدوح کو بہت کچھ تسلی دی، لیکن محمد علی کا اضطراب مولانا عبدالماجد سے کم نہیں تھا۔ اس خبر وحشت اثر نے محمد علی کی ساری نشاطِ مسرت چھین لی، اُنہوں نے فوراً مولانا عبدالماجد صاحب کو واپس بھیجا اور برابر خط اور تار کے ذریعہ سے اُن کی خیریت دریافت کرتے رہے اور جب تک وہ پورے طور سے صحت کی طرف سے مطمئن نہ ہو گئے، یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

جذباتیت:

جس شخص میں رفق و محبت کا مادّہ اِس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہو، ظاہر ہے وہ بہت زیادہ سریع الاحساس اور نازک جذبات کا ہوگا۔ چنانچہ محمد علی بھی اِس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ اُن پر جب جذبات غالب ہوتے تھے تو وہ قابو سے باہر ہو جاتے تھے اور کسی طرح بھی اپنے احساس و جذبات کو چھپا نہیں سکتے تھے۔ میر محفوظ علی صاحب کے معلومات سے اِس عنوان کے ماتحت بھی بہت فائدہ پہنچا، وہ فرماتے ہیں:

''محمد علی مرحوم بھی جذبات کا مجموعہ تھے اور اِسے خامی کہو یا پختگی، وہ اپنے جذبات کو ضبط نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے انقباضی اور انبساطی، دونوں حالتوں میں دیکھا۔ مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں جلسہ ہوا، راجہ محمود آباد نرم جماعت کے قائد تھے اور محمد علی گرم جماعت کے روحِ رواں، مگر صبح کو اُن کی رائے میں نرمی آ گئی۔ اس میں ''الہلال'' نے ایک مضمون لکھا جس میں یہ شعر لکھ دیا:

معشوق ما بہ مذہب ہر کس موافق است
بابا شراب خورد و بزاہد نماز کرد

محمد علی نے یہ مضمون دیکھا تو چونکہ اُن کے خیال سے واقعات کو اُلٹ پھیر کر دکھایا گیا تھا، لہٰذا غصہ سے عجیب حالت تھی۔ کہنے لگے، محفوظ! اِس کے جواب میں کوئی شعر بتاؤ۔ میں نہ شاعر نہ شعرا کے کلام کا حافظ، بھلا ایک منٹ میں شعر کیا بتا سکتا تھا؟ مگر اُن کی حالت دیکھ کر کہہ دیا، اچھا! ابھی بتاتا ہوں۔ اتفاق کی بات سعدی کا ایک شعر ذہن میں آ گیا، اگرچہ بہ تکلف مناسب موقع ہو سکتا تھا مگر اُس وقت اقتضائے مصلحت یہی تھا کہ شعر پڑھ ضرور دیا جائے، چنانچہ میں نے کہا:

بر کفے جام شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوس ناکے نداند جام و سنداں باختن

یا تو وہ حالت تھی کہ غصے میں آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے یا دفعتاً منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ مسکرائے، ہنسے، قہقہہ لگایا، پھر پھڑک اُٹھے اور جوش میں آ کر مجھے گود میں اُٹھا کر سارے ہال میں گھومتے پھرے۔''

ہرکرن ناتھ کے ساتھ ایک واقعہ:

اس جگہ بھی راقم الحروف کو ایک واقعہ یاد آ گیا، وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے دلچسپ ہے۔ یہ واقعہ اُس زمانہ کا ہے جب آویزشِ نجد و حجاز کا مسئلہ بہت زور سے ہندوستان کی اسلامی سیاسیات میں

ایک ہنگامہ پیدا کر رہا تھا۔ محمد علی سے اور اُن کے مرشد مولانا عبدالباری مرحوم سے اختلاف شدید رونما ہو چکا تھا۔ اُدھر دوسری طرف ہندو مسلم تعلقات بھی از حد کشیدہ ہوئے تھے اور شدھی و سنگٹھن اور تبلیغ و تنظیم میں پورے طور سے ٹکر ہو رہی تھی۔

محمد علی ایک جلسہ کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے اور چودھری خلیق الزماں صاحب کے دولت کدۂ خیالی گنج میں مقیم ہوئے۔ ٹھاکر (راجہ) نواب علی خاں صاحب نے جو محمد علی کے سخت مخالف تھے، فرنگی محل میں ایک جلسہ کر کے محمد علی کو اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب نگرامی مرحوم کے ذریعہ ندوہ سے دو ایسے طالب علم منگوائے جو نسبتاً تیز دست اور زود نویس ہوں۔ اِس سلسلہ میں مجھے خیالی گنج میں محمد علی کے جائے قیام پر حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ وہ جلسہ تو نہ ہو سکا، مگر کئی گھنٹہ تک محمد علی سے شرفِ حضوری حاصل رہا۔

اِسی اثناء میں لکھنؤ کے مشہور سابق سیاسی کارکن پنڈت ہرکرن ناتھ مصرا بیرسٹرایٹ لاء محمد علی سے ملنے تشریف لائے۔ محمد علی کو چودھری صاحب اور پنڈت جی سے جو اختصاص تھا، اُس کی بنا پر وہ بے ساختہ اُٹھے اور فرمایا:

''دیکھو! ''مسلم ہندو نما'' آرہا ہے۔''

اور جب وہ قریب آ گئے تو محمد علی نے بغل گیر ہو کر بے تحاشہ اور مسلسل پنڈت جی کے رخساروں پر اپنی ''صدقِ وفا'' کی مہر لگاتے رہے۔

امان اللہ خاں کے ساتھ:

اِسی طرح بمبئی میں غازی امان اللہ کے رخسار بھی اِس ''کشمکش'' کے آماجگاہ بن چکے ہیں!

❀❀❀

باب ۱۹

اخلاق ورواداری

محمد علی اُن لوگوں میں تھے جو ''معاف'' تو کر دیتے تھے، لیکن ''بھولتے'' کبھی نہیں تھے۔ سیاسی زندگی میں بار ہا اُنہیں اپنے عزیز دوستوں اور رفیقوں سے اختلاف کرنا پڑا لیکن ایسا بہت کم ہوا کہ ذاتی تعلقات اور مراسم میں بھی کبھی فرق آیا ہو، اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں محمد علی اگر منفرد نہیں تو ممتاز ضرور ہیں۔

سر یعقوب کا بیان:

سر محمد یعقوب فرماتے ہیں:

''مجھ سے اور محمد علی سے اگرچہ بعض اوقات پبلک معاملات میں اختلافِ رائے بھی ہوتا تھا اور آپس میں خوب نونک جھونک رہتی تھی، لیکن اُن کے اور میرے ذاتی تعلقات اور باہمی معاملات میں کبھی فرق نہیں آیا اور ملاقاتوں میں وہی گرم جوشی اور بے تکلفی قائم رہی جو طالب علمی کے زمانہ سے شروع ہوتی تھی۔''

سجاد حیدر سے تعلقات:

سیّد سجاد حیدر صاحب یلدرم سے محمد علی کے نہایت عزیزانہ تعلقات طالب علمی کے آغاز ہی سے تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ دونوں کی راہِ عمل الگ تھی۔ جس زمانہ میں محمد علی علی گڑھ کو توڑ کر جامعہ ملیہ قائم کر رہے تھے اور اپنی ''اولڈ بوائز لاج'' سے بہ نوکِ سنگین نکالے جا رہے تھے، اُس وقت سجاد حیدر

صاحب پرانے کالج کے امناء کی طرف سے محمد علی کو ''سمجھانے'' تشریف لائے تھے کہ اپنی حرکت سے باز آ جاؤ، لیکن محمد علی تحریک خلافت کے علمبردار رہے۔

جامعہ ملیہ قائم کی، یونیورسٹی اور اربابِ یونیورسٹی سے سخت ترین مخالفتیں رہیں...سب کچھ ہوا، لیکن محمد علی اور سجاد حیدر کے مراسم و تعلقات تادم مرگ اُسی طرح قائم رہے، جس طرح علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں تھے۔

مسٹر جناح کے ساتھ ایک واقعہ:

غالباً 1925ء میں آنریبل رضا علی کی صدارت میں بمقام بمبئی مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تھا، محمد علی اور مسٹر جناح بھی اُس میں شریک تھے۔ دورانِ مباحثہ میں اِن ''محمد علیین'' میں خوب خوب اختلافات ہوئے، نوک جھونک ہوئی، طعن و تعریض ہوئی، سب ہی کچھ ہوا۔ لیکن جب جلسہ ختم ہو گیا تو خود محمد علی اُٹھے اور نہایت محبت اور گرم جوشی سے مسٹر جناح کو سینہ سے لگایا اور اُن کے رخساروں کو بوسہ دیا۔

مسٹر داس کا ایک واقعہ:

مسٹر سی۔ آر۔ داس نے گاندھی جی کے سیاسی پروگرام ''ترکِ موالات'' سے ناگپور میں سخت اختلاف کیا تو طرح طرح کے اثرات اُن پر ڈالے گئے، لیکن محمد علی نے اپنے تعلقات و توقعات کی بنا پر داس کو نہ صرف پروگرام کے قبول کر لینے پر مجبور کیا بلکہ اِس پر بھی سخت اصرار کیا کہ وہ اپنی پریکٹس ترک کر دیں۔ داس اِن دونوں شقوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ داس کے اور محمد علی کے دوستوں نے بھی محمد علی کو سمجھایا کہ وہ داس کو ترکِ وکالت پر مجبور نہ کریں، لیکن محمد علی اپنے طے کی ہوئی بات سے کب باز آنے والے تھے؟ آخر کار محمد علی کا خود بیان ہے کہ:

> ''ایک شب کو رات کے تین بجے کے قریب جب میں مہاتما جی کے پاس سے داس کے پاس آیا تو داس نے مجھے علیحدہ لے جا کر کہا، ''محمد علی! تمہاری رائے ٹھیک تھی، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ بیرسٹری ترک کر دوں۔ جس وقت داس نے مجھے اپنا یہ

فیصلہ سنایا، میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کس قدر مسرت ہوئی؟ میں اُس وقت داس سے لپٹ گیا اور اُس کے گالوں کو بار بار بوسے دیتا رہا۔"

ایک دلچسپ "مقابلہ":

محمد علی اربابِ علی گڑھ کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکے، اُن کی آزادئ رائے اور حریت ضمیر وہ چیز تھی جس نے بہتوں کو اُن کا دشمن بنا دیا تھا، لیکن محمد علی اِن باتوں سے آزردہ خاطر کبھی نہیں ہوئے بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے اُنہوں نے اس قسم کی تمام مخالفتوں کا مقابلہ کیا۔

اِسی قسم کا ایک دلچسپ مقابلہ یہ ہے کہ علی گڑھ کی ٹرسٹی شپ کے لیے محمد علی کا نام پیش ہوا۔ اربابِ کالج نے مخالفت کی، علی گڑھ کے انگریز اسٹاف نے مخالفت کی اور تعجب یہ ہے کہ کالج کے سیکریٹری نواب اسحٰق خاں مرحوم نے مخالفت کی اور اُن کے بجائے میجر سیّد حسین بلگرامی کا نام پیش کر دیا گیا۔

پہلے تو محمد علی پر یہ زور ڈلوایا گیا کہ وہ میجر بلگرامی جیسی صاحبِ علم و فضل شخصیت کے مقابلہ میں خود ہی دست بردار ہو جائیں لیکن محمد علی نے صاف انکار کر دیا۔

اب دوسری زبردست ترکیب یہ چلی گئی کہ ہز ہائنس نواب سر حامد علی خاں مرحوم والئِ رامپور سے زور ڈلوایا گیا کہ محمد علی اس مقابلہ کے لیے نہ کھڑے ہوں، چنانچہ ایک روز ہز ہائنس نے نواب اسحٰق خاں، شوکت صاحب اور بعض دوسرے لوگوں کی موجودگی میں اس کا تذکرہ کیا اور اپنی خواہش ظاہر کی کہ محمد علی مقابلہ نہ کریں تو اچھا ہے۔ لیکن اب محمد علی کو اور اصرار ہو گیا اور وہ کسی طرح بھی "دستبرداری" پر راضی نہیں ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقابلہ ہوا اور نہایت دلچسپ و کامیاب! فیصلہ یہ ہوا کہ محمد علی ممبر منتخب ہو گئے!

لیکن اب محمد علی کی بلندئ اخلاق، وسعتِ ظرف اور علوئے ہمت ملاحظہ ہو کہ کامیابی کے بعد وہ خود میجر بلگرامی کے علم و فضل کے مقابلہ میں مستعفی ہو گئے اور اپنی جگہ اُن کے لیے خالی کر دی۔

یہ تھا محمد علی کا کردار، یہ تھی محمد علی کی رواداری!

لاجپت رائے سے:

محمد علی کو اپنی زندگی میں کتنا سخت وشدید اختلاف رہا، اِس سے ہر اخبار بین شخص واقف ہے لیکن بایں ہمہ لاجپت رائے کی خوبیوں کا اعتراف بھی ہمیشہ فرماتے رہے۔

سائمن کمیشن کے سلسلہ میں لاجپت رائے نے اسمبلی میں (1927ء) ایک مدلل، زبردست اور دِلنشین تقریر کی تھی جس میں ہندو مسلم اختلافات کی ساری ذمہ داری گورنمنٹ پر ڈالی تھی۔ محمد علی کو اُن کی تقریر اتنی پسند آئی کہ اُنہوں نے ''ہمدرد'' میں کئی مقالات اِس موضوع پر سپردِ قلم فرمائے اور لالہ جی کی تقریر کی دِل کھول کر تعریف وتوصیف اور مدح وستائش کی۔

1928ء میں سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلہ میں لاجپت رائے لاہور میں پولیس کے ہاتھوں لاٹھیاں کھا کر کچھ عرصہ کے بعد وفات پا گئے۔ محمد علی اُس زمانہ میں بغرضِ علاج یورپ گئے ہوئے تھے لیکن واپس آتے ہی اُنہوں نے ہندوستان میں جو سب سے پہلا بیان دیا ہے، اُس میں اُنہوں نے لاجپت رائے کی وفات کو قابلِ رشک بتایا اور اپنے لیے تمنا کی کہ کاش ایسی سعادت اُنہیں بھی حاصل ہوتی۔

مالوی جی کا واقعہ:

مالوی جی کی مہا سبھائی ذہنیت کا محمد علی نے ہمیشہ ماتم کیا اور اپنی اُن کی راہِ عمل ایک ہونے کے باوجود کبھی اُن کے اور اُن کے مقاصد میں تصادم ہوا تو اُنہوں نے سخت سے سخت مخالفت کی اور کبھی کوئی رعایت نہیں کی۔ لیکن سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلہ میں جب مالوی جی جیسے معتدل بزرگ بھی اس کے مخالف رہے اور مدارس کانگرس میں اُنہوں نے ایک مؤثر اور دِل گداز تقریر کی اور گورنمنٹ کی پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی تشریح کی، اور اپنی بے بسی کا اظہار کیا کہ ہم ہندوستانی کس طرح ''اشاروں'' پر ناچ رہے ہیں۔ محمد علی کو مالوی جی کی یہ دِل گداز تقدیر بہت مرغوبِ خاطر ہوئی اور اُنہوں نے مالوی جی کے قدم لے لیے اور اپنی تقریر میں فرمایا:

''اگر مالوی جی نے اپنی سچی ذہنیت کا اظہار کیا ہے تو حضرات! سائمن کمیشن کو آنے دیجیے، ہمیں اُس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ جس طرح مصر میں ملز کمیشن سے کہہ دیا گیا تھا کہ جو کچھ پوچھنا ہو، سعد پاشا زاغلول سے پوچھو۔ اُسی طرح ہم بھی کہہ دیں گے کہ ہم کچھ نہیں جانتے، اقلیتوں کے امین مالوی جی ہیں، جو کچھ ہو اُن سے پوچھو۔''

سر عبدالقیوم کا واقعہ:

ساردا بل کے سلسلہ میں محمد علی سے اور سر عبدالقیوم و مسٹر جناح سے ایک موقعہ پر مباحثہ ہونے لگا۔ رمضان کا زمانہ تھا، تھوڑی دیر کے بعد ''گرمیٔ بحث'' نے دوسری صورت اختیار کر لی۔ لیکن خیر تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ تندی و ترشی ختم ہو گئی، لیکن محمد علی کے دِل پر اس کا اثر نہیں ہوا۔ وہ مسٹر جناح اور سر عبدالقیوم سے حسب سابق ملتے رہے اور اپنے تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیا۔

یہ تھا محمد علی کے اخلاق درواداری کا ایک دھندلا سا مرقع!

باب ۲۰

ایثار و استغناء

محمد علی کی پرورش اگر چہ ناز و نعم میں ہوئی اور اُن کا ماحول ہمیشہ ایسا رہا جس میں روپیہ کی پرستش ہوتی تھی اور خود اُن کی طبیعت بھی کسبِ زر سے نفور نہیں تھی، لیکن پھر بھی اُن کی طبیعت میں شاہانہ استغنا اور غیر معمولی ایثار و سیر چشمی کا جوہر مضمر تھا۔

آکسفورڈ کے ''آنرز میں گریجویٹ'' کو دُنیاوی دلفریبیوں نے قدم قدم لبھایا اور سیم و زر کے انباروں نے اُن کے قدموں کو چھوا، لیکن دل اتنا مستغنی تھا، طبیعت میں ایثار کا ایسا مادہ تھا کہ کبھی بھی اس کی پروا نہیں کی۔ اگر اُنہیں صرف روپیہ کی ہوس ہوتی تو بڑودہ سے وہ مستعفی نہ ہوتے، رامپور کی ملازمت نہ ترک کرتے، جاؤرہ کی وزارت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے، بھوپال کی چیف سکریٹری شپ اپنے قبضہ میں رکھتے یا پھر سرکاری مناصب میں سے کسی رتبۂ بلند پر سرفراز ہوتے۔

لیکن طبیعت کو اِن چیزوں سے کوئی ایسا لگاؤ نہیں تھا کہ ان کی خاطر وہ اِسی گورکھ دھندے میں پھنس جاتے اور ملک و قوم کی جو خدمت اُن سے بن آنے والی تھی، اُسے نذرِ تغافل کر دیتے۔

اُنہوں نے ایسا نہیں کیا، روپیہ کی اُنہیں ہمیشہ ضرورت رہی، مصارف اُن کے ہمیشہ بڑھے چڑھے، آمد و خرچ کا توازن وہ کبھی نہیں قائم کر سکے، اس لیے اُنہوں نے سر آغا خاں سے امداد بھی لی اور مہاراجہ صاحب محمود آباد سے بھی، مہاراجہ اَلور سے بھی اور سیٹھ عبداللہ ہارون سے بھی۔ اپنی ضروریات کے لیے اُن کا دستِ سوال ہمیشہ دراز رہا۔ لیکن استغنا و ایثار کا یہ عالم تھا کہ آغا خاں سے اختلافِ شدید کیا اور اُن کی اعانت سے محروم ہو گئے۔ مہاراجہ محمود آباد سے جب اُن کی رائے ٹکرائی، اُنہوں نے بلا

تامل اُن کی مخالفت کی اور بالآخر اُنہوں نے بھی اپنا دستِ اعانت کھینچ لیا۔ڈاکٹر انصاری نے بہت زیادہ محمد علی کی مدد کی، لیکن جب حق وضمیر کا معاملہ آن پڑا تو محمد علی سے زیادہ اصول کے معاملہ میں ڈاکٹر انصاری کی مخالفت دائرہ انسانیت میں رہ کر کسی نے نہیں کی۔محمد علی ہمیشہ فقیر رہے لیکن لکھ لٹ بھی رہے۔ ہمیشہ حاجتمند رہے لیکن بے نیاز بھی رہے۔یعنی وہ رائے فروش کبھی نہیں رہے، گو اُن کا دستِ سوال ہمیشہ احباب وشناسا کے سامنے دراز رہا۔

اورانسان کے کردار کا یہی زوردار پہلو ہے کہ وہ حاجت مند ہو، اپنی ضروریات کے لیے دوسروں سے طالبِ اعانت ہو، لیکن اصول کے معاملہ میں کبھی اِن باتوں کی پروانہ کرے اور مردانہ وار اپنے اختلافات کا اظہار کردے۔

محمد علی کی سیرت اِسی اصول کا ایک نمونہ تھی۔

بیگم غلام حسین سے سلوک:

راجہ غلام حسین محمد علی کے دستِ راست تھے،''کامریڈ'' کی ترقی اور شہرت میں راجہ مرحوم کی کوششیں کئی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔اپنے ایسے عزیز رفیق کار سے محمد علی کو محبت بھی بہت زیادہ تھی۔چنانچہ ایک اتفاقی حادثہ سے راجہ غلام حسین کا انتقال ہوا تو محمد علی نے اُن کی یاد میں نہایت دردانگیز اور مؤثر مرثیہ لکھا اور جب نظر بندی سے رہا ہوئے، نظر بندی کے زمانہ میں کافی نقصان اُٹھا چکے تھے اور تمام کاروبار تباہ ہو گیا تھا۔لیکن بیگم غلام حسین کی اعانت سے وہ کیسے باز رہ سکتے تھے؟ چنانچہ اپنی تہی دستی اور پریشان حالی کے باوجود بیگم غلام حسین کو پانچ سو کی رقم اور ایک مشین پریس عطا فرمائی، اِس پر ایک شخص نے اعتراض بھی کیا لیکن وہ کب باز رہ سکتے تھے؟

زمیندار کی امداد:

ہندوستان کے اخبارات میں ''زمیندار'' نے قوم وملک کی راہ میں جن شدائد ومصائب کا مقابلہ کیا ہے اور جس حیرت انگیز استقامت اور استقلال کا ثبوت دیا ہے، وہ ہر شخص مانتا ہے۔محمد علی کو اُس کی

پالیسی اور اُس کے اندازِ صحافت سے ہمیشہ شدید اختلاف رہا، لیکن اُنہوں نے اُس کے مصائب ونوائب پر کبھی خندہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اُس کی اعانت کی۔ اُس کے لیے چندہ جمع کیا اور خود اپنی مفلس اور قلاش جیب سے بھی جو کچھ ہو سکا، مدد کی۔

خلافت کمیٹی کا سب سے پہلا چندہ:

محمد علی جس وقت نظر بند کیے گئے ہیں اور پورے پانچ سال تک اُنہوں نے یہ ایام محن اِسی قید میں بسر کیے ہیں، اُس وقت گورنمنٹ ہند کی طرف سے اُنہیں ڈھائی سو کی حقیر رقم ملتی تھی اور چھندواڑہ میں محمد علی مع اپنے پورے خاندان کے مقیم تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ مختصر رقم اتنے وسیع کنبہ کے کیے کیونکر کافی ہوسکتی تھی؟ ذرائع آمدنی بالکل مسدود تھے، ''ہمدرد''، ''کامریڈ'' بند کر دیئے گئے تھے، پریس سے ضمانت طلب ہو چکی تھی اور کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ مجبوراً قرض سے کام چلایا گیا، پھر مراد آباد میں جو جاگیر تھی رفتہ رفتہ وہ ختم ہوگئی۔ غرض اِن مصائب کے ساتھ محمد علی نے اپنے ایام نظر بندی ختم کیے اور جب وہ رہا ہوئے ہیں تو روٹی کو محتاج تھے، قرض میں بال بال بندھا ہوا تھا، دہلی کے مکان کا کرایہ بھی برسوں سے ادا نہیں ہوا تھا، ہر طرح کی مصیبت اور پریشانی کا سامنا تھا۔

جب رہا ہوئے تو قوم نے اُن کی عزت افزائی بھی کی اور اُن کے نقصانات کی تلافی بھی کرنا چاہی، یعنی ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں مرحوم کی کوششوں اور دوسرے قدر دانِ خلافت کی سرگرمیوں سے ایک رقم خطیر جمع ہوگئی اور طے کیا گیا کہ جب علی برادران دہلی آئیں تو وہ رقم اُن کی خدمت میں پیش کردی جائے تا کہ وہ اُس سے اپنا قرض ادا کر سکیں اور اپنا کام چلا سکیں۔

چنانچہ جب وہ دہلی پہنچے تو یہاں اُن کا نہایت عدیم المثال شاہانہ استقبال ہوا اور ایک ہزار اشرفیوں کا ہار اُن کے گلے میں ڈالا گیا۔ لیکن ایثار، استغنا، توکل اور سیر چشمی کا یہ عدیم النظیر نمونہ دیکھنا! کہ اس گدائے بے نوا نے اُسی وقت اشرفیوں کے اُس ہار کو سترہ ہزار میں فروخت کیا اور اِسی سلسلہ میں دوسری جو رقمیں جمع ہوئی تھیں، اُنہیں جمع کیا۔ کل انتیس ہزار کی گراں قدر رقم ہوئی جس میں سے ایک پائی بھی نہیں لی اور وہ سب کی سب خلافت فنڈ میں داخل کر دی گئی۔ یہ خلافت کمیٹی کا سب سے پہلا چندہ تھا

جو دو فاقہ مست لیکن دریا دل بے نواؤں کی طرف سے پیش کیا گیا تھا!

چاندی کا سیٹ:

اِسی طرح غالباً حیدر آباد میں ایک موقعہ پر ایک قدر دان اور عزیز دوست نے ایک نہایت قیمتی بھاری چاندی کا نہایت خوبصورت چائے کا سیٹ مع چاندی کی چائے کی پیالیوں کے پیش کیا۔ مگر جس کو اب جام سفال نے اپنا گرویدہ بنالیا ہو، وہ چاندی کے برتنوں میں چائے کس طرح پی سکتا تھا؟ اس لیے وہ خلافت کو دے دیا گیا۔

یہ تھا محمد علی کی سیر چشمی اور دریا دلی کا ایک معمولی سا نمونہ!

ندوہ کو چندہ دینا:

کانپور میں دار العلوم ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ حکیم اجمل خاں مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا، اپنی خصوصیت کے اعتبار سے وہ عجیب وغریب جلسہ تھا۔ ایک طرف تو اس میں بڑے بڑے سیاسی زعماء مثلاً ظفر علی خاں صاحب، ڈاکٹر کچلو، حسرت موہانی وغیرہ موجود تھے، دوسری طرف علماء وفضلا کی ایک خاصی جماعت بھی رونق افروز مجلس تھی مثلاً حکیم اجمل خاں، قاری شاہ سلیمان پھلواردی وغیرہ۔ تیسری طرف اس میں حامیانِ تعاون کی بھی ایک خاصی جماعت موجود تھی مثلاً حافظ ہدایت حسین صاحب ممبر گول میز کانفرنس، سر رحیم بخش۔ اس ''مجموعہ اضداد'' میں محمد علی کی شخصیت سب سے نمایاں تھی!

دوسرے دِن جب عام چندہ شروع ہوا تو صاحب مقدرت لوگوں نے یا تو چندہ دینا شروع کیا اور یا اعلان کرنا شروع کیا، سب سے پہلے تو محمد علی نے اپنے مخصوص عقیدت مندوں سے جبراً چندہ کا اعلان کرایا اور پھر اپنی بے بضاعتی اور بے نوائی کے باوجود غالباً ڈیڑھ سو روپیہ سالانہ چندہ کا اعلان فرمایا۔

ایک اور واقعہ:

1928ء میں جب محمد علی عازم انگلستان ہوئے ہیں، اُس زمانہ میں مسز سروجنی نائڈو بھی وہیں تشریف رکھتی تھیں۔ لندن میں مسٹر سکلاتوالہ کی کوششوں سے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں سائمن کمیشن

کے تقرر پر مسز سروجنی نائڈو اور محمد علی نے ولولہ انگیز تقریریں کیں اور ہندوستانی مسائل و معاملات پر گورنمنٹ کے اِس غیر مدبرانہ اور ایک اخبار کی زبان میں ''مضیطر انہ'' طرزِ عمل پر سخت نکتہ چینی کی۔ اُسی وقت اُسی جلسہ میں ایک انجمن کی تشکیل بھی ہوگئی جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ وہ ہندوستان کے نقطۂ نظر اور برطانوی ہوسِ استعمار کے متعلق پروپیگنڈا کرے۔

محمد علی اگرچہ دوسرے کے خرچ پر ولایت اپنا علاج کرانے گئے تھے، لیکن اِس موقع پر اُن کا فیاض دِل بھی متاثر ہوا اور اُنہوں نے ایک خاصی رقم چندہ میں عطا فرمائی۔

باب ۲۱

رائے عامہ پر رائے

رائے عامہ پر نظریہ:

محمد علی عقیدتاً جمہوری خیال کے آدمی تھے، ملوکیت اور استبداد سے انہیں قطعی نفرت تھی۔ خود اپنی ذات کے لیے بھی وہ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ محض اُن کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اُن کی ہاں میں ہاں ملا دی جائے!

وہ جمہور کو آزاد خیال بنانا چاہتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ جمہور میں حریتِ رائے اور آزادیٔ ضمیر کے جذبات پیدا ہوں، لوگ خود معاملات کی حقیقت و اصلیت اور اسباب و علل پر غور کرنا سیکھیں اور پھر خود ہی اپنے دماغ کی ہدایت اور اپنے ضمیر کی رہنمائی میں رائے دیں!

یہی وجہ ہے کہ محمد علی نے کبھی اپنی شخصیت کا واسطہ دلا کر لوگوں سے رائے نہیں حاصل کی نہ اپنی مرعوب کن شخصیت کو بیچ میں ڈال کر لوگوں سے اپنی حمایت میں رائے لینا چاہی۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ سحر کاری سے مرعوب و متاثر نہ کیے جائیں، بلکہ اُن میں پختہ کاری کے عناصر ہوں کہ ملک و قوم کی ترقی کے لیے یہ ازبس ضروری ہے۔

لاہور کا ایک واقعہ:

نجد و حجاز کی ہنگامہ آرائیوں کے زمانہ میں محمد علی کو بار بار التجائیں کر کر کے لاہور طلب کیا گیا، اِس لیے کہ وہاں کے ''احرار'' اِس صورت حال پر قابو نہیں پا سکے تھے جو وہاں کے خوش عقیدہ حضرات نے پیدا

کر دی تھی۔ پھر نت نئی خبروں سے اور زیادہ عوام کو سلطان ابن سعود کے متعلق گمراہ کیا جاتا تھا کہ آج قبۂ خضرا پر حملہ ہوا چاہتا ہے اور آج فلاں بزرگ کی قبر مسمار کر دی گئی اور آج ''حضرت'' ابوطالب کا مزار کھود کر پھینک دیا گیا!

اِن حالات میں مولانا ظفر علی خاں صاحب نے اُنہیں لاہور طلب کیا۔ محمد علی گئے، جلسہ کی شرکت کے لیے مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی پہنچ گئے تھے۔ محمد علی، ظفر علی خاں صاحب کے ہاں فروکش ہوئے اور اُنہیں کی صدارت میں جلسہ کیا گیا۔

مولانا احمد سعید کی تقریر:

حالاتِ حاضرہ پر مولانا احمد سعید صاحب نے ایک تقریر کی جو اپنے انداز کے اعتبار سے بہت پسند کی گئی۔

بخاری صاحب کی تقریر:

پھر پنجاب کے مشہور خطیب مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی پوری شانِ خطابت سے تقریر کی۔ اُن کی تقریر کیا تھی؟ سحر و اعجاز تھی! تمام مجمع گوش بر آواز تھا اور یا تو مخالفت ہو رہی تھی یا موافقت ہونے لگی۔ کہاں ''غالب کے پرزے اُڑنے کی خبر گرم تھی'' اور کہاں ایک دوسرا ہی ''تماشہ'' ہونے لگا۔

محمد علی اِس کامیابی سے بہت مسرور ہوئے کہ مخالفت کے اِس شدید اندیشہ کے باوجود نہ صرف یہ کہ مخالفت نہیں ہوئی بلکہ صدارت، احمد سعید صاحب کی خطابت اور سب سے بڑھ کر عطاء اللہ شاہ کی سحر کاری نے یہ رنگ پیدا کر دیا کہ مجمع مٹھی میں آ گیا۔ لیکن اِس واقعہ سے محمد علی کو اپنی ''کامیابی'' کا یقین نہیں آیا۔

محمد علی کا ''وعظ'':

اُنہوں نے بخاری صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا:

''بھائی! میں تمہاری تقریر سے بہت خوش ہوا۔ تم نے سامعین کو بالکل مسحور کر دیا تھا۔

اگر اِس کے بعد تم اِن سے کوئی غلط کام بھی کرانا چاہتے تو وہ فوراً کر بیٹھتے۔ جو قدرت تم کو اپنی زبان پر ہے، وہ خدا داد ہے اور خدا کی ایک بڑی نعمت ہے، مگر ایک بڑی خطرناک نعمت ہے اور تمہاری مسئولیت اِس کے باعث اور بڑھ گئی ہے۔ جب تک تم اِسے حق کی راہ میں استعمال کرو گے، فلاحِ دارین حاصل کرو گے لیکن اگر کبھی یہ باطل کی راہ میں استعمال کی گئی تو ہزاروں بندگانِ خدا کے گمراہ کرنے کے لیے بھی کافی ہو گی۔ لوگوں کا مسحور کرنا اچھا نہیں، سحر کاری میں نہ ساحروں کے لیے، نہ مسحوروں کے لیے فلاح ہے۔ ضرورت اِس کی ہے کہ ہر مسئلہ کے دونوں پہلو سامعین کے سامنے پیش کر دو اور اُنہیں سے اِس کا حل اور فیصلہ کراؤ۔ اِس طرح تم عوام کی قوتِ فیصلہ کو ترقی دے سکو گے ورنہ عوام کالانعام مشہور ہیں۔ آج تم نے اِنہیں مسحور کر دیا تو کل اِسی چرب زبانی اور ظرافت کے باعث اِن پر کسی دوسرے کا جادو بھی چل سکے گا اور اِس طرح اُنہیں حق و باطل کی تمیز تا قیامت نہ آئے۔ کبھی تمہارے ساتھ ہوں گے، کبھی تمہارے مخالفین کے۔ آج تم کو تخت پر بٹھائیں گے، کل تمہیں اُتار کر دوسرے کو سریر آراء بنا دیں گے۔''

رائے عامہ پر محمد علی کے یہ خیالات پر زعیم قوم اور سالکِ راہِ قیادت کے لیے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام دیں گے۔

❀❀❀

باب ۲۲

مایوسی

آخر ایام حیات میں محمد علی بہت زیادہ مایوس ہو گئے تھے، وہ جانتے تھے کہ آج اُن کی بات سنی نہیں جارہی ہے۔ کل تک جو لوگ محمد علی کے لیے فرشِ راہ ہوتے تھے، وہی آج تیز و تند نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کل جو لوگ محمد علی کی قیادت کے گن گایا کرتے تھے، آج وہ اپنے تیئں خود کو سب سے بڑا لیڈر سمجھ رہے تھے۔ کل جن لوگوں کی زبان محمد علی کے ذہن و دماغ، زبان و قلم اور جوہر قیادت کے بیان میں تر ہو رہی تھی، آج اُنہیں کے نزدیک محمد علی کی آواز بالکل بے وقعت تھی۔ کل تک علی برادران کی عقیدت مندی اور پیروی رواجِ عام کے ''فیشن'' میں داخل تھی، لیکن انقلابِ دہر دیکھئے! آج اُن کی مخالفت، حریتِ ضمیر کا سب سے بڑا ثبوت تھی۔

ایک زعیم کے لیے یہ حالات حد درجہ حوصلہ شکن اور ہوش رُبا ہوتے ہیں۔ اُس کی قوتِ فہم وفکر زائل ہو جاتی ہے، وہ ''مایوس'' ہو کر عزلت گزین ہو جاتا ہے یا کم از کم اپنی زبان پر مہر سکوت لگا لیتا ہے۔

لیکن محمد علی اس کلیہ سے بھی مستثنٰی تھے۔ اُنہیں اگرچہ اِس کا احساس تھا کہ اب اُن کی قدر کم ہو گئی ہے اور لوگ اُن کی ہر ہر طرح سے مخالفت کر رہے ہیں، لیکن پھر بھی اپنی قوتِ عمل پر اُنہوں نے تعطل کبھی نہیں طاری کیا اور برابر سرگرم جہد و عمل رہے، تا آنکہ موت کے زبردست ہاتھ نے اُن کی سرگرمیٔ کار کا خاتمہ کر دیا۔

محمد علی کا بیان:

ایک موقع پر محمد علی نے خود اِن ناسازگار اور دِل شکن حالات کا اعتراف کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

''مجھ سے زیادہ اِسے کوئی محسوس نہیں کرتا کہ ہندوستان میں میرے ہم خیال بہت کم ہیں اور جو میرے ہم خیال ہیں بھی، وہ بھی عملاً میرے ساتھ تعاون کی زحمت گوارا نہیں فرماتے۔ کچھ میرے لیے دُعا کرلیا کرتے ہیں، زیادہ تر لاپرواہ ہیں جو میرے ہم خیال نہیں۔ وہ خود تو اِس کی کیا معذرت کرتے کہ کیوں ہم خیال نہیں ہیں؟ لیکن طرفہ تر یہ ہے کہ اُلٹی مجھ سے شکایت کرتے ہیں کہ تُو ہمارا ہم خیال کیوں نہیں ہے؟ اور جس چیز کو اپنے لیے استقامت اور آزادیٔ رائے کے نام دیتے ہیں، میرے لیے اُسی چیز کو ضد اور خود رائی کے لقب عطا فرماتے ہیں۔''

ایک دوسرا بیان:

فتنۂ راجپال کے زمانہ میں محمد علی کی پنجاب نے بہت سخت مخالفت کی تھی، لیکن محمد علی کے حامیوں نے لاہور میں ایک جلسہ محمد علی کی صدارت میں کرنا چاہا۔ محمد علی آمادہ بھی ہو گئے۔ ایک صاحب نے محمد علی کی روش پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اُنہیں چند اہم ''مشورے'' دیئے کہ یہ کام کیجیے گا اور وہ کام نہ کیجیے گا۔ اِس کی حمایت کیجیے گا، اُس کی مخالفت کیجیے گا۔ اِس کے ہاں جایئے اور اُس سے ملیئے گا بھی نہیں۔

محمد علی نے اِس ''ہدایت نامہ'' کو اپنے اخبار میں شائع کر دیا اور حسبِ ذیل رائے کا اظہار کیا:

''ملاحظہ ہو کہ یہ خط ایک ایسے شخص کا لکھا ہوا ہے کہ جو مجھے ''محترم'' بھی کہتا ہے اور اپنے تیئں میرا ''عقیدت مند'' بھی ظاہر کرتا ہے، لیکن سارا خط ایسا ہے کہ مجھ سے کاتب کے ''احترام'' کا پرزور مطالبہ کرتا ہے اور مجھے اُس کا ''عقیدت مند'' بنانے پر مصر ہے۔ ''احکام عشرۂ ربانی'' کے انداز میں میرے لیے احکام صادر فرمائے گئے ہیں کہ یہ ضرور کرنا اور یہ ہرگز نہ کرنا۔ یہی وہ ''نیم حکیم خطرۂ جان'' اور ''نیم ملا خطرۂ ایمان'' ہیں جو آج مسلمانوں اور ہندوؤں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ یہی وہ تعلیم یافتہ حضرات ہیں جو اپنے زعم باطل کے باعث ''پبلک'' بن بیٹھے ہیں اور خادمانِ ملک و ملت کو دبانا، ڈرانا، دھمکانا اور لالچ دلانا چاہتے ہیں۔ اِن کو راضی کر لیجیے، پھر آپ کی

''لیڈری''، مسلم۔ یہ اور اِن کے بنائے ہوئے ''لیڈر'' ہی وہ لوگ ہیں جن کی شان میں آیا ہے کہ ''پیران نہ می پرند، مریداں می پرانند''، میں ایسی پیری سے باز آیا اور ایسے مریدوں کو دُور ہی سے سلام کہتا ہوں۔''

مدیر ''انقلاب'' کی روایت:

''انقلاب'' کے مدیر روایت فرماتے ہیں:

''(محمد علی) نے دہلی میں ایک دوست سے دورانِ گفتگو فرمایا تھا کہ افسوس مسلمانوں نے میری قدر نہ کی۔ ہندوستان کے مسلمان زندہ پرست نہیں، مردہ پرست ہیں۔ جب میں مرجاؤں گا تو یاد کریں گے۔ مگر میں بھی اِن سے تنگ آیا ہوا ہوں کہ ہندوستان میں مرنے ہی کا نہیں۔ خدا کرے کہ مجھے ہندوستان میں موت ہی نہ آئے۔''

سطورِ بالا سے یہ عبرتناک حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ محمد علی اپنی قوم سے کس قدر مایوس ہو گئے تھے اور اُن کی آخری زندگی کس قدر تلخ گزری کہ نہ دوستوں اور عزیزوں کی کوئی جماعتِ خاص رہ گئی تھی جس پر اعتماد کیا جا سکتا اور نہ متبعین اور معتقدین کا کوئی ایسا گروہ رہ گیا تھا جو اُن کے بتائے ہوئے لائحۂ عمل اور اُن کی پیش کی ہوئی تجویزوں کو قبولیت اور عمل کا جامہ پہناتا۔

لیکن محمد علی کا یہ کردار بھی عجیب وغریب ہے کہ مایوس ہو جانے کے باوجود وہ اپنی زرّیں خدمات سے دست کش نہیں ہوئے۔ امان اللہ خاں کا یہ شعر محمد علی پر کتنا صادق آتا ہے:

اے قوم گرچہ سنگ جفا بر و ظلم زرید ۔۔۔ ایں شیشہ شکستۂ ہنوز از وفا پرست

❀❀❀

باب ۲۳

ہندوؤں سے دِل برداشتگی کے اسباب

وفات سے کچھ عرصہ پیشتر محمد علی کانگریس کے مخالف ہو گئے تھے اور اُن کا حکم مسلمانوں کو یہ تھا کہ وہ کانگریس کی سرگرمیوں میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیں۔

بہ ظاہر یہ بہت تعجب خیز بات ہے کہ محمد علی کانگریس اور ہندوؤں سے برداشتہ کیوں ہوئے؟ اُن کی ساری سیاسی جدوجہد کا ایک خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو پنجۂ اغیار سے نجات دلا سکیں اور پھر اِس طرح بالواسطہ سارے عالم سے انگریزوں کی حیدیت اور ''انتداب'' کا خاتمہ کر دیں۔ پھر اُنہوں نے اپنے مقصد کے خلاف کانگرس سے جنگ کیسے کی؟ اور کسی نہ کسی حد تک انگریزوں کی اعانت کیونکر اُن سے کی گئی۔

جو لوگ مغزِ حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے یا نہیں پہنچنا چاہتے، اُن کا فیصلہ تو یہ ہوتا ہے کہ انہیں موتی لال وغیرہ سے دشمنی تھی اس لیے وہ کانگریس کے مخالف ہو گئے۔

دعویٰ جتنا دلچسپ ہے، دلیل اُس سے کہیں زیادہ پر لطف!

اصل واقعہ حقیقت سے تامل اور فکر کے بعد معلوم کر لیا جا سکتا ہے۔ محمد علی کانگریس میں اُس وقت تک شریک رہے اور اپنے بے پناہ جذبۂ عمل اور غیر معمولی شخصی اثرات کے ساتھ شریک رہے، جب تک وہ اِسے ''انڈین نیشنل کانگریس'' سمجھتے رہے اور اپنی اِس وفاداری پر اُنہوں نے اتنی استقامت کا ثبوت دیا کہ اِس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ غور کی بات ہے کہ وہ کانگرس میں اُس وقت تو شریک رہے جب اِس کی ''سرد بازاری'' شروع ہو گئی تھی اور تحریک شدھی و سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو

کانگریس سے بیزار اور متنفر کر دیا تھا اور علیحدہ کس وقت ہوئے؟ جب اِس کی ''گرمیٔ بازار'' پھر عود کر آئی تھی اور بہت سے گوشہ نشین افراد پھر قومیت کے روپ اور کھدر کے لباس میں اسٹیج پر نظر آنے لگے تھے۔

جب اُنہوں نے انتہائے خلوص اور نیک نیتی سے یہ سمجھا کہ یہ کانگریس اب ''انڈین نیشنل'' نہیں بلکہ ''ہندو مہا سبھا'' کا ''نقش ثانی'' ہے تو وہ علیحدہ ہو گئے اور اُنہوں نے اِس کی ذرا بھی پروانہ کی کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے؟ بلکہ اِس کی کوشش کی کہ ہوا کا رخ جدھر بھی ہو، اُسے قبضہ میں کرنا چاہیے!

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ ہندوستان میں بدقسمتی سے ایسے انداز میں حکومت کی جا رہی ہے اور ہندو مسلمان دونوں قوموں کو ایسے سانچہ میں ڈھال لیا گیا ہے کہ ایک قوم دوسری کو سخت نفرت، کراہیت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ہندوستان میں کانگریس ہی وہ ''بیت السلام'' ہو سکتا تھا جس میں ہر دو اقوام کے نیک نیت، سمجھ دار، معاملہ فہم، دُور اندیش اور غیر متعصب حضرات مصروفِ عمل ہوں، لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ یہاں بھی مہا سبھائی ذہنیت چھائی ہوئی ہے، اکثر کانگریسی جب امتحان کی کسوٹی پر کسے جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے جوشِ عمل کی بہترین جولاں گاہ مہا سبھا کا پلیٹ فارم تھا تو آخر وہ کیوں نہ کانگریس سے دل برداشتہ ہو جاتے۔

اور پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ محمد علی کی قوتِ عمل اسلام کے لیے وقف تھی۔ اگر کانگریس نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا تو اُنہوں نے اپنا ہاتھ کبھی نہیں کھینچا اور انگریز نے تعاون کرنا چاہا تو اُنہوں نے اُسے بھی موقع دیا۔ اگر وہ صرف ''ہندوستانی'' ہوتے اور مذہب کو پس پشت ڈال کر کانگریس میں شریک ہوئے ہوتے تو اُن کی علیحدگی مؤجبِ حیرت ہو سکتی تھی۔

گاندھی جی کا بیان:

ہندوستانی سیاسیات میں گاندھی جی کو جو عظمت و بزرگی اور جو اقتدار و نفوذ حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ وہی ایک ایسے شخص تھے جن کے متعلق اکثر مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ اُن سے بڑھ کر غیر متعصب بہی خواہِ قوم اور ہمدردِ اسلام کوئی نہیں۔

1924ء کے مشہور فسادِ کوہاٹ کے اختلاف سے بھی پیشتر گاندھی جی کی بات جو محمد علی کے لیے

دِل شکن ثابت ہوئی، وہ گاندھی جی کا وہ بیان تھا جو اُنہوں نے جوہو سے 29 مئی 1924ء کو اپنی رہائی سے ایک ماہ بعد شائع فرمایا تھا اور جس میں ارشاد ہوا تھا:

''مسلمان ونگئی ہیں اور ہندو بزدل۔''

یہ بیان محمد علی کے لیے اس لیے اور زیادہ دِل شکن ثابت ہوا کہ اب تک اُن کا طرزِ عمل یہ رہا تھا کہ جوشِ رواداری میں ہمیشہ ہر غلطی کا الزام وہ مسلمانوں کے ہی سر رکھتے تھے، محض اِس اُمید پر کہ ہندو مسلم تعلقات خوشگوار رہیں۔ لیکن گاندھی جی کا یہ بیان اُن کے لیے بہت افسردہ کن ثابت ہوا۔

صوبہ متحدہ کی سیاسی کانفرنس:

محمد علی نے مسٹر جناح کی رفاقت میں ''تجاویزِ دہلی'' تیار کی تھیں جن کا اہم جزو مخلوط انتخاب تھا۔ اب تک مسلمان مخلوط انتخاب سے بیزار تھے، لیکن محمد علی نے اِسے مسلمانوں سے منوایا پھر کانگریس سے قبول کرایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور پر صحیح قومیت کے تخیل کو پیش نظر رکھ کر جداگانہ انتخاب سے اپنی بیزاری کا اظہار اور مخلوط انتخاب پر آمادگی کا ارادہ کیا تھا۔ ہندوستان کا قوم پرور طبقہ اِس پر بہت مسرور تھا اور سب محمد علی کو مبارک باد دے رہے تھے کہ اُنہیں کے تدبر اور جذبۂ عمل سے اس مشکل کو بھی حل کیا، لیکن بعد کو یہ صورت نہیں قائم رہی جس کی ضروری تفصیل حسب موقعہ آئے گی۔ یہاں اتنا کافی ہے کہ محمد علی نے اِسے مسلمانوں سے منظور کرایا اور کانگرس سے اِسے منظور کرانے میں اپنا سارا زور ختم کر دیا اور بالآخر اِس میں وہ کامیاب بھی ہوئے، یعنی مجلس عاملہ نے منظور کیا، پھر کانگریس کے اسپیشل اجلاس نے منظور کیا اور کانگریسی لیڈروں نے منظور کیا۔ پھر مہاسبھائیوں نے منظور کیا، حتیٰ کہ موتی لال نہرو اور پنڈت مالوی اور ڈاکٹر مونجے تک نے منظور کیا۔ لیکن یہ اُس زمانہ کا واقعہ ہے جب سری انواس آئنگر جیسا صحیح الخیال شخص صدر نشین تھا، لیکن بعد کو جو دوسرے تغیرات ہوئے اُن کا ذکر آگے آئے گا۔

اس جگہ ربط کے لیے یہ خیال رکھئے کہ محمد علی نے اِسے سب جگہ سے منظور کرایا، کچھ عرصہ کے بعد ''صوبہ متحدہ سیاسی کانفرنس'' کا 26,27,28 نومبر 1925ء کو انعقاد بمقام علی گڑھ طے پایا۔ اِس میں

زیر بحث مسائل میں ''وہ سمجھوتہ'' بھی تھا جس کی تصدیق و توثیق سری نواس آئنگر صدرِ کانگریس نے کلکتہ میں کرائی تھی۔

محمد علی جب علی گڑھ پہنچے تو اُن کے مشاہدات و تاثرات کیا ہوئے؟ اِسے اُنہیں کی زبان سے سنیے!

''آمنہ مرحومہ کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر جلسہ میں آیا۔ جو باتیں وہاں پہنچ کر سننے میں آئیں اُنہوں نے قلب کو اور بھی مضمحل کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک سبجیکٹ کمیٹی میں ہی بحث رہی۔ جب سبجیکٹ کمیٹی کی کارروائی کا حال سنا تو سوچنے لگا کہ آمنہ مرحومہ کے لیے روؤں یا اپنے صوبہ کا غم کروں۔ یہ جلسہ صوبہ کی ہندو سبھا یا مسلم لیگ کا نہ تھا، کانگریس کا جلسہ تھا۔ اگر یہاں بھی باوجود آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسہ ہائے منعقد بمبئی و کلکتہ، ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں اس قدر شدید اختلافات موجود ہیں خود صوبہ کی کانگرس کمیٹی میں ہندو مسلمان اس طرح دست و گریبان ہیں تو اس میں ملک میں امن و امان کب قائم ہوگا اور اِس ملک والوں کو آزادی کب نصیب ہوگی؟ جلسہ گاہ سے حاجی موسیٰ خاں صاحب کے مکان پر آیا جہاں ڈاکٹر (انصاری) صاحب اور شعیب قریشی صاحب نہایت افسردہ دِل بیٹھے ہوئے تھے۔ جوں ہی کلکتہ والے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ کے ریزولیشن کا وقت آیا، صاف معلوم ہونے لگا کہ اکثریت کی ذہنیت باطل ہندو سبھائی ہے۔''

موتی لال کا تغیر:

وسط مئی 1927ء میں جب کانگریس کے اجلاس منعقد بمبئی میں ''تجاویز دہلی'' پیش ہوئیں تو مجلس عاملہ میں جس شخص نے اُن کے منظور کرانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا، وہ خود پنڈت موتی لال نہرو تھے اور پھر یہ وہی پنڈت موتی لال نہرو تھے جنہوں نے اپنی ''نہرو رپورٹ'' میں بعض اہم امور میں اِس کے خلاف فیصلہ دیا اور سارے ہندوستان سے اور خود مسلمانوں سے بھی منظور کرانا چاہا۔

اب اسے جو کچھ بھی کہیے، اس ''تغیر رنگ'' سے محمد علی متاثر ضرور ہوئے۔

جے رام داس کا اختلاف:

کانگریس کے اُسی جلسہ میں جس میں موتی لال جی یہ "تجاویز دہلی" منظور کرا رہے تھے، اُس میں اُسے اُن مہا سبھائیوں نے بھی منظور کیا جو وہاں موجود تھے لیکن جے رام داس دولت رام صاحب جو اُس جلسہ میں موجود بھی نہیں تھے، اُنہوں نے سب سے پہلے اِن تجاویز کی مخالفت کی۔

گاندھی جی اور دوسرے کانگریسیوں کا اختلاف:

یہ دردناک اور افسوس ناک صورت حال ابھی ختم نہیں ہوئی، محمد علی کا بیان ہے:

"سری نواس آئنگر نے کلکتہ کانگریس کمیٹی کا جلسہ منعقد کیا جس میں گائے اور باجے کے متعلق ایک مدبرانہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ وہاں بھی دو ہندو مہا سبھائی آخر وقت تک لڑتے رہے جن میں سے ایک اخبار "سوراجیہ" کے مالک اور ایڈیٹر پرکاشم صاحب اور دوسرے سندھ کے جے رام داس صاحب (بمبئی کے جلسہ میں) مجلس عاملہ کی منظوری کے بعد یہ تجویز سبجیکٹ کمیٹی میں پیش ہونے والی ہی تھی کہ مہاتما جی اپنے گوشہ تنہائی سے برآمد ہوئے اور ڈاکٹر انصاری کو بلا کر فرمایا کہ میں اس لیے آیا تھا کہ کچھ تمہاری مدد کروں اور ہندو مسلم تنازعات کا آخری فیصلہ کراؤں، لیکن جب میں نے اِس تجویز کو دیکھا جسے مجلس عاملہ نے سبجیکٹ کمیٹی میں پیش کرنے کے لیے تیار کیا ہے اور جسے بمبئی اور کلکتہ کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں نے منظور کیا تھا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ اس گائے والے حصہ پر تو میں نہ کوئی اور ہندو راضی ہو سکتا ہے، وہ تو بالکل ہمارے مذہبی فرائض کے منافی ہے۔ مجھے رات بھر اس جنجال کے باعث نیند نہیں آئی کہ میں تو تمہیں مدد دینے کے بجائے فیصلہ پر پہنچنے میں ایک روک بن جاؤں گا۔ تم علی برادران کے پاس جاؤ! اُنہیں بھی میرے پاس لاؤ۔ ہم حاضر خدمت ہوئے اور مہاتما جی کے مذہبی خیالات کا ایک بار پھر اعادہ کیا گیا۔ میں نے

مہاتما جی کی منطق پر اعتراض کیا اور بالآخر انہیں ایک ایسی چیز پر لے آیا جو اُنہیں بھی قبول تھی اور ہمیں بھی۔''

یہ تو تھے محمد علی کے ذاتی مشاہدات و تاثرات لیکن باہر سے اُن کو جو اطلاعات اُن کے رفقا کی طرف سے ملتی تھیں، وہ بھی ایسی ہی درد انگیز حقیقت کا مظہر ہوتی تھیں۔ یہ اطلاعیں اُن کو اُن رفقا کی طرف سے ملتی تھیں جو خود عقیدتاً کانگریسی ہوتے تھے اور ہندو مسلم اتحاد جن کی زندگی کا مقصد ہوتا تھا، لیکن اعترافِ حقیقت پر وہ بھی مجبور ہوتے تھے اور فریاد محمد علی ہی کے حضور میں پیش کرتے تھے!

اس قسم کے متعدد افسوس ناک واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے اُس عہد کی ہندو ذہنیت کا صحیح مرقع آنکھوں کے سامنے آ سکے، لیکن بہر حال یہ اوراق ایک کتاب کے لیے صرف ہو رہے ہیں، کسی اخبار کے کالم نہیں ہیں اس لیے مجبوراً تفصیلی واقعات سے گزیز کرنا پڑتا ہے۔ ''محمد علی میوزیم'' میں اُن کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ چیز بہت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ کچھ مصلحتاً اور کچھ ضرورتاً اس قسم کے تکلیف دہ واقعات کی مثال سے ہم چشم پوشی کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ محمد علی کے ثقہ اور معتمد رفقاء نے (اُن رفقا نے جن کی زبانیں اُس وقت ہندوؤں کی شکایت کر رہی تھیں اور آج جو قید و بند کے مصائب تحریک وطنی کے سلسلہ میں پھر جھیل رہے ہیں) محمد علی کے حضور میں اپنی شکایتیں پیش کیں جن سے محمد علی کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ مختصراً یہ اور اسی قسم کے دوسرے اسباب تھے جنہوں نے محمد علی کو ہندوؤں سے اور آخر میں کانگریس سے اور سب سے آخر میں گاندھی جی سے دِل برداشتہ کر دیا تھا۔

باب ۲۴

علالت

یوں تو کئی سال سے اُن کی طبیعت خراب تھی، 1928ء میں یورپ وہ علاج ہی کے لیے گئے تھے مگر وفات سے ڈیڑھ سال پیشتر سے محمد علی کی طبیعت اور صحت پر حد درجہ برا اثر پڑا تھا۔ اُن کی ذیابیطس کی شکایت پھر زور شور سے شروع ہو گئی تھی، آنکھوں کی بینائی پر بھی سخت اثر ہوا تھا۔ چنانچہ ایک آنکھ کی بینائی تو جاتی ہی رہی تھی اور دوسری آنکھ بھی خطرہ میں تھی۔ قلب کی حرکت بھی بہت خراب ہو رہی تھی اور شاید ذیابیطس کی وجہ سے اُن کی ہڈیاں بھی خراب ہو رہی تھیں، چنانچہ اُن کے پیر متوزم رہنے لگے تھے اور ڈاکٹروں کی طرف سے اُنہیں ہدایت تھی کہ اگر جان عزیز ہے تو سکون اور فراغ خاطر کے ساتھ کسی گوشہ میں تمام عملی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ جاؤ۔

لیکن ملکی اور قومی معاملات نے اُنہیں اِس درجہ مضطر بنا رکھا تھا کہ اُن سے خاموشی اور سکوت کی توقع کرنا ایک امر محال تھا، بالخصوص مسلمانوں کی حالتِ زار نے اُن میں اگرچہ ایک حیرت انگیز قوتِ عمل تازہ کر دی تھی، لیکن اِسی سرعت کے ساتھ اُن کی صحت انحطاط کی منازل طے کر رہی تھی۔

دہلی میں:

جب تک وہ دہلی میں علیل اور صاحب فراش رہے، اُس وقت تک ڈاکٹر انصاری اُن کی صحت کے نگراں رہے اور برابر مشورہ دیتے رہے کہ گوشہ گیر ہو جاؤ، صحت حاصل ہو جانے کے بعد پھر جو جی میں آئے وہ کرنا۔ مگر محمد علی اپنے دردِ قوم اور پاسِ ملت کی بنا پر یہ سچا مشورہ نہ قبول کر سکے۔ پھر آب و ہوا اور تبدیلیٔ علاج کی خاطر شملہ چلے گئے۔

شملہ میں ضمناً یہ فائدہ حاصل ہونے کی توقع بھی تھی کہ نسبتاً اطمینان وسکون رہے گا، مگر وہاں بھی وہ اپنے اشغالِ ملکی سے باز نہ آئے، نتیجہ ہوا کہ وہاں اُن کی صحت اور زیادہ خراب ہوگئی اور دِل کے متعدد دورے اِس قدر سخت پڑے کہ حالت نازک ہوگئی۔

وائسرائے کا طبیبِ خاص:

اُسی زمانہ میں محمد علی کی حالت سے متاثر ہوکر لارڈ اِرون وائسرائے ہند نے اپنا پرسنل سرجن محمد علی کی خدمت میں بھیجا تاکہ صحیح تشخیص کے بعد کوئی معقول علاج کیا جاسکے۔ اصل غرض لارڈ اِرون کی یہ تھی کہ کم از کم محمد علی کی صحت اِس قابل ہوجائے کہ وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرسکیں، اِس لیے کہ وہ بہت مصر تھے کہ محمد علی گول میز کانفرنس میں ضرور شریک ہوں۔

ہنگامۂ اختلاف:

وائسرائے کے سرجن کا دیکھنا غضب ہوگیا اور مخالفین کو موقع ہاتھ آگیا کہ وہ محمد علی کی ''ٹوڈیت'' اور ''گورنمنٹ پرستی'' پر جس طرح چاہیں، اپنے اشہبِ قلم کو بے لگام کریں، چنانچہ لوگوں نے اِس بہانے سے خوب اپنے دِل کی دیرینہ تمنائیں پوری کیں اور پورے طور سے محمد علی کو آماج گاہِ سب وشتم بنالیا۔

ایک اخبار کا طنز:

محمد علی کی علالت کے زمانہ میں سب سے زیادہ افسوس ناک اور قابل ملامت نکتہ چینی اُس اخبار کی تھی جو پنجاب کے ایک ''آقا'' کی ملکیت میں نکل رہا تھا۔ اُس کو اِس کا خیال بھی نہیں رہا کہ ایک بیمار پر اور ایسا بیمار جس کو نقل وحرکت بھی دشوار ہو، اِس دِل شکن اور ''سنسنی خیز'' انداز میں تنقید کرنا صحافتی ذمہ داری، شرافت اور انسانیت کا نہایت بے دردی سے خون کرنا ہے۔

بہرحال اُس نے محمد علی کی ''اس منفعت بخش'' علالت پر خوب خوشیاں منائیں اور علی الاعلان اُن کی اِس علالت کو ایک ڈھونگ سمجھا جو جلبِ زر یا کسی اور مقصد کی خاطر رچایا گیا تھا۔

سر یعقوب کا مشاہدہ:

اُسی زمانہ میں سر محمد یعقوب، محمد علی کو دیکھنے گئے اور اِن تاثرات کے ساتھ واپس آئے:

''محمد علی سے میری آخری ملاقات گزشتہ جولائی میں شملہ کے رپن ہسپتال میں ہوئی، آخر جون میں جب میں شملہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ محمد علی وہاں مقیم ہیں۔ دوسرے روز شام کو میں اُن سے ملنے گیا، ''دھول پور ہاؤس'' میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرے آواز دینے پر ایک نوکر لڑکا باہر آیا، اس نے کہا کہ رات میاں کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی اور اِس وقت ذرا آنکھ لگ گئی ہے۔ اپنا کارڈ چھوڑ کر میں واپس ہو رہا تھا کہ اوپر سے محمد علی کی آواز آئی، یعقوب! یعقوب!! یہاں آجاؤ، میں اوپر پہنچا، دیکھا کہ محمد علی پلنگ پر بیٹھے ہیں، سائمن کمیشن کی رپورٹ ہاتھ میں ہے۔ اوّل حسبِ معمول نہایت گرم جوشی سے مصافحہ اور علیک سلیک ہوئی، میں نے مزاج کا حال پوچھا، کہنے لگے کہ کل شام سائمن رپورٹ ہاتھ میں آئی، رات کو دو بجے تک میں اِس کو پڑھتا رہا، اِسی حالت میں دورہ ہو گیا اور دِل میں تکلیف پیدا ہوگئی، رات بھر اِس رپورٹ کو پڑھتا رہا اور اب قریب ختم پہنچ گیا ہوں۔

قریب ایک گھنٹہ کے بڑے جوش کے ساتھ رپورٹ پر نکتہ چینی اور تنقید کرتے رہے، میرے واپس آنے کے بعد اُسی شب میں پھر دل کا دورہ پڑا۔''

گول میز کانفرنس:

اِس حالت میں لارڈ ارون نے اُنہیں گول میز کانفرنس کے لیے مدعو کیا۔

واقعہ یہ تھا کہ اپنی صحت کے باعث محمد علی قطعاً اپنا سفر ملتوی کر دیتے، لیکن اُنہوں نے دیکھا کہ کانفرنس کے مسلم مندوبین میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اُن کی جماعت کا ہو، اُن کا ہم خیال ہو، یا کم از کم ایسا ہو جس پر وہ اپنے عقائدِ سیاسی میں پورے طور سے اعتماد کر سکیں، اس لیے مجبوراً اُنہوں نے اپنی سخت ترین علالت کے باوجود شرکت کا ارادہ کیا اور ہزاروں مخالفتوں اور نکتہ چینی کے باوجود وہ شریک ہوئے۔

ایک شاہد عینی:

جب وہ عازم انگلستان ہوئے تو اُن کی حالت کیا تھی؟ ایک صاحب جو محمد علی کو رخصت کرنے اور الوداع کہنے بمبئی آئے تھے، وہ کہتے ہیں:

''(محمد علی) کی روانگی (گول میز) کا نظارہ بڑا رقت انگیز تھا۔ جس وقت آپ کو اسٹریچر پر لٹا کر ساحل بمبئی سے وائسرائے آف انڈیا جہاز پر سوار کرایا گیا، اُس وقت تمام حاضرین کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، گویا زندہ جنازہ جا رہا ہے۔''

مولانا عبدالماجد بدایونی کا سوال:

مولانا عبدالماجد صاحب بدایوانی مرحوم نے جب مولانا (محمد علی) سے پوچھا:

''آپ اتنا طویل سفر کیوں اختیار کر رہے ہو؟''

تو آپ نے عجیب مسکراہٹ سے جواب دیا:

''مرنے کے لیے جس وقت راقم الحروف (مولانا عبدالماجد) آپ (محمد علی) کو الوداع کہنے کے ارادہ سے بمبئی گیا تو مرحوم دارالخلافت کے بالاخانہ پر خون کی قے کر رہے تھے۔''

اِن حالات میں ملک وملت کا یہ فدائی اور اخلاص وایثار کا یہ مجسمہ متحرک، دوسروں کے کندھوں پر لد کر جہاز پر پہنچایا گیا اور بالآخر انگلستان روانہ ہو گیا۔

''کاش! محمد علی کو لندن نہ جانا پڑتا، لندن خود محمد علی کے قدموں میں آ گیا ہوتا۔''

پیرس:

جب محمد علی پیرس پہنچے تو اُن کی حالت وہاں پھر خراب ہو گئی اور اتنی زیادہ خراب ہو گئی کہ ڈاکٹروں نے لندن جانے سے منع کر دیا۔ لیکن محمد علی نے اِس قدغن کا جواب یہ دیا کہ پیرس ہی میں اپنا مشغلہ شروع کر دیا یعنی پیرس کے طلبہ کے سامنے اسلام اور قومیت وغیرہ پر تقریر۔

وہاں علاج میں بہت سرگرمی اور تندہی کا اظہار کیا گیا۔ دماغ، زبان، دِل، نبض، تھوک، پاخانہ،

پیشاب۔ ہر چیز کے ماہروں نے ہر چیز کا الگ الگ ''ٹیسٹ'' کیا اور پھر علاج شروع ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی صحت اتنی سنبھل گئی کہ وہ لندن جا سکیں، چنانچہ ڈاکٹروں کی اِس ''دبی دبی رائے'' سے بھی محمد علی نے پورا فائدہ اٹھایا اور لندن چل کھڑے ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ایک بہت ہی عجیب وغریب اور دِل نواز تقریر کر کے پھر علیل ہو گئے۔ اب کی مرض نے پہلے سے زیادہ سخت حملہ کیا۔

مکتوب بنام عرفان:

چنانچہ مولانا عرفان صاحب کو محمد علی لکھتے ہیں:

''جب سے یہاں آیا ہوں، دوبارہ صاحبِ فراش ہو چکا ہوں۔ 19 کو اپنی تقریر کرنے کے بعد سخت تکلیف اٹھائی اور شب کے بارہ بجے تک دردِ قولنج میں مبتلا رہا۔ دِل کی خرابی کے باعث دورانِ خون ٹھیک نہیں ہے، اس لیے نیچے کا سارا جسم سخت ورم میں مبتلا ہے۔ دمہ والوں کی طرح شب میں سانس چلتی ہے، اس لیے لیٹ بھی نہیں سکتا۔ 24 گھنٹہ برابر پلنگ پر بیٹھا رہنا پڑتا ہے۔''

تقریر کا تذکرہ:

اپنی مشہور گول میز والی تقریر میں ضمناً نواب صاحب بھوپال کی اِس عنایت کا کہ شملہ میں وہ اپنے سابق ''ٹیوٹر'' کی سخت علالت دیکھ کر اپنے ساتھ بھوپال لے گئے اور ''گیسٹ ہاؤس'' کو ایک ''ہسپتال'' میں تبدیل کر دیا، گو وہاں بھی اُن کی حالت خراب ہی رہی لیکن بہر حال شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی علالت کا تذکرہ دیکھئے، کیسے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں! بیمار ہیں، زار و نزار ہیں لیکن اپنی تقریر میں ابر بہار ہیں۔ ہر شخص خوش، ہر شخص مسرور۔ فرماتے ہیں:

''جب مجھے شملہ کے شفاخانہ میں بھیجا گیا تو ایک یورپین خاتون نے ہمارے ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ بڑے میاں کو کس مرض کی شکایت ہے؟ ڈاکٹر نے جواب دیا کہ یہ نہ پوچھو کہ اِسے کیا شکایت ہے، بلکہ یہ پوچھو کہ اسے کون سی شکایت نہیں ہے؟''

علالت کی تفصیل:

''میری یہ کیفیت ہے کہ قلب کی حالت درست نہیں، بینائی میں فرق آ گیا ہے، پاؤں متورم ہیں، ذیابیطس کا عارضہ ہے۔ بیماریوں کی اِس طویل فہرست سے جو میں نے پیش کی ہے، میرے دِل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں کرنل گڈنی ایک طبیب کی حیثیت سے تشریح امراض کے معاملہ میں مجھے اپنا رقیب نہ سمجھ لیں (قہقہہ)۔ میں کہتا ہوں کہ جس آدمی کے حواس بجا ہیں، وہ اِن بیماریوں کے ساتھ میل کا سفر بھی نہیں طے کر سکتا۔ لیکن پھر بھی میں خشکی اور سمندر کے سات ہزار میل کا سفر طے کر کے یہاں پہنچ گیا ہوں کیونکہ جہاں ہندوستان اور مسلمان کا معاملہ آ جاتا ہے، وہاں میری حالت دیوانوں کی سی ہو جاتی ہے۔''

غرض اِس نازک حالت میں بھی محمد علی اپنی کارگزاری اور عملی قوت کا برابر ثبوت دیتے رہے۔

❀❀❀

باب ۲۵

وفات

صفحاتِ ماقبل میں آپ محمد علی کی علالت کے مفصل حالات پڑھ چکے ہیں۔

جو شخص اتنی مسلسل علالت کے باوجود ڈاکٹروں اور طبّی مشیروں کی مخالفت کے باوجود سرگرم رہے اور وہ بھی اِس طرح کہ نہ دِن کا خیال نہ رات کا، نہ کھانے کی فکر نہ پانی کی، نہ ساری قوتِ عمل گردش رہی ہو، تعجب ہے کہ اُس کی وفات اتنی دیر میں کیوں ہوئی؟ اُسے تو شملہ میں ختم ہو جانا چاہیے تھا! یہ خدا کی مشیت ہے۔ جب تک وہ کسی سے کام لینا چاہتا ہے، اُس وقت تک موقع دیتا ہے اور وہ چراغِ صبح کی طرح بھڑک بھڑک کر اپنی مضمحل اور افسردہ روشنی سے کسی نہ کسی حد تک ضیاباری کرتا ہے، پھر جب وقت آ جاتا ہے تو بادِ صبا کا ایک جھونکا اِس جھلملاتے ہوئے چراغ کو ختم کر دیتا ہے، محمد علی کی مثال ایسی ہے تھی!

تقریر کے بعد:

گول میز کانفرنس کی تقریر کے بعد سے محمد علی کی حالت جو گری تو پھر نہیں سنبھلی اور اس کا کوئی امکان بھی نہیں باقی رہ گیا تھا۔

وفات کی شبِ بلا سے پیشتر وہ رات بھر کام کرتے رہے۔

ہندو مسلم اسکیم:

ہندو مسلم تعلقات پر جو اُنہوں نے ایک مفصل اسکیم تیار کی تھی، اُس کا مسودّہ ٹھیک کراتے رہے اور وزیر اعظم کے پاس اُس کے بھیجنے کی فکر کرتے رہے۔

وفات:

حالت بظاہر اگرچہ اتنی تشویش انگیز نہیں تھی کہ اُن کی جان کا خطرہ کیا جاتا اسی لیے شوکت صاحب ایک دوست سے ملنے آئر لینڈ تشریف لے گئے تھے، لیکن اپنی اِس اسکیم کے بعد وہ بے ہوش ہو گئے اور کئی گھنٹہ کی بے ہوشی کے بعد صبح کو کچھ دیر کے بعد آنکھ کھلی۔ اُس وقت تھکا ماندا بوڑھا بھائی بھی پہنچ چکا تھا کہ دیکھتے دیکھتے محمد علی کی روح عالم بالا کو سدھاری! انا للہ و انا الیہ راجعون۔

دیارِ غیر میں موت سے ''بے کسی'' کی خواہ کتنی ہی ''شرم'' رہ جائے، لیکن ہوتی عبرتناک ہے۔ اُس بیوی پر کیا کچھ نہ گزر گئی ہوگی جو اِن اُمیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ تیمارداری اور چارہ سازی کرتی ہوئی گئی تھی کہ اپنے محبوب شوہر کے ساتھ واپس ہوگی، لیکن آہ! اب اُس کے ساتھ محمد علی کے بجائے ایک جسدِ بے روح ہے جس کے سرہانے بیٹھی وہ حق وفا ادا کر رہی ہے لیکن کب تک؟

اُس بچی پر کیا نہ بیتی ہوگی جو باپ کے ساتھ نہ جا سکی تھی اور دہلی ہی میں بیٹھی ہوئی روزانہ خطوط کا انتظار کیا کرتی تھی، خبر صحت کی جویا رہتی تھی اور اِس کی منتظر کہ عنقریب مہر پدر سے پھر لطف اندوز ہوگی! لیکن آہ... جب اُسے زبانِ برق نے اُس کے پیارے باپ کی خبر وفات سنائی ہوگی، اُس وقت اُسے اپنی محرومی پر کتنی حسرت، کتنا تاسف اور کتنا ناقابل برداشت صدمہ ہوا ہوگا کہ وقتِ آخر بھی وہ اپنے پیکرِ رفق و محبت باپ کی زیارت نہ کر سکی!

اور آہ! اُس بوڑھے لیکن جواں ہمت بھائی کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی جس کا وہ دستِ راست تھا، دِل کی طاقت تھا اور وجہ شکیبائی تھا۔ دونوں بھائیوں کی داستانِ محبت کیسی کچھ مشہور ہے؟ شوکت نے سچ کہا کہ محمد علی اُس کا بھائی بھی تھا، بیٹا بھی، عاشق بھی تھا اور معشوق بھی! اُس بڑے بھائی نے اپنے سامنے اپنی زندگی کی کمائی کو لٹتے ہوئے دیکھا اور خاموش رہا۔

یہ سب کچھ ہوا، نالہ و شیون بھی ہوا، نوحہ و ماتم بھی ہوا، سینہ کوبی اور چاک دامانی کا مظاہرہ بھی ہوا، لیکن اِس کا کیا علاج کہ محمد علی ہم سے ایسا جدا ہوا کہ اب اِس عالم خاکی میں آنکھیں اُس کی کبھی بھی زیارت نہ کر سکیں گی۔ فیاللحسرۃ۔

باب ۲۶

قابل رشک کشمکش

خبر وفات:

محمد علی کی خبر وفات آناً فاناً سارے ملک میں پھیل گئی اور جوق در جوق لوگ آنا شروع ہوئے کہ مراسم تعزیت ادا کریں۔

مہاراجہ اَلور کی حالت:

علالت کے زمانہ میں مہاراجہ صاحب اَلور کی یہ حالت تھی کہ اضطراب واضطرار کے عالم میں ننگے سر اور ننگے پیر بار بار دوڑ دوڑ کر آئے تھے، وفات جب ہوئی تو اُنہیں اور بھی صدمہ ہوا۔ وفورِ رنج وتاثر کا یہ عالم تھا کہ وہ شوکت علی صاحب سے آنکھ نہیں ملا سکے تھے۔

التوا:

اب زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ لاش دفن کہاں کی جائے؟ بعض احباب کا خیال تھا کہ تدفین لندن ہی میں ہونی چاہیے لیکن گھر والے اس کے خلاف تھے۔

ہندوستان سے طلبی:

بیگم محمد علی اُنہیں ہندوستان لے جانا چاہتی تھیں اور خود ہندوستان سے سیکڑوں تار پہنچے کہ نعش یہاں لائے تا کہ ہم تشنہ کامانِ زیارت آخری زیارت ہی سے مشرف ہو جائیں، لیکن ابھی اِس کے متعلق کوئی

فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان کے مختلف شہروں سے دعوتیں پہنچیں کہ محمد علی کی نعش یہاں آئے اور اِس سرزمین سے بڑھ کر کوئی دوسری سرزمین نہیں ہوسکتی۔

رامپور:

رامپور نے یہ استحقاق پیش کیا کہ اسے محمد علی کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے، اس لیے محمد علی کو وہیں سپردِ خاک ہونا چاہیے جہاں سے اُن کا خمیر ہے۔

لکھنؤ:

لکھنؤ نے یہ استحقاق باصرار پیش کیا کہ اُس سے بڑھ کر اِس امانت کا حق دار کوئی نہیں ہوسکتا کہ یہیں اُن کے مرشد مولانا عبدالباری مرحوم کی آخری آرام گاہ ہے، یہیں محمد علی نے انجمن خدام کعبہ کی تاسیس اور جمعیت خلافت کے قیام کی کوششیں کیں، اس لیے محمد علی کو اپنے مرشد کے پاس آسودۂ خاک بھی ہونا چاہیے۔

اجمیر:

اجمیر نے استدعا یہ پیش کی کہ محمد علی کو سلطان الہند، غریب نواز، خواجہ معین الدین اجمیری قدس اللہ سرہٗ کے سایہ ہماپایہ میں آخری موقع استراحت ملنا چاہیے۔ اس لیے بھی کہ خود محمد علی کو درگاہِ خواجہ سے بہت عقیدت تھی اور وہ اکثر یہاں حاضری دیا کرتے تھے، اور اس لیے بھی کہ ہندوستان میں اِس آستانہ سے بڑھ کر کوئی اور ایسا آستانہ نہیں کہ اس خصوصیت میں اس کا ہم سر ہوسکے۔

کلکتہ:

کلکتہ نے کہا کہ آرزوؤں اور تمناؤں، حوصلوں اور کوششوں، سرگرمیوں اور کارگزاریوں نے یہیں عمل کی صورت اختیار کی اور یہیں اُن کی ابتدا ہوئی۔ ''کامریڈ'' بھی یہیں سے نکلا اور اُن کی پبلک زندگی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا، لہٰذا واجب ہے کہ اُس کی آرزوؤں اور اُس کے جسدِ خاکی کا مدفن وہی قرار دیا جائے جو مطلع رہ چکا ہے۔

علی گڑھ:

علی گڑھ آگے بڑھا اور اُس نے کہا کہ محمد علی کے ذہن ودماغ کی نشوونما یہیں ہوئی، تعلیم وتربیت یہیں ہوئی، حوصلوں اور ولولوں نے یہیں پرورش پائی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محمد علی طلوع بھی یہیں سے ہوا تھا، لہٰذا غروب بھی یہیں ہو۔

دِلّی:

شاہانِ مغلیہ کی راج دھانی، دِلّی ایک سوگوارانہ انداز سے آگے بڑھی اور اُس نے کہا، محمد علی چمکے یہیں، پھلے پھولے، یہیں کامیاب وکامگار ہوئے، ناکام ونامرادی کی زندگی یہاں بسر کی، چھندواڑہ کی رہائی کے بعد دِلّی ہی نے سب سے زیادہ عدیم المثال شاہانہ استقبال کیا تھا اور اب دِلّی ہی اپنی اِس متاعِ عزیز کو جس نے اسے اپنے وطن ثانی کی حیثیت دے دی تھی، اپنی آغوشِ لحد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آرام کی نیند سلائے گی اور پھر استحقاق بھی اُسے حاصل ہے کہ محمد علی کی چہیتی ماں آبادی بانو کی آغوشِ تمنا یہیں اُس کے لیے کھلی ہوتی۔

بیت المقدس:

لیکن بیت المقدس کی سرزمین نے اپنے مقدس بازوؤں کو پھیلایا اور محمد علی سے کہا، تیری ساری زندگی اور ساری جدوجہد تیری دوستی اور دشمنی اللہ کے لیے تھی۔ دیکھ! یہ برگزیدہ انبیائے مرسلین کے جسد پاک اور بے شمار اولیائے مقبولین کے اجسام مطہرہ میرے سینہ میں محفوظ ہیں۔ آ! میں تجھے ایک گوشہ عافیت اِسی سرزمین یمن وسلام کا دیتی ہوں، بول! منظور ہے؟

محمد علی کی روح مسکرائی اور آگے بڑھی، مسجد عمر نے اپنا سینہ شق کیا اور محمد علی اُس میں سما گیا۔ کیا قسمت تھی! یہ رُتبہ بلند ملا جس کو، مل گیا! بقول میر انیس:

یاں کی زمین سے مرتبہ پست آسمان کا ہے
کہتے ہیں جس کو عرش وفرش اس مکاں کا ہے

باب ۲۷

تکفین و تدفین

بیت المقدس کی دعوت منظور:

بالآخر بہت غور وفکر اور کشمکش کے بعد سرزمین قدس کی دعوت منظور کر لی گئی اور اِس کے انتظامات ہونے لگے کہ محمد علی کو اِس سرزمین کفر والحاد سے اُس سرزمین قدس میں منتقل کر دیا جائے۔

نماز جنازہ:

''جس ہوٹل میں مولانا مقیم تھے، وہاں سے نعش رات کے بارہ بجے لفٹ سے نیچے اتاری گئی۔ نعش ایسی معلوم ہوتی تھی کہ جیسے کوئی شخص سکون وآرام سے سو رہا ہے، نعش کو دوا کا انجکشن دے کر ایسا کر دیا گیا تھا کہ دس برس بھی نہ بگڑے۔ نعش پر شب و روز قرآن خوانی ہوتی رہی۔ 5 جنوری 1931ء کو شوکت علی، عبدالرحمٰن صدیقی اور مظفر نے نعش کو غسل دیا اور شام کے چھ بجے حسب اعلان لیڈ بگٹن ہال میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔

جس میں اراکین گول میز کانفرنس، سفرائے ایران ومصر و کابل، وزیر ہند لارڈ سینکے، وزیراعظم کا نمائندہ اور دیگر معززین شریک تھے۔ نعش بذریعہ نارکنڈا جہاز ٹیلری بندر سے بیت المقدس روانہ کی گئی، 21 جنوری کو پورٹ سعید پہنچی۔

شاہِ مصر کے نمائندے وزیراعظم مشائخین شہر پورٹ سعید جلوس میں شامل تھے، مسجد

عباس میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ مصری پولیس نے سلامی دی اور جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ شہزادہ محمد علی نے محمد علی مرحوم کے لیے غلافِ کعبہ کا ایک ٹکڑا تابوت پر رکھنے کے لیے مرحمت فرمایا، مرحوم کا کفن خالص کھدر کا تھا۔''

بیت المقدس میں:

''یروشلم 23 جنوری، آج شہیدِ ملت مولانا محمد علی کا تابوت یہاں پہنچا۔ پبلک کا ایک جم غفیر اِس عظیم الشان جلوس کے چاروں طرف موجود تھا۔ تمام عربوں، مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کی دُکانیں شہیدِ ملت کے اعزاز میں بند تھیں، یہودیوں نے عربی پریس کو چاروں طرف سے ہمدردی اور تعزیت کے پیام بھیجے ہیں، مولانا شوکت علی نے اعلان کیا ہے کہ میرے عزیز بھائی کا یروشلم میں دفن ہونا مشرقی ممالک کے ابدی اور مستحکم اتحاد پر دلالت کرتا ہے۔ جلوسوں میں مولانا شوکت علی اور یروشلم کے مفتیٔ اعظم پیش پیش تھے اور اُن کے پیچھے تمام دُنیا کے ماتم کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں ساتھ ساتھ آ رہے تھے، تابوت بالکل مقبرہ تھا۔ قاہرہ، عمان، تیونس وغیرہ ممالک سے آئے ہوئے اصحاب نے پردرد مرثیہ پڑھے۔ جب تابوت بیت المقدس میں پہنچا تو مجمع اِس قدر بڑھ گیا تھا کہ بہت مشکل سے تابوت گاڑی سے باہر نکالا جا سکا۔ مسلمانوں، عیسائیوں اور خواتین کے وفد بیگم صاحبہ محمد علی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دو لاکھ سے زیادہ مردوں، عورتوں کا مجمع تھا جو جلوس کی صورت میں اسٹیشن سے حرم شریف تک تابوت کے ساتھ آیا۔ سڑکوں کے دونوں طرف مکانوں کی کھڑکیاں، چھتیں آدمیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ ہر طرف آدمیوں کے سر ہی سر نظر آتے تھے۔ لوگوں کا سڑک پر سے گزرنا مشکل ہو رہا تھا۔ تابوت کوئی تین گھنٹہ میں حرم شریف پہنچا۔ سب قوموں کے معززین، برطانوی حکومت کا نمائندہ، امیر عبداللہ اور شاہ حسین کے قونصل اور ہر شہر کے پروٹسٹنٹ اور گریک چرچ کے مذہبی

پیشوا اُس وقت موجود تھے اور سب نے تعزیت کی۔ بعد نماز، جنازہ کی نماز پڑھی گئی۔ مسجدِ اقصیٰ کے اندر اور باہر سارے صحن میں مردوں اور عورتوں کا بڑا زبردست مجمع تھا، ہزاروں خواتین کی موجودگی جو چار چار کی صورت میں برقعہ اوڑھے صف بستہ کھڑی تھیں، نہایت متاثر کن تھی۔ تابوت صخرہ شریف کے آگے رکھا گیا اور تمام مشہور مسلمانوں نے آخری تقریریں کیں۔''

اور اس طرح بالآخر ہندوستان کا یہ سپوت آب وگل کے جھگڑوں اور آلائشوں سے چھوٹ کر ہمیشہ کے لیے مطمئن ہو گیا۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی کا تاثر:

مولانا سیّد سلیمان ندوی نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا:

-''تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو۔ تو اُمتِ محمدیہ کا سوگوار تھا، فرض ہے کہ پوری اُمتِ محمدی تیرا سوگ کرے۔ تو نے دُنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا، سزاوار ہے کہ دُنیائے اسلام تیرا ماتم کرے۔ ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لیے غمزدہ، بلقان کے لیے اشک بار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختہ غم اور بیت المقدس کے لیے وقفِ الم۔ اے ہند کے آوارہ گرد مسافر! تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا۔ مناسب یہی تھا کہ تیرے لیے اوّلین قبلہ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اُس میں سما جائے۔''

باب ۲۸

جلوس اور جلسے

عام حالت:

محمد علی کی خبر وفات ایسی نہیں تھی کہ اپنا اثر ظاہر کیے بغیر رہتی۔ اُس کی شخصیت ایک عالم سے اپنا لوہا منوا چکی تھی، اسی لیے ایک عالم نے اُس کا ماتم کیا۔ ممالکِ غیر میں جہاں جہاں محمد علی کا نام اور محمد علی کی شہرت پہنچی تھی، وہاں اُس کی وفات پر ماتم کیا گیا۔

کابل میں ماتم:

ہندوستان کے پڑوسی ملک ''افغانستان'' نے بھی محمد علی کا دِل کھول کر ماتم کیا۔ مہاجرین ہند کے اُس جلسہ تعزیت میں ہز میجسٹی شاہ نادر خاں فرمانروائے افغانستان نے بہ نفس نفیس شرکت کا ارادہ کیا اور بعد کو ایک خاص مانع کے سبب وہ نہ آ سکے تو اُس جلسہ میں اپنے وزراء اور اسٹاف کو اپنی نمائندگی کے طور پر شرکت کے لیے بھیجا۔

ہندوستان میں ماتم:

ہندوستان میں جب یہ خبر پہنچی ہے تو سارے ہندوستان پر ایک سناٹا چھا گیا اور گو اُس زمانہ میں تحریکِ سول نامتابعت جاری تھی جس کے محمد علی سخت مخالف تھے، مگر پھر بھی ہندوستان بھر میں اُن کا زبردست ماتم کیا گیا، جلوس نکالے گئے، تقریریں کی گئیں، اُن کی خدمات سراہی گئیں اور اُن کے کارنامے بیان کیے گئے، اور اِس اظہارِ غم والم میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ جس

طرح خلافت کمیٹیوں اور محمد علی کے ہم خیالوں نے اُن کا سوگ منایا، بالکل اُسی طرح کانگریس کمیٹیوں اور ہندوؤں نے محمد علی کے ماتم میں حصہ لیا اور ہرتال وغیرہ سب میں اُنہوں نے اپنے کو برابر کا شریک و سہیم ثابت کیا۔

لکھنؤ کا جلسہ:

لکھنؤ کا جلسہ چونکہ راقم الحروف کے سامنے ہوا تھا، اس لیے اُس کے متعلق تفصیل سے بتایا جا سکتا ہے تاکہ لکھنؤ کے جلسہ سے دوسرے جلسوں کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔

اِس خبر کے پھیلتے ہی لکھنؤ پر حزن والم کا بادل چھا گیا، ہر شخص متاثر تھا۔ عام اِس سے کہ وہ محمد علی کے خیالات سے اتفاق رکھتا ہو یا اختلاف۔

مولانا ظفر الملک کا تاثر:

چنانچہ راقم الحروف مولانا ظفر الملک کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس خبر بد کی اطلاع کو دو روز گزر چکے تھے، بر سبیل تذکرہ محمد علی کا ذکر آ گیا تو ظفر الملک صاحب کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ آنسو روکنا چاہتے تھے مگر نہیں روک سکے۔ اُنہوں نے بولنا چاہا مگر گریہ گلوگیر ہو گیا۔ یہ منظر اتنا مؤثر تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ مولانا ظفر الملک صاحب کو محمد علی کی آخری آراء وافکار سے سخت اختلاف تھا اور کچھ ہی عرصہ پیشتر وہ گزشتہ تحریکِ سول نافرمانی (نمک سازی) کے سلسلہ میں جیل سے رہا ہوئے تھے۔

دوسرے روز پھر حاضری کا اتفاق ہوا، پھر اُس روز بھی ممدوح کے وفورِ تاثر کا یہی عالم تھا۔

جلسہ کے انتظامات:

مسلمانانِ لکھنؤ کے اظہارِ غم والم کے لیے لکھنؤ کے ہر طبقے کی طرف سے ایک جلسہ کا اعلان کیا گیا اور ہڑتال کا مطالبہ کیا گیا۔

ایک دوسرا جلسہ:

اس جلسے کے انتظامات ابھی مکمل نہیں ہوئے تھے لیکن سلسلہ جاری تھا، اس سے ایک روز پیشتر لکھنؤ کی ''اسٹوڈنٹس یونین'' نے ایک عظیم الشان جلسہ کے انتظامات کیے جس میں لکھنؤ یونیورسٹی، دار العلوم ندوۃ العلماء، کرسچین کالج، جوبلی کالج، شیعہ کالج، امین آباد مسلم ہائی اسکول، حسین آباد ہائی اسکول کے تمام طلبہ نے نہایت سرگرمی و مستعدی سے حصہ لیا اور شام کو ۹ بجے نظیر آباد سے طلبہ کا ایک جلوس ہزار تماشائیوں کے ساتھ ننگے سر، بازو پر سیاہ نشان باندھے، دو دو کی صف میں چلا۔ اُس نے قیصر باغ، روشن دولہ، گولہ گنج، مولوی گنج، خیالی گنج اور امین الدولہ پارک کی طرف کے تمام حصوں میں گشت کیا اور پھر گنگا پرشاد میموریل ہال میں داخل ہوا۔ حاضرین کی کثرت سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، تل رکھنے کی گنجائش نہیں تھی، اوپر کی گیلریاں بھی آدمیوں سے پر تھیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک طالب علم کی صدارت میں وہ جلسہ ہوا اور بہت دیر تک جاری رہا۔ لکھنؤ یونیورسٹی، دار العلوم ندوۃ العلما اور دوسری درس گاہوں کے طلبہ نے نہایت پر جوش اور درد انگیز تقریریں کیں، خوش قسمتی سے راقم الحروف کو بھی اُس جلسہ میں تقریر کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

اصل جلسہ:

دوسرے روز اصل جلسہ بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوا۔ پہلے تو رضا کاروں کے تمام دستے جنہوں نے سارے شہر میں گشت کیا تھا، آئے۔ پھر کانگرس کے والنٹیر آئے۔ پھر دوسری انجمنوں کی کوریں آئیں اور پھر حاضرین آنا شروع ہوئے۔ حالت یہ تھی کہ امین الدولہ پارک میں آدمیوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا اور اُس میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ ہر فرقہ، ہر جماعت، ہر خیال اور ہر مسلک کے عام و خاص خصوصاً عام لوگ موجود تھے۔

شرکاء:

جلسہ کے مخصوص و ممتاز حاضرین میں بھی مختلف الخیال اور مختلف العقائد حضرات کا گروہ نظر آ رہا تھا مثلاً قطب الدین عبد الوالی صاحب، صبغت اللہ صاحب شہید، عنایت اللہ صاحب فرنگی محل، مولانا ظفر

الملک صاحب، مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی، چودھری خلیق الزماں صاحب، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی، پنڈت ہرکرن ناتھ مصراء... اِس کے علاوہ اور بہت سے معززین ہندو مسلم شریک تھے۔

مولانا صفی کی نظم:

مولانا صفی نے اپنی دِل گداز نظم سے حاضرین کو تڑپا دیا، وہ نظم اپنے موقعہ سے آئے گی۔ اِسی طرح اور دوسرے حضرات نے تقریریں کیں اور مرثیہ پڑھے اور اپنے غیر معمولی غم والم کا اظہار کیا۔

جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ بڑے عرصہ تک ہوتا رہا۔

راقم الحروف نے مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی سے اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ اتنی غیر معمولی کامیابی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ انہوں نے فرمایا، حضرت جوہر خود فرمائے گئے ہیں:

ہو تم تو نذرِ عشق نہ لکھیں وہ مرثیہ
یہ بات ہے مروّتِ اہل سخن سے دُور

❁❁❁

باب ۲۹

عام اظہارِ آراء (۱)

اخبارات:

محمد علی کی وفات کے بعد ملک کے اکثر اخبارات و رسائل نے ''رئیس الاحرار نمبر'' نکالے اور اُن میں محمد علی کے سوانح و کوائف، اُن کی خدمات اور اُن کی ایثار و قربانی پر زبردست مقالات لکھے۔ اِن میں خاص طور پر قابل ذکر ''انقلاب''، ''مدینہ'' اور ''خلافت'' کے نمبر کہے جا سکتے ہیں، اُنہوں نے مواد پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

اِس کے علاوہ عربی اخبارات نے بھی اُن پر بہت کافی معلومات جمع اور شایع کیں۔ مصر وغیرہ کے تمام اخبارات نے بڑے بڑے مقالات سیاہ جدولوں میں شایع کیے اور بلا تفریق عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے اخبارات نے اس حادثہ فاجعہ پر اپنے دِلی تاسف کا اظہار کیا۔

مصر کی قوم پرور پارٹی ''وفد'' کا آرگن اخبار لکھتا ہے:

الماء:

''دو دِن ہوئے، ہندوستان کے قلب وجگر پر ایک گہرا زخم لگا ہے، ایسا زخم جو مدتوں مندمل نہ ہو سکے گا۔ یہ زخم مولانا محمد علی کی انتہائی افسوس ناک موت کی وجہ سے لاحق ہوا ہے۔ مرحوم ہندوستان کے ایک نہایت ہی جلیل القدر اور شاید سب سے زیادہ جری رہنما تھے۔ خدمتِ وطن میں اُنہوں نے بے شمار مصائب برداشت کیے اور

بالآخر میدانِ جہاد ہی میں جام شہادت نوش کیا۔
محمد علی فطرتاً انقلابی تھے اور جب ہم کسی کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ انقلابی ہے تو پھر یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ وہ برطانیہ کا دشمن ہے، کیونکہ برطانیہ ہی سب سے بڑی ملک گیر طاقت ہے۔ محمد علی کی پوری زندگی برطانیہ کے خلاف جہاد میں گزری، یقیناً ہندوستان اُنہیں مدتوں یاد رکھے گا۔ اے مجاہدِ اعظم! فردوس میں لازوال زندگی حاصل کر اور پروردگار سے التجا کر کہ تیرا وطن اور سارا مشرق جلد آزاد ہو جائے، وہ مقصد جس کے لیے تو نے جان دی ہے۔"

المقطم:

عیسائیوں کا اخبار المقطم لکھتا ہے:

"لندن سے ہمیں یہ جانکاہ خبر پہنچی ہے کہ مولائی محمد علی کا انتقال ہو گیا۔ مولائی محمد علی ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما اور دنیا کے مسلم رہنماؤں میں ایک بلند رُتبے کے مالک تھے، اُنہوں نے اسلام، ہندوستان اور پورے مشرق کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔"

یہ تو تھے عربی اخبارات کے دو بلند تر اخبارات کے افکار و آراء، اب انگریزی اخبارات پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیجیے۔

ڈیلی ایکسپریس:

ڈیلی ایکسپریس لکھتا ہے:

"مولانا محمد علی موت کی آغوش میں انگلستان تشریف لائے تا کہ گول میز کانفرنس کی شمولیت کر کے اپنے ملک و ملت کی بہترین خدمات انجام دیں۔ اُن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آخری وقت بالکل قریب ہے اور اُن کو بتایا گیا تھا کہ وہ چند گھنٹوں سے

زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے، لیکن باوجود اِس کے روحانیت کے اُس جذبہ کے ماتحت جو اہل مشرق سے مخصوص ہے، آپ نے اپنی زندگی کی آخری رات بھی ڈیلی گیٹوں کو اپنا آخری اور الوداعی پیغام لکھوانے میں گزار دی تا کہ کسی طرح فرقہ وارانہ پیچیدگی کو سلجھا کر وطن کی آخری خدمات سرانجام دیں۔ آپ نے لندن ہوٹل میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ والیانِ ملک اس قائد اعظم کی بالیں پر اشکبار تھے۔ ایک ہاتھ اپنی عاشق زار بیگم کے ہاتھ میں اور دوسرے اپنے شیدائی برادر بزرگ کے ہاتھ میں جو تمام رات آئر لینڈ میں سفر کرتے ہوئے موت سے چند ہی گھنٹے پہلے پہنچے تھے۔ ہندوستانی شہزادہ بار بار کمرہ میں آتے تھے اور دُعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تھے۔''

ٹائمز آف انڈیا:

''ٹائمز آف انڈیا'' کا لندنی وقائع نگار جو غالباً اِس کا کوئی سابق ایڈیٹر ہے، لکھتا ہے:

''مرحوم کے ساتھ میری دوستی سالہا سال سے چلی آ رہی تھی جبکہ وہ مہانہ ریاست بڑودہ میں محکمہ افیون کے افسر تھے اور اس تنگ حلقے کی بے لطفیوں کی تلافی مضمون نگاری سے کیا کرتے تھے۔ جب وہ (ابکی) لندن آئے اور میں اُن سے ملا تو مجھے اُن کی صورت دیکھ کر بہت صدمہ ہوا۔ وہ اصل میں برلبِ مرگ تھے اور اِس حقیقت سے خود بھی آگاہ تھے، لیکن وہ کانفرنس کی ایک نہایت طویل اور بے حد دِلکش تقریر کرنے تک زندہ رہے، مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں امن اور صلح کے لیے آیا ہوں۔''

❁❁❁

باب ۳۰

عام اظہار آراء (۲)

اقوالِ مشاہیر:

ملکِ معظم اور مسٹر میکڈانلڈ وزیراعظم کے علاوہ خاص خاص حضرات کے تاثرات یہ ہیں:

مولانا شوکت علی:

''میرا بھائی ایک بہادر اور شجاع سپاہی تھا جس نے لڑتے لڑتے میدانِ جنگ میں جان دی۔''

مولانا حسرت موہانی

''اِسلام کے سپاہی کے لیے اِس سے بہتر اور کیا انجام ہوسکتا ہے کہ اُس نے لڑتے ہوئے اپنی جان دی۔''

مولانا حسین احمد:

''مولانا محمد علی آزادی کے سب سے بڑے علمبرداروں میں سے تھے اور اُنہیں اپنے ملک کی سیاسی نجات کے ساتھ خاص شغف تھا۔ اُن کی نظر سیاسی، مذہبی اور فقہی معاملات میں اُس بلندی پر پہنچ جاتی تھی جہاں تک ہر شخص کی نگاہ کا پہنچنا محال ہے۔''

سبھاش چندر بوس (میر کلکتہ کارپوریشن):

''مولانا ایک بلند ارادہ اور عدیم النظیر قائد تھے جو صفِ اوّل میں مصروفِ جنگ تھے، آپ کی سرگرمیاں صرف مادرِ وطن تک محدود نہ تھیں بلکہ آپ کی نگاہ وسیع ترقی اور اتحادِ مشرق آپ کی زندگی کا خواب تھا۔ مولانا میرے ذاتی دوست تھے، حال ہی میں چند اُمور میں مولانا محمد علی سے اختلاف ہو گیا تھا لیکن بلاشبہ اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُن اُمور میں جن میں لوگ اُن سے متفق نہیں تھے۔ مولانا کا مقصد محض خدمتِ خلق تھا، مولانا کی زندگی آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ ایک قابل تقلید مثال ہوگی۔''

فیڈرل سب کمیٹی کے ارکان:

''مولانا محمد علی ایک ایسی شخصیت تھے جنہیں اپنے فرض کی حمایت میں اپنی کمزوری اور تکالیف کا مطلق پاس نہ تھا۔''

مسٹر جیکر:

''مولانا محمد علی ہندوستانی سیاسیات میں ایک اہم ہستی تھے اور اُنہوں نے قومی مفاد کی زبردست خدمت انجام دی۔''

سرسی۔ پی۔ راما سوامی آئر:

''مولانا محمد علی ایک طاقتور اور بااثر شخصیت تھے۔''

لارڈ ریڈنگ:

''مولانا محمد علی زبردست قوتِ عمل کے مالک تھے، وہ اپنے عقائد کو نہایت پختگی کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ اُن کی ہمت اور جرأت کو دیکھتے ہوئے ہمارے قلوب میں تعریف و توصیف کا جذبہ موجزن ہے۔''

سر جارج رینے، رکنِ حکومتِ ہند:

''مولانا محمد علی نے ملک وقوم کو اپنی مشکلات پر ترجیح دی اور بالآخر ملک ووطن پر فدا ہو گئے۔''

مسٹر آرتھر مور:

''مولانا محمد علی ایک شیر دِل سپاہی تھے۔''

سر ہری سنگھ گوڑ:

''مولانا محمد علی نے ہندوستان کی جو خدمات انجام دیں، وہ تاریخ ہند کے صفحات پر ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مرحوم کی حب الوطنی سے انکار کر سکے۔''

سر تیج بہادر سپرو:

''میں مولانا محمد علی سے تیس سال سے واقف تھا، اُن کی شخصیت شاندار اور زور دار تھی۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے ملک سے بہت محبت کرتے تھے اور اُن کی وفات ایسے وقت میں ہوئی جبکہ ہندوستان کو اُن کی اشد ضرورت تھی۔''

سر اکبر حیدری:

''مولانا محمد علی نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک ملک کی خدمت کی۔''

مشہور مصنف ایچ۔ جی۔ ویلز:

''مولانا محمد علی کا دِل نپولین کا دِل تھا، اُن کی زبان برک کی زبان تھی، اُن کا قلم میکالے کا قلم تھا۔''

مسٹر بن وزیر ہند:

''محمد علی ایک جلیل القدر مسلمان۔ ایک زبردست محبِ وطن اور عام انسانیت کے ایک عظیم القدر پیشوا تھے۔''

لارڈ پیل سابق وزیر ہند:

''مولانا محمد علی میرے رفیق کار تھے اور مجھے اُن کے انتقال سے بے انتہا رنج ہوا ہے۔''

مسٹر فز براکوے، ممبر پارلیمنٹ:

''مولانا محمد علی بہترین دِل ودماغ کے مالک تھے۔''

لارڈ سینیکی:

''مولانا محمد علی اوّل و آخر ہندوستان کی فلاح و بہبود کے طالب تھے۔''

سر محمد شفیع:

''مولانا محمد علی محبّ وطن اور ایثار شعار انسان تھے۔''

پنڈت موتی لال نہرو:

''مولانا محمد علی میرے پرانے دوست، پختہ مسلمان اور زبردست شخصیت تھے۔''

کلکتہ کارپوریشن کے ارکان:

''مولانا محمد علی کی قبر پر امن، اتحاد اور رواداری کا مندر تعمیر کرو۔''

امین الحسینی مفتی فلسطین:

''محمد علی اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سب کچھ قوم وملت اور اِسلام کے لیے قربان کردیا۔''

مہاراجہ بیکانیر:

''مولانا کا کیریکٹر اعلیٰ اور اوصاف پسندیدہ تھے۔''

مسٹر بھروچہ:

''مولانا ایک سحر البیان مقرر، صاحبِ قلم، بہادر جنگجو، اِسلام کے پر جوش اور سچے پیرو تھے۔''

مدیر ٹائمنر (لندن):

''محمد علی اصول کے لیے جیے، اصول کے لیے مصیبت اُٹھائی اور اصول کے لیے مرے۔''

مولانا سیّد سلیمان ندوی:

''افسوس! وہ پر درد آواز جو 1911ء سے 1930ء تک ہندوستان اور دُنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ وہ بے قرار دِل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا تھا اور اوروں کو بے تاب کرتا تھا، قیامت تک کے لیے ساکن ہو گیا۔ وہ اشک آلود آنکھیں جو دین وملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرتا کہ اُن کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی۔ وہ مترنم جب جوہر بزم میں خوش نوا بلبل بن کر چہکتے تھے، اُن کے ترانے اب ہمارے کان نہیں سنیں گے۔ وہ آتش زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی، اُن کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی۔ وہ پر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالے جاتا تھا، اُن کا تلاطم ہمیشہ کے لیے تھم گیا۔ وہ پر زور دست و بازو جو شب و روز کی خدمت گزاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے، وہ اب ایسے

تھکے کہ پھر نہ اُٹھیں گے اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعداء کے نرغہ میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر نہ کھڑا ہو گا۔

الوداع! محمد علی، الوداع! والسلام الیٰ یوم القیام!

مسٹر برملوی، ایڈیٹر ''بمبئی کرانیکل'':

''مولانا محمد علی کی وفات سے صرف مسلمانانِ ہند ہی کو نہیں، بلکہ تمام ہندوستان کو ایک نقصانِ عظیم پہنچا ہے۔ اُن کی زندگی ہمارے لیے ایک اَنمول تحفہ تھا۔''

مسٹر جی۔ کے۔ نریمان:

''میرے قلب پر محمد علی کی صاف گوئی اور کشادہ دلی کا بہت اثر ہے، محمد علی زبردست سیاست داں تھے اور بہت سی سیاسی مجالس میں اُن کی فتح کا باعث اُن کا وہ بے مثال کیریکٹر ہوتا تھا جس نے ملکِ معظم تک سے خراج تحسین حاصل کر لیا۔ مجھے محمد علی کی وہ مخصوص خصائل پر رشک آتا تھا، ایک یہ کہ وہ خطرہ کے نازک ترین وقت پر بھی اپنی عقل و حواس کو قابو میں رکھتے تھے اور دوسرے یہ کہ اُن کی طاقت کا خزانہ ہمیشہ معمور رہتا تھا۔''

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی:

مولانا ممدوح اپنے ایک گرامی نامہ میں مولانا عبدالماجد صاحب مدیر ''سچ'' کو تحریر فرماتے ہیں:

''محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ خدا جانے کتنی دفعہ دُعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں۔ مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہے، وہ صرف ایک صفت مسلمانوں کی سچی محبت بے غرض ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں میں نے کبھی دیکھا نہیں، اس لیے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں۔''

باب ۳۱

نذرِ عقیدت، مرثیوں کی صورت میں!

محمد علی کی وفات ایک ایسا سانحۂ کبریٰ تھا کہ ہر طبقہ اور ہر جماعت نے اُن کے غم والم میں نمایاں حصہ لیا۔ چنانچہ اُن کی وفات پر جہاں تقریریں ہوئیں، جلسے ہوئے، تجویزیں پاس ہوئیں، مضامین و مقالات لکھے گئے، اکابرین ملک نے بیانات کی صورت میں اپنے غم والم کا اظہار کیا، وہاں شعرا نے اپنے جذبات کو اشعار کی صورت میں مدوّن کیا اور محمد علی کے حضور میں اپنا یہ خراجِ عقیدت بصدِ رنج وتعب پیش کرنے کا افتخار حاصل کیا۔

اِن محدود صفحات میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ سارے مرثیہ آپ کی خدمت میں پیش کیے جا سکیں، مجبوراً چند پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور ان میں بھی اخذ بالتصاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ سیرۃ کے آئندہ مطول ایڈیشن میں کوشش کی جائے گی کہ تمام قابل ذکر مرثیہ .تمامہ شائع کیے جا سکیں۔

اِس سلسلہ کا آغاز مشرق کے زبردست شاعر علاقہ اقبال کے اِن چند اشعار سے کیا جاتا ہے جو گو تعداد میں کم ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اِن چند اشعار کے اندر محمد علی کی سیرۃ اور خصوصیت کا پورا مرقع علامۂ ممدوح نے پیش کر دیا ہے۔

ا۔ اقبال

یک نفس جانِ نزار او تپید اندر فرنگ　　تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں در گزشت

اے خوشا! مشتِ غبار او کہ از جذبِ حرم　　از کنارِ اندلس و از ساحل بربر گزشت

خاک قدس اورابہ آغوشِ تمنا در گرفت سوئے گردوں رفت راہے کہ پیغمبر گزشت
می نہ گنجد جزبہ آں خاکے کہ پاک از رنگ وبوت بندۂ کو از تمیز اسود و احمر گزشت
جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشم آ سیاست گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خاور گزشت

۲۔ مرگِ غربت

(از مولانا صفی لکھنوی)

کیوں اشکبار ہند نہ ہو صورتِ سحاب مغرب میں جب غروب ہو مشرق کا آفتاب
وہ مردِ ذی کمال کہ جس نکتہ سنج کی تحریر بے نظیر تھی، تقریر لا جواب
اسلامیوں کے واسطے سینہ سپر وہ شیر تیغ زباں سے معرکہ آراء و فتح یاب
آزادیٔ وطن کی تمنا کا خضر راہ وابستہ جس کے شیب سے تھا قوم کا شباب
مسلم ہوں یا ہنود ہوں، وہ چاہتا یہ تھا اپنے وطن کے دونوں نہیں مالک الرقاب
وہ پختہ مغز قائداعظم، بلند فکر ہر دم تھا جس کے پیش نظر جادۂ صواب
وہ حق پسند جس کی زباں پر چڑھی ہوئی اللہ کے رسول پر اُتری ہوئی کتاب
آزادیٔ وطن کے لیے دے کے نقد جان پلٹا ہے وہ مسافر اخلاصِ انتساب
ہر صوبہ دے رہا ہے جسے دعوتِ قیام آنکھیں بچھا رہی ہے لحد بہر فرشِ خواب
جس بے نوا کی قبر پہ چھڑکاؤ کے لیے آمادہ طفل اشک بھرے شیشۂ گلاب
بے ساختہ زباں پہ یہ جاری ہوا صفیؔ وحشت اثر خبر سے بڑھا جبکہ اضطراب
ہنگام نزع، قوم ہی کا دِل میں درد تھا حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

۳۔ جوش

ہندوستان کے مشہور شاعر حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے بھی محمد علی پر چند اشعار کہے ہیں اور حق یہ

ہے کہ جوشؔ نے اپنے اشعار میں سوز و گداز اور حقیقت و بیانِ واقعہ کا جتنا امتزاج کیا ہے، اُس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

اے متاعِ بردۂ ہندوستان و ایشیا! اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار
غش تھا کاوش پہ تری اندازۂ صبح و شام ختم تھی قدموں پر ترے نیرنگیٔ لیل و نہار
اے غرور ملک، ملت! تو وہاں لیتا تھا سانس موت جس عالم میں بنتی ہے حیاتِ پائیدار
وقت کے سیلاب سے تیرا سفینہ ہے بلند سیرتِ پیغمبر اسلام کے آئینہ دار
تجھ کو بخشی تھی مشیت نے وہ برتر زندگی جس بہادر زندگی کو موت پر آتا ہے پیار
تیرے آگے لرزہ براندام تھی روحِ فرنگ اے دلِ ہندوستان کے عزمِ تند و استوار
طنطنے سے تیری ہیبت آفریں آواز کے تھی حسین ابن علی کی استقامت آشکار
ڈوب جاتی تھی دلِ باطل میں لہراتی ہوئی تیرے لہجے میں لچکتی تھی وہ تیغ آبدار
موڑ کر رکھ دی تھی تو نے جنگ کے میدان میں اہل بدعت کی کلائی، خنجر قاتل کی دھار
تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن، سلطان شکار
خون میں تیرے نہاں تھی جنبش نبض علی خون میں تیرے ودیعت تھا مزاجِ ذوالفقار
تیری سیرت میں تھی مضمر صولت پیغمبری تیری فطرت میں تھی پنہاں سطوتِ پروردگار
روئے ملت پر ہے تیری موت کی تابندگی کج ہوئی جاتی ہے ماتھے پر کلاہِ افتخار

۴۔ سر پھرا ملاح

(از حفیظ جالندھری)

حضرت حفیظ نے اپنی یہ نہایت ہی پسندیدہ نظم یہاں جامعہ میں جامعہ کے یوم تاسیس 29 اکتوبر 1931ء کے موقع پر سنائی تھی، امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب بھی موجود تھے۔

حفیظ صاحب نے جس دقت نظر سے محمد علی کے ماحول اور کردار کی نقاشی کی ہے، وہ ہر شخص کا کام

نہیں، یہ اُنہیں کے موقلم کو قدرت حاصل ہے۔

نظم اپنے کیف وتاثر کے اعتبار سے اس کی مستحق ہے کہ وہ بلاکم وکاست پوری کی پوری شائع کر دی جائے لیکن قلت گنجایش کی وجہ سے ہم اپنی یہ تمنا بھی آئندہ ایڈیشن کے لیے اُٹھائے رکھتے ہیں اور اس صحبت میں صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

شب تاریک بیم موج، گردابے چنیں حائل — نہنگانِ اجل کی نیتیں پیدا و پر مائل
غضب تھا اک شکستہ ناؤ کا منجدھار میں پھنسنا — فضا کی سسکیاں، قسمت کا رونا، موت کا ہنسنا
فقط اِک سر پھرا ملاح طوفانوں سے لڑتا تھا — ہوا کے آب کے جنوں سے شیطانوں سے لڑتا تھا
اگرچہ ناؤ میں انبوہ در انبوہ انساں تھے — یہ سب ملاح کے ہم قوم تھے یعنی مسلماں تھے
یہ سب تھے عقل وجرأت میں ارسطو و اسکندر — مگر آرام سے لیٹے ہوئے تھے ناؤ کے اندر
چلی جاتی تھی کشتی خشمگیں موجوں سے ٹکراتی — اُبھرتی، بیٹھتی، دبتی، دباتی اور چکراتی
کہیں گرداب کے منہ پر کہیں پرشور دھارے پر — کبھی اِس کے اشارے پر، کبھی اُس کے اشارے پر
ہوائی دوش پر خونخوار عفریتوں کی فوجیں تھیں — پہاڑ اُٹھ اُٹھ کے ٹکراتے تھے پانی کی موجیں تھیں
تعجب ہے کوئی پروا نہیں تھی ناؤ والوں کو — کہ طوفاں میں نظر آتی تھی خامی باکمالوں کو
انہیں معلوم تھا طوفان نے کشتی کو گھیرا ہے — گھڑی بھر میں یہ بیڑا اب نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
انہیں دعوے تھے بحر زندگی میں ناخدائی کے — انہیں گر یاد تھے گرداب میں مشکل کشائی کے
یہ طوفان پہ کر سکتے تھے لچھے دار تقریریں — دکھا سکتے تھے تقریروں میں طوفان کی تصویریں
ہوا کا رخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے تھے — تہہ دریا نہنگوں کی نظر پہچان جاتے تھے
یہ سب جو پاؤں پھیلائے ہوئے کشتی میں بیٹھی تھی — پرانے ناخداؤں اور ملاحوں کے بیٹے تھے
مگر وہ سر پھرا ملاح، تنہا تھا، اکیلا تھا — اِدھر پانی کی شدت تھی، اُدھر موجوں کا ریلا تھا
وہ چلاتا تھا اُٹھو بھائیو! ہمت کرو، آؤ — ذرا ہمت دکھاؤ دست وباز وکام میں لاؤ
اِدھر سیلاب پھر آتا ہوا معلوم ہوتا ہے — اُدھر گرداب بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے

مبادا ناؤ اب کی اور بھی کمزور ہوجائے یہ گرداب بلا شاید وہاں گور ہو جائے
نہیں ہنگام سونے کا کھڑے ہو جاؤ، تن جاؤ حوادث کے مقابل آہنی دیوار بن جاؤ
وہ چلایا، وہ چیخا، منتیں کیں، آہ و زاری کی مگر بے سود تھا سب کچھ کسی نے بھی نہ یاری کی
نہ آمادہ ہوا کوئی بھی جرأت آزمائی پر سبھی ہنستے رہے ملاح کی ہرزہ سرائی پر
شکستہ ناؤ کا ملاح بے دم ہو گیا آ کر بڑھا کر حوصلہ تن میں لہو کم ہوگیا آخر
گرا دریا میں چپو ہاتھ سے پتوار بھی چھوٹی شکستہ ہو گئے بازو مگر ہمت نہ ٹوٹی
تھکن کا ہو رہا تھا اب اثر آہستہ آہستہ لگا جھکنے وہ سر افراز سر آہستہ آہستہ
وہی سر جو ہواؤں سے نہ طوفانوں سے جھکتا تھا نہ فرعونوں سے جھکتا تھا نہ ہامانوں سے جھکتا تھا
نہ جھکتا تھا کبھی میر و وزیر و شاہ کے آگے وہ سر ایک مرتبہ پھر جھک گیا اللہ کے آگے
تعجب سے ردائے ابر میں سے برق نے جھانکا کہ یہ اِک آخری سجدہ تھا اس مردِ مسلماں کا
شکستہ ناؤ میں طوفان کی اس چیرہ دستی میں وہ اپنا فرض پورا کر چکا تھا اس بحر ہستی میں

یہ تو تھے ہندوستان کے شعرائے نامدار کے نالہ ہائے دِل فگار، لیکن ممالکِ اسلامی کے شعرأ نے بھی اپنے قطرتِ اشک کی نذر اس بارگاہِ عالی میں چڑھائی ہے۔

۵۔امیر الشعراء مصر کا مرثیہ

اخبار ''الشوریٰ'' مصر میں احمد شوقی کا یہ بلند پایہ مرثیہ شائع ہوا تھا جس کے جستہ جستہ اشعار کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے۔ پورا مرثیہ طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

''اے قدس! تو اپنی تربت کے مہمان کی وجہ سے قابل مبارکباد ہے، آج تو اُس کی ملاقات سے سرفراز ہو۔

نبی ﷺ نے اس کے لیے اپنے براق کے بیٹھنے کی جگہ کھول دی اور اس کے آنے کا مقام وہ ہے سے نبی ﷺ رات کو گئے تھے۔

مشرق کے حقوق کے لیے لڑنا اُس کا کام تھا اور اسلام کا قضیہ اُس کی عباء۔

مشرق کے لیے جو اُسے تڑپ تھی یا ہندوستان کے واقعات کے لیے اُس کی بے خوابی، اُسے عزیز ہندوستان فراموش نہیں کر سکتا۔

نیل اپنی مصیبتوں میں اُس کی آواز کو یاد کرے گا اور ترک اُس کی سچی تڑپ کو فراموش نہیں کریں گے۔

آپ نے زندگی میں وہاں کے باشندوں کی مدد و معاونت کی تو آپ وہاں کے لیے اجنبی کیسے ہو سکتے ہیں؟"

❋❋❋

باب ۳۲

لختے چند

بیت المقدس میں جب محمد علی لائے گئے اور اُن کی نمازِ جنازہ ادا ہوئی تو مشرق کے چند بڑے بڑے بزرگوں نے تابوت کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے احساسِ قلب کا اظہار کیا تھا جن میں سے دو کے تاثرات مختصراً ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:

ا۔ احمد زکی پاشا

آپ نے مسجد اقصیٰ میں کھڑے ہوکر فرمایا:

''اے بزرگانِ مسجدِ اقصیٰ، اے ابنائے عرب اور اے اُمتِ اسلام!

مولانا محمد علی کی زندگی جہاد کی ایک مسلسل لڑی تھی، زمانہ نے اُسے دیکھا اور تاریخ نے اُسے محفوظ کیا اور یہی نہیں بلکہ آج کے بعد لوگ ہمیشہ یہ دیکھیں گے کہ ہمیشہ کے لیے وہ قربانی کی اَن مٹ یادگار رہے گا۔ وہ اِس اَمر کا عنوان رہے گا کہ وہ شخصیت کا سخت دشمن تھا۔

ہم اِس کے گواہ ہیں کہ شہید اپنے ہمعصروں میں لسانِ صدق تھا اور ہمارے دِل اِس ایمان سے پر ہیں کہ خدا نے اُس پر انعام کیا اور اُس کو آخر میں بھی لسانِ صدق بنا دیا۔

اس ہندوستانی لیڈر نے اپنی زندگی ملک کے لیے وقف کر دی تھی، اس نے اپنے ملک کی آزادی کے لیے وہ، وہ جہاد کیا کہ جہاد کا حق ادا کر دیا۔

فقید ملم اور خادم اسلام پر خدا کی سلامتی۔

۲۔ شہزادۂ محمد علی پاشا

محمد علی پاشا سابق وزیر اوقاف وزعیم جماعت احرارِ مصر نے کھڑے ہوکر فرمایا:

''جنگِ بلقان میں، جنگِ عظیم میں، ترکوں اور یونانیوں کی لڑائی میں محمد علی نے جو کچھ کیا وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا اور اِس غرض کے لیے جو کچھ اُسے جیل خانوں اور مالی تکلیفوں کا مقابلہ کرنا پڑا، وہ بھلایا نہیں جاسکتا۔

اُس کا شعور اِس خیال سے اُس پر حاوی تھا:

''قوت حق نہیں، لیکن حق قوت ہے۔''

اے معزز مسافر! یہ مصیبت بڑی ہے، تکلیف بھاری ہے، لیکن ہم صبر کے اجر سے برداشت کر لیں گے، میں اس لیے آیا ہوں کہ تم کو سلام کہوں، تم مرے نہیں بلکہ زندہ ہو۔

ہماری تسلی تمہارے بعد تمہارے کام ہیں جو ہمیشہ رہیں گے۔ تیرے جان سے قبل تیرے اعمال آگے چلے گئے۔ اُنہوں نے جنات کے دروازے تیرے لیے کھول دیئے اور تیرے اقرباء کے لیے بزرگی کو چھوڑ گئے۔

❀❀❀

باب ۳۴

یادگار کی تجویزیں

محمد علی کی وفات کے بعد سارے ہندوستان میں اُن کی یادگار کا مسئلہ اُٹھایا گیا اور ہر طرف سے مختلف تجویزیں پیش ہوئیں۔

مجسمہ کی تجویز:

جناب نیاز فتح پوری نے ''نگار'' میں محمد علی کا ماتم کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ''زندہ'' قوموں کی طرح محمد علی کے لیے ایک مجسمہ تیار کرایا جائے جو اُن کی یادگار کا کام دے۔

دائرہ سیاسیہ:

مولانا حسرت موہانی اور بعض دوسرے زعماء نے یہ تحریک کی، محمد علی کی یادگار میں ایک دائرہ سیاسیہ کی بنیاد ڈالی جائے جس میں محمد علی کے نظریہ سیاست کی تعلیم و تبلیغ ہو۔

جامعہ ملیہ:

ملک کے ایک بڑے گروہ نے یہ تجویز پیش کی کہ محمد علی کو جامعہ سے جو تعلق تھا اور جامعہ کو اپنی تاسیس میں محمد علی کے شرف وجود سے جو بزرگی حاصل ہوئی تھی، اُس کا اقتضا یہ ہے کہ جامع ملیہ کو محمد علی کی یادگار بنایا جائے اور اِسی پر ساری کوششیں صرف کر دی جائیں۔ جملہ زعمائے قوم نے اِس کی تائید کی اور ''برکت'' کے لیے مجلس کارکن میں اُن تمام بزرگوں کے اسمائے گرامی بھی رکھے گئے۔ لیکن اِن تجاویز کا جو نتیجہ ہوا، اُنہیں ناظرین ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

متفرق یادگاریں:

لیکن اِس بڑی یادگار کے علاوہ مختلف شہروں اور میونسپلٹیوں نے اپنی اپنی بساط کے موافق جو کچھ امکان میں تھا، اُس سے دریغ نہیں کیا۔

دہلی میونسپلٹی:

دہلی میونسپلٹی نے یہ یادگار مناسب سمجھی کہ اُس کے ایوان میں محمد علی کی تصویر آویزاں کر دی جائے۔

بمبئی کارپوریشن:

بمبئی کارپوریشن نے دو سڑکیں ''محمد علی روڈ'' کے نام سے نامزد کر دیں۔ ابھی وہاں ایک ''محمد علی ہال'' کی تجویز بھی زیر غور ہے، اس کا نتیجہ دیکھتے کب نکلتا ہے۔

الٰہ آباد میونسپلٹی:

الٰہ آباد میونسپلٹی میں بھی یہ مسئلہ اُٹھایا گیا، چنانچہ اُس کے غیور ارکان نے فوراً یہ تجویز منظور کر لی اور ایک پارک ''محمد علی پارک'' کے نام سے اور ایک سڑک ''محمد علی روڈ'' کے نام سے نامزد کر دی۔ لکھنؤ میونسپلٹی کی خاموشی پر تعجب ہے، شاید اس کے صدر محمد علی کے ایک مشہور رفیق کار تھے۔

محمد علی میموریل ہائی اسکول:

اجمیر کے مسلمانوں نے مرزا عبدالقادر ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی۔ (علیگ) اور معین الدین صاحب بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی۔ کی مساعی سے نہایت عمدہ یادگار قائم کی۔ یعنی بیاور میں ایک ''محمد علی میموریل ہائی اسکول'' قائم ہو گیا جس میں تعلیم جاری ہے۔

علی گڑھ میں یادگار:

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں محمد علی کے پرانے دوست اور ساتھی مسٹر احسان الحق جج نے ایک تجویز اُن کی یادگار کے متعلق پیش کی تھی۔

محمد علی کو علی گڑھ سے جو تعلق ہمیشہ رہا، اُس کا اقتضا یہ تھا کہ محمد علی کی ایک یادگار وہاں ضرور قائم کی جائے۔ چنانچہ سنا ہے کہ وہاں بھی یہ معاملہ ''زیرِ غور'' ہے۔

تبصرہ:

حقیقت یہ ہے کہ اِس سے بڑھ کر کوئی اور تلخ اور پژمردہ کن حقیقت نہیں ہو سکتی کہ مسلمان قوم نے اپنے پیشواؤں اور رہنماؤں کی یادگار قائم کرنے میں ہمیشہ بخل اور تغافل سے کام لیا، گو اُس نے ماتم میں سینہ بہت زور زور سے کوٹا اور گریبان بھی خوب چاک کیے۔

وقار الملک، محسن الملک، خود سر سیّد، سیّد محمود، شبلی، حالی، آزاد، نذیر احمد، اجمل خاں اعظم، اِن بزرگوں میں کس کی ''یادگار'' قوم نے تیار کر دی جو خواہ مخواہ کے شماتت کا لطف اٹھانے کے لیے محمد علی کی یادگار کا مسئلہ پیش کر دیا گیا۔ نتیجہ وہی جو اِس قسم کی ''آل انڈیا میموریل کمیٹیوں'' کا ہمیشہ سے ہوا کرتا ہے۔

کمیٹی بنی ہوئی ہے، اِس کے ارکان مصروفِ خواب ہیں، اُنہیں نہ یادگار کے مسئلہ سے کوئی خاص عملی دلچسپی ہے نہ فکر، پھر محمد علی کی یادگار قائم ہو تو کیونکر؟

❀❀❀

حصہ دوم

جہد و عمل

باب ا

ملازمت

پہلے حصے میں محمد علی کی سیرت کا وہ مرقع پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس میں محمد علی کے وہ خدو خال نمایاں ہو سکیں جن کا تعلق اُن کی ذاتی زندگی سے تھا، یعنی اخلاق و عادات، اُفتادِ طبع اور رنگِ مذاق، ابتدائی نشو ونما وغیرہ۔

لیکن اِس حصہ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد علی کی عملی زندگی کن کن صبر آزما اَدوار سے گزری، اُن کو ملک وقوم کی خدمت کی راہ میں کیسے کیسے ہمت شکن حالات و مصائب سے دو چار ہونا پڑا اور ساتھ ہی ساتھ اُنہوں نے اپنی بے نظیر قوتِ عمل، قوتِ فیصلہ اور قوتِ تدبر سے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے، نیز اُن کی عملی زندگی کی ابتداء کس طرح ہوئی اور کس طرح رفتہ رفتہ وہ ''مسٹر'' محمد علی سے ''مولانا'' محمد علی ہو گئے۔

انگلستان سے واپسی:

سول سروس کے امتحان میں ناکامی کے بعد محمد علی واپس بلائے گئے اور رامپور میں اُن کی شادی کر دی گئی۔ اب وہ تلاشِ معاش میں سرگرداں ہونے والے ہی تھے کہ ایک بار اُن کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی نے پھر ہمت کی اور دوبارہ انگلستان بھیجا تا کہ وہ بی۔ اے۔ کی ڈگری آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کر سکیں۔

انسپکٹر جنرل تعلیمات رامپور:

وہاں سے قابل رشک کامیابی کے ساتھ وہ واپس آئے اور نواب صاحب رامپور نے اُنہیں اپنی ریاست میں سب سے بڑا افسر تعلیمات بنا دیا اور اِسی کے ساتھ رامپور ہائی اسکول کی پرنسپل شپ کے فرائض بھی محمد علی سے متعلق ہو گئے۔

سازش:

محمد علی اپنے یہ دوگانہ فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر رہے تھے۔ لیکن جیسا کہ ریاستوں میں عام قاعدہ ہے، اُن کے خلاف سازشیں ہونے لگیں کہ کسی طرح اُنہیں اِس منصب سے معزول کر دیا جائے۔ اس لیے کہ ریاست کے اُن لوگوں کی جو دربار میں کسی نہ کسی حد تک رسائی رکھتے ہیں، یہ سب سے بڑی خوشگوار خدمت ہوتی ہے کہ وہ والئِ ریاست کو اعلیٰ عہدیداروں اور ریاست کے بہی خواہوں کے خلاف بھڑکاتے رہیں۔

نواب ناصر علی سے تعلقات:

نواب ناصر علی خاں صاحب، جناب نواب حامد علی خاں صاحب والئِ رامپور کے برادر خورد بھی اُس زمانہ میں آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ غیر ملک میں قدرتاً اپنے ہم وطنوں سے زیادہ خصوصیت ہو جاتی ہے، لہٰذا فطرتاً محمد علی کو نواب ناصر علی کے ساتھ زیادہ ارتباط اور انس ہو گیا، اور جب محمد علی ہندوستان واپس آئے تو نواب صاحب رامپور کی خدمت میں اُنہوں نے مہجور اور معتوب بھائی کا ہدیۂ عقیدت و محبت پیش کیا۔

بس یہ چیز محمد علی کے لیے غضب ہو گئی اور اِسی پر ساری سازش کی عمارت تیار ہو گئی۔ نواب صاحب کے کان اِس طرح بھرے گئے کہ محمد علی نے اپنے زمانہ قیام انگلستان میں ناصر علی خاں سے سازش کر لی ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ بندگانِ عالی متعالی کو تختِ حکومت سے محروم کر کے نواب ناصر علی خاں کو فرماں روائے رامپور بنا دیں۔

نواب صاحب مرحوم کے دِل میں یہ بات جم گئی، وہ محمد علی سے کبیدہ خاطر رہنے لگے اور اپنی

کشیدگی کا اظہار اپنے طرزِ عمل سے ظاہر فرمانے لگے۔ یعنی ہر ایٹ ہوم، ڈنر یا اور سرکاری تقریب پر تمام قابلِ ذکر لوگ بلائے جاتے تھے لیکن محمد علی کو عمداً نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

دِل برداشتگی:

اِن حالات سے محمد علی بہت دل برداشتہ ہوئے اور اپنے لیے اُنہوں نے کوئی دوسرا گوشہ عمل اختیار کرنا چاہا کہ وہاں وہ بے غل وغش اپنی محنت، قابلیت، ذہانت مستعدی اور ایمانداری کا ثبوت دے سکیں۔

شوکت کی طلبی:

چنانچہ اُنہوں نے مولانا شوکت علی صاحب کو جو اُس وقت محکمہ افیون کے ایک افسر اعلیٰ تھے، تار دے کر بلایا۔ شوکت صاحب بھائی کا تار پا کر فوراً عازم رامپور ہوئے۔

نواب صاحب سے ملاقات:

محمد علی نے اُن سے تمام حالات بیان کیے اور اِس ہمت شکن صورت حال کا تدارک کرنا چاہا، چنانچہ شوکت صاحب ہز ہائنس نواب صاحب رامپور سے ملے۔ ہز ہائنس شوکت صاحب پر بچپن ہی سے بہت مہربان تھے، ہم عمر اور ساتھ کے کھیلے ہوئے بھی تھے، اس لیے شوکت صاحب نے بے تکلفی کے ساتھ نواب صاحب کی خدمت میں عرضِ حال کر دیا۔

اُس وقت تو نواب صاحب مطمئن ہو گئے لیکن ایسی باتیں دِل سے نکلتی کم ہیں، رفتہ رفتہ پھر وہی طرزِ عمل اُن کے کردار سے ظاہر ہونے لگا۔

شوکت صاحب کا مشورہ:

آخر شوکت صاحب کی یہی رائے قرار پائی کہ محمد علی رامپور سے استعفیٰ دے دیں اور کہیں اور قسمت آزمائی کریں۔

چنانچہ وہ استعفیٰ دے کر شوکت صاحب کے پاس چلے گئے اور ایک عرصہ تک شوکت صاحب ہی کے ''مہمان'' رہے اور فکرِ روزگار میں سرگرداں۔ اُسی زمانہ میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان بھی

دیا لیکن ایک مضمون میں ناکام رہے، بالآخر وہ برسر روزگار ہو ہی گئے۔

کنور فتح سنگھ سے تعلقات:

کنور فتح سنگھ ولی عہد حکومتِ بڑودہ اور محمد علی سے دورانِ قیام انگلستان میں بہت گہرے اور مخلصانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، کنور صاحب موصوف کی ایک عرصہ سے یہ تمنا تھی کہ وہ محمد علی کو اپنی ریاست بڑودہ میں بلوالیں۔

بالآخر اُنہوں نے اپنے والد کو مجبور کر دیا کہ محمد علی بڑودہ ضرور بلوائے جائیں اور اُن کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

بڑودہ میں تقرر:

چنانچہ مہاراجہ صاحب بڑودہ نے اُنہیں نہایت شفقت سے بلایا اور بڑی محبت سے رکھا، اور محکمۂ افیون میں ایک اعلیٰ منصب پر تقرر کر دیا۔

حیرت انگیز ذہانت:

محمد علی وہاں کی زبان سے ناآشنائے محض تھے، اس لیے اُن کے تقرر کے وقت یہ شرط بھی لگا دی گئی تھی کہ جب تک وہ وہاں کی زبان سے واقف نہ ہو جائیں اور عرائض وغیرہ خود نہ سمجھ سکیں، اُس وقت تک فیصلہ پر محمد علی کے ساتھ ایک دوسرے افسر کے دستخط بھی ہوا کریں گے تاکہ کسی قسم کی غلطی نہ ہونے پائے۔

محمد علی اِس شرط کو اپنے اوپر ایک پابندی خیال کرتے تھے، اس لیے اُنہوں نے چند ہی مہینہ کے اندر اِس زبان پر اتنی دسترس حاصل کر لی کہ عرائض وغیرہ کو پورے طور سے سمجھنے لگے، اِس کے بعد وہ شرط منسوخ ہو گئی۔

کارگزاری:

محمد علی نے وہاں جاتے ہی اپنی کارگزاری اور مستعدی کے حیرت انگیز ثبوت دینا شروع کیے، محمد علی

نے بڑودہ میں کم وبیش سات سال تک ملازمت کی اور ساڑھے چار سال کی قلیل مدت میں اُنہوں نے سترہ لاکھ کا خالص منافع کرایا جو گزشتہ سالوں کے اوسط منافع سے دو ہزار پندرہ فیصدی کی تعداد میں زیادہ تھا۔

یہ غیر معمولی کارگزاری اور حسن انتظام کا کارنامہ ایسا تھا جس نے مہاراجہ کی نظر میں محمد علی کو اور زیادہ وقیع اور زیادہ محبوب بنا دیا، اور ''گیکوار بڑودہ'' کی شفقتیں بہت زیادہ بڑھ گئیں، چنانچہ اِسی کار گزاری کے صلہ میں محمد علی کو ریاست کے ضلع نوساری کا کمشنر مقرر کر دیا گیا۔

نوساری کی کمشنری:

اِس منصبِ جلیل پر پہنچ کر محمد علی کی قوتِ عمل میں اور اضافہ ہو گیا۔ یہاں اُنہوں نے متعدد اصلاحات نافذ کیں اور خصوصاً گراں قیمت پر زمین خریدنے کے متعلق غرباء پر جو ظلم ہو رہا تھا، اُس کا پورے طور سے استیصال اور قلع قمع کر دیا۔ اِس کارروائی نے اُنہیں اور زیادہ مقبول، ہر دلعزیز اور لوگوں کی نظروں میں محبوب بنا دیا۔

دیانت وامانت:

> ''دورانِ ملازمت میں آپ کی دیانت وامانت کے متعدد ثبوت ملے، مثلاً ایک دفعہ ایک ٹھیکے کے سلسلہ میں آپ کو ایک بہت بڑی رقم بطور ہدیہ مل رہی تھی، آپ کو بتایا گیا کہ یہ ریاست کا ایک دستور قدیم ہے اور سب افسر اِس قسم کے ہدایا قبول کر لیا کرتے ہیں، لیکن آپ نے بہت سختی سے انکار کر دیا، بلکہ دوسرے افسروں کو بھی اس ''لقمہ تر'' کے اگلنے پر مجبور کیا۔''

نوساری کی کمشنری کے زمانہ میں دولت مند اور ذی اثر پارسیوں کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور زمین کی جبری خریداری کے دستورِ قدیم کو قائم رکھنے کی استدعا کی۔ لیکن آپ نے فرمایا:

> ''جب ظلم معلوم ہو جائے تو پھر مجھ سے اُس کی پردہ پوشی نہیں ہو سکتی۔''

پرسنل اسسٹنٹ:

اِس کے بعد محمد علی ولی عہدِ ریاست (کنور فتح سنگھ) کے پرسنل اسسٹنٹ مقرر کر دیئے گئے اور اِس حیثیت سے بھی بہت مفید خدمتیں انجام دیتے رہے۔

اِس عہدہ پر تقرر اس لیے ہوا کہ کنور موصوف شراب کے بہت زیادہ عادی ہو گئے تھے، ہزاروں جتن کیے گئے مگر یہ لت نہیں گئی۔ پھر محمد علی کو اُن کا پرسنل اسسٹنٹ مقرر کیا گیا تا کہ وہ اپنے دوستانہ تعلقات کا اثر ڈال کر اِس عادتِ قبیحہ کو اُن سے ترک کرا سکیں۔ مگر یہ عادتِ مشؤمہ کہیں چھٹتی ہے؟ بالآخر کنور صاحب موصوف کثرتِ شراب نوشی کے باعث انتقال فرما گئے۔

مشغلۂ تحریر:

محمد علی کی تخلیق اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ وہ ایک ریاست میں کمشنری یا محکمۂ افیون کی افسری میں اپنے ایام حیات بسر کریں، قدرت کو اُن سے بڑے بڑے کام لینے تھے، اپنی ملازمت کی کثیر مصروفیتوں کے باوجود وقت نکال کر ملکی و قومی مسائل پر وہ وقتاً فوقتاً ''ٹائمز آف انڈیا'' بمبئی وغیرہ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

گپ:

اپنی ملازمت سے پیشتر دورانِ قیام الٰہ آباد میں اُنہوں نے اپنی اِس دلچسپی کو مستقل طور پر قائم رکھنے کے لیے ایک مختصر سا تفریحی انگریزی رسالہ ''گپ'' اپنے رفیق آکسفورڈ کنور جگ دیش پرشاد (سابق چیف سیکریٹری یو۔پی۔ گورنمنٹ) کی رفاقت میں نکالا، مگر افسوس کہ اِس کے صرف دو پرچے نکل سکے اور اِس کے بعد کوئی نمبر نہ نکلا (ایک پرچہ (پہلا نمبر) میر محفوظ علی صاحب کی عنایت سے ''محمد علی میوزیم'' جامعہ ملیہ میں موجود ہے، مؤلف)۔

ملازمت سے بیزاری:

اِس عرصہ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ پہلے تو محمد علی نے ریاست کی ملازمت سے نکل کر

گورنمنٹ کی ملازمت کے حلقہ میں داخل ہونا چاہا اور اس کے لیے شملہ کے بعض ذمہ دار انگریزوں نے اُن سے وعدہ بھی کرلیا کہ ہم عنقریب کوئی اعلیٰ عہدہ دلوائیں گے، مگر پھر اُن کا ملازمت ہی سے جی ہٹ گیا اور اُن کی طبیعت اپنے لیے ایک وسیع تر میدانِ عمل تلاش کرنے لگی۔

محمد علی اِنہیں تفکرات میں تھے کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اُنہیں ملازمت سے بالکل بیزار کر دیا۔

مکتوب بنام محفوظ علی:

چنانچہ نوساری سے اپنے رفیق قدیم میر محفوظ علی صاحب کو ایک مکتوب میں وہ اس کی تفصیل و اسباب کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''میں نے اپنی ترقی کی درخواست دی، ٹالم ٹولا ہوتی رہی مگر اِس عرصہ میں مسٹر دت کا نزول ہوا۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، اُن کی رائے میری ترقی کے خلاف ہوئی، اِس لیے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اِس عرصہ میں ''ٹائمز آف انڈیا'' میں چند مضامین میرے شائع ہوئے جس میں مسلمانوں کے حقوق کی پیروی کی گئی تھی اور مسٹر گوکھلے کی دوست نما دشمنی کا پردہ فاش کیا گیا تھا۔ مسٹر دت سخت ناراض ہوئے اور میرا جواب طلب کیا، میں نے جواب اِس قدر دنداں شکن دیا کہ کچھ بن نہ پڑی۔ کونسل میں جواب پیش ہوا اور کچھ نتیجہ نہ نکلا سوائے اِس کے کہ ایک عام سرکلر شائع کیا جائے اور وہ بھی خفیہ کہ سرکاری عہدیداروں کو ایسے مضامین لکھنا مناسب نہیں جن کی وجہ سے مختلف مذہب اور اقوام میں مخالفت پیدا ہو۔ سر ہیرلڈ اسٹورٹ کوشش کر رہے ہیں کہ سیکریٹریٹ میں کوئی عمدہ عہدہ دلا دیں، اگر چاہتا تو کچھ کام نہ کرتا مگر عادت کو کیا کروں؟ ست بیٹھا نہیں جاتا، حرام کی روٹی کھانا منظور نہیں۔ دوسرے یہ بھی خیال ہے کہ چلو ایک اور محکمہ کے کام سے واقفیت ہو جائے گی۔ کام کی وجہ سے سر چھٹانے کی مہلت نہیں ہے، اس

ریاست سے سخت بیزار ہوں اور دراصل نوکری سے بیزار ہوں۔"

اجرائے "کامریڈ" کا خیال:

بالآخر اُن پر یہی خیال غالب آیا کہ وہ نوکری ہی سے اپنی بیزاری کا اعلان کر دیں۔ چنانچہ اُنہوں نے 10 جنوری 1910ء کو یہ خط میر محفوظ علی صاحب کو لکھا تھا اور 1910ء کے اختتام تک پورے طور سے یہ طے کرلیا کہ وہ اب ملازمت نہیں کریں گے، بلکہ اخبار نکالیں گے اور اِس ذریعہ سے قوم و ملک کی خدمت کریں گے۔ چنانچہ حسبِ بیان میر محفوظ علی صاحب، لکھنؤ میں ایک اسکیم تیار ہوئی کہ اخبار کلکتے سے نکالا جائے، محمد علی اِس کے ایڈیٹر ہوں اور میر محفوظ علی صاحب اِس کے مینیجر۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم بھی اِس مشورہ میں شریک تھے۔

جاؤرہ کی وزارت:

لیکن ابھی قدم قدم پر محمد علی کے لیے موانع موجود تھے۔ وہ اِس حلقہ سے نکلنا چاہتے تھے، لیکن یہ حلقہ تھا کہ خود محمد علی کو لپٹ رہا تھا۔

سر مائیکل اوڈوائر کا اصرار:

سر مائیکل اوڈوائر سے محمد علی کے خاص تعلقات تھے۔ اُس زمانہ میں وہ پنجاب کے ایک اعلیٰ عہدہ دار تھے، نواب صاحب جاؤرہ نے محمد علی کو جاؤرہ کی وزارت پیش کرنی چاہی اور سر مائیکل اوڈوائر نے نواب صاحب سے تائید اور محمد علی سے اصرار کیا۔ دوسری طرف بیگم صاحبہ بھوپال نے بھی محمد علی کو اپنی ریاست میں چیف سیکریٹری کا عہدہ دینا چاہا، مگر محمد علی طے کر چکے تھے کہ وہ اب ملازمت نہیں کریں گے، اس لیے اُنہوں نے اِن دونوں "پیش کش عہدوں" کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور "کامریڈ" کے اجراء کا انتظام کرنے لگے۔

بڑودہ سے علیحدگی:

چنانچہ محمد علی نے پہلے تو دو سال کی رخصت لی اور اِس کے بعد مہاراجہ بڑودہ پر ملکِ معظم کی توہین کا

جو الزام لگا تھا اور محمد علی نے جس کی صفائی دی تھی، اِس واقعہ کے بعد وہ مستعفی ہو گئے۔ اگر چہ مہاراجہ صاحب اُن کا استعفیٰ کسی طرح منظور کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔

صلۂ کارگزاری:

محمد علی نے سات سال تک وہاں ملازمت کی اور نہایت امتیاز و شان کے ساتھ وہاں اپنی زندگی بسر کی، لیکن جب وہاں سے وہ علیحدہ ہوئے ہیں تو سات سال کی مدت کارگزاری پر اُنہیں پنشن تو کسی طرح بھی نہ مل سکتی تھی، ہاں اُن کے افسر بالادست نے حسن خدمات کے صلہ میں یہ تجویز کی کہ سات ہزار کی رقم محمد علی کو بطور انعام پیش کی جائے اور پھر محمد علی نے اس رقم کو بھی حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

مدیر ''سچ'' کی رائے:

''سچ'' کے محترم ایڈیٹر نے بالکل سچ فرمایا:

''کامریڈ کے ایڈیٹر کے دنیوی ترقی سے بہتر سے بہتر مواقع موجود تھے، ہندوستان کا ذکر نہیں انگلستانی صحافت میں بلند سے بلند کرسیٔ ادارت اُس کے لیے خالی تھی۔ مناصبِ سرکاری میں بڑی سے بڑی رفعت اُس کے لیے چشم براہ تھی، عزت، ثروت، اقتدار، وجاہت کے اصنام کبیرہ نے قدم قدم پر اسے لبھایا۔ لیکن اُس کشتۂ عشق نے ماسوا کی جانب نظر اُٹھانا بھی گناہ سمجھا اور سارے رشتے چھوڑ کر صرف ایک کا ہو رہا۔''

باب ۲

کامریڈ

بڑی آرزوؤں اور تمناؤں، بڑی کوششوں اور صبر آزمائیوں کے بعد بالآخر ''کامریڈ'' کلکتہ کی اُفق سیاست سے طلوع ہوا۔

ہاتھ بے تاب ہو ہو کر بڑھے کہ ''کامریڈ'' کو حاصل کریں، نظریں بڑھ بڑھ کر پڑیں کہ کامریڈ کے ''جنت نگاہ'' صفحات سے لطف دید حاصل کریں اور لوگوں نے دوڑ دوڑ کر کامریڈ کو لینا چاہا کہ کہیں ادب وسیاست کی اس متاعِ گراں مایہ سے وہ محروم نہ رہ جائیں۔

اِس اشتیاق و کشمکش کا مظاہرہ ہندوستان کے ''کالے'' لوگوں نے نہیں کیا بلکہ ''انگلستان'' کے ''گوروں'' نے کیا، حکومت کے افسروں نے کیا اور بڑے بڑے صاحب بہادروں نے کیا۔

میر محفوظ علی کا بیان:

میر محفوظ علی صاحب فرماتے ہیں:

''انگریزوں کی اچھی خاصی تعداد کامریڈ کی خریدار، اُس کے مضامین کی عاشق اور اُس کے طرزِ نگارش کی مداح تھی۔''

ہر ایکسی لینسی کا اضطراب:

وائسرائے (لارڈ ہارڈنگ) کی بیگم صاحبہ وقتاً فوقتاً ٹیلیفون پر دریافت کرتی رہتی تھیں:

''کامریڈ کس وقت چھپ کر اُن کے پاس پہنچ جائے گا؟''

محمد علی کا بیان:

خود کامریڈ کے ایڈیٹر کا بیان ہے:

''کامریڈ نے اربابِ حکومت کی ایک بڑی اور نہایت مقتدر جماعت کو اپنی طرف مبذول کرالیا، لارڈ ہارڈنگ (وائسرائے ہند) کے نام جو اعزازی پرچہ جاتا تھا اُس کو وہ خود ہفتہ بھر تک نہ چھوڑ سکتے تھے۔''

لیڈی ہارڈنگ کی خریداری:

اس لیے بے چاری لیڈی ہارڈنگ نے خود ایک پرچہ دام دے کر اپنے نام الگ جاری کرایا۔

ولی عہد جرمنی کی خریداری:

اور اُن کے مہمان ولی عہد جرمنی نے (جو اُسی زمانہ میں ہندوستان بغرضِ سیاحت آئے تھے) بھی دام دے کر اپنے نام ایک پرچہ جاری کیا۔

حکومتِ ہند کا کوئی محکمہ ایسا نہ تھا جس کے عمال نے ممبر اور سیکریٹری سے لے کر انڈر سیکریٹری تک کامریڈ کو نہ منگایا ہو۔

گورنر کی قدردانی:

اور یہی حال صوبہ کے حکمرانوں اور اُن کے مشیروں (ایگزیکٹو کونسل کے ممبران) کا تھا۔

مسٹر میکڈانلڈ کی قدردانی:

اسلنگٹن کمیشن (جس کا ذکر کہیں حسبِ موقع آ چکا ہے) جب ہندوستان آیا تو مسٹر میکڈانلڈ (وزیراعظم برطانیہ) جو اُس وقت پارلیمنٹ کے لیبر ممبر تھے، ہندوستان تشریف لائے تھے۔ لکھنؤ میں اُنہوں نے محمد علی سے اپنی ملاقات کے وقت اِس کا بہ مسرت ذکر کیا تھا کہ وہ کامریڈ کو بالالتزام پڑھتے ہیں، اسی طرح اور بہت سے انگریز انشاپردازوں نے محمد علی کے کامریڈ کو بہت زیادہ سراہا اور اس کے حسن

انشاء، اصابتِ رائے اور غیر معمولی مہارتِ زبان کا اعتراف کیا۔

ہدیہ:

میر محفوظ صاحب ایک دلچسپ ہدیہ کا تذکرہ کرتے ہیں:

''سر فلیٹ وڈ ولش ہندوستان کے وزیر مالیات جب ولایت جانے لگے تو محمد علی اُن سے ملنے گئے، باتیں کرتے کرتے وہ محمد علی کو اُس کمرہ میں لے گئے جہاں اُن کا سامانِ سفر بندھ رہا تھا۔ کھلوا کر کہنے لگے، محمد علی! دیکھو، اِس میں کیا ہے؟ دیکھا تو کامریڈ کے پرچے تھے۔ کہنے لگے، ''میں لندن پنچ کے ایڈیٹر کو یہ تحفہ لیے جا رہا ہوں'' محمد علی بولے، ''پنچ کے ایڈیٹر کو تو کامریڈ برابر جاتا ہے''، کہنے لگے، وہ اور بات ہے، میں اپنے دوست سر اون سیمن ایڈیٹر پنچ کو اُن کے مذاق کے لائق اِس سے بہتر ہدیہ ہندوستان سے نہیں لے جا سکتا، تمہارے اور اُن کے طرزِ تحریر میں جو یک رنگی ہے کہ بعض اوقات تمہارے اور اُن کی تحریر میں تمیز کرنا مشکل ہے، اس کی داد وہی دے سکتے ہیں۔''

غرض اِس محیر العقول اور شاندار انداز میں ''کامریڈ'' چلتا رہا اور ملک کی قدر افزائی کرتا رہا، تا آنکہ وہ پریس ایکٹ کے منحوس ہاتھوں بند ہو گیا جس کا پبلک اور پریس نے بہت شاندار طریقے پر احساس کیا۔

نشاۃِ ثانیہ:

بے جاپور جیل سے رہائی کے ایک سال بعد اکتوبر 1924ء میں محمد علی نے اپنی صدارت کانگرس کے دوران میں ''کامریڈ'' نکالا تھا۔ لیکن اب ملک کی سیاسیات میں اتنا تغیر ہو چکا تھا، اُن کے مشاغل میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا اور اُن کی ذمہ داریاں اِس قدر بڑھ گئی تھیں، نیز راجہ غلام حسین اور ولایت علی بمبوق جیسے یگانۂ روزگار رفقاء سے وہ اِس طرح محروم ہو گئے تھے کہ ''کامریڈ'' جیسا نکلنا چاہیے تھا، ویسا

نہیں نکال سکے اور اِس کا خود اُنہیں بھی سخت احساس تھا۔

لیکن عالم یہ تھا کہ تن تنہا وہ ''کامریڈ'' کا بار اُٹھائے ہوئے تھے۔ سب ایڈیٹر کی لاکھ تلاش کی مگر جیسا سب ایڈیٹر وہ چاہتے تھے، نہ مل سکا۔ اس لیے اکثر اس دوسرے دور میں ''کامریڈ'' بعد از وقت نکلتا تھا۔

اپنے طور پر وہ بہت کوشش کرتے تھے کہ اس کی شان برقرار رہے، اس میں تنوع پیدا کیا جائے اور وہ وقت پر نکل سکے، لیکن انصاف شرط ہے۔ جو شخص مسلسل بیمار بھی رہتا ہو، یونٹی (اتحاد) کانفرنس میں بھی شریک ہوتا ہو، ہندو مسلم فسادات کے موقع پر محل واردات پر بھی جسے پہنچنا پڑتا ہو، کانگریس کے جلسوں میں بھی جسے شرکت کرنی پڑتی ہو، نظام خلافت کے استحکام و ترقی کی ذمہ داریاں بھی جس شخص پر ہوں، مسلمانوں کو تبلیغ و تنظیم کے پھندے میں جس جس طرح پھانسا جا رہا تھا، اُس کی گرہ کشائی بھی اُس کو کرنی پڑتی ہو، غرض ہر قومی اور ملکی معاملہ میں اسے پیش پیش رہنا پڑتا ہو اور ہندوستان کا دورہ کرنا پڑتا ہو اور پھر سب سے بڑھ کر ستم یہ کہ سب ایڈیٹر نہ ملتا ہو، اُس سے یہ توقع ہی غلط تھی کہ وہ سابقہ معیار پر ''کامریڈ'' کو نکال سکے گا۔

ذاتی کوششیں:

پھر بھی محمد علی اپنی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ کسی جلسہ کی صدارت کے لیے، کسی مسئلہ کے حل کرنے کے لیے، کسی قضیہ کے تصفیہ کے لیے محمد علی باہر گئے بلکہ جانا پڑا۔ ''کامریڈ'' کی تاریخ اشاعت سر پر آ رہی ہے تو جہاں وہ گئے، وہاں اُنہوں نے رات کی نیند حرام کر دی۔ دِن بھر جلسہ میں تھکے اور رات کو بیٹھے ہوئے رات بھر ''کامریڈ'' کا ''لیڈنگ آرٹیکل'' لکھ رہے ہیں اور بلگام کانگرس (دسمبر 1924ء) کے موقع پر یہاں تک ہوا کہ بہ صرف زرِ کثیر اپنی ناداری و افلاس کے باوجود تار پورا مضمون بھجوایا، کچھ تار ''بابو'' صاحب کی غیر معمولی ''انگریزیت'' نے اور کچھ بعض اور حضرات کی کرم فرمائیوں نے دفتر ہی میں مضمون مسخ کر دیا۔ اب 'کامریڈ' جو شائع ہوتا ہے تو محمد علی نے جو کچھ لکھا تھا، اُس کے علاوہ سب کچھ ہے اور نہیں ہے تو وہ جو اُنہوں نے لکھا تھا!

بی اماں کی وفات:

محمد علی کی بی اماں سے جو غیر معمولی محبت تھی، اُس کا ہر شخص کو علم ہوگا۔ اپنی ماں پر وہ فدا تھے اور ذرا بھی اُن کی تکلیف اُن سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ لیکن احساسِ فرض کا یہ نادر نمونہ ملاحظہ ہو کہ اُس چہیتی ماں کا انتقال ہو چکا ہے، لوگ تعزیت اور شرکتِ جنازہ کے لیے آ رہے ہیں، تجہیز و تکفین کا سامان ہو رہا ہے۔ لیکن محمد علی ہیں کہ ایک گوشہ میں رو بھی رہے ہیں اور ''کامریڈ'' کے پروف کی تصحیح بھی کر رہے ہیں کہ اخبار وقت پر شائع ہو جائے۔

التوا:

آغاز 1926ء سے صحت بہت خراب ہوئی تو بالآخر اِن ناسازگار حالات سے مجبور ہو کر محمد علی نے ''کامریڈ'' کی اشاعت اِس اُمید پر 1926ء میں ملتوی کر دی کہ جب تک کوئی قابل اور مستعد سب ایڈیٹر نہیں ملے گا، وہ اجرائے ''کامریڈ'' کا خیال بھی دِل میں نہیں لائیں گے، چنانچہ نہ سب ایڈیٹر ملا اور نہ محمد علی ''کامریڈ'' کا سہ بارا اجرا کر سکے۔

لیکن اِس گئی گزری حالت میں بھی ''کامریڈ'' نقصان میں نہیں چل رہا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنا خرچ پورا کرتا تھا، بلکہ ''ہمدرد'' کے غیر معمولی خسارہ کا بوجھ ہلکا کرنے میں بھی محمد علی کی مدد کرتا تھا۔

❁❁❁

باب ۳

مسلم یونیورسٹی

سر سیّد کے بعد:

سر سیّد کے زمانہ تک تو مسلمانوں کا یہ ''مدرسۃ العلوم'' ایک خاص اسلوب اور ایک خاص شان کے ساتھ چلتا رہا، لیکن اُن کی وفات کے بعد ہی سے اِس میں گھن لگنا شروع ہو گیا۔ اگر چہ اُن کے لائق اور نادر روزگار جانشینوں نے اپنی پوری زندگی اُن کے اِس مشن کے لیے وقف کر دی اور اپنے ذاتی مصالح و حالات کو بالکل پس پشت ڈال دیا، اور پوری مستعدی و سرگرمی سے علی گڑھ کی خدمت منہمک ہو گئے، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ علی گڑھ کالج پھر وہ رنگ حقیقتاً نہیں قائم کر سکا جس کی اُس سے توقع تھی۔

انگریز اسٹاف:

سب سے زیادہ جس جماعت نے علی گڑھ کو محمد علی کے معیار سے نقصان پہنچانے میں حصہ لیا، وہ وہاں کا انگریز اسٹاف تھا!

انگلش اسٹاف تنخواہ دار ملازم تھا لیکن اِس ہیبت آفریں نام کی ہیبت خود اُس کے ٹرسٹی صاحبان پر چھائی ہوئی تھی اور اس کے وجوہ بھی تھے۔ اس جماعت کو نظم و انتظام کا دعویٰ تھا۔ یہ غرہ تھا کہ علی گڑھ کی ساری شہرت اُس کے دم سے وابستہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ گھمنڈ تھا کہ اُس کا تعلق حکمراں قوم سے تھا اور ''حکمراں'' قوم نے بھی اپنی ''سر پرستیوں'' سے ثابت کر دیا تھا کہ علی گڑھ کی سیاسیات میں اگر وہ دخل دے سکتی ہے تو اسی معاملہ میں جب انگریز اسٹاف کے ارکان شاکی ہوں، ''ہز ایکسی لینسی پیٹرن'' کی توجہ

اُس وقت پورے ادارے حکمرانی سے منعطف ہوتی تھی، جب ٹرسٹیوں اور انگلش اسٹاف کے درمیان کشمکش ہو رہی ہو۔

مسٹر آرچ بولڈ:

لیکن سب سے پہلے اِس طلسم سامری کو سر سیّد کے لائق، جری اور ''مسلمان'' جانشین نواب وقار الملک مرحوم نے توڑا۔ مسٹر آرچ بولڈ اُس وقت علی گڑھ میں پرنسپل تھے اور سیکریٹری کے احکام و ہدایات اُن کے لیے سامانِ تفریح سے زیادہ نہیں تھے، نواب صاحب مرحوم نے اُنہیں اطاعت پر مجبور کیا۔ اُنہوں نے قانون و آئین کے بالکل خلاف براہِ راست اپنے اختلاف کا معاملہ ''ہزایکسی لینسی پیٹرن'' کی خدمت میں پیش کر دیا اور ہرایکسی لینسی نے بھی ازراہِ انصاف پروری و عدالت پژوہی اس معاملہ میں اپنی پوری سرگرمی ظاہر فرمائی، مگر وقار الملک کی کوہِ وقار ہمت میں جنبش نہیں ہوئی اور وہ یقیناً کسی تہدیہ و ترغیب سے متاثر نہیں ہوئے۔ (1909ء)

خودسری:

یہ اسٹاف ''ڈسپلن'' کے مبلغ ہونے کے باوجود ''ڈسپلن'' کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ تعلیمی و انتظامی ہر معاملہ میں اُس کا وقار اور اُس کی ہیبت کام کر رہی تھی اور لوگ مجبور تھے کہ اُس کے جذبات و خیالات کا احترام کریں اور خود گورنمنٹ نے بھی اپنے طرزِ عمل سے اِسے ثابت کر دیا تھا کہ علی گڑھ کالج کا وہ انگریز پروفیسر جسے علی گڑھ سے شکایت ہو، اُس کے لیے حکومت ہر قسم کی آسانیاں پیدا کرنے کو مستعد تھی اور گورنمنٹ کی اَسامیاں اُس کے استقبال کے لیے چشم براہ۔

اندرونی حالات:

دوسری طرف اندرونی حالات نہایت نازک ہو رہے تھے۔ فرقہ بندیاں تھیں، قدم قدم پر جتھے تھے، تفرقے تھے، ہنگامے تھے۔ ایک جماعت چاہتی تھی کہ علی گڑھ میں اُسی کا اقتدار رہے، دوسری جماعت کی خواہش یہ تھی کہ پہلی جماعت کو زک دے کر خود برسرِ اقتدار ہو جائے۔ غرض مقصدِ حقیقی

سب سے زیادہ جو جماعت علی گڑھ کی سیاسیات پر قبضہ رکھتی تھی اور علی گڑھ کالج پر قبضہ کرنا چاہتی تھی، وہ وہی جماعت تھی جسے اصطلاح میں ''اربابِ علی گڑھ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور بالخصوص اپنی کوششیں صرف کرنے والا:

اُن میں کوئی قمر تھا، کوئی آفتاب تھا!

یہ تھے علی گڑھ کے سیاسی حالات جن کا محمد علی نے مقابلہ کرنا چاہا اور جن کی اصلاح کرنی چاہی۔

محمد علی کی دلچسپی:

محمد علی کو علی گڑھ کالج سے مرتے دم تک بڑی دِلچسپی رہی اور وہ نہایت خلوص ومحبت سے اُس کی خدمت کرنے کا ولولہ اپنے دِل میں موج زن پاتے رہے، اور جب کبھی بھی اُنہیں موقعہ حاصل ہوا انہوں نے نہایت جوش اور تندہی کے ساتھ اپنی اُس تعلیم گاہ کی خدمت کی جس میں وہ پروان چڑھے تھے اور جہاں اُن کے ذہن ودماغ کی نشو ونما ہوئی تھی۔

پیش کش:

اِس اقتضائے وفا ومحبت کے خیال سے سب سے پہلے محمد علی نے اپنے کالج کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور چاہا کہ اِس طرح کالج کے اُن احسانات کی جو اُس نے اُن کے قلب ودماغ پر کیے تھے، تلافی کریں۔ خود نواب محسن الملک مرحوم کی دِلی خواہش تھی کہ محمد علی علی گڑھ کالج میں رہیں اور ان کی بیش قیمت خدمات سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر علی گڑھ کو فائدہ پہنچایا جائے۔

مسٹر ماریسن کی مخالفت:

لیکن مسٹر ماریسن جو طالب علمی کے زمانہ میں محمد علی کو عزیز رکھتے تھے، اُن کی ترقیوں سے خوش ہوتے تھے اور اُن کے ایک مضمون کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں نہایت زبردست داد دے چکے تھے، اور اپنے اس شاگرد کی ذہنیت سے بھی واقف تھے۔ علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانہ کی اُس کی رہنمائیاں، یونین میں اُس کی تقریریں، اور انگریزوں کی خودسری اور آزادروی کے متعلق اُس کا مسلک بھی اُنہیں

خدمت کسی کا بھی نہیں تھا، سب اپنا اقتدار اور اپنا تسلط چاہتے تھے۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن:

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم اس لیے ہوئی تھی کہ اولڈ بوائز میں ارتباط پیدا کرے، اُنہیں علی گڑھ کی خدمت پر آمادہ کرے، اُن کے لیے مواقع بہم پہنچائے کہ وہ علی گڑھ آئیں اور اپنی تعلیم گاہ کے انحطاط یا ارتقاع کا معائنہ کریں تا کہ اُن کے دلوں میں خدمت کا جذبہ پیدا ہوا۔

مگر اُسے بھی خود غرضیوں اور نفس پرستیوں کا اکھاڑہ بنالیا گیا۔ سمجھا یہ گیا کہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن پر جس جماعت کا قبضہ ہوگا، وہی کالج میں بھی ایک خاص رسوخ کی مالک ہوگی اور وہی جماعت ٹرسٹیوں میں بھی ممتاز و وقیع ہوگی، اُسی کو کارگزاری اک زیادہ موقع ملے گا۔ اس لیے قوم میں بھی وہ اپنی جگہ پیدا کرلے گی۔

بس اِس خیال نے مناقشت کی تخم پاشی کی اور اختلاف میں اضافہ ہوتا رہا، اور اس کی کوششیں ہونے لگیں کہ اس جماعت پر بھی ہمارا ہی قبضہ ہو۔

ٹرسٹیوں کی حالت:

تیسری طرف ٹرسٹیوں کی حالت اور زیادہ ابتر ہو رہی تھی۔ ٹرسٹی شپ ہمیشہ سے ایک خاص اعزاز کی مترادف تھی اور پھر ملک و سرکاری دونوں حلقوں میں، اس لیے ہر "صاحبِ دل" کا یہ حوصلہ تھا کہ وہ ٹرسٹی ضرور منتخب ہو اور اِس رُتبہ بلند پر فائز ہو جانے کے بعد وہ مطمئن ہو جاتا تھا، اور اُس کی قوتِ عمل سرد پڑ جاتی تھی اس لیے کہ اُسے اطمینان ہو جاتا تھا کہ اب تو "تاحین حیات" وہ اس منصبِ رفیع سے معزول ہوتا نہیں، اس لیے کہ بورڈ آف ٹرسٹیز کا ایک قاعدہ یہ بھی تھا کہ اُس کے ارکان دوامی ہوتے تھے۔ دوسرے ٹرسٹی خود ہی ٹرسٹی منتخب کرتے تھے، اس لیے زید نے عمر کو رائے دی اور عمر نے اپنا ہاتھ زید کے لیے اُٹھا دیا، حساب کتاب برابر۔

خود کوزہ و خود کوزہ گرد، خود گل کوزہ!

معلوم ہوتا تھا، اس لیے اُنہوں نے سخت مخالفت کی اور کسی طرح بھی اِس پر راضی نہ ہوئے کہ محمد علی علی گڑھ کالج کے اسٹاف میں داخل ہوسکیں، اور اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اس لیے کہ اُن کی ہیبت اور اُن کی رائے کی ''عظمت'' سب کے دلوں پر تھی اور جن پر نہیں تھی، اُن پر ہزایکسی لینسی پیٹرن کی تھی۔

اصل اختلاف:

محمد علی کو اصل اختلاف یہ تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ ٹرسٹیوں کا انتخاب ٹرسٹی ہی نہ کرلیا کریں، بلکہ اِس کا تعلق دوسروں سے ہونا چاہیے۔ دوسرے ٹرسٹی دوامی طور پر نہ منتخب ہوا کریں کہ اِس صورت میں اُن کی قوتِ عمل مضمحل ہوجاتی ہے اور کوئی کام اُن سے بن نہیں آتا۔

یہ چونکہ براہِ راست شہ رگ پر حملہ تھا اس لیے اِس کی سزا یہ دی گئی کہ کوشش ہوئی کہ محمد علی رکن ہی منتخب نہ ہوسکیں اور جب کبھی ''اولڈ بوائز ایسوسی ایشن'' میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا تو ایک دوسرے بزرگ کا نام ''مقابلہ'' کے لیے پیش کردیا جاتا تھا، اور جب محمد علی ٹرسٹی منتخب بھی ہوگئے تو اُنہیں دوامی رکن نہیں بنایا گیا۔

ایام ملازمت کی کوششیں:

اپنے بڑودہ اور نوساری کے زمانۂ قیام و ملازمت میں بھی محمد علی علی گڑھ کی خدمت سے باز نہیں آئے اور جو کچھ کرسکتے تھے، کرتے رہے۔ وہاں رہ کر مضمون نگاری کے علاوہ اور ذریعہ خدمت کیا تھا؟ اس کو اُنہوں نے اختیار کیا۔

مکتوب بنام محفوظ علی:

چنانچہ اپنے ایک مکتوب مؤرخہ 27 اپریل 1910ء میں اپنے عزیز دوست محفوظ علی صاحب کو لکھتے ہیں:

''علی گڑھ سخت آفت میں مبتلا ہے، نادر شاہی حکم کی پابندی ہوتی ہے، وقار الملک پر

ضعف غالب ہے، عزیز مرزا علی گڑھ آئے تھے مگر نواب صاحب نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ جو اعزاز اُنہیں ملتا تھا اُس سے انہیں محروم رکھیں، اس لیے اُن کو دیس نکالا ملا اور اب لکھنؤ میں مسلم لیگ کی سرداری کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ جس ایک شخص پر اِس قدر بھروسہ تھا اِس چاٹ سے وہ بھی نہ بچ سکا، آفتاب کو عزیز مرزا کا آنا سخت شاق گزر رہا تھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ مسلم لیگ لکھنؤ جائے گا تو اس اعزازی بخیل کو اور بھی شاق گزرا۔ دہلی مسلم لیگ میں شریک ہونے کو آیا تو تہیہ طوفاں کیے ہوئے، لیکن جب یہ سنا کہ عزیز مرزا سیکریٹری ہو کر لکھنؤ جاتے ہیں تو فوراً خاموش ہو گیا۔ اگر مسلم لیگ ہاتھ سے گیا تو گیا، کالج اور کانفرنس تو بدستور اُسی کے قبضہ قدرت میں رہے، میں نے عزیز مرزا کو علی گڑھ سے علیحدہ کرنے کی سخت مخالفت کی مگر یہ عزیز مرزا کو بری معلوم ہونے لگی۔ اب علی گڑھ اور آفتاب اور اِس نادر شاہی کی مخالفت کے لیے سر بکف فقط ایک تمہارا بھائی اور ذاتِ الٰہی ہے، ریفارم لیگ نے سوتوں کو ضرور جگایا ہے مگر نہ ہر شخص میں خلوص ہے نہ ہمت اور جوش و عملی کام کرنے کا شوق شاذ ہے، اس لیے آفتاب اور نظام شمسی کے ماتحت سیاروں کی چالیں کارگر ہو جاتی ہیں۔ اِس وقت تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے، اگر تم نے قدم اٹھایا اور چند اُردو اخبارات میں خطوط لکھے تو بے حد مفید ثابت ہوگا۔ اپنے گزشتہ سال کے مضامین کی نقلیں بھیجتا ہوں اس سے میری اسکیم اصلاحی کی تفصیل مل جائے گی۔''

دوسرا مکتوب:

اِس خط سے علی گڑھ کی سیاسی پیچیدگیوں اور محمد علی کی سرگرمیوں پر کافی روشنی پڑتی ہے، اب ایک دوسرا مکتوب کا ایک اہم حصہ بھی ملاحظہ ہو جو میر محفوظ علی صاحب کو لکھا گیا تھا:

''تعجب یہ ہے کہ کالج پر اِس قدر سخت مصیبت آئی ہوئی ہے اور تم علی گڑھ تک نہ گئے اور نہ اب تک اُس قلم سے کام لیا ہے جس کا چلانا ازل سے تمہیں بہتر آتا ہے۔ میں

نے اِس عرصہ میں ''ٹائمز'' میں ایک مضمون علی گڑھ پر لکھا تھا جس کا ایڈیٹر نے بھی حوالہ دیا اور اُسی دن نوٹ لکھا جس میں تحریر کیا کہ ہماری رائے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے کارسپانڈنٹ نے نہایت منصفانہ طور پر ہر معاملہ پر بحث کی ہے۔ آج ایک مضمون پیسہ اخبار کو اِسی پر لکھا ہے، مگر حالات سے بحث نہیں کی ہے صرف قانون ٹرسٹیان کی اصلاح پر لکھا ہے۔ تم کس دن کام آؤ گے اور دو تین مضمون ہر اُردو اخبار میں لکھ ڈالو اور اس کی تائید کرو۔ روزانہ پیسہ اخبار اگر بدایوں میں نہ آتا ہو تو لکھو کہ جاری کرادوں مگر ذوالقرنین کے آفس میں ضرور مل جائے گا۔ اُنہیں بھی کہو کہ وہ بھی تائید کریں اور عبدالحق (اب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی اور سیکریٹری انجمن ترقیٔ اُردو) کو تکتکاؤ۔ میں تنہا کب تک لڑتا رہوں گا؟ کیا تم چاہتے ہو کہ ہتھیار ڈال دوں؟ میں واقعی تھک گیا ہوں اور ممکن ہے اِس سال کے بعد اِس تمام جھگڑے کو خیر باد کہہ دوں۔''

اِن خطوط سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ محمد علی کو علی گڑھ سے کتنی غیر معمولی محبت تھی اور اُس کے نقائص پر کس طرح اُن کا دل کڑھا کرتا تھا اور اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کے باوجود مشغولیتوں اور مصروفیتوں کے ہوتے ہوئے وہ وقت نکال کر اُس کی خدمت کے مواقع تلاش کیا کرتے تھے۔

ملازمت کے بعد:

جیسا کہ اپنے ایک خط میں اُنہوں نے اشارہ کیا ہے کہ ''ممکن ہے اِس سال کے بعد تمام جھگڑوں کو خیر باد کہہ دوں''، اِس پر بھی عمل کیا اور اُسی سال 1910ء کے اَواخر میں مستعفی ہو کر اجرائے ''کامریڈ'' کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔

اب نسبتاً اُن کے لیے علی گڑھ کی خدمت کے زیادہ مواقع تھے، اس لیے کہ ریاست کی ملازمت چھوڑ کر وہ باقاعدہ ''پبلک مین'' بن گئے تھے، چنانچہ اُس زمانہ میں اُنہوں نے بہت زیادہ جوش اور محنت سے علی گڑھ کے لیے کام کیا۔

اولڈ بوائز کی تعمیر واستحکام میں غیر معمولی محنت دکھائی۔ ہر تقریب کے موقعہ پر محمد علی کا علی گڑھ پہنچنا لازمی تھا۔ اِس کے علاوہ کانسٹی ٹیوشن اور دوسرے اہم کاموں میں بھی محمد علی نے بہت نمایاں حصہ لیا۔

کورٹ کی ممبری:

''اولڈ بوائز ایسوسی ایشن'' کو اپنی طرف سے چند نمائندے بھیجنے کا اختیار حاصل ہو گیا تھا اور اُسے محمد علی سے بڑھ کر مستعد اور پر جوش، معاملہ فہم اور دُور اندیش نمائندہ کون مل سکتا تھا؟ لہٰذا اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے اپنی طرف سے کورٹ کی ممبری کے لیے اُنہیں کو منتخب کیا، جیسا کہ اِس سے پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ محمد علی کورٹ کی چند بنیادی خرابیوں مثلاً حق انتخاب اور طریقہ انتخاب وغیرہ میں تبدیلی کرانا چاہتے تھے۔ اس لیے نظام آفتابی کے ماتحت گردش کرنے والے سیاروں نے اِس کی ''سزا'' یہ دی کہ اُنہیں باقاعدہ دوامی ممبر نہیں بنایا۔ محمد علی کو اِس کی کوئی پرواہ نہیں تھی اور نہ باقاعدہ وہ اِس کے متمنی تھے کہ دوامی طور پر ممبر منتخب کر لیے جائیں۔

دوبارہ امیدواری:

لیکن اپنی مدتِ ممبری ختم کرنے کے بعد محمد علی پھر اُسی نشست کے امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔

ایک اولڈ بوائے کا مراسلہ:

خوش قسمتی سے ہمیں ایک اولڈ بوائے کا مراسلہ مل گیا ہے جو ''زمیندار'' میں شائع ہوا تھا اور جس میں محمد علی کے دوبارہ انتخاب کی حمایت کی گئی تھی۔ مراسلہ نہایت اہم اور معلومات افزا واقعات پر مشتمل ہے، اس لیے ہم اُس کے اہم اجزا یہاں پیش کرتے ہیں جن سے بہت سی چیزوں پر روشنی پڑے گی۔

> ''مجھ سے پہلے تین اصحاب اولڈ بوائز کی طرف سے ٹرسٹی مقرر ہو چکے تھے اور چوتھے سال یعنی 1910ء میں نئے قواعد کے مطابق پانچ سال کے لیے مسٹر محمد علی ٹرسٹی منتخب ہوئے۔ یہ امر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ جو اصحاب اولڈ بوائز ایسوسی

ایشن کی طرف سے اب تک ٹرسٹی منتخب ہوئے، اُن میں سے اکثر کو قبل اختتام میعاد بعد میں خود ٹرسٹیوں نے اپنے طور پر منتخب کر کے دوامی ٹرسٹی مقرر کر لیا ہے لیکن مسٹر محمد علی کے متعلق کسی ٹرسٹی کی طرف سے اس قسم کی تحریک بھی نہیں ہوئی ہے۔ اِس پانچ سال کی مدت میں کالج کی فلاں و ترقی کے لیے مسٹر محمد علی نے جو کوششیں کیں ہیں، وہ چار مدوّن میں تقسیم کی جا سکتی ہیں:

① ٹرسٹیوں کے کانسٹی ٹیوشن کی اصلاح

② کالج کے مالیات کا احتساب

③ کالج کے مختلف اجزا یعنی گورنمنٹ، ٹرسٹیوں، پروفیسروں اور طالب علموں کے باہمی تعلقات کو صحیح طور پر ایک دوسرے کو سمجھانا اور اس مقصد کو واضح کرنا جس کے حصول کے لیے سر سیّد نے اِس کالج کی بنیاد ڈالی تھی۔

④ کالج کی تکمیل یعنی اُسے یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچایا۔

(نیز) سائنس کالج کے وہ سب سے پہلے محرک ہیں۔

کالج کی مالی حالت کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا، کالج کی مالیات کے جانچ پرتال کے یہی معنی نہیں ہیں کہ صرف آمد و خرچ کی مدات کی جانچ سالانہ کر لی جائے، بلکہ اصل مقصد یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ روپیہ کسی بے جا مصرف پر نہ صرف کیا جائے۔ اسراف کی روک تھام کے لیے سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ کالج کا بجٹ کافی غور اور پوری چھان بین کے ساتھ تیار کیا جائے، بجٹ کے جلسوں کی یہ کیفیت تھی کہ اگرچہ قواعد کے مطابق ہر سال اپریل سے پہلے بجٹ کا جلسہ منعقد ہونا چاہیے تھا، لیکن کبھی بھی یہ جلسہ وقت پر نہیں ہوا اور بعض موقعوں پر اپریل کا ملتوی شدہ جلسہ دوسرے سال کی جنوری میں منعقد ہوا اور یہ عجیب و غریب صورت پیش آتی ہے کہ سالانہ جلسوں میں صرف 24 گھنٹہ کا فرق ہوا ہے۔ بجٹ کے جلسوں کے التواء کا

ایک نا گوار اثر یہ تھا کہ اخراجات کی کوئی روک تھام ناممکن تھی۔ مسٹر محمد علی کی بار بار کی نکتہ چینیوں سے بہ تدریج یہ تاریخیں مقررہ تاریخوں کے قریب آنے لگیں اور بالآخر گزشتہ بجٹ کے جلسہ میں یہ بات قرار پائی کہ نیا مالی سال شروع ہونے سے قبل بجٹ کی تیاری لازمی ہے جس میں حکومتِ ہند کے مروّجہ دستور کے مطابق نو ماہ کے اصل حسابات اور تین ماہ کے تخمینی حسابات شامل ہوں گے اور حسبِ معمول آئندہ سال کی آمدنی وخرچ کا تخمینہ درج ہوگا۔ کالج کے بعض بے قاعدہ اخراجات کی جس وقت جانچ کی گئی تو یہ معلوم ہوا کہ خرچ کرنے سے پہلے اِس بات کی تحقیقات نہیں کی جاتی کہ جس مد سے صرف کیا جا رہا ہے، اُس میں بجٹ نے کوئی رقم بھی منظور کی ہے یا نہیں اور اگر منظور کی ہے تو اب اِس میں کوئی رقم اتنی باقی بھی ہے کہ نہیں جو مطلوبہ خرچ کے لیے کافی ہو سکے اور نہ کبھی اِس طرف توجہ کی جاتی تھی کہ جس مصرف کے لیے مطالبہ کیا جا رہا ہے، وہ کہاں تک مناسب ہے؟ اِس کمزوری کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بعض چھوٹے اور غیر ضروری کاموں میں روپیہ صرف ہو جاتا تھا اور ضروری کام رہ جاتے تھے۔"

اساتذہ کی تنخواہیں:

جن محترم گمنام مراسلہ نگار صاحب کے خیالات سے اوپر استفادہ کیا گیا آگے چل کر وہ فرماتے ہیں:

"کالج کے اخراجات میں ایک بہت رقم اُستادوں کی تنخواہ میں صرف ہوتی ہے، یورپین پروفیسروں اور بعض اُستادوں کی ترقی تنخواہ کی ایک اسکیم مقرر ہے جس کے مطابق اپنے وقت پر اُن کی تنخواہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، لیکن اُستادوں کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جن کی ترقی کے لیے کوئی معیار مقرر نہیں ہے۔ اُن لوگوں کو مجبوراً یا تو عمائدِ کالج کی تائید اور رضامندی حاصل کرنے کے لیے غلط طور پر کوششیں

صرف کرنی پڑتی ہیں یا اُنہیں اپنی ترقی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ مسٹر محمد علی نے ہمیشہ اِس بات کی مخالفت کی کہ ذاتی اثرات کے ذریعہ سے ترقی کی کوشش کی جائے۔"

سطورِ بالا سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ محمد علی نے اپنی ٹرسٹی شپ کے زمانہ میں کیا کیا خدمتیں انجام دیں اور اولڈ بوائز کے حلقہ میں وہ کس قدر ہر دلعزیز اور محبوب تھے، نیز کس طرح اولڈ بوائز کی طرف سے ٹرسٹی شپ کے لیے محمد علی پر نظریں جا جا کر جم جاتی تھیں۔

یونیورسٹی کی اسکیم:

اب اِن کوششوں اور قابل تعریف کارگزاریوں کے بعد محمد علی کی اُن مساعی پر نظر ڈالیے جو اُنہوں نے علی گڑھ کالج سے یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کی مسلسل اَن تھک اور نہایت گرانقدر خدمتیں کیں۔

جسٹس محمود کی اسکیم:

اصل میں جس وقت اِس مدرسۃ العلوم کی تعمیر ہو رہی تھی، اُسی وقت سرسیّد کے حاشیہ خیال میں اور بعد کو اُن کے مقلدین و متبعین کے نقطۂ نظر میں یہ بات شامل رہی کہ جلد سے جلد اِسے حقیقی معنی میں، اگر قرطبہ اور غرناطہ زورِ کلام میں نکل گیا تھا تو کم از کم آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونہ پر ضرور لا کھڑا کیا جائے۔

اور یہی وہ چیز ہے جس کے لیے حالیؔ کی نظمیں، نذیر احمد کے لیکچرز، محسن الملک کی تقریریں، وقار الملک کی کوششیں، شبلی کی مثنویاں اور تصانیف کے علی گڑھ کے لیے "جملہ حقوق محفوظ" رہے۔

چنانچہ جسٹس سیّد محمود نے اُسی زمانہ میں ایک اسکیم تیار کی تھی اور اُس میں اِس ہونے والی یونیورسٹی کا ایک نہایت مکمل خاکہ تیار کیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ پھر اُن کی زندگی ایسے حوادث سے دوچار ہوئی کہ وہ اپنے والد کی بنائی ہوئی شاہراہ کی تکمیل نہ کر سکے۔ اِس کی تکمیل گو وہ نامکمل ہی سہی دوسروں کی قسمت میں لکھی تھی۔

یونیورسٹی کی تحریک:

1911ء کے آغاز میں جب یونیورسٹی کی تحریک عالم وجود میں آئی کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کو

یونیورسٹی کے درجہ تک جلد از جلد پہنچا دیا جائے تو محمد علی کی زبان اور محمد علی کا قلم اِس تحریک کی حمایت کے لیے وقف تھا۔

شوکت صاحب کو آمادہ کرنا:

اُنہوں نے اپنے برادرِ محترم مولانا شوکت علی سے درخواست کی کہ فرلو لے کر وہ اِس کارِ اہم کو انجام تک پہنچائیں، چنانچہ موصوف نے دو سال کی فرلو لی اور ہز ہائنس سر آغا خاں کی معیت اور سرکردگی میں سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور اپنی بے نظیر قوتِ عمل کا ثبوت یہ دیا کہ تیس لاکھ کی جو رقم فراہم کرنا تھی، اُس میں بیس پچیس لاکھ سے کسی طرح کم نہ فراہم کرایا۔

اختلاف:

بٹلر صاحب (سر ہارکورٹ بٹلر) اُس زمانہ میں ممبر تعلیمات تھے، یہ مسئلہ اُن کے ہاتھ میں آیا۔ اِدھر مسلمانوں نے اپنی پوری قوتِ عمل اِس پر صرف کر دی کہ وہ گورنمنٹ کے مطلوبہ بیس لاکھ پھر تیس لاکھ جمع کر دیں تاکہ ''یونیورسٹی'' پالیں۔ چندہ جمع ہو رہا تھا اور بہت کچھ جمع ہو گیا تھا کہ دفعتاً وائسرائے کی سفارش کے خلاف وزیر ہند صاحب نے جن شرائط کے ساتھ ''مکمل'' یونیورسٹی مسلمان مانگ رہے تھے، اُس کے دینے سے انکار کر دیا اور اپنی طرف سے چند سخت شرائط پروفیسروں کے تقرر اور کورٹ کے اختیارات، دوسرے کالجوں کے الحاق اور یونیورسٹی کے نام کے متعلق پیش کر دیئے جنہیں مسلمان کسی طرح بھی منظور نہ کر سکتے تھے۔

مہاراجہ محمود آباد کی رہنمائیاں:

اُس زمانہ میں مہاراجہ صاحب محمود آباد پبلک معاملات میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، اِس مسئلہ میں بھی اُنہوں نے بہت دلچسپی کا اظہار کیا تھا اس لیے بالاتفاق وہ ''لیڈر'' تسلیم کر لیے گئے اور کانسٹی ٹیوشن کمیٹی (مجلس ترتیبِ ضوابط) کے صدر بنا دیئے گئے۔ اُنہوں نے ممبر تعلیمات سے وعدہ کر لیا کہ وہ فاؤنڈیشن کمیٹی کے ممبروں کی رائے میں تبدیلی کرا سکیں گے۔

مہاراجہ صاحب کے ساتھ علی گڑھ کے اکثر بزرگ اور رؤسائے قوم اور آخر میں ڈاکٹر انصاری صاحب وغیرہ تھے۔

محمد علی کے ساتھ ابوالکلام صاحب آزاد، نواب وقار الملک مرحوم اور دوسرے حضرات تھے۔ قیصر باغ لکھنؤ میں یونیورسٹی کے لینے یا نہ لینے کا جب مسئلہ پیش ہوا تو بہت زیادہ اختلاف کا اندیشہ تھا اور طرح طرح کے خطرات تھے کہ خدا معلوم یہ اسکیم کامیاب بھی ہو سکے گی یا نہیں؟

محمد علی کی ''نرمی'':

جس صبح کو یہ معاملہ پیش آنے والا تھا، اُس کی رات کو پھر باہمی مشاورت ہوئی اور محمد علی اُس میں کچھ ''نرم'' پڑ گئے، یعنی علی نے یہ تجویز پیش کی اور منظور کرائی کہ ''فاؤنڈیشن'' کمیٹی کے ہاتھ سے یونیورسٹی لینے یا نہ لینے کا فیصلہ نکال لیا جائے اور ایک ایسے محدود ڈپوٹیشن کو اِس کا اختیار دے دیا جائے جس کے ممبروں سے اُنہیں کامل اُمید تھی کہ وہ جمہور مسلمانوں کی نیابت اچھی طرح کر سکیں گے اور وہی فیصلہ کثرتِ رائے سے کریں گے جو اِن حالات میں خود فاؤنڈیشن کمیٹی کرتی۔

اسباب:

محمد علی کی اِس روش پر اُن کے بعض رفقاء نے بہت سخت اعتراضات کیے اور اُنہیں بہت شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

درحقیقت یہ تعجب خیز بات بھی ہے کہ محمد علی جیسا جمہوریت پسند آدمی ایک جمہوری مسئلہ کو ایک محدود جماعت کے سپرد کر دینے کا حق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر حالات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اس ''سرگزشتِ شب'' (حدیث الغاشیہ) کی حقیقت کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔

محمد علی یہ جانتے تھے کہ علی گڑھ کی تحریک پر کن لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے، یہ بھی جانتے تھے کہ یہ جماعت تھوڑا بہت ملک و قوم پر اور بہت زیادہ گورنمنٹ کے حلقوں میں اثر و رسوخ رکھتی ہے۔ اُس وقت تک یہ ساری تحریک اُسی جماعت کے ہاتھ میں تھی، اس لیے اُنہوں نے محسوس کیا کہ اگر اس جگہ اختلاف

کیا گیا تو ضد اور ہٹ سے معاملہ اور خراب ہو جائے گا۔ لہٰذا اُنہوں نے ایک ایسا ''وسطی'' راستہ اختیار کیا جس پر دونوں فریق مطمئن ہو سکتے تھے اور کام نکلنے کی اُمید ہو سکتی تھی، اس لیے اپنے ضمیر کے خلاف جیسا کہ اُنہوں نے بارہا اپنے مضامین و مقالات میں اور اپنے مکتوب بنام مہاراجہ محمود آباد میں ظاہر کیا ہے، یہ کیا۔ گو اُن کی اُمیدیں پوری نہیں ہوئی اور وہ آخر وقت تک اپنی اِس روش پر نادم رہے اور نہایت وسعت قلب اور شرافت کے ساتھ اِس کا اعتراف بھی کرتے رہے۔

نتیجہ:

بالاخر 26,27 جولائی 1913ء کو علی گڑھ میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا جو جلسہ ہوا، اُس میں اگر چہ اربابِ علی گڑھ کو پورے مواقع حاصل تھے اور اُنہوں نے اِس سے ہر جائز اور ناجائز فائدہ بھی اُٹھایا، یعنی علی گڑھ کے اضلاع سے بہت کافی تعداد لوگوں کی ''منگائی گئی'' کہ اُن کے خیال کے مطابق فیصلہ ہو سکے لیکن پھر بھی فیصلہ وہی ہوا جس کی جمہور مسلمانوں سے توقع تھی اگر چہ حقیقتاً اِس فیصلہ کے بعد بھی اِس تحریک کو اُس اسلوب پر نہیں چلایا گیا جس کی یہ مستحق تھی۔

جنگ عظیم:

جنگ عظیم کے آغاز ہی پر محمد علی نظر بند کر دیئے گئے۔ اُن کی اِس نظر بندی سے دوسرے فریق نے قدرتاً پورا فائدہ اٹھایا، اُن کی اُس وقتی تائید کے بعد اُن لوگوں کو پھر محمد علی کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس لیے اُن کی نظر بندی کی خبر دوسرے الفاظ میں یونیورسٹی کے ''چارٹر'' کا مژدۂ جانفزا تھا۔

دوبارہ تحریک:

اگر چہ جنگ عظیم کے سلسلہ میں گورنمنٹ بھی پریشان تھی اور اُس وقت اِس مسئلہ کا اُٹھانا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا، مگر اِس مسئلہ کو پھر گورنمنٹ تک پہنچایا گیا۔

گورنمنٹ کی آمادگی:

گورنمنٹ اِس شرط پر یونیورسٹی دینے پر آمادہ ہوگئی کہ مسلمان اِسی قسم کی یونیورسٹی قبول کر لیں جس

طرح ہندوؤں نے اپنے مصالح اور ضروریات کا لحاظ رکھ کر قبول کی تھی۔ جمہورِ عام نے اس کی مخالفت کی، گروہِ احرار نے اِس کے خلاف زبردست تقریریں کیں اور مضامین لکھے، مگر جو لوگ اِس ادارہ اور اِس تحریک پر قابض ہو چکے تھے، اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اُنہوں نے پورے طور سے اِس پر آمادگی ظاہر کی کہ ہم اِس طرح کی یونیورسٹی قوم کے لیے مفید اور مناسب سمجھتے ہیں، اس لیے ضرور لیں گے اور جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں، انہوں نے تعلیم بھی کسی یونیورسٹی میں پائی ہے؟

محمد علی کی مخالفت:

محمد علی اگرچہ اُس زمانہ میں نظر بند کر دیئے گئے تھے لیکن پھر بھی اس مسئلہ سے ہر امکانی دلچسپی لیتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی کا مسئلہ جنگ عظیم کے اختتام تک نہ اٹھایا جائے، اس کے بعد پوری شدت کے ساتھ اُٹھایا جائے۔ اِس صورت میں کامیابی کی زیادہ امید ہے، بہ نسبت اِس صورت کے کہ جلد بازی کر کے خواہ مخواہ کام بگاڑ دیا جائے۔

مکتوب بنام محمود آباد:

چنانچہ چھندواڑہ سے اُنہوں نے ایک نہایت اہم خط مہاراجہ صاحب محمود آباد کے نام لکھا جس میں اپنی بے بال و پری کے باوجود اپنا نقطہ نظر نہایت تفصیل اور پورے دلائل کے ساتھ پیش کیا جس کا اہم اقتباس انہیں کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''یہ بہ وثوقِ تمام کہہ سکتا ہوں کہ میری مختصر پبلک زندگی میں اِس واقعہ سے زیادہ اہم کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ میں نے بظاہر اپنے کھلے ہوئے اور دیرینہ اصولوں کے سراسر خلاف ایک جمہوری حق کو ایک محدود جماعت کے سپرد کرنے کی تجویز جمہور کے سامنے پیش کی، مگر آخر کار چند واقعات ایسے پیش آئے کہ خود اُن حضرات کو جن کی مخالفت کو مٹانے کی غرض سے مجھے ان کے ساتھ متذکرہ بالا سمجھوتہ کرنا پڑا تھا، مارچ 1913ء میں لکھنؤ میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ جب تک فاؤنڈیشن کمیٹی کو پھر مدعو نہ کیا

جائے اور کل معاملات کو اُس کے سامنے پیش نہ کیا جائے، کوئی کارروائی جائز طریقے سے نہیں ہو سکے گی۔

اگست 1915ء میں آنجناب نے چند اصحاب کو شملہ پر مدعو فرمایا اور اس امر کی کوشش کی کہ مسلمان ایک ایسی یونیورسٹی کو جو ہندو یونیورسٹی کے اصولوں پر مبنی ہو، قبول کر لیں۔ 10 اپریل 1916ء کے لیے فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ پھر تجویز کیا گیا اور میں مشکور ہوں کہ آنجناب نے مجھے فراموش نہیں فرمایا۔ مگر کیا بے جا ہو گا اگر میں عرض کروں کہ اصل مدعا شوریٰ نہ تھا، بلکہ مجھے اپنی رائے سے متاثر کرنا مقصود تھا۔ میرے دیرینہ دوست سیّد سجاد حیدر صاحب یہاں آئے اور اُن سے یونیورسٹی کے مسئلہ پر دیر تک بحث رہی۔

یہ ظاہر ہے کہ 10 اپریل 1916ء کو مسلمان اگر طوعاً نہیں تو کرہاً ضرور اُن امور پر راضی ہو گئے جن کے خلاف وہ اور میں اُس وقت تک دونوں تھے۔ غالباً آپ سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ 10 اپریل 1916ء کے فیصلوں پر میں ہرگز مطمئن نہیں ہوا۔ آج پھر فاؤنڈیشن کمیٹی کو مدعو کیا جا رہا ہے اور قوم کے دیرینہ خواب کی اس طرح تعبیر کی جائے گی کہ جس طرح کی یونیورسٹی ایک دوسری قوم نے بظاہر اپنی قومی خصوصیات وضروریات کو ملحوظِ خاطر رکھ کر لینا قبول کی ہے، اُسی طرح کی یونیورسٹی ہم بھی اعلانیہ اپنی قومی خصوصیات وضروریات کے خلاف قبول کر لیں۔ کہاں 11,12,13 اگست 1912ء کے مطالبے اور دعوے تھے، کہاں آج کی ہمتیں اور ارادے ہیں؟ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سا عظیم الشان تعلیمی فائدہ اِسی سال اِس کی بنیاد رکھے جانے سے حاصل ہو جائے گا جو ایک دو سال کے توقف و تامل سے فوت ہو جائے گا۔

پھر کیا وجہ ہے کہ اس عجلت سے کام لیا جا رہا ہے اور ایک متنازعہ فیہ مسئلہ کو جس کا دورانِ

جنگ میں چھیڑنا خود سرکارِ عالیہ کے پیش کردہ اصول کے خلاف ہے، چھیڑا جا رہا ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے میں بہ وثوق تمام کہہ سکتا ہوں کہ کوئی وجہ اس عجلت کی موجود نہیں اور متعدد وجوہ اس عجلت کے خلاف موجود ہیں۔

ایک عرصہ تک میں نے انتظار کیا کہ اُن حضرات کا رجحان معلوم ہو جو کم از کم 10 اپریل 1916ء سے پیشتر میرے ہم خیال تھے، لیکن جب وقت تنگ رہ گیا تو میں نے مجبور ہو کر ایک تحریک 25 مارچ کے جلسہ کے لیے سیکریٹری صاحب کی خدمت میں مع ایک مفصل عریضہ کے داخل ایجنڈا کرنے کے لیے ارسال کر دی۔ مگر اب معلوم ہوا کہ جلسہ 8 اپریل کو ہوگا اور لوگوں کا خیال ہے کہ آنجناب نہایت سرگرمی سے مسلمانوں سے نہ صرف 11,12 اگست 1912ء (26,27 جولائی 1913ء کے فیصلوں کے خلاف فیصلہ کرانا چاہتے ہیں بلکہ 10 اپریل 1916ء کے فیصلہ کے بھی خلاف فیصلہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور مجھے یہاں تک اطلاع ملی ہے کہ آپ اعلانیہ فرماتے ہیں کہ اگر ضرورت ہوگی تو میں لکھنؤ سے دس ہزار آدمی اپنی رائے کے موافق رائے دینے کے لیے لے آؤں گا، یہ وہ خیالات ہیں جو آپ کے متعلق میں اپنے دل میں ہرگز جاگزیں نہیں ہونے دینا چاہتا!

اگر آنجناب سیّد سجاد حیدر صاحب یا کسی دوسرے صاحب کو جو آنجناب کی رائے سے پوری طرح واقف ہوں، یہاں روزانہ فرمائیں تو اُمید ہے کہ وہ مندرجہ تحت سوالوں کا جواب آنجناب کی طرف سے دے سکیں:

① یونیورسٹی کے مسئلہ کو تا اختتام جنگ کیوں نہ ملتوی رکھا جائے اور اس عرصہ میں وہ تمام کارروائی کالج کی ترقی واصلاح کے متعلق کیوں نہ کر لی جائے جو بلاتوسط سرکار عالیہ ہم آج بھی کرنے کے مجاز ہیں۔

۲) وہ کون سا تعلیمی فائدہ ہے جو یونیورسٹی کے متعلق اس وقت آخری فیصلہ کرنے میں متصور ہے مگر ایک دو سال بعد فوت ہو جائے گا۔"

۳) کیا جنگ کے باعث قیام یونیورسٹی میں باوجود ہمارے فیصلہ کر دینے کے کہ جیسی بھی ملے قبول کر لی جائے، رکاوٹیں پیش نہ آئیں گی؟

۴) کیا ہم عنقریب کافی اور عمدہ اسٹاف جو یونیورسٹی کے شایانِ شان ہو، مہیا کر سکیں گے؟

۵) کیا علی گڑھ کالج کے اربابِ حل وعقد پر آپ کو اعتماد ہے کہ وہ یونیورسٹی کو مناسب طریقہ پر چلا سکیں گے۔

٦) اگر آپ کو ان حضرات پر اعتماد ہے تو آپ اب تک کیوں اُن سے اِس قدر کشیدہ رہے ہیں اور کیوں علی گڑھ کالج کے معاملات میں آپ نے اُس سرگرمی کا جس کی آپ کے ہر جاننے والے کو آپ سے توقع تھی، اب تک اظہار نہیں فرمایا اور کیوں انتخابِ صدرِ کانفرنس کے معاملہ میں آپ کی جانب سے اربابِ حل وعقد علی گڑھ کی اِس قدر مخالفت یا اُن کی جانب سے آپ کی اور آپ کے ہم خیال اصحاب کی مخالفت ہوئی؟

آپ کو کیا، قوم کا جاہل سے جاہل شخص بھی اب سمجھ گیا ہے کہ یونیورسٹی کا مسئلہ بحالت موجودہ قوم کی موت اور زیست کا مسئلہ ہے۔ ہماری نظر بندی نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ بہت سی قومی معاملات میں کوئی حصہ نہ لیں، مگر چونکہ تعلیمی معاملات میں ہم ایک حد تک آزاد ہیں اور خط کتابت کر سکتے ہیں، اس لیے کم از کم مکاتبت اور مراسلت میں معذور نہیں، اپنا تو اس پر عمل ہے۔

فریاد و فغاں بلبلِ ناشاد کیے جا مہمانِ قفس خاطر صیاد کیے جا
فریاد ہو یا نالہ ہو یا آہِ جگر سوز جو ہو سکے تجھ سے دِلِ ناشاد کیے جا

مشکل یہ ہے کہ ہم کو آج اُنہیں سے شکایت پیدا ہوتی ہے جن کی تعریف میں ہماری زبانیں کل تک سوکھتی تھیں، استبدادیوں کا جامہ استبداد کہیں سے احرار کو دستیاب ہو گیا ہے اور اسے ہمارے سب سے بڑے حریت پسند زیب بدن کیے ہوئے ہیں، بھلا کہہ نہیں سکتے، برا کہنے کو جی نہیں چاہتا۔

دل برد و حق آنست کہ دلبر تواں گفت　　بیداد تواں دید و ستمگر نہ تواں گفت

موجودہ زمانہ ہمیشہ نہ رہے گا مگر جو فیصلہ ہم اور آپ آج کریں گے اس کا اثر ہمارے بچوں اور آنے والی نسلوں کی تعلیم پر صدیوں تک پڑتا رہے گا، کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ اُن کے لیے ہم اپنی کم ہمتی بطور ورثہ کے چھوڑ جائیں؟''

اِس خط کو آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اس میں جو سوالات ہیں، وہ درحقیقت سوالات نہیں ہیں بلکہ دلائل ہیں اور خود اپنی اہمیت کو ظاہر کر رہے ہیں۔

دوسری کوششیں:

محمد علی کی کوششیں یہیں ختم نہیں ہوگئیں بلکہ اپنی بے بال و پری کے باوجود اُنہوں نے اِس معاملہ کو حسب دِل خواہ طے کرنے کی اور کوششیں بھی کیں۔

اُنہوں نے حالت نظر بندی میں ممبر صاحب تعلیمات کو ایک درخواست بھیجی جس میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اُنہیں اُس جلسہ میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے جس میں یونیورسٹی کے لینے یا نہ لینے کا فیصلہ ہونے والا تھا تا کہ وہ وہاں اپنی رائے پیش کر سکیں۔ اس لیے کہ اُنہیں علی گڑھ کی تحریک سے جو دلچسپی رہی ہے، اُس کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اس میں شریک ہوں۔ مگر ممبر صاحب تعلیمات نے اِس درخواست کا جواب دیا کہ وہ ایسی اجازت دینے سے ''معذور'' ہیں۔

''صلۂ کارگزاری'':

محمد علی نے ''ہمدرد'' میں ایک بار ضمناً علی گڑھ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک عجیب وغریب

انکشاف کیا تھا، بے موقع نہ ہوگا اگر اس جگہ اس کا خلاصہ اُنہیں کے الفاظ میں یہاں پیش کر دیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں:

''1915ء میں علی برادران نظر بند کر دیئے گئے اور وہ قانونِ اساسی جسے میں نے اور میرے رفقاء نے بڑی محنت سے اور اربابِ بست و کشاد کی سخت مخالفت کے باوجود کالج کے قانون کو اصلاح دے کر تیار کیا تھا، ہماری نظر بندی کی ابتدا سے لے کر انتہا تک ایک بار نہیں بلکہ بار بار حکومت کے حکم سے خراب کیا گیا۔ سر شفیع نے فوراً یونیورسٹی ایکٹ کا نفاذ کرا لیا اور مہاراجہ صاحب محمود آباد نے بہ حیثیت وائس چانسلر کے نوبت بجا کر یونیورسٹی کا افتتاح کر دیا۔ یہ وہی سر شفیع تھے جو 1912ء میں مارلین صاحب کی وزیر ہند کی طرف سے پیش کردہ شرائط کو قبول کرنے کے لیے ہرگز آمادہ نہ تھے، مگر جو بحیثیت وزیر تعلیمات ہونے کے ڈاکٹر ضیاء الدین کے ایماء سے علی برادران کو قید خانہ بتیول سے چھوٹنے پر بھی علی گڑھ نہ آنے دینے کی کوشش پر آمادہ ہو گئے اور جنہوں نے 1920ء کی ابتدا ہی میں سر ہارکورٹ بٹلر سے ہز ہائنس نواب صاحب رامپور کو پیغام بھجوایا کہ یا تو علی برادران کو علی گڑھ جانے سے روک دیا جائے یا اُنہیں رامپور سے جلاوطن کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے علی گڑھ کو نہ چھوڑا، البتہ رامپور اُس دن سے آج تک نہ جا سکے۔''

❀❀❀

باب ۴

مسلم لیگ

غدر کے بعد سے مسلمانوں نے سیاسیات سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ برادرانِ وطن کی ایک سرگرم جماعت نے البتہ کانگرس میں جان پیدا کرنے کی کوشش کی اور اُس زمانہ کے لحاظ سے جو قوت اُسے پہنچائی جاسکتی تھی، وہ پہنچائی اور گورنمنٹ پر اثرات ڈالے گئے۔

اُس وقت تک مسلمان گورنمنٹ کے ظل عاطفت کو سایۂ الٰہی سمجھ رہے تھے اور کسی ایسی ''باغیانہ'' تحریک میں شریک ہونے کے لیے نہیں تیار تھے جس سے سرکار دولت مدار کی چین پیشانی اُن نیاز مندوں کے جذبۂ وفا کو ذرا بھی محل نظر سمجھے اور یہ بھی ''گستاخوں'' کی صف میں نظر آسکیں۔

حالات میں تغیر:

لیکن ظاہر ہے یہ حالات ہمیشہ تو قائم نہیں رہ سکتے تھے، گورنمنٹ کے گوشۂ چشم التفات میں تبدیلی ہوئی۔ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی علی الاعلان ظاہر ہوئی تو الحمد للہ کہ مسلمان میں بھی احساس پیدا ہوا اور سب سے زیادہ مسرت بخش بات یہ ہے کہ یہ احساس اُس جماعت کی طرف سے پیدا کرایا گیا جو سیّد عالی مقام کی جانشین تھی اور سیاسیات کو شجر ممنوعہ سمجھ کر اُس سے ہر وقت اپنی بے تعلقی اور بے زاری کا اعلان کرنا اپنی بہترین ملکی وقومی خدمت سمجھتی تھی۔

مسلم لیگ کی تاسیس:

اُسی جماعت نے نواب وقار الملک بہادر اور نواب محسن الملک مغفور کی کوششوں (1902ء میں

جب بمقام ڈھاکہ ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی) وہیں ایک گوشہ میں مسلمانوں کی آئندہ سیاسی زندگی کی تشکیل کے لیے ایک سیاسی جماعت کی تعمیر و تاسیس کی تھی جس نے مسلم لیگ نام پایا۔

محمد علی کا حصہ:

محمد علی نے اگرچہ اُس وقت تک سیاسی دنیا میں قدم نہیں رکھا تھا اور نہ بحیثیت ایک سیاسی قائد کے اُس وقت تک اُن سے توقعات وابستہ تھیں، لیکن پھر بھی محمد علی نے اُس کی تاسیس اور اُس کے استحکام میں نمایاں حصہ لیا اور اِس طرح اُس کے بانیوں میں اپنے لیے ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی۔

میر محفوظ علی کا بیان:

میر محفوظ علی صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

''اس موقع پر باوجودیکہ اسلامی ہند کی دماغی قابلیت کا عطر موجود تھا، مگر مسلم لیگ کے نظام کی درستی اور قواعد وضوابط کی تیاری کا سارا کام محمد علی نے کیا۔''

سر یعقوب کی رائے:

اِسی طرح سر محمد یعقوب فرماتے ہیں:

''علی گڑھ کا پرانا کھلنڈرا ولایت سے ایک زبردست مضمون نگار، ایک پر جوش مقرر اور ایک ہونہار مدبر بن کر آیا تھا۔ مسلم لیگ کی ساخت اور اس کے قواعد کی ترتیب میں محمد علی کا بڑا حصہ تھا، اور اُس وقت محمد علی کی زندگی سراپا سیاست بن گئی۔''

لیگ کا نصب العین:

لیکن گو اُس وقت ایک حد تک مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو گئی تھی اور مسلمان سیاسیات میں جھجک جھجک کر حصہ لینے پر آمادہ ہو رہے تھے، شاید اسی لیے لیگ کا نصب العین بہت پست رکھا گیا۔ اُس وقت تک اُس کے دائرہ عمل میں صرف یہ بات تھی کہ سال بھر کسی ایک مقام پر ایک سالانہ جلسہ منعقد کرائے، اس میں کچھ گورنمنٹ کی بھلائیاں اور کچھ ہندوؤں کی برائیاں بیان کر کے تان اِس پر توڑی جائے کہ

مسلمانوں کے ساتھ برادرانِ وطن ناانصافی کرتے ہیں، گورنمنٹ بھی کبھی کبھی اپنا ابر کرم دوسری طرف برسا دیتی ہے۔ اعلیٰ ملازمتیں مسلمانوں کو نہیں ملتیں اور ادنیٰ ملازمتوں میں بھی ''نشستیں محفوظ'' ہیں لہٰذا اُمید ہے کہ سرکار ابد قرار کی توجہ گرامی ہم وفا کیشوں اور جور پرستوں پر بھی مبذول ہوگی۔ گو اُس زمانہ میں کانگرس بھی اپنی ''وفا شعاری'' اپنے لیے باعثِ فخر سمجھ رہی تھی اور اُس کا کام بھی یہی تھا کہ ''تعزیت'' اور ''مؤدبانہ گزارش'' کی تجویزیں پاس کرے اور اِس کے بعد پھر خاموش ہو جائے۔

محمد علی کی عملی شرکت:

لیکن جب محمد علی کو عملی شرکت کا موقع حاصل ہوا تو اُنہوں نے لیگ کے قالبِ بے جان میں ایک روحِ تازہ پیدا کرنا چاہی، ایسی روح جو دوسروں کو ہشیار کر سکے اور بیداری پیدا کر سکے۔

سیلف گورنمنٹ:

لیگ کے نصب العین کی پستی کا اُنہیں احساس تھا اور اِس کے لیے انہوں نے انتھک کوششیں کیں، بالآخر خداوندانِ لیگ نے بھی اِس حقیقت کا احساس کیا اور انتہائی شجاعت و مردانگی کے ساتھ اِس کا اعلان فرما دیا کہ اب لیگ کا ''نصب العین'' ہندوستان کے مناسب حال (سوٹ ایبل) سیلف گورنمنٹ ہے۔

لیکن محمد علی کی کوششیں ابھی نہیں ختم ہوئیں۔ اُنہوں نے برابر اس میں ایک نئی زندگی پیدا کرنی چاہی اور وہ اس سے کبھی الگ نہیں ہوئے، نہ تحریک خلافت کے ہنگامہ زا زمانہ میں اور نہ تحریک کی افسردگی کے مضمحل کن عہد میں، وہ ہمیشہ اس میں شریک ہوئے اور اس کی بلند سے بلند تر سطح نظر تک رہنمائی فرماتے رہے۔

❁❁❁

باب ۵

طبّی وفد

محمد علی کے کارناموں میں بہت اہم کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ہندوستان سے ایک طبی وفد بلقان بھجنے میں بڑی سرگرمی ظاہر کی تا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی عملی ہمدردی کا ثبوت مل سکے۔

جس وقت محمد علی نے یہ عزم کیا ہے کہ ہندوستان سے ایک طبی وفد بھیجا جائے، اُس وقت حالات نہایت ناسازگار تھے اور کامیابی کی کوئی صورت نہیں نظر آتی تھی، لیکن محمد علی نے اپنی غیر معمولی اور بالکل منفرد قوتِ فیصلہ اور قوت سے کام لے کر اس کا بیڑا اٹھایا اور دُنیا نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ اسے اتمام تک پہنچا دیا۔ واقعات کی ضروری تفصیل یہ ہے:

جنگِ بلقان:

1913ء میں جنگِ بلقان شروع ہوئی۔ اُس وقت ہندوستان مسلمانوں میں سخت ہیجان، جوش، اور حرکت کا ظہور عمل میں آیا۔

ملک کا وہ طبقہ گورنمنٹ سے تعاون کرتا تھا، اُس نے بھی اپنی وفاداری بالائے طاق رکھ دی اور اپنی ہمدردی کا اظہار ترکانِ آلِ عثمان کے ساتھ کرنا شروع کیا۔

کم از کم اسلامی ہند میں وہ سب سے پہلا دور تھا جس میں مسلمانوں نے اس طرح اپنے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہو اور علی الاعلان اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اپنی ہمدردی ظاہر کی ہو، اور غریب سے غریب آدمی نے بھی ایثار و سیر چشمی کا نہایت نادر نمونہ پیش کیا ہو۔

مسٹر ممتاز حسن کا واقعہ:

لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر مسٹر ممتاز حسن نے امین آباد میں ایک نہایت پر جوش، درد انگیز اور فصیح و بلیغ تقریر کی۔ صاحب ڈپٹی کمشنر بھی اُس جلسہ میں موجود تھے، وہ مسٹر ممتاز حسن کی اِس شعلہ نوائی سے بہت متحیر ہوئے اور اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن مسٹر موصوف نے نہایت جرأت اور ہمت سے کہہ دیا کہ یہ ایسا مذہبی معاملہ ہے جس میں ہم مسلمانوں سے کسی قسم کی کمزوری کی مطلق اُمید نہ رکھی جائے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر نے اُنہیں اطمینان دلایا کہ وہ مسلمانوں کے اِس احساس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

مولانا شبلی کی نظم:

مولانا شبلی سا عافیت پسند اور عملی سرگرمیوں سے الگ رہنے والا بزرگ بھی اپنے جوش کو قابو میں نہ رکھ سکا اور ایک معرکۃ الآرا نظم لکھی جو قیصر باغ کی بارہ دری میں پڑھی گئی اور بہت سے لوگوں کے کان میں آج بھی اُس کی گونج باقی ہے، پھر جب طبی وفد بخیر و عافیت واپس آیا ہے تو پھر اُن کے تاثرات اشعار آبدار کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

اُن دونوں نظموں میں مولانا شبلی نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی صحیح ترجمانی کی، بلکہ انگریزوں کی پالیسی اور مدبرین برطانیہ کی مسلم آزار روش پر بھی نہایت آزادی سے نکتہ چینی اور تنقید کی۔

ڈاکٹر انصاری کا ارادہ:

اِن حالات میں ڈاکٹر انصاری کی یہ خواہش ہوئی کہ وہ ہندوستان سے ایک طبی وفد لے جائیں اور مجروحین و مقتولین کی جو خدمت اُن سے بن آئے، کریں۔

محمد علی کی حمایت:

محمد علی سے جب اُنہوں نے اپنے اِس قابل صد ستائش عزم کا تذکرہ کیا تو محمد علی نے بہت زبردست تائید کی اور اُنہیں پورے طور سے آمادہ کیا کہ وہ اِس کارِ خیر کو ضرور انجام دیں۔

مشکلاتِ راہ:

لیکن سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ سرمایہ ناپید تھا اور بغیر کافی سرمایہ کے یہ مہم اتمام تک پہنچ نہیں سکتی تھی۔

ہلالِ احمر کا وعدہ:

اُس زمانہ میں ترکانِ آلِ عثمان کی امداد و اعانت کے لیے ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں ''ہلالِ احمر'' کے نام سے انجمنیں قائم ہوگئی تھیں جن کا مقصد سرمایہ جمع کرنا اور ترکوں کو پہنچانا تھا، کیونکہ گورنمنٹ نے بھی مسلمانوں کے جوش وخروش کو دیکھ کر اِس کی اجازت دے دی تھی کہ یہاں سے اُنہیں مالی امداد بھیجی جاسکے اور آسانیاں بھی پیدا کردی تھیں کہ اِس راہ میں مشکلات جو آئیں، اُن میں کسی نہ کسی حد تک سہولت ہو۔ چنانچہ محمد علی نے معاملہ دہلی کی انجمن ہلالِ احمر کے سامنے پیش کیا۔ مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت سمجھائی، وفد کی ضرورت اور اہمیت کی طرف اُس کے ممبروں کی توجہ مبذول کرائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن نے پندرہ ہزار کی رقم منظور کی اور اس کے انتظامات کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ رقم اس وفد پر صرف کی جائے گی اور وفد بھیجا جائے گا۔

وعدہ خلافی:

لیکن یہ وعدہ ابھی شرمندۂ تکمیل نہ ہوا تھا کہ انجمن نے اپنی رائے بدل دی اور وہ رقم جو دینے کا وعدہ کیا تھا، اُسے براہِ راست ترکوں کو بھیجنے کے انتظامات کرنے لگی۔ محمد علی نے ہر چند سمجھایا، کوششیں کیں، منت سماجت کی، عواقب ونتائج اُن کے سامنے پیش کیے، مگر سب بے سود۔ انجمن کی اکثریت نے پھر اپنی رائے نہیں ''بدلی۔''

حیرت انگیز عزم:

میر محفوظ علی صاحب اپنا مشاہدہ بیان فرماتے ہیں:

''محمد علی نے جلسہ ہی میں مجھ سے (محفوظ علی سے) پوچھا، ہمارے پاس کتنی رقم ہے؟

میں نے کہا، ''اتنے ہزار اتنے سو روپیہ'' کہنے لگے، ''الحمدللہ ہمارے پاس کافی رقم ہے، انصاری! میں نے طے کرلیا ہے کہ انشاء اللہ مشن جائے گا اور ضرور جائے گا، میرے پاس دس روپیہ بھی ہوتے جب بھی ہمت نہ ہارتا۔ تم اللہ کا نام لے کر انتظام کرو، رقم کی فراہمی میرے ذمہ۔

اُسی رات کو اپنے خدمت گار محمد حسین سے کہا، ''جا کر میرے کمرے میں لیمپ تو جلا دے''، کمرے میں جا کر ''کامریڈ'' کے لیے مضمون لکھا جس میں مسلمانوں سے بھی مشن کے چندہ کے لیے وہ دِل ہلا دینے والی اپیل کی جس نے ''کامریڈ'' کے دفتر میں روپیوں کی بارش شروع کر دی۔ ''کامریڈ'' کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دِن میں دس دس، پندرہ پندرہ ہزار روپے وصول ہوئے ہیں اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈر اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو ہو گیا ہے۔''

آخر کار اِس طرح محمد علی نے مایوسیوں اور نا اُمیدیوں کے عالم میں اِس مہم کا آغاز کیا اور اِسے اتمام تک پہنچا کر دم لیا۔

❀❀❀

باب ٦

ٹرنر ماریسن کمپنی اور دوسرے واقعات

ترکوں کا قرضہ:

1913ء میں جب دولِ یورپ نے ترکی کو مالی دقتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کر کے اس کی کوشش کی تھی کہ وہ ایک ذلت آمیز صلح پر مجبور ہو جائے تو محمد علی نے اپنی پوری کوشش اِس امر پر صرف کر دی کہ گورنمنٹ اِس کی اجازت دے دے کہ ترکوں کی مالی امداد کی جا سکے، اور جب اس میں کامیابی ہو گئی تو محمد علی نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور لوگوں کو اِس پر آمادہ کیا کہ وہ ترکی تمسکات کے حصص خریدیں اور اِس مقصدِ عظیم میں اُنہیں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ محمد علی کے ایک سابق عقیدت مند کا بیان ہے:

"یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہندوستان کی اسلامی آبادی نے ایک کثیر رقم ترکی سلطنت کو بطور قرض کے دی۔"

مقدونیہ آؤ:

حکومت ہائے بلقان کے انسانیت سوز اور شرمناک مظالم سے متاثر ہو کر ترکوں کی ایک جماعت نے ایک اپیل شائع کی جس کا عنوان تھا:

"مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو۔"

وہ اپیل اپنے درد و تاثر اور واقعیت و حقیقت کے اعتبار سے نہایت زبردست اثر اپنے اندر رکھتی

تھی۔ محمد علی نے اسے ''کامریڈ'' میں بالاقساط شائع کیا جس پر دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ''ہمدرد'' و ''کامریڈ'' کے وہ تمام پرچے ضبط کر لئے جس میں یہ اپیل شائع ہوئی تھی اور دو ہزار کی ضمانت طلب کی۔

جس سابق ''عقیدت مند'' صاحب کا بیان اوپر گزر چکا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''اِس حکم کے خلاف آپ نے سب سے زیادہ آزاد خیال عدالت کلکتہ ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ آپ کی جانب سے مشہور مقنن مارٹن نے تمام عمر کا قانونی تجربہ اور اپنی بہترین قانونی قابلیت اِسی حکم کو ناجائز قرار دینے میں صرف کی مگر مسٹر مارٹن، محمد علی اور تمام ہندوستان ششدر رہ گیا جب فاضل ججوں نے یہ ظاہر کیا کہ پریس ایکٹ ایک ایسا ہمہ گیر قانون ہے جس میں صحائفِ آسمانی بھی آسکتے ہیں۔''

ٹرنر ماریسن کمپنی:

آگے چل کر وہی صاحب فرماتے ہیں:

''1914ء میں ٹرنر ماریسن کمپنی نے حجاز کی جہاز رانی کے اجارہ کی درخواست مع واپسی ٹکٹ حکومتِ بمبئی کی خدمت میں پیش کی۔ اُس نے مع اپنی سفارش کے حکومت ہند کی منظوری کی اجازت بذریعہ تار مانگی، اس خفیہ کارروائی کی خبر آپ کو بھی بذریعہ تار ہوگئی۔ آپ نے فوراً ''کامریڈ'' کا ایک ضمیمہ شائع کیا جس میں اس درخواست کی منظوری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور پرائیویٹ طور پر لارڈ ہارڈنگ کو اِس مسئلہ کی جانب متوجہ کیا۔ آپ کی اِس جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ وائسرائے نے اِس درخواست کو بالکل مسترد کر دیا۔ اب وہی مذموم طریقہ آپ کی نظر بندی کے بعد مستحسن قرار دیا گیا اور ٹھیکہ بھی اُسے دے دیا گیا۔''

❀❀❀

باب ۷

ہمدرد

کلکتہ سے دہلی:

محمد علی نے ''کامریڈ'' کا اجرا کلکتہ سے کیا تھا، اس لیے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنا اخبار حکومتِ ہند کے دارالسلطنت اور مرکز سے نکالیں لیکن جب حکومت نے اپنا مرکز تبدیل کر لیا اور کلکتہ سے دہلی آ گئی تو محمد علی نے بھی حکومت کا تعاقب کیا اور دہلی پہنچ گئے، اور یہاں آ کر انہوں نے ''ہمدرد'' کے اجرا کے انتظامات بھی ''کامریڈ'' کے ساتھ شروع کر دیئے۔

تعویق:

اصل میں اُن کا یہ خیال پرانا تھا مگر حالات ساز گار نہ ہو سکے، اس لیے اُن کا ارادہ قوت سے فعل میں نہ آ سکا۔ سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ بیروت سے اُنہوں نے جو ٹائپ ''ہمدرد'' کے لیے منگایا تھا وہ پورا نہیں تھا اور جب وہ مکمل نہ ہو جاتا اُس وقت تک ''ہمدرد'' کا نکلنا مشکل تھا۔

حکیم اجمل خاں کی رائے:

میر محفوظ صاحب فرماتے ہیں:

''ایک روز حکیم اجمل خاں تشریف لائے اور دریافت کیا کہ ہمدرد کے اجرا میں کیا دیر ہے؟ محمد علی نے کہا، ابھی تک پورے اخبار کے لیے ٹائپ نہیں آ سکا ہے، فرمانے لگے آج کل خبروں کی بہم رسانی کی سخت ضرورت ہے، اگر پورا اخبار نہ نکل سکے تو صفحہ دو

صفحہ ہی کا نکال دیجیے، آمدنی بھی ہوگی اور پبلک کی خدمت بھی۔

محمد علی نے اِس رائے کو پسند کیا اور ہمدرد کا وہ سلسلہ خاص 23 فروری 1913ء سے جاری ہوا جسے عام طور پر نقیب ہمدرد کہتے ہیں۔ یہ پرچہ روزانہ ایک ورق پر چھپتا رہا اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا۔''

ہمدرد کا اسٹاف:

محمد علی کو معلوم ہوتا ہے شخصیت شناسی میں بھی ملکہ تام حاصل تھا۔ ''ہمدرد'' کے اسٹاف میں چن چن کر انہوں نے ایسے آدمی رکھے تھے جو محمد علی کی تربیت کی بدولت مختلف حیثیات سے روشناس خلق ہوئے! بہت سے ذرّوں کو محمد علی نے اپنی نگاہِ کیمیا اثر سے آفتاب بنا دیا۔ ہندوستان کا کوئی اخبار آج تک اتنا قابل قدر ادارتی عملہ نہیں فراہم کر سکا۔ ''ہمدرد'' کے عملہ کا ایک ایک فرد اپنے وقت کا ایک بہت بڑا ادیب وصحافی ثابت ہوا۔

میر محفوظ علی صاحب سا ادیب بے مثل جو تقریباً مضمون نگاری فرماتے تھے (دراصل منیجر تھے)۔ سیّد ہاشمی فرید آبادی، قاضی عبدالغفار، سیّد جالب، مولوی عبدالحلیم شرر، فاروق صاحب دیوانہ سبھی ''ہمدرد'' کے دفتر میں موجود تھے۔

اور پھر دورِ ثانی میں عارف ہسوی اور ڈاکٹر سعید احمد جیسے افراد کا کھنچ کھنچ کر ایک ہی حلقہ میں جمع ہو جانا محمد علی کی سحر آفریں شخصیت کا نتیجہ تھا، پھر جس اخبار کو اتنا بے نظیر عملہ ادارت اور محمد علی سا قابل ایڈیٹر ملے وہ کیوں نہ آسمانِ صحافت پر مہر و ماہ بن کر چمکتا؟ وہ چمکا اور اُس نے اپنی ضوفشانی سے دوسرے سیارگانِ وثوابت کی روشنی اور چمک دمک میں کمی پیدا کر دی۔

محمد علی کی ادارتی رہنمائیاں:

قاضی عبدالغفار صاحب جو اُس زمانہ میں ''ہمدرد'' کے رکن ادارت تھے، تحریر فرماتے ہیں:

''میری زندگی میں وہ یادگار صبح تھی، یعنی وہ پہلا دن جب بہ حیثیت استاد شاگرد

میرے اور محمد علی کے مستقل تعلقات شروع ہوئے۔ میں اُس زمانہ کو بھول نہیں سکتا۔ کیا زمانہ تھا جب ہمدرد و کامریڈ کے دفتر میں صبح اور شام تمام ممبران اسٹاف اخبار کے متعلق مشورے میں شریک ہوتے تھے۔ شوکت علی، محمد علی، سیّد محفوظ علی، راجہ غلام حسین، میں اور دو چار، ہم سب زیر بحث مسائل پر بحث کرتے تھے اور محمد علی صاحب ایک ایک کو اُس کے کام کے متعلق ہدایات دیتے تھے۔ ان کے دماغ کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ جب ایک چھوٹا سا نوٹ لکھنے کے لیے بحث کے خاص خاص پہلو بتانا شروع کرتے تھے جو اگر سب حیطۂ تحریر میں لائی جاتی تو ''ہمدرد'' کے آٹھ دس کالم ہو جاتے۔''

دفتر ہمدرد کی فضا:

آگے چل کر قاضی صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں

''ہمدرد کے دفتر کی آب وہوا بھی کچھ عجیب تھی، وہ صحبتیں اور دل کی اُمنگوں کی خواہش، اقبال کی نظمیں اور شوکت علی بھائی کا ترنم، غلام حسین مرحوم کے دھیمے مذاق، محفوظ علی بھائی کی شیریں گفتاری کہ ہر لفظ جو دہانِ موزوں سے نکلتا تھا گویا ایک برکت فلک سیر سے کم نہ ہوتا تھا۔''

محمد علی کا نظریہ صحافت:

''ہمدرد'' کے ذکر کے سلسلہ میں نامناسب نہ ہوگا، اگر محمد علی کا وہ نظریہ صحافت پیش کر دیا جائے جس پر عمل پیرا ہو کر ''ہمدرد'' نے ہندوستانی صحافت میں اپنے غیر فانی نقوش قائم کیے ہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ محمد علی ابھی بڑودہ میں برسر ملازمت ہیں۔ انشا پردازی اور مضمون نگاری کا جب جوش اٹھتا ہے تو ''ٹائمز آف انڈیا'' بمبئی میں اپنے قلم کی روانی دکھاتے ہیں اور اُس کے ایڈیٹر سے خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔ خود اُن کے دِل

میں بھی اِس میدان میں آنے کی تمنا پرورش پا رہی ہے اور اِس جنجال سے جلد از جلد رہائی چاہتے ہیں مگر بقول غالب:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

اُسی زمانہ میں گجرات سے ان کے ایک شناسا نظام الدین صاحب نے ایک اخبار نکالنا چاہا اور محمد علی سے مشورہ طلب کیا، محمد علی نے مشورہ کی صورت میں صحافت کے یہ زرّیں اصول اُن کی خدمت میں پیش کر دیئے:

''اخبار کی کامیابی کے لیے اتنی باتوں کا ہونا لازمی ہے:

① ذاتیات سے بالکل مبرا ہو۔ نہ کسی دشمن کے خلاف کچھ لکھا جائے نہ خواہ مخواہ دوستوں کی تعریف کے قصیدے گائے جائیں۔

② کسی شخص یا اخبار کی رائے کے خلاف کچھ لکھنا ہو تو وہ مخالفت محض رائے تک رہے، ذات کا حصہ شامل نہ ہو۔

③ جو کچھ لکھا جائے، عبارت آرائی کے خیال سے نہیں نہ لوگوں کے چٹکیاں لینے کی غرض سے، بلکہ متانت سے اور نہایت سنجیدگی سے۔

④ جہاں تک ممکن ہو وہی خبریں چھاپی جائیں جو انگریزی ڈیلی چھاپتے ہیں، اگر اِس سے زیادہ کوئی لوکل باہر کی خبر چھاپنی ہو تو اُس کے راوی کا ثقہ ہونا سب سے ضروری ہے۔

⑤ اخبار کا مقصد اپنی قوم کو نفع پہنچانا ہونا چاہیے نہ کہ دوسری قوم کو نقصان پہنچانا اس لیے دوسروں کے رنج پر اپنے کو خوش نہ ہونا چاہیے، خصوصاً ہنود پر بے جا حملہ نہ کرنا چاہیے، اُن کے حملہ کا دفعیہ ضروری ہے۔

⑥ اخبار خبروں کا مجموعہ ہوتا ہے لہٰذا زیادہ تر خبروں کا حصہ ہونا چاہیے۔

⑦ مضامین میں ایک ایڈیٹوریل ہو، کسی ایسے مضمون پر جو اس زمانہ میں زیر بحث ہو اور یہ مضمون اخبار بھرنے کی غرض سے نہ لکھا گیا ہو بلکہ ایسا ہو کہ جس کا لکھا جانا نہایت ضروری تھا۔ مضمون پولٹیکل ہو، خواہ سوشل خواہ تعلیمی خواہ تجارتی۔

⑧ ایڈیٹوریل نوٹ حال کے واقعات اور خبروں پر اپنی رائے زنی کے لیے ہیں اس لیے اسی کام میں آنا چاہیے۔

⑨ ایک مضمون کسی اور کا بھی ہونا چاہیے، خواہ وہ کسی خبر کے متعلق ہو یا کسی مستقل مضمون پر۔

⑩ مختلف مقامات پر چند مضمون نگار دوستوں یا تنخواہ داروں کا بندوبست کرنا چاہیے جو مہینہ میں ایک مرتبہ آدھے کالم میں آسکے۔

⑪ خطوط وہی چھاپے جائیں جو واقعی کسی ضرورت سے لکھے گئے ہوں نہ کہ نامہ نگاروں کی جودتِ طبع کے اظہار کے لیے۔

⑫ اخبار مذہبی بحث سے بالکل معرا و مبرا ہو۔

⑬ ایڈیٹر کو خود تمام مسئلوں پر غور کرنا اور دوسرے اخباروں اور کتابوں سے واقفیت حاصل کرنا لازم ہے، آپ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ روزانہ اخبار کا ایڈیٹر کس قدر سخت محنت کرتا ہے خود مجھے مصر کے متعلق کچھ لکھنا ہے، روزانہ اخبارات سے بہت سے واقعات معلوم ہوتے رہتے ہیں مگر تین چار کتابیں شروع سے آخر تک پڑھی ہیں تب جا کر ایک دو کالم کا مضمون لکھ سکوں گا۔ اگر قلم برداشتہ لکھنا چاہوں تو بہت آسان ہے مگر پڑھنے والے کو مشکل ہے۔"

نظریہ کیسا تھا؟

یہ تھے محمد علی کے وہ زرّیں اصولِ صحافت جن پر اُن کا اخبار "ہمدرد" چلا اور جس نے ہمیشہ غیروں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

محمد علی کو اپنی زندگی میں بار ہا بڑی بڑی شخصیتوں کے خلاف قلم اٹھانا پڑا اور سخت سے سخت مخالفت کرنی پڑی، لیکن غور کیجیے! آپ کو معلوم ہوگا کہ اُنہوں نے اپنے اصول سے تجاوز کبھی نہیں کیا۔ جس مسئلہ میں اُنہوں نے اختلاف کیا، اس کے بعد کسی دوسرے مسئلہ میں اُنہوں نے اس سے زیادہ اتفاق کیا اور اتفاق وحمایت کا حق ادا کر دیا۔

ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر عالم وغیرہ کے سلسلہ میں آپ اس کی تفصیل پڑھ چکے ہیں۔

یہی وجہ ہے جو اُن کا زبردست سے زبردست مخالف اُن کی قدر کرتا تھا۔

حکیم برہم کا خط:

چنانچہ جب ''ہمدرد'' کی نشاۃ ثانیہ ہوئی ہے تو حکیم برہم مالک وایڈیٹر اخبار ''مشرق'' گورکھپور نے اُنہیں ذیل کا خط اپنی ساری مخالفتوں کے باوجود لکھا۔

> ''بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمدرد و کامریڈ کے اجرا کا قصد فرمایا، یقین ہے کہ قوم اور ملک کی متزلزل حالت ٹھیک ہو جائے گی اور رائے عامہ کی پریشانی دُور ہو جائے۔ جس روز پہلے پرچے جاری ہوں، میرے نام ایک سال کے لیے دونوں پرچے ویلو روانہ کر دیں۔''

اعلیٰ انتظامات:

محمد علی نے ''ہمدرد'' اِس شان اور اِس آن بان کے ساتھ چلایا کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

ہندوستان کا وہ پہلا اُردو روزنامہ تھا جس نے براہِ راست ایسوسی ایٹیڈ پریس اور روائٹر کی خدمات حاصل کی تھیں۔

اشاعت:

یہی چند در چند اور گونا گوں خصائص تھے جن کی بنا پر ''ہمدرد'' ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اور جنگ کے زمانہ میں تو اُس کی اشاعت بہت زیادہ بلکہ ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ یہی وہ پہلی معراج تھی جو ''ہمدرد'' کو

حاصل ہوئی اور اُس کے بعد سے آج تک کوئی اخبار ہندوستان کی اُردو صحافت میں اپنی کثرتِ اشاعت کا ایسا نمونہ نہیں پیش کر سکا۔

گورنمنٹ کا خراجِ تحسین:

اپنے اِس قابل رشک کارنامہ کی داد تعجب ہے کہ ''ہمدرد'' نے گورنمنٹ سے بھی حاصل کر لی، چنانچہ اُن کی نظر بندی کے بعد چیف کمشنر صوبہ نے اُردو پریس کے اوپر اس کی غیر ذمہ دارانہ روش پر سرکاری سالانہ رپورٹ میں جو نہایت زبردست اعتراضات کیے تھے۔ اُن سے ''ہمدرد'' کو مستثنیٰ کر دیا تھا اور اُس کے مضامین و مقالات کی تعریف و توصیف کی تھی۔

''**الفضل ماشهدت به الاعداء**'' کی یہ کتنی صحیح تصویر ہے؟

سنسر:

''ہمدرد'' پر جنگ کے بعد سنسر بٹھا لیا گیا اور بغیر اُس کی منظوری کے کوئی مضمون یا خبر شائع کرنا جرم کر دیا گیا تھا تو ایک دلچسپ لطیفہ پیش آیا جسے خود محمد علی نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ''ہمدرد کے سنسر نے تو ایک بار چڑیا چڑ ونٹے کی کہانی کو بھی خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی! ہے تو چڑیا چڑ ونٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی معلوم ہوتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے، نہ معلوم اِس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو اور جواب وہی ہمارے سر آ پڑے۔''

التواء:

آخر محمد علی کی نظر بندی کے بعد ''ہمدرد'' کی اشاعت بھی ملتوی کرنی پڑی اور گو سیّد جالب صاحب ''آف ہمدرد'' بہت کوششیں کیں مگر افسوس ہے کہ وہ کامیاب نہ ہو سکے اور اخبار کا چلانا اُن کے لیے ناممکن ہو گیا۔

درمیانی وقفہ:

''ہمدرد'' کی نشاۃِ اولیٰ اور نشاۃِ ثانیہ کے درمیانی وقفہ میں ہندوستان پر جو آفتیں آئیں، مسلمانوں پر جو مصائب ٹوٹے، عالم اسلامی پر برطانوی ہوسِ استعمار کے دندانِ آز جس جس طرح تیز ہوئے، خود ہندوستانی سیاسیات میں جو عظیم الشان مدو جزر آیا اور محمد علی کی ذات جن حالات کی آماج گاہ رہی، یہ عنوان اُس تفصیل کی نذر نہیں کیا جا سکتا۔ سر دست اُن تمام انقلابات وحوادث سے قطع نظر کر کے آپ ایک بار ''ہمدرد'' کے دفتر میں اپنی نظر جمائیے۔

نشاۃِ ثانیہ:

بے جاپور جیل سے رہائی کے بعد محمد علی نے ''کامریڈ'' کے ساتھ ''ہمدرد'' کی زمام ادارت پھر اپنے ہاتھ میں لی۔

عہدِ ثانی کو عہدِ اوّل سے عمدہ ہونا چاہیے تھا مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ محمد علی کے ذہن اور دماغ پر جو حملے ہوئے، اُنہوں نے اُن کی متاعِ اطمینان وسکون کو درہم برہم کر دیا اور وہ فروغِ خاطر کے ساتھ ''کامریڈ'' کی طرح ''ہمدرد'' کو بھی نہ چلا سکے۔ علاوہ ازیں اُن کی غیر معمولی مصروفیت جس میں کانگریس کی صدارت کے سبب اور اضافہ ہو گیا تھا، نیز عہدِ اوّل کے سے مخلص رفقاء اب ناپید تھے۔

لیکن پھر بھی ''ہمدرد'' نے اپنا معیار قائم رکھا اور وہ کبھی بھی اُن جرائد واخبارات کی صف میں نظر نہیں آیا جن کا مقصد صرف دریوزہ گری ہے اور جن کا دلچسپ مشغلہ خواہ مخواہ دوسروں کو چھیڑ چھیڑ کر ''گرمیٔ بازار'' کا ہنگامہ پیدا کرنا۔

وہ اپنی سنجیدہ، متین اور جاذبِ توجہ روش پر چلتا رہا اور اب چونکہ پبلک اور زیادہ بد مذاق بنائی جا چکی تھی، اس لیے وہ ''چاشنی'' ڈھونڈتی تھی اور ''چاشنی'' یہاں کہاں؟

''ہمدرد'' کی دوسری ناکامی کا سبب یہ ہوا کہ اب اُس کے نظریہ میں بھی فرق آ گیا تھا، یعنی پہلے وہ اصولِ صحافت پر عامل تھا اور پورے طور پر ایک ''اپ ٹو ڈیٹ'' بلند روزنامہ تھا۔ لیکن اب محمد علی نے اُسے صرف قوم کے مریضِ غم کا نسخہ بنا دیا جس میں پرہیز کی غیر دلچسپ ہدایتیں تھیں، تلخ وترش دواؤں کی فہرستیں تھیں اور ایک ہی طور پر مسلسل علاج کرنے کی کوشش تھی۔

اِس بنیادی تغیر کے باوجود اُس نے اپنی آن بان میں کوئی فرق نہیں کیا، نہ بے موقع طور پر اُس نے کسی کی خوشامد کر کے کسبِ زر کی کوشش کی اور نہ گالیاں دے کر، ڈرا دھمکا کے بعض اخبارات کی اصطلاح میں کچھ ''اینٹھا۔''

خواجہ حسن نظامی کی رائے:

چنانچہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے 24 نومبر 1926ء کے روز نامچہ میں ''ہمدرد'' کی بلند پائیگی کا اعتراف اِن الفاظ میں کیا تھا:

> ''مسلمانوں کے اور ہندوستان کے شہرۂ آفاق لیڈر مولانا محمد علی صاحب کی ایڈیٹری میں ''ہمدرد'' روزانہ شائع ہوتا ہے، اُس اخبار کی طرز عامیانہ نہیں ہے بلکہ انگریزی کے اعلیٰ اخباروں کی شان کے موافق نہایت باوقار اور مدلل رائے زنی اِس اخبار میں ہوتی ہے۔ اسلامی ممالک اور اسلامی حقوق اور ہندوستانی حقوق کی یکساں حمایت کرتا ہے۔''

مہاراجہ اِندور کا واقعہ:

ہندوستانی اخبارات بالخصوص اُردو اخبارات کا بالعموم یہ شیوۂ امتیاز رہا ہے کہ جہاں کسی بڑے آدمی پر کوئی آفت آئی اور اُنہوں نے اُس کے آستانہ کے دورے لگانا شروع کیے کہ اگر اِس ذریعہ کچھ مل گیا تو ''خدمات'' حاضر ہیں اور نہ ملا تو پھر ایڈیٹوریل کی شمشیر برہنہ موجود ہے۔

مہاراجہ نابھ، مہاراجہ اِندور، حضور نظام کی پائگاہوں کے واقعات، لکھنؤ میں ایک مشہور تاجر کا مقدمہ، علی گڑھ سے ڈاکٹر ضیاء الدین کی علیحدگی، کہاں تک شمار کرایئے؟ اِن سب واقعات میں مقامی اور غیر مقامی اخباری ''نمائندوں'' نے ماشاءاللہ بہت کافی مالی حالت مضبوط کر لی۔

مہاراجہ صاحب اِندور کا جب ممتاز بیگم والا مشہور واقعہ عالم وجود میں آیا، اُس وقت اگر ''ہمدرد'' چاہتا تو اپنا سارا قرضہ اِس آمدنی سے ادا کر سکتا تھا اس لیے کہ اُسے کسی سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس

کی رائے کا گورنمنٹ کے حلقہ اور قوم کے طبقہ میں جو اثر تھا، وہ ظاہر تھا۔ چنانچہ ''ہمدرد'' کے بعض ''ہمدردوں'' نے مہاراجہ صاحب تک اِس قسم کی تحریک کرنا چاہی کہ اُن پر جو آفت آ رہی تھی، اس کا مقابلہ بھی ہو سکے گا اور ''ہمدرد'' کو بھی فائدہ پہنچ جائے گا۔

محمد علی کو اِس کی خبر ہوئی تو کہتے ہیں:

''جوں ہی میں نے اِس کا ذکر سنا، میں نے اُن آدمیوں کو ڈھونڈ نکالا اور اُن سے حلف لیا کہ وہ اِس قسم کا کوئی ذکر نہ اوروں کی طرف سے نہ اپنی طرف سے کریں گے۔''

اَلور کی جوبلی:

دوسرا نہایت اہم واقعہ ''ہمدرد'' کی اصابت و استقامت کا یہ ہے:

مہاراجہ صاحب اَلور نے اپنی طرف سے ایک معقول رقم دے کر محمد علی کو انگلستان بھیجا تھا کہ وہ اپنی صحت کی طرف اِسی بہانہ سے متوجہ ہوں، کچھ آرام ملے اور کچھ علاج کریں تو کسی نہ کسی حد تک تو صحت درست ہو ہی جائے گی۔ محمد علی روانہ ہو گئے۔

''ہمدرد'' کی مالی حالت اُس وقت بہت خراب ہو رہی تھی اس لیے وہ اُسے بند کر دینا چاہتے تھے؛ لیکن اُن کے دو وفا شعار اور مخلص دوست آگے بڑھے اور اُنہوں نے ''ہمدرد'' کو بند نہیں ہونے دیا۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے ''ہمدرد'' کی ادارتی رہنمائیاں اپنے متعلق کر لیں اور مولانا ظفر الملک صاحب علوی مدیر ''الناظر'' نے انتظامی نقائص کو دُور کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ محمد جعفری صاحب مدیر ''ملت'' جو اِس سے پہلے سب ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے، ایڈیٹر کر دیئے گئے۔

ولایت سے واپسی پر بھی کچھ دِنوں یہی انتظام رہا محمد علی رنگون کی پیہم طلبیوں سے مجبور ہو کر رنگون گئے ہوئے تھے۔

عین اُسی زمانہ میں مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ کی روایت کے مطابق محمد علی کی عدم موجودگی میں اِس کی تحریک کی گئی کہ اَلور کی جوبلی پر ''ہمدرد'' اپنا ایک ''اسپیشل نمبر'' نکالے اور جملہ مصارف مع شئے

زائد، ریاست کے ذمہ۔

جعفری صاحب نے اتنے اہم معاملہ میں تنہا اپنی ذمہ داری پر کوئی کارروائی مناسب نہ سمجھی۔ محمد علی رنگون میں تھے لہٰذا اُنہوں نے دریاباد کا رُخ کیا اور مولانا عبدالماجد صاحب سے استفسار و استصواب کیا، مولانا نے بھی ذاتی طور پر کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اُنہوں نے اُسی وقت رنگون ایک تار دیا جو خاصا مفصل تھا، اس لیے کہ وقت کم رہ گیا تھا۔ محمد علی نے مہاراجہ صاحب اَلور کی تمام عنایتوں اور زرپاشیوں کے باوجود صاف انکار کر دیا اور لکھ دیا:

''کہہ دیا جائے کہ ہمدرد کا اِس طرح کا اسپیشل نمبر آج تک نہیں نکلا، اس لیے معذوری ہے۔ ہاں ہمدرد پریس میں اگر ضرورت ہو تو ایک پمفلٹ چھپ سکتا ہے۔''

اشتہارات:

اِن ذرائع کے علاوہ اگر صرف کسبِ زر مقصود ہوتا تو ''ہمدرد'' میں ایسے اشتہارات شائع ہو سکتے تھے جن کی اشاعت سے پڑھنے والوں کا نہیں تو چھاپنے والوں کا ''بھلا'' ہو سکتا تھا، لیکن ''ہمدرد'' نے اِس مذاقِ عام کی بھی کبھی پیروی نہیں کی۔ وہ اصول پر مر گیا لیکن اپنی خاطر اُس نے اصول کا ''قتل'' گوارا نہیں کیا۔

❀❀❀

باب ۸

ہنگامہ کانپور

کانپور کی مسجد اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ کم از کم اُس کے نام سے ہر شخص واقف ہے، خواہ اصل واقعہ کا صحیح طور پر کسی کو علم ہو یا نہ ہو۔ یہی وہ واقعہ ہے جب مسلمانوں نے ظلم و جبر کے مقابلہ میں نہایت استقامت، استقلال اور بہادری کا ثبوت دیا تھا اور ہنسی خوشی اپنی جانیں محض اللہ اور اُس کے گھر کی حرمت کی خاطر نثار کر دی تھیں۔

اصل واقعہ:

اصل واقعہ یہ ہے کہ 1913ء میں کانپور کی میونسپلٹی کی طرف سے ایک سڑک تعمیر ہو رہی تھی۔ ایک مسجد ''سنگِ راہ'' بنی ہوئی تھی اور اُس کی وجہ سے اِس مجوزہ ''صراطِ مستقیم'' میں کجی پیدا ہو رہی تھی۔

مسجد کے متولیوں نے غایت درجہ دریا دلی اور رواداری کے ساتھ میونسپلٹی کو اِس کی اجازت دے دی کہ راستہ میں مسجد کے غسل خانہ اور پاخانہ کے جو سنگِ گراں حائل ہیں، اُنہیں ہٹا دیا جائے۔

میونسپلٹی کو موقعہ مل گیا اور اُس نے اسے منہدم کرانے کے انتظامات شروع کر دیئے۔

عامۃ المسلمین، جمہورِ علماء اور ہندوستان کے تقریباً تمام بزرگوں نے اِس کے خلاف اظہارِ رائے کیا اور متولیوں کی اس غلط فہمی کو رفع کرانا چاہا کہ وہ اپنی کسی جائیداد کے متعلق تو اتنا فیاضانہ اعلان کر سکتے تھے، لیکن مسجد کے معاملہ میں نہیں۔

یہ تمام ہنگامہ اور شور و غل بیکار ثابت ہوا اور مسجد کا وہ حصہ آخر کار منہدم کر دیا گیا۔ اُس کے انہدام نے مسلمانوں نے قلوب پاش پاش کر دیئے، کانپور میں بالخصوص اور سارے ہندوستان میں بالعموم ایک

آگ لگ گئی۔ ہندوستان بھر میں جلسے ہوئے، تجویزیں پاس ہوئیں، گورنمنٹ کے اس فعل پر اظہارِ نفرت کیا گیا لیکن کانپور جہاں یہ ہنگامۂ ہائلہ ہوا تھا، وہاں کے مسلمانوں نے سر سے کفن لپیٹ کر مسجد کا رخ کیا اور منہدم شدہ حصۂ مسجد کو پھر درست کرنے لگے۔ پولیس آئی، اُس نے اُن لوگوں کو واپس کرنا چاہا مگر ناکام ہوئی۔ فوج آئی، اُس نے اُن مجاہدین راہِ حق وصداقت کو مرعوب کرنا چاہا مگر بے سود۔ ہوائی فائر ہوئے مگر لاحاصل اور اس کے بعد پھر فوج کی گولیاں چلیں، کارتوس ختم ہوئے اور لوگ دھڑا دھڑ گرنا شروع ہوئے۔ گولیاں سینوں پر پڑی تھیں اور لوگ شہید ہو ہو کر زخمی ہو ہو کر، نیم جان ہو ہو کر گر رہے تھے اور یہ سب کچھ دِن کی روشنی میں، عدل پرور ونصفت شعار حکومت کے ایماء سے ہو رہا تھا بلکہ حکم سے ہو رہا تھا۔

اِس واقعہ فاجعہ نے مسلمانوں کے غم وغصہ اور اضافہ کر دیا اور احتجاج نے بہت نازک صورت اختیار کر لی، مگر حکومت صوبہ جاتِ متحدہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ سر جیمز مسٹن نے اسے اپنے وقار کے خلاف سمجھا کہ وہ اس ''ایجی ٹیشن'' سے متاثر ہو جائیں۔

محمد علی کی کوششیں:

اِس سلسلہ میں مولانا آزاد سبحانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مرحوم مولانا مظہر الحق، مہاراجہ محمود آباد نے بھی جو گرانقدر خدمتیں انجام دیں، وہ فراموش نہیں ہو سکتیں۔

ان مقامی اور محدود کوششوں کے علاوہ محمد علی نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پہلے تو انہوں نے سر جیمز مسٹن صاحب گورنر صوبہ متحدہ سے نجی طور پر خط کتابت کی، اس لیے کہ اُنہیں امید تھی کہ ان کے ذاتی تعلقات جو سر جیمز مسٹن سے چلے آرہے تھے، وہ کام آئیں گے اور مسئلہ کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔ مگر اُن کے سر میں وہ نشہ نہیں تھا جو اِس ''ترشی'' سے اُتر سکتا۔

مسٹر میکڈانلڈ کو تار:

نتیجہ یہ ہوا کہ جب محمد علی مایوس ہو گئے تو اُنہوں نے غالباً ستمبر 1913ء میں بمبئی جا کر مسٹر

میکڈانلڈ کو ایک تار دیا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ اِس معاملہ کو سمجھیں اور پارلیمنٹ میں اُس کے متعلق سوال کریں۔ مگر مسٹر میکڈانلڈ نے بھی اُس تار کا کوئی جواب نہیں دیا اور جب ملاقات ہوئی تو ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کیا۔

انگلستان بہ ہمراہی وزیر حسن:

جب یہ صورت بھی بے اثر رہی تو محمد علی نے ایک اور تجویز پر عمل کیا یعنی مسٹر (اب سر اور چیف جسٹس) وزیر حسن سیکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ کو اکتوبر 1913ء میں اپنے ہمراہ لیا اور انگلستان پہنچ گئے۔ یہ روانگی بہت دلچسپ رہی، جب تک جہاز میں سوار نہ ہو لیے، کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ مبادا مسٹن صاحب کی حکومت اِس منصوبہ کو درہم برہم کر دے۔ بہر حال وہاں اِس مسئلہ کے متعلق اُنہوں نے بہت کافی پروپیگنڈا کیا۔ مضامین لکھے، تقریریں کیں۔ اربابِ حکومت، ممبرانِ پارلیمنٹ اور ارکانِ کابینہ سے ملاقات کی اور ہر طرح سے اُنہیں اِس مسئلہ کی نزاکت جتلائی اور عواقب و نتائج سے باخبر کیا۔

کامیابی:

آخر اُن کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور سر جیمز لاٹوش سابق گورنر صوبہ متحدہ (رکن مجلس وزیر ہند) محمد علی کے دلائل سے کافی متاثر ہوئے اور اِس طرح لندن سے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کو ہدایت بھجوائی گئی اور اُنہوں نے بطور خود اِس معاملہ کا تصفیہ اِس طرح کیا کہ کانپور پہنچے، ہسپتال میں زخمیوں کا معائنہ کیا، جیل میں قیدیوں کو محبت اور پیار کی نظر سے دیکھا، انہیں اپنا ''بیٹا'' سمجھا اور سب کو رہا کر دیا اور مسجد کی تعمیر کی اجازت مرحمت فرمائی۔

محمد علی کی واپسی:

اِس نمایاں کامیابی کے بعد آخر دسمبر 1913ء میں محمد علی ہندوستان واپس آئے اور اُن کا نہایت پر خلوص اور شاندار استقبال کیا گیا اور اُن کی جاں فشانی اور کارکردگی کا نہایت خلوصِ قلب سے اعتراف کیا گیا۔ اُن کی رہنمائی کا ایک اہم زینہ یہ بھی تھا۔

باب ۹

''چوائس آف دی ٹرکس''

1914ء میں جب جنگِ عظیم شروع ہوئی ہے، اُس وقت ''لندن ٹائمز'' نے ایک اشتعال انگیز مضمون اپنے اخبار میں شائع کیا تھا اور ترکوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ صرف دُور سے تماشا دیکھیں، اِس جنگ میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیے، یہاں تک کہ یونان پر بھی اُن کی پیش قدمی نہ ہو۔

مضمون حد درجہ اشتعال انگیز اور دِل شکن پیرایہ میں لکھا گیا تھا جس سے ترکوں کی سخت توہین اور حقارت مقصود تھی۔ اگرچہ اُس زمانہ میں بیگم محمد علی سخت علیل تھیں اور اِسی فکر و پریشانی میں محمد علی کو رات رات بھر جاگتے گزرتی تھی مگر وہ اپنے اِس جوش کو قابو میں نہ رکھ سکے جو اُس مضمون کے دیکھتے ہی اُن میں پیدا ہوا تھا۔

محمد علی کا بیان:

چنانچہ اُس مضمون کے متعلق خود محمد علی کا بیان ہے:

''میں نے یہ مضمون چالیس گھنٹے کی لگا تار محنتِ شاقہ برداشت کر کے لکھا اور اِس تمام عرصہ میں ایک منٹ بھی نہ سویا اور جب خود لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا تو اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کو خود بولتا جاتا تھا اور اُن سے لکھواتا تھا، اور اِس چالیس گھنٹے میں نہ صرف سونے سے محروم رہا بلکہ خوراک بھی قہوہ کی چند پیالیوں سے بہ مشکل ہی آگے بڑھی۔''

ضمانت کی ضبطی:

یہ مضمون گورنمنٹ کے حلقوں میں اس قدر ناپسندیدگی سے دیکھا گیا کہ چند ہی روز میں اِس کا نتیجہ بھی نکل آیا یعنی ''ہمدرد'' و ''کامریڈ'' کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔

پیروی:

لیکن محمد علی خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے۔ اُنہوں نے اِس حکم کی آسانی کے ساتھ تعمیل نہیں کی، بلکہ اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی اور لطف یہ کہ اِس مقدمہ کی خود پیروی کی، خود جرح کی اور خود اِس حکم کے پرزے بارگاہِ عدالت میں اُڑائے۔

تفصیل:

میر محفوظ علی صاحب کے الفاظ میں اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

''کامریڈ کی ضبطی ضمانت کے سلسلہ میں محمد علی نے عدالت میں خود بحث کی اور دورانِ بحث میں وکیلوں اور بیرسٹروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے، اور ہر شخص دم بخود تقریر سن رہا تھا۔ باہر نکلے تو ہر ہندو مسلمان وکیل بیرسٹر کے منہ سے بیک زبان یہی جملہ نکلا، ''مسٹر محمد علی! کاش، آپ بیرسٹر ہوتے۔''

محمد علی نے جواب دیا، ''اب بھی جو کچھ ہوں، اُس کی کون سی قدر ہو رہی ہے جو بیرسٹری میں ہوتی؟''

اِس طرح بالآخر ضمانت ضبط کر لی گئی اور ''کامریڈ'' موت کے آغوش میں چلا گیا۔

❀❀❀

باب ۱۰

نظر بندی

جنگِ عظیم اپنے ساتھ عالم اسلامی اور اسلامی ہند بلکہ سارے ہندوستان کے لیے بڑی بڑی برکتیں لائی تھی۔

ڈاکٹر انصاری اور اجمل خاں کا مشورہ:

ضبطی ضمانت کے بعد محمد علی نے پھر ذیابیطس کی شکایت محسوس کی اور ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری اور حکیم اجمل خاں نے آپ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ نے فوراً سارے دماغی کام نہ چھوڑ دیئے تو آپ کی زندگی کو خطرہ ہے۔ اِس مشورہ کے بعد محمد علی رامپور گئے کہ وہاں تبادلۂ آب وہوا کا خیال بھی تھا اور وطن کی کشش بھی۔

رام پور میں نظر بندی:

دہلی کے ایک رفیق کار کا بیان ہے:

''رامپور پہنچے ہی تھے کہ ڈائریکٹر جنرل پولیس صوبۂ متحدہ، نواب صاحب رامپور کے پاس آئے اور نواب صاحب کی معرفت آپ طلب کیے گئے۔ وہاں آپ سے کانپور کے قضیہ کے متعلق سوالات کیے گئے اور اِس دوران سخت گفتگو ہوگئی۔

ڈائریکٹر جنرل کے جانے کے بعد آپ کو یہ بتایا گیا کہ آپ نواب صاحب کی بغیر اجازت رامپور سے نہیں جاسکتے، گویا دوسرے معنوں میں آپ نظر بند کیے گئے۔ غالبًا

14 گھنٹے کی پر لطف نظر بندی کے بعد آپ رہا ہوئے۔ اس کے بعد آپ نینی تال کی گھاٹیوں میں شکار کھیلنے گئے تو واپسی پر سخت بخار میں مبتلا ہوئے، اِس عرصہ میں ڈاکٹر انصاری نے نینی تال میں موسم گرما بسر کرنے کے لیے مکان وغیرہ کا بندوبست کیا۔ آپ کی علالت کی خبر سن کر مولانا شوکت علی دہلی سے رامپور گئے اور دونوں بھائیوں کا ارادہ حسبِ دستور حضرت معین الدین چشتی کے سالانہ عرس پر اجمیر شریف جانے اور وہاں سے نینی تال جا کر موسم گرما گزارنے کا تھا۔ اجمیر شریف جاتے ہوئے ایک ہفتہ کے لیے دہلی ٹھہرے، دہلی تشریف لائے ہوئے آپ کو دو ہی روز گزرے تھے کہ دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا جابرانہ حکم 17 مئی کو قانونِ تحفظِ ہند کی رو سے آپ کو دیا گیا کہ آپ مع اپنے برادر محترم کے اپنے تئیں نظر بند سمجھیں۔ اِس حکم کی رو سے آپ پر وہ تمام پابندیاں عائد کی گئیں جو جرائم پیشہ پر بھی عائد نہیں کی جاتیں، آپ نے اِس حکم کو پڑھتے ہی خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ یہ ایک پیغمبرانہ سنت ہے جس کی ادائیگی کے لیے خدائے حکیم نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے منتخب کیا۔"

قاضی عبدالغفار کا بیان:

اِس حکم کو سن کر محمد علی پر کیا تاثرات غالب ہوئے اور اُن کے چہرہ بشرہ سے کیا ظاہر ہوتا تھا، اسے قاضی عبدالغفار صاحب کی سطورِ ذیل سے معلوم کیجیے۔ وہ لکھتے ہیں:

"خوش وقتی کا یہ عالم تھا کہ جس وقت نظر بندی کا حکم آیا ہے میں دفتر میں نہ تھا، لیکن بلایا گیا اور جب محمد علی صاحب کے کمرہ کے پاس پہنچا تو میں نے ایک شور مبارک کباد سنا اور یہ خیال ہوا کہ شاید کوئی بہت اچھی خبر کہیں سے آئی ہے۔ لیکن دیکھتا ہوں تو کمرہ کے وسط میں میز پر احکام نظر بندی کھلے رکھے ہیں اور ایک غلغلہ تہنیت برپا ہے جس میں دونوں بھائیوں کی آواز جو ایک دوسرے کو ہنس ہنس کر مبارکباد دے رہے تھے، سب سے زیادہ بلند ہے۔"

مہرولی کی روانگی:

بہر حال اِن احکام نادری کے بعد محمد علی نے حسب الحکم مہرولی جانے کا ارادہ کیا۔ 5 مئی کو جمعہ کے روز علی برادران جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے گئے تھے، اہالیانِ دہلی کو اِس خبر کی اطلاع مل گئی تھی اس لیے ایک خلقت کی خلقت اِن دونوں بھائیوں کی زیارت کو آئی تھی۔

عبدالغفار صاحب کا مشاہدہ:

قاضی عبدالغفار صاحب اُس روز کا اپنا مشاہدہ یوں بیان فرماتے ہیں:

''وہ آخری جمعہ مجھے یاد ہے جب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر یہ دونوں اہل دہلی سے رخصت ہو رہے تھے اور دِل کی کیفیات سے بے قابو ہو کر رونے والوں کو تلقین صبر و استقامت کر رہے تھے۔ مسجدِ شاہجہانی کی سیڑھیوں پر یہ دو انسان پتھر کے دو مینار تھے جن پر زمانہ کی طوفان انگیزیاں بے اثر تھیں۔''

مہرولی کی پابندیاں:

مہرولی کے ایام نظر بندی میں محمد علی کو کچھ آسانیاں بھی حاصل تھیں یعنی وہ مشغلۂ تحریر جاری رکھ سکتے تھے اور اِس صورت میں اُنہیں بہت زیادہ دقت بھی نہیں تھی۔ راجہ غلام حسین ''کامریڈ'' کے لیے اور قاضی عبدالغفار و سیّد جالب ''ہمدرد'' کے لیے کافی تھے۔

یہاں پہنچ کر محمد علی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے اپنا ''گناہ'' دریافت کیا جس کا یہ مختصر ''سرکاری'' جواب دیا گیا:

''صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایسے سوالات کا جواب دینا پسند نہیں کرتے۔''

زائرین کا ہجوم:

محمد علی مہرولی میں نظر بند تھے لیکن شکر ہے کہ اہالیانِ دہلی کو دہلی میں نظر بند نہیں کر دیا گیا تھا، اس لیے دہلی والوں کو یہ آسانی حاصل تھی کہ وہ مہرولی آ کر محمد علی سے مل سکیں۔ اگر چہ وہ خود مہرولی سے باہر نہیں

جاسکتے تھے!

گورنمنٹ کو شاید اُن کی یہ حرکت بری معلوم ہوئی، اس لیے اُس نے اُن خطرناک لوگوں کو مہرولی سے ہٹا دیا اور لینڈ ون بھیج دیا۔

مہرولی سے لینڈ ون:

لینڈ ون پہنچ کر مہرولی کی سی نیم ''آزادی'' بھی سلب کر لی گئی اور اُن کے قلم پر سنسر شپ قائم کر دی گئی۔ پہلے اگر ''ہمدرد'' میں مضامین لکھ سکتے تو اب اُس سے بھی محروم ہو گئے۔ ''ہمدرد'' بھلا اِس نعمتِ عظمیٰ سے کیوں محروم رہتا، اُسے بھی سنسر کے فیض گراں مایہ سے مفتخر ہونے کا موقعہ عطا فرمایا گیا۔ اِس سلسلہ میں چڑیا چڑونٹے کی کہانی کے حالات ''ہمدرد'' کے سلسلہ میں بیان ہو چکے ہیں۔

لینڈ ون پہنچ کر محمد علی نے اپنے پرانے دوست اور جدید دشمن سر جیمز مسٹن گورنر صوبہ متحدہ سے اپنی نظر بندی کے اسباب دریافت کیے، مگر یہاں سے بھی وہی جواب ملا کہ گورنر صاحب (شاید اپنی کثیر مصروفیتوں کے سبب) اپنے احکام پر مزید گفت وشنید نہیں کر سکتے۔

جرم کیا تھا؟

علی برادران کی نظر بندی کے بعد ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوا کہ آخر اُن لوگوں کا جرم کیا ہے جس کی بناء پر قیدِ بے میعاد بھگتنے پر اُنہیں مجبور کیا جا رہا تھا؟

عجیب سوئے اتفاق کہ یہ سوال ہمیشہ ایسے وقت گورنمنٹ سے کیا گیا جب وہ بالکل خالی الذہن ہوتی تھی اور جواب دینے پر اپنے تئیں کسی طرح آمادہ نہیں پاتی تھی، اور اگر کونسل کے ''آنریبل ممبر'' اِس پر بھی اپنے سوال کے جواب پر مصر ہوتے تھے تو کبھی کچھ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا اور کبھی کوئی دوسری بات بتائی جاتی تھی۔

آنریبل رضا علی کا سوال:

آنریبل رضا علی نے جب سوال کیا تو جواب یہ دیا گیا کہ نظر بندی کا حکم دفعہ 3 قانونِ تحفظ ہند

کے ماتحت دیا گیا ہے اور پھر 1916ء میں جب دہلی کی انتظامی رپورٹ شائع ہوئی تو علی برادران کے متعلق یہ لکھا گیا:

''اِس ماہ میں محمد علی، شوکت علی کو نظر بند کرنا ضروری معلوم ہوا اس لیے کہ گورنمنٹ کے خلاف اُن کی سخت و تلخ کارروائیاں مسلمانوں کی ایک جماعت پر برا اثر ڈال رہی تھیں۔''

مسٹر مظہر الحق اور مسٹر جناح کے سوالات:

پھر امپیریل کونسل میں جب مسٹر مظہر الحق اور مسٹر جناح نے ضمناً علی برادران کے متعلق سوال کیا تو بتلایا گیا کہ چونکہ کھلم کھلا اُنہوں نے گورنمنٹ کے خلاف حصہ لیا، اس لیے وہ نظر بند کر دیئے گئے اور اگر وہ آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کریں تو گورنمنٹ اُن کی رہائی کے مسئلہ پر غور کر سکتی ہے اور بعد کو جب 1917ء کے ایجی ٹیشن میں مسز بیسنٹ وغیرہ رہا کی گئیں تو پھر علی برادران کی رہائی کا مسئلہ پیدا ہوا، مگر اب اُن کے جرم کی نوعیت بدل چکی تھی۔ خیر اِس کا ذکر آگے آئے گا۔

لینڈون سے چھنڈواڑہ:

اِن حضرات کو جب مہرولی سے لینڈون بھیجا گیا تھا تو خیال تھا کہ اب یہاں کچھ روز نظر بندی ہی کی حالت میں سہی، مگر اُنہیں موقع ملے گا کہ نسبتاً آرام وسکون کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ مگر گورنمنٹ تو اُن سے کھیل کر رہی تھی، یہ زندگی بھی اُسے نہیں پسند آئی اور اس نے اُنہیں چھنڈواڑہ جیسے دُور دراز مقام پر منتقل کر دیا۔

مکتوب بنام عبدالغفار:

چھنڈواڑہ پہنچنے کے حالات ہم محمد علی کے اُس مکتوب سے لیتے ہیں جو اُنہوں نے اپنے اسسٹنٹ قاضی عبدالغفار صاحب کو لکھا تھا:

''راستے کی مختصر سی سرگزشت سناتا ہوں، شرائط یہاں بھی بجنسہٖ وہی ہیں جو لینڈون جاتے وقت موصول ہوئے تھے۔ راستے کی کیفیت سنو، پہلے اطلاع شروع نومبر میں

ملی تھی کہ تیار رہو، لیکن یکا یک 13 نومبر کو اطلاع ملی کہ 20 نومبر کو چھنڈواڑہ جانا ہو گا۔ اِس اطلاع کے ملنے پر ہم نے چند کارڈ دوستوں کو ڈال دیئے کہ فلاں راہ سے فلاں وقت گزریں گے۔ سنسر نے بلا استثنا سب کو بھیج دیا اس لیے کہ اِس میں بظاہر کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ الہٰ آباد میں گاڑی سات گھنٹے بعد ملتی تھی اس لیے بھائی ظہور احمد (مسٹر ظہور احمد بیرسٹر) کو لکھ دیا کہ کھانا تمہارے ساتھ کھائیں گے۔ والدہ، بیوی اور بچوں کے لئے ایک گاڑی کا انتظام کر دینا کہ الہٰ آباد دیکھ لیں۔ چنتا منی کو لکھ دیا کہ تم سے، سپرو سے اور پنڈت (موتی لال) جی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ چلنے سے ایک دن پہلے اطلاع ملی کہ جو سب انسپکٹر ہمراہ جائے گا، اُسے ہدایت ملی ہے کہ ہماری پارٹی کا کوئی متنفس کسی اسٹیشن کے باہر نہ جائے گا، گو ہمارے نام جو حکم آیا تھا اس میں یہ شرط نہ تھی۔ ہم نے صاف کہہ دیا کہ گورنمنٹ نے ہم کو نظر بند کیا ہے مگر ہمارے متعلقین آزاد ہیں، ہم نے ارادہ کر لیا کہ خود الہٰ آباد اسٹیشن پر رہیں گے، باہر نہ جائیں گے۔

ہم 20 کو 10 بجے صبح کو روانہ ہو کر سہ پہر کو کوٹ دوار پہنچے۔ 6 بجے شام کو ریل چلی، 7 بجے نجیب آباد پہنچے، 2 بجے صبح مراد آباد، 6 بجے روانہ ہوئے، 4 کے قریب پہنچے۔ وہاں آنریبل سیّد رضا علی یعقوب (سر یعقوب) مسعود، عبدالسلام وغیرہ تمام احباب ملنے آئے۔ رامپور سے میری اہلیہ مع حمیدہ اور گلنار اور زاہد کے آ گئے تھے، وہ شریکِ سفر ہوئے، ان کے علاوہ رامپور سے بہت عزیز اور دوست آ گئے تھے۔ من و سلویٰ کوٹ دوار ہی پر آنا شروع ہو گیا تھا، مراد آباد پر اور نازل ہوا۔ بریلی پر علی گڑھ کے احباب سے رخصت ہوئے۔ انصاری (ڈاکٹر انصاری) رامپور سے مراد آباد آ گئے تھے، ڈاکٹر عبدالرحمٰن (بھی) آ گئے تھے۔ بریلی میں بھائی داؤد وغیرہ چائے لے کر آئے تھے۔

لکھنؤ پہنچے تو گاڑی خلافِ معمول پل کے اس طرف پلیٹ فارم پر رُکی، مگر اُس کے رُک جانے کے بعد بہت سے احباب مع تقدس مآب مولانا عبدالباری صاحب قبلہ و مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی تشریف لائے، قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ کانپور سے، علی گڑھ سے، بارہ بنکی سے احباب آئے تھے۔ راستے کے لیے کھانا، میوہ اور مٹھائیاں اِس کثرت سے آئیں کہ دونوں درجے لبالب بھر گئے اور بیٹھنے کو جگہ نہ رہی۔ بلا مبالغہ تین چار سو آدمیوں کے لیے کھانے کا سامان کافی تھا، مولانا عبدالباری صاحب قبلہ مع متعدد احباب کے رائے بریلی تک تشریف لائے۔ ان بزرگوں کی تحسین ہر لحہ ہم کو شرمسار کرتی تھی۔ ناظر (اب ناظر یار جنگ)، وسیم (مسٹر وسیم بیرسٹر)، ولایت (ولایت علی بمبوق) کو ہم الٰہ آباد تک لے گئے کہ 7 گھنٹے وہاں بھی خوب گزریں گے۔

اتفاقاً راستہ میں ڈاکٹر سپرو سے ملاقات ہوگئی کیونکہ وہ ہم سفر تھے، اس طرح الٰہ آباد کی ''قدم بندی'' کا بھی صدمہ نہ ہوا، لکھنؤ کے سیّد ظہور احمد صاحب بھی ملے۔

الٰہ آباد کے اسٹیشن پر قدغن:

آگے چل کر معلوم ہوا کہ الٰہ آباد سے اسٹیشن پر جاتے ہوئے پرندوں کے پر جلتے ہیں، پلیٹ فارم ٹکٹ بند اور اسٹیشن خالی ہے اور غالباً ہم کو 7 گھنٹے سے قبل ہی وہاں سے کہیں اور لے جائیں۔ یہ بھی سنا کہ پولیس کے سو، سوا سو آدمی پہرہ دے رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ الٰہ آباد کے لوگوں نے اسٹیشن پر ہمیں گارڈن پارٹی دینے کی اجازت چاہی تھی مگر اجازت نہ ملی۔ مجبور ہو کر ظہور کچھ میوہ اور کھانا اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کو دے آئے کہ اسے دیکھ بھال لو، اگر کوئی چیز خلافِ قانون دستیاب نہ ہو تو اِن نظربندوں کو دے دینا۔ الٰہ آباد کے اسٹیشن کو سوائے پولیس کے خالی پایا۔ دو افسر طبقۂ یورپین سے موجود تھے، دونوں شوکت کے شناسائی اور ایک تو دوست نکلے۔

پولیس افسر کی ناروا حرکت:

تھوڑی دیر کے بعد ایک ذاتِ شریف نہایت کرّ وفر کے ساتھ تشریف لائے اور پہلے اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ اِن لوگوں کو اسٹیشن سے نکال دو۔ یہ لوگ ڈاکٹر ناظر الدین حسن، مسٹر محمد وسیم، مسٹر ظہور احمد بیرسٹران'' اور سیّد ظہور احمد صاحب بی۔اے۔وکیل تھے، میں اُن کی سلامت روی اور متانت کی تعریف کروں گا کہ باوجود سخت غصے اور مایوسی کے وہ خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔ چلنے سے پیشتر والدہ نے اُنہیں گلے لگایا اور کہا کہ بیٹا اِن باتوں سے آزردہ خاطر نہ ہونا، اِس کے بعد وہ ذاتِ شریف ہماری طرف تشریف لائے اور کہا کہ آپ اپنی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ شوکت نے کہا، اس کی آخر کوئی وجہ؟ کہا، میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ایسا ہی کریں، ہم نے جواب دیا کہ ہم وہیں تک پابند ہیں جہاں تک گورنمنٹ کے احکام موصول ہو چکے ہیں، ورنہ ہم بالکل آزاد ہیں، ہمیں یہاں سات گھنٹے قیام کرنا ہے۔ اِس پر صاحبِ موصوف بولے کہ نہیں آپ کو ساڑھے پانچ بجے کی ایک گاڑی سے ستنہ جانا پڑے گا اور وہاں چند گھنٹے تک کی گاڑی کا انتظار کرنا پڑے گا جو یہاں سے جبل پور تھرو جاتی ہے۔

کشمکش:

ہم نے کہا کہ ہمارے احکام میں یہ داخل نہیں ہے، ہمیں احکام ملے ہیں کہ تین بجے کی گاڑی میں الٰہ آباد پہنچیں اور شب کو دس کے تھرو میں جبل پور جائیں، اس پر وہ بولے کہ نہیں گورنمنٹ نے احکام بدل دیئے ہیں، آپ کو ابھی جانا ہوگا۔ ہم نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی احکام اِس قسم کے موصول نہیں ہوئے ہیں، جو حکم ہم کو ملا ہے اگر ہم اِس کی خلاف ورزی کریں گے تو ہم تین برس کی قیدِ بامشقت اور ایک ایک ہزار روپیہ کے جرمانہ کے مرتکب ہوں گے۔ اس پر فرمایا کہ میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہی

احکام گورنمنٹ کے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضورِ والا کی شناسائی کا بھی ہم کو شرف حاصل نہیں ہے، پھر ہم تحریری اور مہر حکومت سے مزین احکام کے عوض محض آنجناب کی زبانی ہدایت کو کیوں قبول کرلیں؟ فرمایا، اسٹیشن کا چارج میرے پاس ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں آپ سے مل کر محفوظ ہوا مگر اس شرفِ نیاز مندی کے حصول کے بعد بھی ہم سرکاری احکام پر آپ کے ارشادات کو ترجیح نہیں دے سکتے۔

جھڑپ:

اِس پر تیکھے پن سے فرمایا کہ کیوں بدمزگی پیدا کرتے ہو؟ میں نے تم سے نہایت نرمی سے کہہ دیا کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ، میں نے جواب دیا کہ اس میں بدمزگی کا سوال کچھ بھی نہیں ہے اور میں نے اس قدر نرمی سے کہہ دیا کہ ہم گورنمنٹ کے احکام کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ اِس پر نہایت تند و ترش ہو کر فرمایا کہ کیوں اس راگ کو الاپے جاتے ہو؟ اِس پر شوکت نے آنکھیں دِکھا کر کہہ دیا کہ بس اِس لہجے میں گفتگو نہ کیجیے، اِس پر ذرا ہوش میں آئے اور پھر کہا کہ بدمزگی کیوں پیدا کرتے ہو، میں تو نہایت نرمی سے کہتا ہوں کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ شوکت نے کہا کہ آپ کی درخواست معقول نہیں ہے، میں بھی آپ سے نرمی سے کہتا ہوں کہ ہم سے تعرض نہ کیجیے اور یہاں سے چلے جائیے۔ اِس پر حاکمانہ انداز سے فرمایا کہ تم مجھے مجبور کرتے ہو کہ میں اپنے احکام کی تعمیل بہ جبر کراؤں۔ شوکت نے کہا، شوق سے آپ ضرور کوشش کریں مگر ساڑھے تین من کی لاش اور سوا چھ فٹ کے قد اور ڈیڑھ گز کے سینہ والے سے جبریہ تعمیل احکام کرانا آسان نہیں، بولے کہ میں سمجھتا تھا کہ آپ جنٹلمین ہیں، اس پر میں نے عرض کی کہ ہم سمجھتے تھے کہ آپ بھی ''جنٹلمین'' ہیں مگر... اِس ''مگر'' کے اضافہ نے آپ بزرگوار کو چکرا دیا، پھر کہنے لگے کہ اب میں جبریہ تعمیل کراؤں گا، شوکت نے کہا کہ ہم تو کہہ ہی رہے ہیں کہ شوق سے کوشش فرمائیے۔

دوسرے افسر پولیس کا دخل:

اِس قدر گفتگو کے بعد دوسرا پولیس انسپکٹر آیا اور اُس نے کہا کہ اِس مسئلہ کو آپ ہمیں پر چھوڑ دیجیے، اس موقع کو غنیمت سمجھ کر (وہ حضرت) جدھر سے تشریف لائے تھے واپس تشریف لے، ہم سے پولیس انسپکٹر نے کہا کہ کچھ مضائقہ ہے اگر آپ انہیں کا کہا مانیں، یہ بھی شوکت کا شناسائی تھا۔ شوکت نے جو جواب پہلے دیا تھا، وہی اس کو بھی دیا کہ یہ معاملہ جج کے تعلقات کا نہیں، سرکاری احکام کا ہے۔ اس کے بعد ہم ویٹنگ روم گئے اور وضو کر کے ظہر اور بعد ازاں عصر پڑھی، نماز سے فارغ ہوئے تو اطلاع ملی کہ شوکت کے پرانے دوست اور میرے بھی گہرے شناسا مسٹر فریمنٹل کلکٹر الٰہ آباد ملنا چاہتے ہیں۔ ہم گئے تو ہم سے کہا، یہ کیا جھگڑا ہے؟ شوکت نے تمام کیفیت سنائی، اِس پر کہا کہ مجھے دو تین دِن سے معلوم تھا کہ تمہارے سفر کا پروگرام بدلا جائے گا۔ میں چلتے وقت برن، چیف سیکریٹری سے پوچھ آیا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کو ساڑھے پانچ ہی بجے چلنا ہوگا۔ شوکت نے کہا، قاعدہ کی رو سے چیف سیکریٹری کا حکم ملنا چاہیے لیکن چونکہ میں تم سے واقف ہوں، تاہم اسے تحریر کرو تاکہ "سند ہو اور وقتِ ضرورت کام آئے"۔ حکم پانے پر ہم نے والدہ اور بچوں کو اطلاع کرادی کہ گاڑی ابھی جائے گی۔

روانگی:

(روانہ ہوکر) رات کو بارہ بجے ہم ستنہ پہنچے، گاڑی وہیں تک جاتی تھی۔ دس بجے والی گاڑی الٰہ آباد سے آئی تو ہم پھر روانہ ہوئے اور صبح کو جبل پور پہنچے اور شب کو یہاں (چھنڈواڑہ) پہنچے۔"

❁❁❁

باب ۱۱

چھنڈواڑہ کے ایام اسیری

چھندواڑہ کی نظر بندی کے بعد علی برادران صبر و شکر کے ساتھ چھندواڑہ ہی میں رہتے تھے اور وہاں رہ کر ملک وقوم کی جو خدمت کر سکتے تھے، اُس میں منہمک رہے۔

تعمیر مسجد:

اپنی اسیری ہی کے ایام میں علی برادران نے اپنا ایک اور کارنامہ ظاہر کیا یعنی تعمیر مسجد وہاں اگر چہ مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی تھی، لیکن مذہبی عبادت گاہوں کی طرف عام لوگوں کو زیادہ خیال نہیں تھا۔ اِن بھائیوں نے اُن میں مذہبی روح پیدا کی اور ایک مسجد کی بناڈلوائی کہ وہاں مسلمان سربسجود ہوکر آستانہ الٰہی پر اپنی عبودیت وفتادگی کا اظہار کریں، اُس زمانہ میں اِس مسجد میں ایک خاصی چہل پہل تھی۔

رہائی کی کوششیں:

مسلمانانِ ہند اپنے ان محبوب رہنماؤں کی اسیری پر حد درجہ مضطرب تھے اور جو امکانی کوششیں وہ کر سکتے تھے، اُنہوں نے کیں۔ مسٹر مظہر الحق اور مسٹر جناح نے امپیریل کونسل میں جو سوالات کیے اور اُن کے جو جوابات دیئے گئے، وہ آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔

مہاراجہ محمود آباد کی کوششیں:

اِس سلسلہ میں راجہ (پھر مہاراجہ) صاحب محمود آباد کی کوششیں بھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ اُنہوں نے اپنے رسوخ واثر سے فائدہ اٹھا کر اِن مجاہدین راہِ حق کی رہائی کی بہت کوششیں کیں اور یہ

نفس نفیس چھنڈواڑہ گئے اور ان مسائل کا حل کرنا چاہا۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ خلافِ توقع اُن کی کوششیں بھی بے سود ہیں۔

مسلم لیگ کی صدارت:

ستمبر 1917ء میں (نظر بندی کے تقریباً ڈھائی سال کے بعد) محمد علی کو مسلمانانِ ہند نے اپنی غیر معمولی محبت اور قدر دانی کے ثبوت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا جو اُس زمانہ میں مسلمانوں کی واحد سیاسی انجمن تھی۔ لیکن نہ آپ کو شریکِ جلسہ ہونے کی اجازت ملی اور نہ اُس کی کارروائی میں اشارتاً کنایتاً کسی طرح حصہ لینے کی۔ اِسی مسلم لیگ کی صدارت کے متعلق فرمایا تھا:

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہرؔ
لیکن صلۂ روز جز اور ہی کچھ ہے

جب گورنمنٹ کے استبداد نے آپ کو اِس کا موقع نہیں دیا کہ آپ اِس میں شریک ہو سکیں تو آپ کے بجائے بی اماں مرحومہ اجلاس میں شریک ہوئیں اور کرسیٔ صدارت پر محمد علی کی تصویر آویزاں کر دی گئی، کیا روح پرور منظر ہوگا!

بی اماں نے لیگ کے اجلاس میں اپنا ''پیغام عمل'' پڑھا، دہلی کے ایک صاحب کے بیان کے مطابق:

''جس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام دے رہا تھا اور جس نے اجلاسِ لیگ کو مجلس ماتم بنا دیا۔''

مسٹر تلک کا ریزولیوشن:

اُس سال کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کے مشہور سیاسی قائد مسٹر تلک نے ایک ریزولیوشن کانگریس میں پیش کیا جس میں علی برادران کی فوری رہائی پر گورنمنٹ ہند کی عنانِ توجہ مبذول کرانے کی سعی ناکام کی گئی اور بے اثر رہی۔

مسٹر مانٹیگو ہندوستان میں:

اُسی زمانہ میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو تشریف لائے، ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے اُن سے ملاقاتیں کیں۔ گاندھی جی، مسٹر بیسنٹ، مسٹر جناح، پنڈت مالویہ، مسٹر چنتامنی، امام صاحب جامع مسجد، بیگم صاحبہ بھوپال، راجہ صاحب محمود آباد سبھی اُن سے ملے۔ اصلاحاتِ ہند پر مسٹر مانٹیگو نے سب سے نہایت تفصیل سے تبادلہ خیالات کیا، ہر شخص کے خیالات معلوم کیے اور ہر شخص کو اپنا نقطہ نظر سمجھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر مانٹیگو فطرتاً معقول آدمی تھے، وہ ہر شخص کا دُکھ درد سننا چاہتے تھے، آزاد خیال اتنے تھے کہ اگر اُن کا بس چلتا تو وہ کانگریس کے اجلاس میں بھی شریک ہوتے، مگر حکومتِ ہند کی مصلحت پروریوں نے اِس کی ''اجازت'' نہ دی۔

محمد علی نے بھی خواہش کی کہ وہ مسٹر مانٹیگو سے ملنا چاہتے ہیں اور ہندوستان و مسلمانانِ ہند کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں، حکومتِ ہند نے اِس درخواست کا کوئی معقول جواب نہیں دیا اور ملاقات کی اجازت بھی نہیں دی۔

مسلمانوں کا وفد:

ہندوستان میں یہ کچھ رسم سی پڑ گئی ہے کہ حکومت کا جب کوئی ذمہ دار افسر آتا ہے تو اُسے ایک پارٹی ضرور دی جاتی ہے، اُس کی خدمت میں ایک سپاس نامہ ضرور پیش کیا جاتا ہے اور ایک وفد بھی کسی نہ کسی طرح حاضر بارگاہِ ہمایونی ہونے کا شرف ضرور حاصل کرتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کا ایک متفقہ وفد قرار پایا کہ نواب محمد اسحاق خاں کی سرکردگی میں مسٹر مانٹیگو سے ملاقات کرے۔

وفد نے اپنے ایڈریس میں مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے علی برادران کی رہائی کا مسئلہ بھی پیش کیا۔ وفد جب مسٹر مانٹیگو سے ملنے دہلی آیا تو اُسے اطلاع دی گئی کہ ملنا صرف اِسی

صورت میں ہوسکتا ہے کہ علی برادران کا ذکر وفد کے ایڈریس سے خارج کردیا جائے۔

وفد کی طرف سے جواب دیا گیا کہ چونکہ یہ وفد ذاتی طور پر شرفِ باریابی نہیں حاصل کررہا ہے بلکہ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے اِس اعزاز کے حاصل کرنے کا متمنی ہے، اس لیے اپنی طرف سے نہ وہ کچھ اضافہ کرسکتا ہے اور نہ کچھ کم کرسکتا ہے۔

یہ جواب حکومت کے لیے تشفی بخش نہیں ثابت ہوا، اس لیے وفد کو ''پیش گاہِ معلیٰ'' میں شرفِ حاضری سے محروم رکھا گیا۔

عہد نامہ کی کوشش:

7 ستمبر 1917ء کو مسٹر عبدالمجید مشہور خفیہ کے سپرنٹنڈنٹ کو ملک کے ایجی ٹیشن سے متاثر ہوکر چھنڈواڑہ بھیجا گیا اور وہ سر چارلس کلولینڈ کی طرف سے ایک عہد نامہ لائے کہ جس پر دستخط کرنے سے ان زندانیوں کو رہائی مل سکتی تھی۔

عہد نامہ کا مفاد یہ تھا کہ دورانِ جنگ میں علی برادران کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ گورنمنٹ کے دشمنوں کو کسی قسم کی اخلاقی یا عملی مدد پہنچ سکے اور ہر طرح پرامن رہیں گے، نہ کوئی ایسی بات کریں گے جس سے ملکِ معظم کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ اُن کی طرف سے جواب دیا گیا کہ ہم یہ سب کچھ اُس وقت کرنے کے لیے تیار ہیں جب کہ ہمارے مذہبی مفاد سے آپ کا مفاد متصادم نہ ہو رہا ہو، اور اگر ایسی صورت ہوئی تو پھر ہم نہ کوئی وعدہ کرسکتے ہیں اور نہ کسی قسم کی پابندی قبول کرسکتے ہیں۔

سر چارلس سے محمد علی کے تعلقات:

اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہائی کا مسئلہ پھر تعویق میں آگیا اور ملک میں جو ایک خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی، وہ پھر افسردگی میں تبدیل ہوگئی۔

اس تعویق کی سب سے بڑی وجہ سر چارلس کا وجود باجود تھا، سر چارلس محمد علی سے کیوں خار کھائے

بیٹھے تھے؟ اِس پر مسٹر گھاٹے (علی برادران کے مشیر قانونی) کے اِس خط کے اِس جملہ سے روشنی پڑتی ہے جو اُنہوں نے مسٹر بیسنٹ کو لکھا تھا۔

مسٹر گھاٹے کا خط مسٹر بیسنٹ کے نام:

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب مسٹر محمد علی مع سیّد وزیر حسن کے انگلستان میں تھے تو وہاں اُن سے کہا گیا تھا کہ وہ اُس جماعت میں شریک ہوں جس کا نام اب ''انڈو برٹش ایسوسی ایشن'' ہے اور حکومتِ ہند کے اینگلو انڈین عمال کے ساتھ لارڈ ہارڈ نگ اور سر علی امام کے مقابلہ میں کارروائی کریں تا کہ 1911ء کے دربار میں جو انتظامی تبدیلیاں کی گئی تھیں، وہ پھر لوٹ دی جائیں، یہ افسر اعلیٰ سر چارلس کلولینڈ ڈائرکٹر جنرل سی آئی ڈی تھے اور یہ واقعہ قابل غور ہے کہ اس سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دینے کے بعد مسٹر محمد علی نے محسوس کیا کہ اُن کے ساتھ سر چارلس کا طرزِ عمل بالکل بدل گیا۔''

سرکاری کمیشن:

پھر ستمبر 1918ء میں ایک سرکاری ٹریبونل مقرر کیا گیا جس کے حلقہ تحقیقات میں یہ بات داخل تھی کہ وہ علی برادران کی نظر بندی کے صواب وعدم صواب پر غور کر کے ایک رپورٹ پیش کرے۔

کمیشن کے ایک رُکن سر عبدالرؤف پنجاب ہائی کورٹ کے جج بھی تھے، اُن بزرگ سے علی گڑھ کے سلسلہ میں ایک مدت سے چشمک چلی آرہی تھی۔ 15 دسمبر کو یہ تحقیقاتی کمیٹی چھندواڑہ پہنچی اور اُس نے علی برادران کی فرداً فرداً شہادت لی۔

علی برادران کے بیانات:

علی برادران نے اپنے بیانات میں گورنمنٹ کے ظلم و جبر کو دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا، اپنے مذہبی فرائض بتائے اور کمیشن کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ مذہبی معاملات میں گورنمنٹ سے

اُن کی وفاداری بالکل مشروط ہے۔ اگر اُس نے مذہبی معاملات و مقامات پر دست اندازی کی پالیسی ترک کردی تو ہم اُس کے وفادار ہیں اور اگر وہ اپنی روش پر ثابت قدم رہی تو ہم سے بڑھ کر اُس کا دشمن کوئی نہیں، اور اپنی اِس مشروط وفاداری کو ملکہ وکٹوریہ کے تاریخی اعلان سے مدلل کیا اور اپنے تئیں پورے طور سے حق بجانب ثابت کیا اور گورنمنٹ کے ناروا فعل پر دلائل کی روشنی میں اظہارِ تعجب کیا۔

اور چونکہ اپنے نقطہ نظر سے وہ اپنے بے گناہی اور گورنمنٹ کی دراز دستی کو ثابت کر چکے تھے، اس لیے اُنہوں نے گورنمنٹ سے اپنے اُس نقصان کی تلافی بھی طلب کی جو اِس ناواجب اور ناجائز نظر بندی کے سلسلہ میں اُن کی تجارت اور اُن کے اخبار پر پڑا تھا۔

کمیشن کی سفارشات:

کمیشن نے اپنی ''تحقیق انیق'' کی بنا پر نظر بندی تو بالکل جائز ٹھہرائی اور نقصانات کا جو معاوضہ طلب کیا گیا تھا، اُسے بھی باطل ٹھہرایا لیکن از راہِ معدلت گستری و مراحم خسروانہ اِن بلبلانِ اسیر کی رہائی کی بہ یک جنبش قلم ''سفارش'' کردی۔ گورنمنٹ بھلا اتنی ''مدلل سفارش'' کو کیونکر منظور کرسکتی تھی کہ اس کا فعل حق بجانب قرار دیا گیا ہو، ملزمین مجرمین کی صورت میں تسلیم کر لیے گئے ہوں اور اُن کا مطالبہ وتاوان باطل ٹھہرایا گیا ہو۔ پھر اُسے کیا پڑی تھی کہ اِس سفارش کو وہ قبول کرتی؟ چنانچہ سفارشیں شرفِ قبولیت نہ حاصل کرسکیں اور علی برادران بدستور چھنڈواڑہ میں نظر بند و قدم بند رہے۔

مسز بیسنٹ کی رہائی:

نومبر 1918ء میں مسز اینی بیسنٹ ہندوستان کے سخت احتجاج کے بعد رہا کی گئیں، اُن کی رہائی سے اُمید بندھی تھی کہ شاید علی برادران بھی رہا کر دیئے جائیں، مگر یہ اُمید غلط ثابت ہوئی اور علی برادران رہا نہیں کیے گئے۔

مسز بیسنٹ کی کوششیں:

مسز بیسنٹ کی کوششوں کی داد نہ دینا سخت بے انصافی ہوگی۔ اُنہوں نے رہا ہوتے ہی علی

برادران کی رہائی کی سخت کوششیں کیں اور ہر طریقہ سے گورنمنٹ کو متاثر کرنا چاہا، اور اُسے سمجھانا چاہا کہ علی برادران کی نظر بندی نہیں بلکہ رہائی عین مصلحت ہے، مگر گورنمنٹ کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔

مسز بیسنٹ کی وائسرائے سے ملاقات:

چنانچہ اپنی کوششوں کو اتمام تک پہنچانے کے لیے مسز بیسنٹ نے وائسرائے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور وائسرائے سے مل کر اِس مسئلہ پر مفصل تبادلہ خیالات کیا، اور علی برادران کی نظر بندی کے مقاصد اور رہائی کے سیاسی فوائد گورنمنٹ کے گوش گزار کرا دیئے۔ مگر نتیجہ اِس کا بھی ناکامی تھا، چنانچہ وائسرائے ہاؤس سے واپس آ کر اُنہوں نے جو بیان دیا اُس کا ایک حصہ یہ ہے:

مسز بیسنٹ کا بیان:

> ''میں دہلی میں ہز ایکسی لینسی وائسرائے سے ملاقات کر کے بھی آئی ہوں۔ ہز ایکسی لینسی وائسرائے نے میرے تمام پیش کردہ دلائل کو بغور سنا اور بہت صاف باتیں کرتے رہے۔ وائسرائے اور اُن کی کونسل شوکت، علی محمد علی صاحبان کی نظر بندی کے معاملہ پر غور اور مزید غور کر چکے ہیں اور مجھے ایک ایسے شخص نے جو گورنمنٹ کا معتمد علیہ ہے، یہ اطلاع دی ہے کہ گورنمنٹ نے بالاتفاق یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ مذکورہ بالا نظر بندوں کو رہا نہ کیا جائے۔''

اسباب:

لیکن وہ کون اسباب تھے کہ مسز بیسنٹ تو صرف تین مہینہ کی دلچسپ نظر بندی کے بعد رہا ہو گئیں اور علی برادران تین، ساڑھے تین سال کی نظر بندی کے بعد بھی رہا نہ کیے گئے۔ آخر اِس کے اسباب کیا ہیں؟ یہ سوال جتنا دلچسپ ہے، اِس کا جواب اِس سے کہیں زیادہ عجیب و غریب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ علی برادران سے خائف تھی، اس لیے انہیں نظر بند کرنا تو عین مقتضائے وقت و مصلحت سمجھا گیا لیکن اسبابِ نظر بندی خود اُس کے ذہن میں بھی پوری طور سے نہیں تھے۔ اس

لیے جب کبھی بھی اُس سے اُن کی نظر بندی کے متعلق استفار کیا گیا تو وہ ہمیشہ بے سر و پا جوابات دیتی رہی۔ کبھی اُنہیں ایک سازش کا مجرم سمجھا گیا جس میں امیر افغانستان کو حملہ کی دعوت دی گئی تھی اور کبھی یہ کہا گیا کہ ایک فوجی افسر کو باغیانہ خط لکھا تھا، اس لیے معتوبِ سرکار ہیں، اور کبھی یہ الزام تراشا گیا کہ وہ ملکِ معظم کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں اس لیے اُن کی نظر بندی مصلحتِ وقت ہے، اور کبھی گھبرا کے یہ کہہ دیا کہ اُنہوں نے پیش کردہ عہد نامہ پر دستخط کیوں نہیں کیے؟ غرض جس وقت جو بات زبان پر آ گئی، وہ کہہ دی گئی۔ کسی غور و فکر کی نہ ضرورت تھی نہ پرواہ۔

پروفیسر الیاس برنی کا خط:

ایام نظر بندی میں محمد علی کے احباب پر کیا گزرتی تھی؟ اِس کا اندازہ ذیل کے دو خطوں سے ہوگا، پروفیسر الیاس برنی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''پیارے بھائی!

اِس وقت صبح کے چار بجے ہیں کہ بے ساختگی کے عالم میں یہ خط لکھ رہا ہوں، کل حیات سے آپ کی تازہ ترین غزل ملی اور نہیں کہہ سکتا کہ اِس کو پڑھ کر دِل کی کیا حالت ہوئی ہے؟ رات اِسی کو گنگناتے گنگناتے سویا اور اِتنے سویرے جو آنکھ کھلی تو دِل نے پھر وہی رنگ جمایا۔ جوں جوں پڑھتا ہوں، خوشی سے یا رنج سے، نہ معلوم کیا کہوں؟ گرم گرم آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔

تم سے بعید تھا کہ بھلا دو، اگرچہ ہم
اِک عمر ہو گئی کہ ہوئے انجمن سے دُور

یہ شعر دِل پر نشتر کا کام کر گئی اور بے تاب ہو کر یہ خط لکھنا شروع کیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ قوم تم دونوں بھائیوں کو بھلا دے۔ دِل دِل میں تمہاری یاد ہے، لب لب پر تمہارے واسطے دعا ہے، گھر گھر تمہارا چرچا ہے۔ جس نے تمہارا نام بھی سنا ہے، تم پر فریفتہ ہے، خاموشی ہے تو اِس کے اسباب کچھ اور ہیں، فراموشی نہیں۔

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

خدا تم دونوں فدائیانِ ملت اور شیرانِ وطن کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔"

مکتوبِ عبدالحق:

دوسرا خط مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر عثمانی یونیورسٹی وسیکریٹری انجمن ترقی اُردو کا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

"میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں اور خدا کا شکر کرتا ہوں کہ تم اپنی بات اور روش پر ثابت قدم رہے۔ تم بلاشبہ اِس مدرسۂ ہند میں بہت ہونہار طالب علم ہو۔

اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں"

اِن خطوط سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اِس وقت مسلمانوں کی اور علی برادران کے شناساؤں کی کیا حالت ہورہی تھی، مگر یہ دونوں کوہِ وقار واعیانِ حریت وآزادی بدستور اُسی متانت، اُسی استقامت اور اُسی قابل رشک صبر وسکون کے ساتھ جو اُنہیں کا حصہ تھی، اِن تمام مصائب کو ہنسی خوشی، چہرہ پر شکن لائے بغیر برداشت کرتے رہے۔

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش
دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر وقناعت والے

(ذوقؔ)

چھندواڑہ سے "رہائی":

کئی سال تک چھندواڑہ کی آب وہوا میں زندگی بسر کرنے کے بعد چھندواڑہ بھی چھٹا اور ایک دوسرا قفس اُن کے لیے تیار کیا گیا۔

تقریر:

واقعہ یوں ہے کہ چھندواڑہ کی مسجد اُنہیں دونوں بھائیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی، وہاں تراویح اور نماز یہ لوگ پڑھا کرتے تھے۔

ایک روز جمعہ کو جمعہ کی نماز کے بعد محمد علی نے ایک نہایت زبردست تقریر کی اور مسلمانوں کو اُن کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ تقریر حسبِ معمول درد واثر اور روحِ مذہب سے بھری تھی، حاضرین پر اِس کا خاصا اثر ہوا۔ گورنمنٹ بھلا اِس قسم کی جرأت کی ہمت افزائی کیسے کر سکتی تھی؟ لہٰذا اُس نے چھندواڑہ سے منتقل کر کے انہیں بیتول جیل پہنچا دیا۔ یہاں سے نظر بندی کے بجائے جیل کی زندگی شروع ہوتی ہے اور جو تھوڑی بہت آزادی برائے نام باقی تھی، وہ بھی ''نذرِ خاطر صیاد'' ہوگئی۔

❀❀❀

باب۱۲

چھندواڑہ سے بیتول

تقریر کے بعد علی برادران کی نظر بندی بھی خطرناک سمجھی گئی اور مناسب سمجھا گیا کہ اُن دونوں کو اب جیل خانہ بھیج دیا جائے، چنانچہ گرفتاری عمل میں آئی اور قوم وملت کے یہ دونوں سردار اسیر زندان کر دیئے گئے۔

شوکت کی ڈائری:

بدقسمتی سے ہمیں بیتول جیل کی زندگی اور چھندواڑہ سے روانگی کے متعلق کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ اِس وقت تک علی برادران پر جو کچھ تحریری مواد موجود ہے، اُس میں بھی کچھ نہیں ملتا۔ صرف اتنا ملتا ہے کہ وہ چھندواڑہ سے بیتول میں قید کر دیے گئے! لیکن یہ کارروائی کیونکر وقوع پذیر ہوئی، اِس کے متعلق سب خاموش ہیں۔ اتفاقاً محمد علی کے کاغذات کے انبار میں ہمیں مولانا شوکت علی کی ڈائری مل گئی جس سے یہ مسئلہ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو گیا۔

شوکت صاحب کی یہ ڈائری بہت نامکمل ہے یعنی صرف چند ہی روز اُنہوں نے ڈائری لکھی اور اس کے بعد یہ مفید، کارآمد اور آئندہ نسلوں کا سامانِ اشتیاق اُنہوں نے خود بند کر دیا۔ لیکن بہرحال ہمیں اپنے عنوان کے متعلق اِس سے بہت کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ اب ہم اِس کے ضروری اقتباسات پیش کرتے ہیں جن کا نفس عنوان سے تعلق ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:

گرفتاری:

''(چھندواڑہ میں) حسبِ معمول ہم قریب گیارہ بجے سو گئے تھے اور 2 یا ڈھائی 2 بجے سحری کو اُٹھے۔ اُس دِن اتفاق سے اندر والدہ اور محمد علی کے بچوں کے ساتھ سحری کھانے بھی نہیں گیا، بلکہ پلنگ پر بیٹھ کر ایک دو منٹ میں دودھ کو ختم کر کے سو گیا۔ تقریباً 4 بجے اپنے بنگلہ کے احاطہ کے چھوٹے دروازہ کی طرف سے بہت سے پاؤں کی آہٹ سنی۔

چونکہ میں بہت چوکنا سونے والا ہوں، فوراً آنکھ کھل گئی اور میں نے بہت سے آدمیوں کو آتے ہوئے دیکھ کر انگریزی میں دریافت کیا، کون ہیں؟ اس پر انگریز نے جو ڈپٹی کمشنر پلوڈن تھا، جواب دیا، ''کیا آپ ہیں مسٹر شوکت علی؟'' میں نے فوراً جواب دیا کیونکہ میں اوّل ہی جان گیا تھا کہ یہ جم غفیر ہماری عزت افزائی کے لیے آیا ہے۔

''جی ہاں! آیئے!'' اِس پر ایک دوسرے انگریز نے جو مسٹر رائٹ 'ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس' تھا، کہا کہ ''ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا، ''آیئے میں چلنے کو تیار ہوں۔'' اِس عرصہ میں پانچ یا چھ انگریزوں نے اور بہت سے سپاہیوں نے میرے پلنگ کو گھیر لیا، میں صرف بنیان اور پاجامہ پہنے تھا۔ رائٹ میرے قریب آیا اور مجھ سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ بہت اخلاق سے پیش آئیں گے، اگر آپ (ہمیں) کسی قسم کی تکلیف نہ دیجیے گا۔ میں نے کہا، ''تکلیف دہی کیسی؟ چلئے! میں تیار ہوں۔''

میں اُس وقت پلنگ کے پاس کھڑا ہو گیا تھا، چاروں طرف آدمی! اِس قدر اہتمام مذاق انگیز تھا۔

تلاشی:

رائٹ نے ذرا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے میرے جسم پر ہاتھ پھیرا کہ کوئی توپ یا مشین گن بنیان میں نہ ہو، اِس کے بعد ہموڈن نے دریافت کیا، ''مسٹر محمد علی کہاں ہیں؟''، میں نے کہا، ''اندر سوتے ہیں، میں بلاتا ہوں۔'' میں نے زاہد کو آواز دی جس پر وہ اور بندن خاں اور اختر علی آ گئے، زاہد نے محمد علی کو باہر سے آواز دی۔ کئی آوازوں کے بعد وہ نکلے تو ویسے ہی بنیان اور پاجامہ پہنے کمرہ کا دروازہ کھول کر باہر آنے لگے تو اُن کے ہاتھ میں کسی انگریز نے ہاتھ ڈال دیا۔ ان کو یہ اطلاع نہ تھی کہ باہر یہ حضرات ہم کو لینے آئے ہیں، غالباً وہ شخص چھندواڑہ کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس 'بیک' تھا۔

محمد علی کو یہ حرکت بری معلوم ہوئی اور اُنہوں نے چاہا کہ اندر جا کر کرتہ پہن آئیں مگر اِس کی اجازت نہ ملی۔ غالباً یہ خطرہ تھا کہ محمد علی کوئی نو ایجاد کردہ آلہ نہ لے آئیں اور اُن سے پلوڈن نے کہا کہ ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ میں تیار ہوں مگر میں غسل کرنا چاہتا ہوں جس کی اجازت نہ ملی۔ اِس عرصہ میں ہمارے نوکر وغیرہ بھی آ گئے۔

مسٹر رائٹ نے جو اِس حملہ کرنے والی فوج کے کمانیر تھے اور بہت غرش کر رہے تھے، کہنے لگے کہ ہم آپ کو پانچ منٹ دیتے ہیں کہ آپ تیار ہو جائیں۔ میں نے سوٹ او رقمیص منگوا کر پہنا، میرے کپڑوں کو بھی میاں رائٹ نے ٹٹولا مگر ذرا شرماتے ہوئے۔ محمد کوٹ بھی نہ پہننے پائے تھے کہ اُن کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر لے چلے۔

مہر مادری:

اِس عرصہ میں برقع پہن کر والدہ صاحبہ تشریف لائیں، اُنہوں نے فرمایا، ''میں بھی

ضرور چلوں گی۔'' اِس پر پلوڈن نے جواب دیا، ''ہم کو فقط اِن دو صاحبوں کے لے جانے کا حکم ہے۔'' محمد علی نے وارنٹ دیکھنے کی درخواست کی، اِس عرصہ میں چار پانچ موٹریں ہمارے بنگلہ کے سامنے آئیں۔ ہم لوگ اُن کی طرف چلے، والدہ صاحبہ ہمراہ تھیں اور چلنے پر مصر۔

پولیس آفسر کی گستاخی:

رائٹ نے کسی سے کہا، ''ذرا اِن بڑی بی کو کوئی روکے۔'' ہم نے پسند نہیں کیا کہ اُن کے ساتھ کسی قسم کی گستاخی یا بدتمیزی کی جائے، وہ برابر ہمراہ چلنے پر اَڑی ہوئی تھیں اور باوجود اندھیرے اور کبرسنی کے تیز تیز قدم رکھ کر سب کے ساتھ موٹر تک آئیں مگر ہم نے اُن کو خدا اور رسول کا واسطہ دیا کہ آپ نہ آئیں۔ بعد مشکل تمام وہ خاموش ہوئیں۔

استقامت کا ثبوت:

محمد حسین غریب مجھ سے گلے ملتے وقت رونے لگا، اُس غریب کے رونے کو دیکھ کر مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں نے ایک زور کا چانٹا رسید کیا اور چلا کر کہا، ''خبردار! کافر کے سامنے ایک آنسو نہ نکلے۔'' وہ بڑا بہادر اور وفادار ملازم ہے، فوراً سنبھل گیا۔ اقبال ہمارے ہی لیے حکم دے چکا ہے۔

یہ رسم بزم فنا ہے اے دِل، گناہ ہی جنبش نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری، جو تو یہاں بے قرار ہوگا

روانگی کے وقت تاثرات:

خدا کا شکر ہے ہمارے اور اعزہ اور متعلقین میں سے کسی نے کمزوری کا اظہار نہیں کیا، سب کے چہروں پر غصہ اور حقارت کے آثار تھے۔ ہم کو خوشی ہے اور فخر ہے کہ ہم نے

نہ تو والدہ صاحبہ اور نہ زاہد اور صادق یا کسی اور عزیز سے اُس وقت اظہارِ محبت کیا۔

روانگی:

ہم سب روانہ ہوئے، اُس وقت کا سرور اور لطف یا تو خدا جانتا ہے یا ہمارا دِل، ہم نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دُینوی لطف اُٹھائے مگر خدا جانتا ہے اِس ''روحانی عیاشی'' میں جو لطف ملا، اُس کا عشرِ عشیر بھی پہلے نصیب نہ ہوا تھا۔''

اِس ہنگامہ کے بعد یہ دونوں بیتول جیل میں نظر بند نہیں، بلکہ بند کر دیئے گئے۔

❁❁❁

باب ۱۳

بیتول سے امرتسر

رہائی:

بالآخر 30 مئی 1915ء کی گرفتاری اور نظر بندی کے بعد دسمبر 1919ء میں کم وبیش پانچ سال کے بعد دفعتاً حیرت انگیز طریقہ پر ان بلبلانِ اسیر کو قیدِ قفس سے آزاد کیا گیا اور پانچ سال کے طویل اور صبر آزما عہدِ مسعود کے بعد پھر وہ مبارک زمانہ آیا کہ عندلیبِ خوش لحن پھر شاخِ چمن پر زمزمہ آرا ہو۔

حور یاں رقص کناں ساغر مستانہ زدند

رہائی کیوں ہوئی؟

اپریل 1919ء میں جب گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف اپنی ستیہ گرہ کا آغاز کیا ہے تو تمام ملکِ برطانیہ کے دست تطاول کا شکار ہوا کوئی بڑا شہر ایسا شاید ہی ہو جس میں گولیاں نہ چلی ہوں اور نہایت بے دردی کے ساتھ غریب ہندوستانیوں کو ظلم و جور کا تختۂ مشق نہ بنایا گیا ہو۔

حادثہ جلیانوالہ باغ:

اُسی زمانہ میں جلیانوالہ باغ کا افسوس ناک اور نا قابل فراموش واقعۂ فاجعہ پیش آیا تھا جس نے سارے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف غم وغصہ کے جذبات برانگیختہ کر دیئے تھے، ہندوستان میں یہ کیفیت بڑھ ہی رہی تھی کہ گورنمنٹ نے غالباً اِس صورت حال کا مقابلہ مناسب نہ سمجھ کر دسمبر 1919ء میں ایک مدبرانہ اعلان کیا اور تقریباً تمام سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔

اِن رہائی یافتگان میں ہندوستان کے محبوب اور قابل افتخار رہنما علی برادران بھی تھے جن کا وطن ثانی جیل خانہ ہو چکا تھا۔

امرتسر:

امرتسر میں جہاں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا تھا، کانگریس کا سالانہ جلسہ اُسی زمانہ میں ہو رہا تھا۔ مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی وہیں ہو رہے تھے۔

کانگریس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو اور مسلم لیگ کے صدر حکیم اجمل خاں مرحوم تھے۔

لہٰذا علی بردران رہا ہوتے ہی سیدھے امرتسر پہنچے کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہوں۔

عدیم النظیر استقبال:

ایک صاحب نے ''حالاتِ علی برادران'' نامی ایک مختصر سا رسالہ علی برادران کی نظر بندی کے بعد لکھا تھا، وہ امرتسر کے استقبال کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> ''آپ 29 دسمبر کو امرتسر پہنچے، راستہ میں جس اسٹیشن پر دونوں بھائیوں کا گزر ہوا ہندو مسلمانوں نے پر جوش خیر مقدم کیا، امرتسر کے اسٹیشن پر جس وقت دونوں بھائیوں کی گاڑی پہنچی تو قومی نعروں سے ہزار ہا ہندو مسلمانوں نے استقبال کیا۔ اسٹیشن سے جلوس مرتب ہو کر سیدھا آل انڈیا نیشنل کانگریس کے پنڈال کی جانب روانہ ہوا۔ جس خلوص اور شوق سے اہل امرتسر نے اِن دونوں بھائیوں کا خیر مقدم کیا، وہ امرتسر کی حیاتِ قومی میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔''

کانگریس میں استقبال:

> ''کانگرس کے پنڈال کے دروازہ پر مہاتما گاندھی، پنڈت مدن موہن مالوی اور دیگر رہنمایانِ ہند نے استقبال کیا۔''

اُس وقت کا منظر:

''کانگریس کے پنڈال میں قدم رکھتے ہی تمام ہندو مسلمان تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے اور اِس زور شور سے مسلسل چیرز بلند ہو رہے تھے کہ پندرہ منٹ تک کارروائی ملتوی رہی۔''

پنڈت موتی لال کا حاضرین سے تعارف:

''پنڈت موتی لال نہرو پریذیڈنٹ کانگریس نے حاضرین سے اُن دونوں بھائیوں کا تعارف کراتے ہوئے اُن کی قومی خدمات کا تذکرہ کیا۔''

مالوی جی کا ڈیلی گیت بنانا:

''پنڈت مدن موہن مالوی نے اُن دونوں بھائیوں کو (کانگریس کا) ڈیلی گیٹ بنایا۔''

یہاں شرکت کے بعد علی برادران مسلم لیگ کے اجلاس میں گئے، وہاں بھی اُسی جوش وخروش اور اشتیاق و بے چینی کے ساتھ اُن کا استقبال ہوا۔

کانگریس میں تقریر:

کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے کہا:

''میں کہتا ہوں اِس آزادی کے لیے مسٹر تلک کو پھر جیل چلا جانا چاہیے، مجھے دوبارہ اپنی عمر بھر کے لیے نظر بند ہونا چاہیے، مسز بیسنٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہیے، مگر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہونا چاہیے جیسے کہ پنجاب میں ہوئے۔''

باب ۱۴

دہلی

دہلی کا استقبال:

پنجاب کے سیاسی اجتماعات میں شریک ہونے کے بعد علی برادران نے دہلی کا قصد کیا۔ یہی اُن لوگوں کا ''دار السلطنت'' تھا اس لیے یہاں اُن کا شاہانہ استقبال ہوا جس کی تفصیل ''حالاتِ علی برادران'' کے حوالہ سے یہ ہے:

''دہلی سو برس کے بعد دلہن بنی ہوئی تھی، قریب قریب تمام چھوٹے بڑے بازاروں میں جھنڈیوں کا جال پھیلا ہوا تھا، استقبالیہ کمیٹی کے عالی شان دروازوں کے علاوہ تمام چھوٹے بڑے بازاروں اور تمام گلی کوچوں کے سروں پر صدہا خوشنما دروازے نصب تھے۔''

آزادی کا جہاز:

''چاندنی چوک کے بازار میں گھنٹہ گھر کے نیچے جہاں وائسرائے اور شہزادوں اور خود ہز امپیریل میجسٹی کو ایڈریس دیا گیا تھا۔ ایک خوشنما آہنی چادروں سے منڈھا ہوا جہاز بنایا گیا تھا اور جلی حرفوں میں ''آزادی کا جہاز'' لکھا ہوا تھا جس پر قومی جھنڈا لہرا رہا تھا، اُس جہاز کی تعمیر صرف چوبیس گھنٹہ میں ہوئی تھی اور پانچ سو روپے سے زائد اُس پر خرچ ہوئے تھے۔ اُس پر ایک درجن آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی، اُس کے نیچے

کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن کے لیے دو روپیہ اور چار روپیہ ٹکٹ تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے دونوں بھائی تشریف لائے، مجمع نے ''اللہ اکبر'' اور ''بندے ماترم'' کے نعروں سے خیر مقدم کیا اور پھولوں کی بارش شروع کر دی۔''

اجمل خاں کی تحریر:

''ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے حکیم اجمل خاں کی ایک تحریر سنائی جس میں علی برادران کی ملکی اور قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کی رہائی پر اظہارِ مسرت کیا تھا اور اِس موقع پر اپنی عدم موجودگی پر افسوس۔''

ایڈریس:

''بعدہٗ رائے بہادر لالہ شیو پرشاد صاحب سی آئی ای، او جی ای رئیس دہلی نے ایڈریس پیش کیا جس کو خواجہ حسن نظامی صاحب نے با آوازِ بلند پڑھ کر سنایا۔''

ایڈریس میں علی برادران کی قومی و ملکی خدمات پر نہایت عقیدت مندانہ الفاظ میں تبصرہ کیا گیا تھا اور اُن کے بے پناہ جذبہ ایثار و سرفروشی کی تعریف و توصیف کی گئی تھی۔ اِس کے بعد علی برادران نے باری باری اہل دہلی کی نوازش کا شکریہ ادا کیا اور اپنی نظر بندی پر روشنی ڈالی۔

❁❁❁

باب ۱۵

وائسرائے کے ہاں وفد

تجویز:

خلافت کانفرنس نے بمقام دہلی وامرتسر یہ تجویز پاس کی تھی کہ مسلمان نمائندوں کا ایک وفد ممالک غیر مثل انگلستان، امریکہ، عراق وغیرہ جائے اور وہاں مسلمانوں کے مذہبی فرائض و واجبات نہایت معقولیت کے ساتھ گوش گزار کرائے۔

گورنمنٹ نے ممالکِ غیر میں وفد کو جانے کی اجازت نہیں دی، ہاں انگلستان جانے کی اجازت دے ددی۔ اِس وفد سے پیشتر ایک وفد اَور ہندو مسلمانوں کا مشترکہ نمائندہ بن کر لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند کی خدمت میں محمد علی کی سرکردگی میں حاضر ہوا تھا اور گورنمنٹ کو اُس کے مواعید یاد دلائے تھے جو اُس نے اپنی ''نہایت وفادار مسلم رعایا'' سے کر کے توڑے تھے۔

ارکانِ وفد:

وفد میں ہندو مسلمانوں کے نہایت با اثر اور ممتاز اصحاب شامل تھے، نیز ہر طبقہ اور ہر جماعت کی نمائندگی کا کافی لحاظ رکھا گیا تھا۔ خاص خاص ممبروں کے نام یہ ہیں:

گاندھی جی، سیٹھ چھوٹانی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی ایم۔اے۔ امیر جماعت احمدیہ لاہور، ممتاز حسین صاحب بیرسٹر لکھنؤ، مولانا کفایت اللہ، مولانا حسرت موہانی، مسٹر سیّد حسین (ایڈیٹر ''انڈی پینڈنٹ'')، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم اجمل خان

صاحب، ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا عبدالماجد بدایونی، سیّد ظہور احمد صاحب سیکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ، مولانا فاخر، مولانا سیّد سلیمان ندوی، آغا محمد صفدر قزلباش، راجہ صاحب محمود آباد، پنڈت موتی لال نہرو، راجہ صاحب جہانگیر آباد، مسٹر جناح۔

اِن میں دو حضرات (مسٹر جناح و پنڈت نہرو) وقت پر دہلی نہیں پہنچ سکے تھے لیکن اُنہوں نے تار بھیج کر اپنے کامل اتفاق کا اظہار کیا تھا۔

ایڈریس:

یہ ایڈریس محمد علی نے تیار کیا تھا جس کا ترجمہ اُن کے برادر بزرگ مسٹر ذوالفقار علی نے کیا ہے، وفد نے وائسرائے کے سامنے کہا:

''ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چاہے کتنا ہی بڑا اور زرخیز حصہ زمین ہو یا کیسا ہی زبردست سیاسی نفع ہو، مگر وہ معاوضہ نہیں ہوسکتا اُس اخلاقی عزت کے نقصان کا جو برطانیہ کو ہوگا، اگر وعدے حرف بہ حرف پورے نہ کیے گئے۔
اخلاقی رعب کا خاتمہ اس لیے اور گراں معلوم ہوگا کہ اُس اعلانِ شاہی کی قلعی کھل جائے گی جو حضورِ والا کے پیشرو وائسرائے نے ترکی کی لڑائی ہونے پر شائع کیے تھے۔''

❀❀❀

باب ۱۶

وفدِ خلافت یورپ میں

قرار داد:

یہی وہ وفد تھا جس کی دہلی اور امرتسر کی خلافت کانفرنسوں میں قرارداد پاس ہوئی تھی۔ یہ وفد یورپ اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہاں کے اربابِ حل وعقد سے مل کر وزراء اور امراء سے مل کر اور اگر ہو سکے تو ملکِ معظم اور وزیر اعظم سے مل کر مسلمانانِ ہند کے جذبات و احساسات معقولیت اور صحت کے ساتھ پیش کرے اور یہ واقعہ ہے کہ وفد نے نہایت گرانقدر خدمات انجام دیں۔

ارکان:

وفد کے صدر محمد علی تھے، مسٹر حسن محمد حیات (موجودہ پبلسٹی افسر و سیکریٹری لیجیسلیٹو کونسل بھوپال) سیکریٹری تھے۔ مسٹر سیّد حسین، مولانا سیّد سلیمان ندوی اور ابو القاسم صاحب وفد کے ارکان تھے۔ مسٹر شعیب قریشی اور مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی اُس زمانہ میں آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان دونوں حضرات نے اپنا تعلیمی سلسلہ عارضی طور سے منقطع کر دیا اور اس وفد کے ساتھ مصروفِ کار رہے۔

وفد کی کوششیں:

سب سے پہلے جب وفد انگلستان پہنچا تو اُس نے وہاں کے تمام ذمہ دار لوگوں سے ملاقات کی اور اُنہیں اصل مذہبی مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی، پھر اِسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ محمد علی نے مختلف مقامات پر

دورے کیے اور جہاں کہیں ایک ذرا سا بھی موقع مل سکا، وہاں وہاں اُنہوں نے تقریر کی اور اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

محمد علی کا بیان:

محمد علی لکھتے ہیں:

''1930ء میں جب میں وفدِ خلافت لے کر یورپ گیا تو اُس وقت ریمزے میکڈانلڈ صاحب پارلیمنٹ کے ممبر تک نہ تھے، لائڈ جارج نے گزشتہ انتخابات میں سب کو شکست فاش دی تھی اور آپ کی نشست تک چھن چکی تھی۔''

خبر وحشت اثر:

''جس دن ہمارا جہاز وینس میں مغرب کے وقت لنگر انداز ہوا، اُسی دِن ہمیں لندن کے اخبارات پڑھنے کو ملے تھے اور اُن سے معلوم ہوا تھا کہ صلح کانفرنس ترکی کا چند ہی دن میں فیصلہ کیے دیتی ہے۔ اُسی شب کو تار گھر جا کر ہم نے نہایت اہم اور پرزور تار اتحادیوں کی ساری حکومتوں کو اور اُن کے اخبارات کو اور بالخصوص لائڈ جارج اور مسٹر مانٹیگو کو صبح کے ساڑھے تین بجے تک تار دیئے تھے اور باوجود فرانس میں ریل والوں کی اسٹرائیک کے ہم اُسی شب کو لندن پہنچے جب کہ قسطنطنیہ کی واپسی کے متعلق دار العوام میں مباحثہ ہو رہا تھا۔''

مسٹر میکڈانلڈ سے دائمی اختلاف:

''وقت کی تنگی اور کام کی اہمیت کے باعث ہمیں اتنی فرصت کہاں تھی کہ ریمزے میکڈانلڈ صاحب کو ڈھونڈ نکالتے۔

حزب العمال کے سالانہ جلسہ کا وقت آیا، ہم وہاں پہنچے جہاں حزب العمال کا جلسہ تھا۔ جاتے ہی کرنل ویجوڈ، مسٹر سنوڈن اور دیگر عمائد حزب العمال سے ملے۔ اس

سے پیشتر مسٹر لینسبری سے ملاقات ہو چکی تھی۔''

کنگز وے ہال میں جلسہ:

''اُنھوں نے ہمارے لیے کنگز وے ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ کرایا تھا جس کے وہ خود صدر رتھے، اُن سے خاصی بے تکلفی بھی ہوگئی تھی، اُن سے ہم ملے اور درخواست کی کہ ہمیں حزبِ عمال کے سالانہ کانفرنس میں ترکی کے ساتھ صلح کی شرائط کے متعلق اظہارِ خیال کا موقع دیا جائے۔ چونکہ اِس عرصہ میں ہم زیادہ تر پیرس ہی میں رہے تھے اس لیے ہمیں اس سالانہ جلسہ کی اطلاع بہت دیر میں ملی تھی۔ اُن لوگوں نے کہا اب تو پروگرام طے ہو چکا، ہم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سیکریٹری ہیں، اُن کو اختیار ہے۔ اگر چاہیں وقت نکال لیں، وہ تو تمہارے پرانے دوست ہیں، تھوڑا سا وقت تو نکال ہی دیں گے۔ میں خوش خوش آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔''

مسٹر میکڈانلڈ کی خفگی:

''میں نہیں کہہ سکتا کہ اُس شخص نے کس تلخی کے ساتھ مجھے جواب دیا، ''ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ہمارا پروگرام یونہی پُر ہے، اُسی کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے۔'' مجھے اِس انکار سے سخت رنج ہوا مگر رنج کے علاوہ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب مجھے اِس انکار کا اصل سبب معلوم ہوا۔''

خفگی کا اصل سبب:

''اس لیے کہ آپ سے نہ رہا گیا اور آپ نے مجھ سے اُسی وقت فرمایا کہ تم نے تو مجھے بالکل ہی بھلا دیا، تم مجھ سے آج ملتے ہو، اتنے دِن سے کہاں تھے؟ میں نے کہا کہ میں لندن سے باہر تھا، فرمایا ''تم ان بنا کار (بعض ممبران پارلیمنٹ و دیگر عمائد لندن) کے پاس گئے اور مجھے بالکل ہی بھلائے رکھا، آج مجھے یاد فرمایا، میں تمہارے لیے

بالکل وقت نہیں نکال سکتا،'' جو شخص ایک دِن برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے والا تھا، وہ اور اِس قدر کم ظرف و تنگدل؟ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ حزبِ عمال کے لیڈروں سے اُن کی اِس قسم کی مخالفت تھی کہ میرا اُن سے ملنا اُن کو اتنا ناگوار ہوا، جو شخص رشک وحسد میں اِس قدر ڈوبا ہوا ہو کہ ہندوستان اور ترکی اور خود برطانیہ کے مفاد کا خیال نہ رکھے اور خیال رکھے تو صرف اِس کا کہ فلاں شخص حزبِ عمال کے اور لیڈروں سے کیوں ملا، مجھ سے کیوں نہ ملا، اُس سے بھلا کسی بھلائی کی اُمید ہو سکتی ہے؟''

لینسبری کی کوشش:

''ان بزرگ کے افکار کے بعد مسٹر کلائنس اور لینسبری نے صدر کانفرنس سے کہہ کر مجھے پانچ منٹ تو تقریر کے لیے دِلا ہی دیئے اور جس انداز سے میں نے تقریر کی، اُس نے سامعین کو اتنا محفوظ کیا کہ صدر کی گھنٹی تین بار بجی مگر ہر بار سامعین چلا چلا کر کہتے رہے کہ ''ابھی اور تقریر کرنے دیجیے، ابھی اِنہیں نہ روکیے۔'' ''آپ بولے جائیں، آپ ابھی تقریر ختم نہ کریں'' اور جب چوتھی بار صدرِ جلسہ نے گھنٹی بجائی تو یہ کہہ کر بجائی کہ ''اب تقریر بیس منٹ لے چکی ہے اور ابھی کام بہت باقی ہے، میں خود معزز مقرر کو ابھی اور سننا چاہتا ہوں مگر کیا کروں، مجبور ہوں۔''

اُس دِن سے مسٹر میکڈانلڈ تادم مرگ محمد علی سے خفا رہے، بہر حال اِس کے علاوہ محمد علی کے وفد یورپ کی کوششوں کے متعلق اور بھی خاصے معلومات حاصل ہوتے ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ان لوگوں نے یورپ بھر میں گھوم گھوم کر اپنے مقاصد کی تبلیغ کی ہے۔

فرانس میں تقریریں:

فرانس میں بھی محمد علی اور مسٹر سیّد حسین نے نہایت معرکتہ الآرا تقریریں کیں اور فرانس کی کم از کم اخلاقی ہمدردی حاصل کرنے کی پوری کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

پاپائے رومہ سے ملاقات:

پھر محمد علی نے پاپائے رومہ سے ملاقات کی اور اُن کے سامنے بھی اپنے مقاصد و داعیات کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا، مسلمانوں کے وہ تاثرات بیان کیے جو اُنہیں ترکی حکومت کے ساتھ وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ خلیفۃ المسلمین کی جو حیثیت مسلمانوں میں ہے، اُسے بیان کیا۔

مسٹر لائڈ جارج سے ملاقات:

پھر محمد علی مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم کے حضور میں باریاب ہوئے۔ لائڈ جارج کا اُس وقت طوطی بول رہا تھا، بڑے کرّ وفر سے اُس نے وزارت اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے اُس نے اپنے وقار و تمکنت کی نمائش کی۔ اُس زمانہ کا لائڈ جارج وہ تھا جب سارے یورپ پر اُس کے تدبر، اُس کی قابلیت اور اُس کی گراں مایہ خدمتِ ملّی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

محمد علی مسٹر لائڈ جارج سے ملے اور آزادی و بے باکی اور معقولیت اور متانت سے مسلمانوں کے مطالبات پیش کیے، گورنمنٹ کے وعدے یاد دلائے، وہ نتائج و عواقب پیش کیے جن سے برطانیہ کو دوچار ہونا پڑتا۔ خلیفہ اور خلافت کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے پیش کی، پھر مسلمانانِ ہند کی وفاداریوں کا تذکرہ کیا، یہ یاد دلایا کہ مسلمانوں نے کس طرح گورنمنٹ کے وعدوں پر اعتبار و اعتماد کر لیا اور پھر اب کس طرح خود گورنمنٹ اپنے تئیں وعدہ خلاف ثابت کر رہی ہے۔

ناکامی:

لیکن محمد علی کی تمام کوششیں، ساری تقریریں اور کل پروپیگنڈا بے کار ثابت ہوا۔ برطانوی قوم وفا پرست اور ایفائے عہد کرنے والی قوم نہیں ہے، وہ ہمیشہ قوت کے دیوتا کو سجدہ کرتی ہے اور کمزوری کے مجسمہ کو حقارت سے ٹھکراتی ہے۔ وہ دُور بیں اور مصلحت شناس نہیں ہے، ہاں ''وقت شناس'' ہے، ''وقت'' پر وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔

تشنگیٔ معلومات:

وفدِ خلافت یورپ کے متعلق اُس وقت تک کوئی مفصل بیان نہیں دیا جا سکتا جب تک شرکاءِ وفد میں سے کوئی بزرگ اپنے قلم کو جنبش نہ دیں، اس لیے کہ اُس زمانہ کے اخبارات میں جو حالات شائع ہوئے اوّل تو وہ مفصل کارروائیوں کے اجمال کی صورت میں شائع ہوئے تھے، دوسرے وہ بھی اب ''کبریت احمر'' کا حکم رکھتے ہیں۔ باوجود تلاش بسیار وفد کے متعلق مستند ترین مفصل معلومات پیش کرنے سے معذوری ہے۔ ہاں اگر شعیب صاحب، حسن محمد حیات صاحب، عبدالرحمٰن صدیقی صاحب یا مولانا سیّد سلیمان صاحب ندوی اپنے قلم کو جنبش دیں تو یہ ممکن ہے لیکن لوگوں کا یہ بیان ہے کہ ایسا ہونا جوئے شیر کے ''خود بخود'' پیدا ہونے سے کم نہیں!

ہمیں جستہ جستہ حالات خود بخود محمد علی کے مختلف مضامین میں ضمناً حاصل ہوئے، وہ اوپر گزر چکے ہیں حسن اتفاق سے جمعیت مرکزیہ خلافت کے شائع کردہ ''حساباتِ وفدِ خلافت یورپ'' کا ایک نسخہ بھی ہاتھ آ گیا ہے۔

لوحِ سلیمان:

اِس میں مولانا سیّد سلیمان ندوی کا ایک مقدمہ بھی ہے، مقدمہ میں موصوف نے حسابات کی تفصیل وغیرہ بتائی ہے اور ضمناً وفد کی کارروائی پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ اِس وقت وہ سرسری نظر بھی بہت غنیمت ہے، اُس مقدمہ کے اہم اجزاءِ ہدیۂ ناظرین ہیں:

اعتراضِ جواب:

''یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ ہمارے اینگلو انڈین دوستوں کو وفد کے حسابات کا انتظار ہے۔ وفدِ خلافت نے کاغذات اور حسابات کو درست کر لیا تھا اور اسی لیے اُس نے حسن محمد حیات صاحب بی اے علیگ کے خدمات وفدِ خلافت کے سیکریٹری کی حیثیت سے حاصل کر لیے تھے۔ اُنھوں نے اِس فرض کو جس تندہی، جانفشانی اور محنت کے ساتھ انجام دیا اُس کی شہادت تو وہ دے سکیں گے جنھوں نے

اُن کو ولایت کے دفتر میں دو دو بجے رات تک کام کرتے دیکھا ہے یا اِس کا اندازہ کچھ وہ لوگ کر سکیں گے جن کا وفد کے اُن کاغذات، واؤچر اور رسیدات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور پرزوں کے دیکھنے کا جو دفتر خلافت کے کئی صندوقچوں میں اب تک محفوظ ہیں، دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ متعدد راتیں اُن کی مہینے میں ایسی گزرتی تھیں کہ وہ کاغذات کی ترتیب و تلاش میں درشب زندہ دار رہتے تھے اور شاید ہی تمام مدت قیام یورپ دو بجے شب سے پہلے اُن کو دِن بھر کے کاغذات سمیٹنے کے بعد بستر پر جانے کا اتفاق ہوا ہو۔ واپسی میں برنڈزی سے لے کر بمبئی تک خود اُن کے قول کے مطابق اُن کو یہ بھی بہ مشکل احساس رہتا تھا کہ وہ سمندر میں چل رہے ہیں یا خشکی پر۔ یہ پورا زمانہ اس کوشش میں صرف ہوا کہ اِدھر ہمارا جہاز بمبئی میں لنگر انداز ہو اور اُدھر اِس دفتر بے پایاں کی ترتیب و درستگی سے نجات مل جائے۔

وفدِ خلافت کے دفتر کا کام رفتہ رفتہ اِس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ تنہا ایک سیکریٹری کے بس سے باہر ہو گیا۔ اِس موقع پر ہم اپنے دوست عبدالرحمٰن صاحب صدیقی کا نام لیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے جنہوں نے محض خلوصِ خاطر اور جوشِ دینی کی بناء پر اپنی تعلیم کو خیر باد کہا اور دفتر کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور آکسفورڈ چھوڑ کر پورے چھ سات مہینے یعنی جب تک وفدِ خلافت ولایت میں رہا، وہ ہر روز صبح سے شام تک میز سے سر نہیں اُٹھاتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک تو طبعاً اُن کو اِس بدمزہ کام سے دلچسپی ہے اور دوسرے جنگِ بلقان کے زمانے میں طبّی وفد ترکی کے منیجر کی حیثیت سے چونکہ وہ اِس سے پہلے کامیاب فرائض انجام دے چکے تھے اس لیے اُن کے تجربہ سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ہاتھ آیا۔ اِس سلسلہ میں مسٹر شعیب قریشی کا نام لینا بھی ضروری ہے جنہوں نے دفتر خلافت کی عملی و تحریری امداد میں پورے چھ مہینے صرف کیے اور اِس کام کے لیے حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے بڑی قربانی گوارا کی اور اپنے فرائض کو

نہایت خوبی سے انجام دیا۔
ہمارے رئیس وفد کو حسابات کی ترتیب اور درستگی میں اس قدر اہتمام بلکہ غلو تھا کہ کبھی کبھی اُن کے ساتھ کے (مُلّا) کو غصہ آجاتا تھا، اُن کے ہاتھ سے جو اخراجات ہوتے تھے وہ روزانہ اُن کو اپنے نوٹ بک میں عموماً درج کر لیتے تھے۔ اِسی کے ساتھ اُن کا یہ بھی فرض تھا کہ اپنے بے پروا رفقائے سفر کے اخراجات کو یاد رکھیں اور رات کو سوتے وقت جب بنیوں کی طرح وہ دِن کا حساب بند کرنے بیٹھتے تھے تو حقیقت یہ ہے کہ اُن کی یادداشت پر تعجب ہوتا تھا۔“

ترتیبِ حساب کے مشکلات:

”محمد علی صاحب کی کوشش تھی کہ روز کا روز حساب ہو جایا کرے لیکن جب تک لندن میں قیام رہتا، یہ کام آسان تھا۔ لیکن مشکل یہ آن پڑتی تھی کہ ہر دوسرے تیسرے ہفتہ میں مختلف دورے اور سفر پیش آجاتے تھے، اِس رواروی میں حسابات کا مرتب رکھنا اور ریل اور جہاز میں بیٹھ کر روز روز کی میزان لگانا عملاً کس قدر مشکل تھا۔ ایک معمولی سفر میں تو انسان بدحواس ہو جاتا ہے، پھر ایسے دُور دراز سفر میں جہاں 24 گھنٹے کے اندر متعدد ملک، متعدد قوموں اور متعدد زبانوں سے واسطہ پڑتا تھا، ریل کے ہچکولے، جہاز کی طوفانِ خیز موجیں قوائے دماغی و جسمانی کو درہم کر دیتی تھیں۔ دفترِ حساب کھول کر بیٹھنا اور اُن کو صاف کر لینا کس قدر مشکل بلکہ عملاً محال تھا، اس دوڑ بھاگ اور چل پھر میں چھوٹے چھوٹے کاغذات، ہوٹل کے بلوں، ڈاک، تار اور ادائے زر کی رسیدوں اور واؤچروں کو سنبھال کر رکھنا اور گاڑی، ٹیکسی، قلی، ریل جہاز ریفریشمنٹ روم، خریدِ اخبارات وغیرہ کی ادا کاریوں کو ہوٹل پہنچ کر اطمینان کے ساتھ بیٹھنے تک یاد رکھنا اور اُن کو نوٹ بک پر ٹانکتے جانا معمولی کام نہ تھا۔
اِس سے زیادہ دقت یہ تھی کہ یورپ کے مختلف ملکوں میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ آج

انگلستان ہیں، کل فرانس، پرسوں سوئٹزر لینڈ، چوتھے دِن اٹلی، یورپ کے مسافروں کو معلوم ہے کہ یورپ کے سفروں میں سکوں کے مبادلہ کی کس قدر غیر معمولی دقتیں پیش آتی ہیں، ہر جگہ نئے سکہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور دوسرے ملک کا سکہ وہاں بیکار ہو جاتا ہے۔ اِس سے کسی ایک سکہ میں حساب کی یکسانی کا قائم رکھنا محال تھا، جب ایک ملک سے دوسرے ملک کو جانا ہوتا تھا تو اُس ملک کے تمام سکوں کو دوسرے ملک کے سکوں میں تبدیل کرانا پڑتا تھا، اِسی طرح مختلف سفروں سے لوٹ کر جب ہم اپنے مستقر پر پہنچتے تھے تو سیکریٹریوں کو کئی کئی دِن اُن سکوں کو انگریزی سکوں میں تبدیل کر کے حساب درست کرنے میں لگ جاتے تھے اور پھر بھی مشکوک رہ جاتے تھے۔

مشکلات کا اب بھی خاتمہ نہیں ہوا ہے، یورپ میں ہر روز ہر شخص کا پہلا کام یہ ہے کہ اخبارات کے کالموں میں سکوں کی قیمت پڑھ لے۔ جس زمانہ میں ہمارا وہاں قیام تھا یہ حال تھا کہ ہندوستانی، فرانسیسی، سویس اور اٹالین سکوں کی قیمت ہر روز بلکہ کبھی کبھی دِن میں کئی کئی دفعہ اُترتی بڑھتی رہتی تھی۔ ہمارے پاس ہندوستان سے روپیوں کی صورت میں رقم بھیجی جاتی تھی، وہاں ہم کو انگریزی پونڈ کی شکل میں ملتی تھی۔

روپیوں کا بھاؤ کسی ایک نظام پر نہ تھا۔ اب اِس پونڈ کو لے کر جو ہم فرانس پہنچے تو اِن کو فرانک بنانا پڑا۔ ہر روز فرانک کا نرخ گھٹتا بڑھتا رہتا تھا، وہاں سے اٹلی جانا ہوا تو فرانک کو لیرہ کی شکل میں بدلوانا پڑا۔ ایک پونڈ کے مقابلہ میں 40 فرانک سے 55 بلکہ 60 فرانک تک ہر روز اُلٹ پھیر ہوا کرتا تھا۔ اٹلی کا سکہ ایک پونڈ کے مقابلہ میں 50 سے لے کر 80 تک بدلتا رہتا تھا۔ ایسی حالت میں ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ وفدِ خلافت کے حسابات کی ترتیب اِس قدر آسان نہ تھی جس قدر بظاہر نظر آتی ہے۔ اس وقت وفدِ خلافت کے کاغذات یورپ کے سفر کردہ ملکوں کے اقتصادیات اور اکانومیکل عجائبات کا مجموعہ ہے۔ اب ہندوستان پہنچ کر ان تمام مختلف سکوں کو

جن کا ہر روز نیا نرخ تھا، روپیوں کی شکل میں لا کر حسابات کو درست کرنا ایک دو ماہ کا کام نہ تھا۔

اِس پر بھی ہمارے رئیس وفد کا عزم یہ تھا کہ واپسی میں 20-15 دِن جہاز میں بیٹھ کر اِن تمام دقتوں کے بحر بیکراں کو بھی طے کر لیا جائے گا، مگر جہاز میں بیٹھ کر اِن کاغذات کے صندوق کو کھول کر ترتیب دیا جانے لگا تو معلوم ہوا کہ اِس آبی سمندر کا طے کرنا تو آسان ہے مگر یہ ''حسابی سمندر'' صرف ایک دو آدمیوں کی محنت سے قطع نہ ہو سکے گا، تاہم یہ پورا سفر وفد کے سیکریٹری نے اِن کاغذات کی ترتیب اور حسابات کی درستگی میں صرف کیا۔ خیال تھا کہ ساحل بمبئی پر پہنچ کر چند ہفتوں میں یہ کام ختم کر دیا جائے گا، مگر کس کو نہیں معلوم کہ اُس دِن سے جس دِن کی صبح کو وفدِ خلافت بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا، رئیس وفد کو تحریک کی اشاعت، تقریر، تحریر، دورہ اور سفر میں ایک دِن کی مہلت اپنے ذاتی کاموں تک کی بھی نہ مل سکی، یہاں تک کہ لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ اُسی زمانہ میں جبکہ اُن کی دو لڑکیوں کی شادیاں ہوئیں تو اُن کو اُس تقریب میں بھی ایک دو دِن سے زیادہ شرکت کا موقع نہ ملا اور سمدھی کو بیگانوں کی طرح فقط اِس فرض کا تماشہ دیکھنا پڑا، اور اِن سب پر مزید یہ کہ جامعہ ملیہ (نیشنل مسلم یونیورسٹی کے معلّموں اور پروفیسروں کی تلاش، نصاب کی تیاری، جامعہ کی تنظیم کا عظیم الشان کام اُن کے سر آ پڑا اور اُن کو پورے تین مہینے تک پرنسپلی کے فرائض انجام دینے پڑے جس کے درمیان میں اُن کو کسی اور کام کے لیے چند لمحے بھی بمشکل میسر آ سکتے تھے اور وہ بھی علی گڑھ کالج اور علی گڑھ ضلع کے حکام کے ساتھ ناگوار قصوں کی تحریری و تقریری جواب دہی میں صرف ہوئے۔

الغرض 14 اکتوبر 1920ء سے لے کر 14 ستمبر 1921ء تک یعنی ولایت کی واپسی سے یوم گرفتاری تک اُن کو چند دِن بھی ایسے نہ ملے جو اطمینان سے بیٹھ کر باقی

کاغذات کو دیکھ سکتے، اس ایک سال کا ایک ایک دِن مختلف شہروں کے دورے مختلف صوبوں کے سفر، ہزار ہا مجلسوں، کانفرنسوں اور انجمنوں کی شرکت وتقریر اور لوگوں کے ہجوم ملاقات کے نذر رہوا۔

لیکن ترتیبِ حسابات کا جو بوجھ اُن پر تھا وہ اِن تمام مشغول ومصروف اور اہم ونازک حالات میں بھی اُن کو فراموش نہ ہوتا تھا۔ بہار، آسام، بمبئی، ممالکِ متوسطہ اور مدارس کے تمام سفروں میں حسابات کے صندوق اور سیکریٹری اُن کے ساتھ ساتھ ہی اور ریلوں، اسٹیمروں میں یا جائے قیام پر جہاں بھی کچھ تھوڑا سا وقفہ اُن کو مل سکا، سکون وآرام کو چھوڑ کر وہ اُن کاغذوں کو لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دوروں اور سفروں میں اُن کے اردگرد خلقت کا کس قدر ہجوم ہوتا تھا، ملاقاتیوں کی کس قدر کثرت ہوتی تھی، دن بھر میں اُن کو کتنی تقریریں کرنی پڑتی تھیں، کتنے مضامین اور پیامات لکھوانے پڑتے تھے کہ اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا مشکل تھا مگر قوم کو اپنے رئیس وفد کے دِل ودماغ پر ناز کرنا چاہیے کہ اِن مشکلات وعوائق وموانع انبار کے باوجود اُنہیں پراگندہ اور منتشر ایام میں حسابات کی ترتیب کا آدھے سے زیادہ کام وہ انجام دے چکے تھے کہ دفعتاً 14 ستمبر 1921ء کو اُن کی گرفتاری پر اُن کی اِس سخت مصروفیت و مشغولیت کا مجبورانہ خاتمہ ہوگیا۔ ناچار اُن کے لائق سیکریٹری حسن محمد حیات صاحب نے اِس ادھورے کام کو پورا کرنا شروع کیا اور بالآخر آج یہ اِس قابل ہوا کہ آپ کے سامنے پیش کیا جاسکے۔''

وفدِ خلافت کی عظمت واہمیت:

''وفدِ خلافت کا انگریزی نام ''انڈین خلافت ڈیلیگیشن'' تھا، وہ ہندوستان سے نہ صرف 7 کروڑ مسلمانوں کی زبان بن گیا تھا بلکہ جیسا کہ لوکمانیہ تلک آنجہانی نے وفد خلافت کو رخصت کرتے ہوئے کہا تھا، وہ متحدہ ہندوستان کی طرف سے پیام لے کر

ہندوستان کی بے وقعتی نہ ہو اور اعلیٰ پوزیشن کے لوگوں کو ان ہوٹلوں کے پتے سے مراسلت کرنے اور وہاں آنے جانے اور دعوت قبول کرنے میں جھجک نہ ہو۔''

وفد کے ارکان کارکن اور عملہ:

''ہندوستان سے ہم چار آدمی جہاز پر روانہ ہوئے۔ مولانا محمد علی، مسٹر سیّد حسین حیات صاحب اور خاکسار۔ کچھ دِنوں کے بعد مولوی ابوالقاسم صاحب کا اضافہ ہوا اور اس کے بعد شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی آئے۔ خلافت وفد اور ''مسلم آؤٹ لک'' کے دفتروں کی نگرانی، ترتیب و اہتمام کے لیے عبدالرحمٰن صاحب صدیقی (آکسفورڈ) ہمارے ساتھ قیام کرنے پر رضا مند ہوئے۔ ''مسلم آؤٹ لک'' کی ترتیب اور ایڈیٹری اور محمد علی صاحب کی تحریری اعانت کے لیے شعیب قریشی صاحب (حال ایڈیٹر ''نیو انڈیا'') و ''انڈی پینڈنٹ'' کو محمد علی صاحب نے مجبور کرنے کر کے اپنے ساتھ رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں صاحبوں کی ذات سے ڈیلی گیشن کے کاموں میں ایسی اعلیٰ امدادیں ملیں جن کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے، حالانکہ اُن کو اس کے سبب سے اپنا ایک پورا ٹرم (دورۂ تعلیم) قربان کرنا پڑا اور مزید قیام کے لیے اُن کو زائد روپے کی فکر کرنی پڑی اور وطن کامیاب لوٹ کر آنے کی آرزو میں چھ سات مہینہ کا وقفہ اُن کو گوارا کرنا پڑا۔

معزز کارکنوں میں کبھی کبھی مسٹر پکتھال (حال ایڈیٹر ''بمبئی کرانیکل'') اور مسز سروجنی نائیڈو اور اکثر مسٹر ہارنیمین (سابق ایڈیٹر ''بمبئی کرانیکل'') اور عبدالقیوم ملک صاحب ایڈیٹر ''مسلم آؤٹ لک'' اور محمد حبیب صاحب بی اے (آکسفورڈ) کی معیت کا شرف بھی ڈیلی گیشن کو حاصل رہا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی احباب اور طلبہ بھی اپنی مہربانی اور محبت سے کبھی کبھی ہم کو سرفراز کیا کرتے تھے، اُن سے دفتر کے اور دوڑ دھوپ کے مختلف کام لیے جاتے تھے۔ فرانس میں موسیو لوکو نیر، موسیو والدام

میدموزل پورواور ڈاکٹر رشاد ہمارے دست و باز و تھے۔ اٹلی میں غالب کمال بے (سفیر ترکی)، ڈاکٹر عبدالحمید سعید (مصر)، نوری عزیز (ترک تاجر)، شیخ خالد (طرابلسی) وغیرہ ہمارے اعوان و مدد گار تھے۔

تنخواہ دار کام کرنے والوں اور نوکروں میں ایک ٹائپسٹ اور جب زیادہ کام ہوتو دو ٹائپسٹ اور ایک دفتر وڈاک کا ملازم، ایک باورچن، ایک مددگار باورچن اور جھاڑو اور صفائی کے لیے ایک ملازمہ اتنے آدمی شامل تھے۔ اکثر نامہ نگاروں، مختلف اخباروں کے نمائندوں، سیاسی پارٹیوں کے ارکان، پارلیمنٹ کے ممبروں، اہم اور بااثر اشخاص کو بھی مدعو کرنا ضروری ہوتا تھا اور جب پیرس اور روما میں جانے کا اتفاق ہوتا تو اکثر اپنے ترک، عرب اور دیگر مسلمان بھائیون کی میزبانی کی عزت بھی حاصل ہوتی تھی۔''

یورپ کی گرانی:

''یورپ کی گرانی جنگ سے پہلے ہی کیا کم تھی اور جنگ کے بعد تو قیاس وشمار سے باہر ہوگئی تھی جس کا اندازہ لگانا اُن لوگوں کے لیے بہت مشکل ہے جن کو ممالکِ یورپ کے سفر کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ ہندوستانیوں میں سے جنہوں نے بمبئی دیکھی ہے اور وہاں کے مصارف کا اُن کو تجربہ ہے، وہ ایک ہلکا خاکہ یورپ کے مصارف اور گرانی کا کرسکتے ہیں۔ وہاں مکانات کا کرایہ، ہوٹلوں کا بل، نوکروں کی تنخواہ ماہوار نہیں بلکہ ہفتہ وار کے حساب سے ادا کرنا پڑتی ہے۔ متوسط ہوٹلوں (مثلاً کرزن ہوٹل) کے چار کمروں اور ایک دفتر اور ملاقات کے کمرہ کے لیے ایک ہفتہ میں 55 پونڈ صرف قیام کے ادا کرنے پڑے اور 28 پونڈ کھانے کے، یہ خرچ اس قدر گراں نظر آیا کہ جلد از جلد کسی پرائیوٹ مکان میں رہنے کا انتظام مناسب معلوم ہوا، چنانچہ ایک پرائیوٹ مکان کے خاندان میں مل کر 'یویا ہاؤس' میں اُٹھ گئے۔ وہاں 53 پونڈ فی ہفتہ صرف

رہنے کے دینے پڑے۔ اُس کو بھی چھوڑ کر ایک مستقل اپنا مکان (فلیٹ) البرٹ ہال مینشن میں لیا جس کا کرایہ قیام 18 پونڈ فی ہفتہ تھا۔ چنانچہ یکم اپریل 1920ء سے یکم ستمبر 1920ء تک اُسی مکان میں ہمارا قیام رہا اور کھانے کا انتظام بھی گھر ہی پر کیا گیا۔ روزانہ 8 آدمی سے لے کر 12 آدمی تک کی اوسط ہمارے مطبخ کے مستقل شرکاء کی رہتی تھی اور جب کبھی مہمانوں کی کثرت ہوتی تھی تو یہ تعداد 16-15 تک بڑھ جاتی تھی، تاہم اِس انتظام سے ہوٹل کی بہ نسبت کھانے کے مصارف بھی کم ہو گئے۔

ایک ٹائپسٹ کی تنخواہ ہندوستان میں چالیس پچاس روپے ماہوار ہے، لیکن انگلستان میں 4 پونڈ یعنی 60 روپیہ فی ہفتہ یعنی 240 روپے ماہوار تھا ہندوستان میں 10,12 روپے میں اچھے ملازم ملتے ہیں، وہاں کم وبیش ایک پونڈ فی ہفتہ یا ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ ہوتی ہے۔ کھانے کی مد میں صرف ایک حساب سن لیجیے کہ ایک انڈے کی قیمت 5 (پونڈ) ہے، پیرس میں تو اور غضب ہے پانی جو ہر جگہ مفت ہے مگر وہاں عموماً کھانے کے ساتھ ہوٹلوں میں شراب پیتے ہیں اور متقی لوگ سوڈا لیمونیڈ وغیرہ۔ اِس سے بھی زیادہ ہم جیسے دینداروں کو اپنی دینداری کی قیمت میں سادہ معدنی پانی پینے کی قیمت 2 (پونڈ) بوتل ادا کرنا پڑتی تھی کیونکہ اہل پیرس نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہاں معمولی سادہ پانی مضر صحت ہے اور اُس کا پینا قابل احتراز ہے۔

آپ کسی ہوٹل میں کھانا کھانے گئے، دربان نے جھک کر شیشہ کے بند دروازے کو کھولا اور جھک کر تعظیم دی، آگے بڑھ کر کلوک روم جہاں آپ اپنا لبادہ اتاریں گے اور چھڑی چھتری رکھیں گے، وہاں کے ملازموں نے آپ کو اس کام میں مدد دی، یہاں سے نکل کر آپ میز پر جا کر بیٹھے، خانساماؤں نے آپ کو کھانا کھلایا۔ فراغت کے بعد جب آپ نے کھانے کا حساب چکایا تو جس قدر ہوٹل کا چارج ہوگا، اُس کا

دسواں حصہ آپ پر فرض ہے کہ خانساماؤں کو ''جبری انعام'' ٹپ عطا کریں اور اس کے جواب میں شکریہ، جناب کی سندِ خوشنودی حاصل کریں، یہاں سے نکل کر محاسب کے پاس گئے، اُن کے پاس کچھ دام اخلاقاً چھوڑے۔ کلوک روم میں اپنے کوٹ اور چھڑی چھتری کی واپسی کے لیے گئے۔ اِس قلیل مدت میں اپنی چیزوں کو غیروں کے دست برد سے حفاظت اور ''پروٹیکشن'' کا خرچ ادا کرنا لازم ہوا، پھر دربان کی خوش اخلاقی کا معاوضہ ضروری ہے۔ غرض اِس طرح کھانے کے علاوہ بالائی مصارف بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ آپ جب کسی گاڑی، موٹر ٹیکسی پر بیٹھیں گے تو کرایہ کے علاوہ ڈرائیور کو 6 پنس دینا بھی کرایہ کا ایک جزو ہے۔

مغربی سیاحوں کو جس قدر مشرقی ممالک کے ملازموں کی ''بخششیں'' پر غصہ اور تعجب آتا ہے، مشرقی سیاحوں کو مغربی ممالک کے ملازموں کو ''ٹپ'' پر اِس سے کم غصہ اور تعجب نہیں آتا۔

سفر کا حال یہ ہے کہ براعظم یورپ کی تیز ریل گاڑیوں کو (کانٹی نینٹل ایکسپریس ٹرینوں) میں فرسٹ اور سیکنڈ دو ہی درجے ہوتے ہیں، لیکن سیکنڈ کلاس میں سونے کی جگہ نہیں ہوتی، اس لیے بڑے سفروں میں سونے کے فرسٹ کلاس میں جانے سے چارہ نہ تھا۔ قلیوں کو آپ دو چار آنے دیتے ہیں، وہاں دو چار روپیوں سے کم نہیں لیتے۔ ہم لوگوں کے سامان کے اُتارنے چڑھانے کی مزدوری 5 کے قریب لیتے تھے، ٹیکسی کا کرایہ پہلے کچھ تھا لیکن ہمارے جانے کے بعد 50 فیصدی کا اضافہ ہو گیا۔ اِدھر آپ نے ٹیکسی پر قدم رکھا اور وہاں 10 پنس پر میٹر کی سوئی آ گئی۔ غرض وہاں کھانا پینا، چلنا پھرنا، اُترنا چڑھنا، بولنا چالنا ہر چیز ''قیمت طلب'' ہے۔

دوسرے تبلیغی مصارف:

''ڈاک کا خرچ آپ دو پیسے اور اب ایک آنہ لفافہ دیتے ہیں، وہاں 3 ہے۔ تار کا

خرچ یہاں ایک آنہ لفظ ہے وہاں سے ہندوستان ضروری تار کے لیے شاید ڈیڑھ شلنگ فی لفظ دینا ہوتا تھا۔ جب کبھی جلسہ کرنا ہوتا تھا تو کوئی ہال چند گھنٹوں کے لیے کرایہ پر لینا پڑتا تھا جس کے لیے 25 تا 33 پونڈ ادا کرنے ہوتے تھے۔ جو لوگ اس کا انتظام کرتے تھے اُن کو اشتہارات کی چھپائی، تقسیم، اخبارات میں اطلاع، روشنی اور کرسیوں کا کرایہ، لوگوں کو بلانے کا خرچ دینا پڑتا تھا۔ چنانچہ کنگزوے کے جلسوں میں 33 پونڈ ہال کا کرایہ تھا اور ڈھائی سو، تین سو پونڈ اِن مصارفِ بالا کے لیے ادا کرنے پڑتے تھے۔ چنانچہ کنگزوے اور کیکسٹن ہال کے ایک ایک جلسہ کا خرچ تین سو، سوا تین سو پونڈ ہوتا تھا۔ مانچسٹر میں ایک جلسہ ہوا اور دو سو پونڈ خرچ ہوئے۔

''مسلم آؤٹ لک'' جو پہلے سے جاری تھا، جب ہم وہاں پہنچے ہیں تو کمی آمدنی کے باعث نزع کی حالت میں تھا۔ ہم کو اپنی تبلیغ اور ضروری مضامین اور اطلاعات اور جلسوں کی کارروائیوں اور خبروں کی اشاعت کے لیے اخبارات کی ضرورت تھی۔ انگلستان کے مشہور و ممتاز اخبارات نے اور خصوصاً ''ٹائمز'' نے جو مخالفت کا رویہ اختیار کیا، اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ مضامین تو مضامین ہمارے اشتہارات وہ قیمتی معاوضہ پر بھی شائع نہیں کرتے تھے۔ لے دے کر مزدور طبقہ کے اخبارات ''ڈیلی ہیرلڈ''، ''فارن افیئرز'' وغیرہ سے معاملہ کرنا پڑا۔ کانگریس کے اخبار ''انڈیا'' کو مدد دے کر اپنے ساتھ لیا، ''مسلم آؤٹ لک'' کے مصارفِ طبع و اشاعت کا سارا بار اٹھایا، ''مسلم آؤٹ لک'' پر کم و بیش 20 پونڈ فی ہفتہ کا خرچ تھا اور کبھی حجم بڑھ جاتا تو 25، 30 سے 40، 50 پونڈ تک خرچ ہو جاتے تھے اور تقریباً چھ سات مہینے اس خرچ کے ساتھ ہم لوگوں نے اُس کو نکالا۔

''ڈیلی ہیرلڈ'' یا ''فارن افیئرز'' میں ہمارے مضامین اور اعتراضات کے جوابات چھپتے تھے، اشتہارات نکلتے تھے۔ ''ڈیلی ہیرلڈ'' کے نصف کالم سے بھی کم کے اشتہار

کے لیے 85 پونڈ دینے پڑتے تھے، ''فارن افیئرز'' کا ایک خاص خلافت نمبر نکلوایا تھا اس کو ۵۰۰ پونڈ دیئے۔ شاید ہندوستان میں ہمارے احباب اس کو بہت زیادہ رقم خیال کریں گے لیکن اِسی کے مقابل میں جب ارمنی اور یونانی اشاعات (پبلی کیشن) اشتہارات اور پروپیگنڈے کے مصارف کو آپ دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ ان کے لاکھوں کا ہم ہزاروں سے اور ان کے ہزاروں کا ہم سیکڑوں سے مقابلہ کر رہے تھے۔

یورپ میں پروپیگنڈے کی ایک عام صورت مضمون نگاروں، نامہ نگاروں اور خبر نویسوں کی خاطر مدارت اور میزبانی ہے۔ کسی بڑی اہم آمد پر اسٹیشن پر اترنے کے ساتھ نامہ نگاروں، انٹرویو کرنے والے اور فوٹو گرافروں کا اژدہام ہو جاتا ہے۔ پھر آپ اپنی خواہش اور انتخاب کے مطابق مختلف بڑے بڑے اخبارات کے ایڈیٹروں، نامہ نگاروں، خبر نویسوں کی دعوت دیں گے اور اپنے معاملہ کے متعلق گفتگو کریں گے یا اُن کو انٹرویو میں اپنا بیان لکھائیں گے اور اِس خالص علمی و سیاسی خدمت کے لیے کچھ نہ کچھ اعزازی خراج آپ پر واجب ہوگا۔ دو چار اخبارات کے وقایع نویسوں کو اپنے ساتھ لگائے رکھنا پڑے گا جو وقت بوقت آپ کے کاموں کے متعلق اخبارات میں خبریں چھپوا دیا کریں۔ ایک دو اخبارات کے شیئر خرید کر کے اُن کا حصہ دار بننا پڑے گا کہ یہ اعزازی معاوضہ کی صورت ہے۔

غرض یورپ کی اقتصادی تجارت کے علاوہ یہ سیاسی تجارت بھی کچھ کم آمدنی کا ذریعہ نہیں اور غریب مشرقی وفدوں کو اُن کی اعانت طلبی سے چارہ نہیں۔

ہمارے جانے سے پہلے سر آغا خاں، مسٹر ایچ۔ ایم۔ اصفہانی اور شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی نے لندن اور پیرس میں اسلامک انفارمیشن بیورو قائم کرائے تھے اور اُن کے لیے کچھ رقم بھی جمع کی تھی مگر جب ہمارا وفد پہنچا تو یہ دونوں بیورو تقریباً دیوالیہ

ہو چکے تھے۔فرانس کے مسلم بیورو کے صدر شریف پاشا تھے جو مالدار آدمی تھے مگر وہ کنارہ کش ہو گئے تھے۔ چونکہ اِن دونوں بیوروں نے حقیقت میں بہت کام انجام دیئے تھے اور دے رہے تھے اور دے سکتے تھے، اس لیے اُن کی امداد لازم تھی۔لندن بیورو کے ہفتہ وار اخبار ''مسلم آؤٹ لک'' کی چھپائی اور اشاعت کا تمام بار ہمارے سر رہا۔ پیرس اسلامک بیورو اور اس کے پانزدہ روزہ اخبار ''ایکو دی اسلام (صدائے اسلام) کے بیشتر مصارف وفدِ خلافت کے سرمایہ سے ہوتے رہے، یہاں تک کہ چلتے ہوئے بھی ڈاکٹر رشاد (ایڈیٹر ''ایکو دی اسلام'') کو اس کے لیے کچھ دے کر آنا ضروری تھا۔

اِس کے علاوہ انگریزی اور فرنچ زبانوں میں رسائل اور مضامین کے طبع و اشاعت کا سلسلہ تھا۔اہم مضامین خلافت، اسلامی ممالک کی کیفیت، سمرنا اور تھریس کے مظالم کی رودادیں اور مردم شماری، جلسوں کی تقریریں اور ہندوستانی جلسوں کی رودادیں پمفلٹ اور رسالوں کی صورت میں چھپوا کر اخبارات میں اربابِ سیاست کے پاس پارلیمنٹ کے ممبروں کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے اور لوگوں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔''

ڈنر:

''یورپ کے کاروبارِ زندگی میں فرصت کے اوقات بہت کم ہیں۔رات کے کھانے کے بعد جو وقت ہے، وہ کھیل تماشوں کے لیے مخصوص ہے۔وہاں اہم معاملات پر گفتگو اور مطمئن ملاقات کا وقت صرف رات کے کھانے (ڈنر) کا وقت ہے۔اُس وقت کا کھانا وہ لوگ بہت دیر میں وقفہ کے ساتھ اور بہت ٹھہر ٹھہر کر کھاتے ہیں۔یہ کھانا عموماً احباب اور اعزہ کے لطفِ صحبت اور پر مذاق گفتگوؤں کے درمیان میں ڈیڑھ دو گھنٹے میں ختم ہوتا ہے۔تمام یورپ میں باہمی گفتگو ملاقات اور مبادلہ خیالات

کا یہی بہترین وقت ہے۔ جو لوگ کسی سے مطمئن ملاقات کرنا چاہتے ہیں وہ عموماً اُس کو اِسی موقع پر آنے کی تکلیف دیتے ہیں۔

اِسی بنا پر تبلیغ و اشاعت کی عام صورت یہ ہے کہ اہم اشخاص اور جماعتوں کو شام کے کھانے (ڈنر) پر بلایا جائے اور میز پر بیٹھ کر اپنے معاملہ پر اُن سے مشورہ، گفتگو اور مبادلہ خیال کیا جائے۔ ہم لوگوں کو بھی اِس سے کام لینا پڑا، بہت کم ہفتے ایسے گزرتے تھے کہ جس میں ایک یا چند اشخاص کو ڈنر دینا نہ پڑتا تھا کہ اِس کے سوا اُن سے گفتگو اور مبادلۂ خیال کی کوئی صورت نہ تھی اور اس پر بھی اُن کا احساس ہوتا تھا کہ وہ اُس کو قبول کرتے تھے۔ کبھی پارلیمنٹ کے ممبروں کو، کبھی لیبر پارٹی کے ممبروں کو، کبھی کسی اخبار کے نامہ نگار کو، کبھی یونیورسٹی کے پروفیسروں کو، کبھی اربابِ سیاست کو ڈنر پر مدعو کرنا ہوتا تھا اور باتوں باتوں میں اُن کو اپنا مقدمہ سمجھایا جاتا تھا، اُن کے شکوک کو دُور کیا جاتا تھا اور اپنی جماعت واعانت کے لیے اُن کو آمادہ کیا جاتا تھا۔

اِس قسم کے اخراجات پیرس میں زیادہ پیش آئے۔ وہاں ایک دفعہ 30 یا 40 آدمیوں کو یعنی پیرس میں جس قدر ترکوں کے حامی یا مشرقی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے تھے، سب کو مدعو کیا اور کھانے کے بعد حمایتِ اسلام کی ایک نئی مجلس کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے بعد روزانہ ایک ایک شعبہ کے اکابر کو بلا بلا کر دعوت دی گئی اور اُن کو کھانے کی میز پر بٹھا کر اپنا مقدمہ سمجھایا گیا اور اُن کو اپنا ہمدرد بنایا گیا۔

اُن لوگوں کے علاوہ پیرس اور اٹلی میں ترکوں، عربوں، مصریوں، ایرانیوں، روسی مسلمانوں، ٹیونسیوں (تیونسیوں)، البانیوں وغیرہ کی بڑی جماعت ہے۔ اُن کے تعارف حاصل کرنے کے لیے اور اُن کو ہم آہنگ بنانے کے لیے وقتاً فوقتاً میز پر یکجا کرنا پڑتا تھا اور اُن میں اپنے کام کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ اِس ذریعہ سے ممالک اسلامیہ میں مسئلہ خلافت اور ہندوستان کے کارناموں کی اہمیت سمجھانے میں بڑی

مد دلی اور اُس اتحادِ اسلامی کے سنگِ بنیاد قائم کرنے کا بہترین موقع میسر آیا جس سے بڑی بڑی اُمیدیں اور توقعات قائم ہیں۔ سعد پاشا زاغلول کے مصری وفد اور حجازی عربوں کے ڈیلی گیشن اور تیونسی وفد کو اپنے ہاں کئی دفعہ بلایا۔ اٹلی میں ترکوں، مصریوں اور طرابلسیوں کو ڈنر دیئے۔

الغرض اِس تمام تفصیل سے یہ معلوم ہوگا کہ وہاں کام کا بڑا لیکن گراں ذریعہ ڈنر اور دعوت ہے، اِسی لیے آپ کو وفد کے حسابات کی تمام مدوں میں سے اس مد میں سب سے زیادہ رقم (بشمول کرایہ مکان و ہوٹل اور متفرقات (دُھلائی، حجامت)، نوکروں کی تنخواہ، ہوٹلوں کی ٹپ وضروریاتِ اتفاقی ارکانِ وفد وغیرہ) نظر آئے گی اور دفتر خلافت میں ہوٹلوں کے حسابات کے بل اور رسیدیں ملیں گی جن میں سے کھانے کے ہر حساب پر جہاں زیادہ صرف ہوا ہے، محمد علی صاحب کے خود اپنے قلم سے وجوہِ زیادتی اور تعداد و اسمائے مہمانان کی تفصیل لکھی ملے گی۔"

مقاماتِ سفر:

"جہاز، ریل اور سواری کی گاڑیوں کی گرانئ کرایہ کے واقعات ہم اوپر لکھ چکے ہیں لیکن اِسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا سفر صرف بمبئی سے لندن اور لندن سے بمبئی تک محدود نہیں ہے۔ ہم کو اغراضِ خلافت، وزراء اور مدبرین کی ملاقات، جلسوں میں تقریریں کرنے اور اہم ترک و عرب اشخاص سے ملنے کے لیے انگلستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کا پورا دورہ کرنا پڑتا ہے۔ انگلستان سے فرانس اور فرانس سے انگلستان ہم کو پانچ دفعہ (آمد و رفت کے دس پھیرے) آنا جانا پڑا۔ انگلستان میں ووکنگ کیمبرج، آکسفورڈ، ایڈنبرا، سوانک، مانچسٹر، اسکاربرو، گلاسگو، کارڈف میں جاجا کر جلسوں میں خطاب کیا۔ اٹلی میں روم، یورپ سے نیپلز، غالب کمال بے سے اور میلان امیر فیصل سے ملنے کے لیے گئے۔ سوئٹزرلینڈ میں جنیوا کی تیسری

سوشیالسٹ کانفرنس میں شرکت کی اور طرابلس جا کر جلاوطن ترک وعرب ومصری احرارِ اسلام سے جا کر ملاقات کی۔"

مصارف کی کل میزان:

"حسابات میں مصارف کی تمام مدیں دی ہوئی ہیں اور ہر ایک مد کی علیحدہ علیحدہ میزان بھی ہے۔ مرکزی دفتر خلافت سے وفدِ خلافت کو شروع سے آخر تک کل ایک لاکھ پچیس ہزار آٹھ سو چالیس روپیہ تین پائی مختلف تاریخوں میں دیئے گئے اور علاوہ ازیں دوسرے اتفاقی ذرائع امداد سے چار ہزار چار سو اکیس روپے سات آنے نو پائی ولایت میں ملے، کل ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب یہ رقم پہنچتی ہے۔ اِس میں سے بیس ہزار تین سو پچانوے سمرنا فنڈ کے تھے جو غالب کمال بے (سفیر ترکی متعین اٹلی) کے حوالے کیے گئے اور پندرہ ہزار دو سو چھیانوے "ڈیلی ہیرلڈ" اخبارات کے حصہ کی خریداری میں خرچ ہوئے۔ باقی تقریباً 171۔3470 دفتر کو واپس کیے گئے۔ 392 روپیہ ابو القاسم صاحب اور سیّد حسین صاحب کے ذمہ باقی ہیں، وفد کے سفر، قیام، طعام اور کاموں پر صرف ہوئے۔

مصارف کا موازنہ:

"یہ سوا لاکھ کے قریب روپے جو آٹھ مہینے کے انگلستا، فرانس، سوئٹزرلینڈ، اٹلی کے کرایہ جہاز وریل، سفر قیام، طعام، تبلیغ واشاعت وطباعت وانعقادِ مجالس ومعاوضہ مضامین ومہمان داری ومیزبانی وغیرہ میں صرف ہوئے۔ اُن کی یکجائی رقم شاید بعض حضرات جن کو یورپ کے وفود کے کاموں کا تخیل (آئیڈیا) نہیں، شاید اندازہ سے زیادہ سمجھیں۔ لیکن ہندوستان سے جن سیاسی وفود نے چند گزشتہ سالوں میں اسی قسم کے کاموں کی خاطر صرف انگلستان تک کا سفر کیا ہے، ان کے اخراجات کی مجموعی رقم

بھی اِسی کے لگ بھگ ہے۔ اُسی زمانے میں جو مصری قومی وفد یورپ میں کام کر رہا تھا، وہ کم از کم 14 ہزار پونڈ (دو لاکھ دس ہزار روپے) لے کر یورپ گیا تھا۔"

تفصیل آمد و خرچ:

مولانا سیّد سلیمان صاحب نے آخر میں آمد و خرچ کی تفصیل بھی ایزاد کر دی ہے، اپنی اہمیت کے لحاظ سے وہ بھی اس قابل ہے کہ پیش نظر رہے:

"مجلس مرکزیہ خلافتِ ہند کے اجلاس مؤرخہ 17 اکتوبر 1922ء منعقدہ دہلی میں مولانا محمد علی صاحب کے وفدِ انگلستان کے حسابات مع ایڈیٹر کے سرٹیفیکیٹ کے پیش ہوئے۔ مجلس مرکزیہ نے اِن حسابات کو بالاتفاق منظور کر کے شائع کرنے کی اجازت دی۔

اخراجاتِ وفد پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ مولانا ممدوح نے جملہ مصارف میں کفایت شعاری کو مدنظر رکھا۔ وفد کا کل خرچ پینسٹھ ہزار روپیہ کے قریب ہے۔ وفد میں چھ اصحاب تھے جو نو مہینے یورپ کے مختلف ممالک میں مسلمانانِ ہند کے جذبات کی ترجمانی کرتے رہے۔ اگر اُن کے اخراجات کا مقابلہ اُس وفد کے اخراجات سے کیا جائے جو گورنمنٹ کی دعوت پر عالی جناب سیٹھ چھوٹانی صاحب کی سرکردگی میں گیا تھا تو آسانی سے اِس امر کا احساس ہو جائے گا کہ مولانا کے وفد پر کم سے کم خرچ ہوا ہے۔ سیٹھ صاحب کے وفد میں بھی چھ اصحاب تھے، ان میں سے ہز ہائنس آغا خاں اور سیٹھ صاحب نے گورنمنٹ سے اپنا خرچ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ مسٹر حسن امام صاحب، عالی جناب ڈاکٹر انصاری صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب نے اپنے اخراجات بل پیش کیے۔ ان حضرات کے قیام انگلستان کے زمانے میں بیس پونڈ روزانہ الاؤنس بل میں رکھا تھا لیکن حکومت ہند نے صرف دس پونڈ روزانہ منظور کیا، اس پر مسٹر حسن امام نے روپیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب و قاضی

عبدالغفار نے منظور کرلیا اور اِس حساب سے اُن کو دس دس ہزار روپیہ وصول ہوا۔

اِن اعداد سے ظاہر ہے کہ مولانا محمد علی صاحب کے وفد فی کس گیارہ ہزار روپیہ خرچ ہوا اور مسٹر حسن امام کے وفد پر فی کس دس ہزار روپیہ۔ لیکن مولانا ممدوح کا وفد نو مہینے یورپ میں رہا اور مسٹر حسن امام کا وفد صرف ڈھائی ماہ انگلستان میں رہا۔ اِس حساب سے مولانا کے وفد کے مقابلہ میں گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے وفد کے اخراجات تین گنا ہوئے۔ اِن اعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن لوگوں کے خیالات پر حیرت ہوتی ہے جو مولانا محمد علی صاحب پر فضول خرچی کا الزام عائد کرتے ہیں۔''

تبصرہ:

مولانا سلیمان ندوی کے بیان کے اہم اور قابل ذکر حصص آپ کے سامنے پیش کیے جا چکے ہیں، اِن پر کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

وفدِ خلافت یورپ کی ''فضول خرچیوں'' کے متعلق طرح طرح کی ''افواہیں'' مشہور ہیں اور بہت ادعا کے ساتھ بعض حلقوں سے یہ آواز بلند ہوئی اور حسبِ ضرورت اب بھی کبھی کبھی بلند ہو جاتی ہے کہ یورپ میں ''گل چھڑے'' اُڑائے گئے، مسلمانوں کا روپیہ بے دریغ صرف کیا گیا اور اِس کا ذرا لحاظ نہ کیا گیا کہ یہ روپیہ ایک غریب و نادار قوم کی جیبوں سے نکل کر آیا ہے، لیکن اِس مفصل جواب سے یقیناً مخالفین و معاندین کے علاوہ اُن تمام حضرات کو تشفی ہو جائے گی جو واقعی اپنے دل میں کسی قسم کا شبہ رکھتے ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس سے زیادہ حزم و احتیاط اور دیانت و امانت کا کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے جس کی تفصیل صفحاتِ بالا میں گزر چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاں ہماری قوم میں بہت زیادہ محامد و محاسن ہیں، وہاں سب سے بڑی خصوصیت خاصہ اس کا ملکۂ تنقید ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زعماء پر، مخلص قائدین پر، ایثار پیشہ رہنماؤں پر جس بے دردی، سنگدلی اور شقاوت کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے، تنقید و تبصرہ کیا ہے اور بالآخر اُن کے قوائے عمل کو

مفلوج کر دیا ہے اور پھر آنسو بہائے ہیں، اُس کی مثال شاید ہی کوئی اور قوم پیش کر سکے۔

اِسی وفد کے معاملہ میں ارکانِ وفد کے ایثار، جذبۂ خدمت، استقامت علیٰ الحق، ثباتِ قدم، محنت و مستعدی اور ''ترکِ فرزند و زن'' کی داد کسی نے بھی نہ دی، لیکن حساب پوچھنے کے لیے ہر شخص آمادہ تھا اور عدم اطمینان کی صورت میں قلم اُس کے ہاتھ میں تھا، اخبارات کے کالم کھلے ہوئے تھے اور دیکھتے دیکھتے بڑے بڑے ''سنسنی خیز انکشاف'' ہونے لگتے تھے۔ بہر حال اِس موضوع پر مزید تفصیل سے گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں ہے، اس لیے صرف اِسی بیان پر اکتفا کی جاتی ہے۔

بہر حال محمد علی نے یقیناً برطانوی سیاست سے متعلق غیر ضروری حسن ظن سے کام لیا، لیکن شاید اُن کا مقصد یہ تھا کہ وہ ''دروغ گو را تا بہ خانہ باید رسید'' پر عمل کریں اور اِس پر عمل کر کے بالآخر وہ سب کچھ اُنہوں نے کیا جس کی اُن جیسے جری اور پختہ دماغ قائدِ اسلام سے توقع تھی۔

واپسی:

بالآخر پورے آٹھ ماہ تک یورپ کا دورہ کر کے محمد علی ہندوستان واپس آئے۔

استقبال:

بمبئی میں ارکانِ وفدِ خلافت کا نہایت شاندار اور قابل رشک طریقہ پر استقبال ہوا۔ اس عرصہ میں ہندوستان کی فضا اور زیادہ بدل چکی تھی اور گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف حقارت و نفرت کے جذبات پوری شدت کے ساتھ برانگیختہ ہو چکے تھے اور مسلمانوں میں ایک عام احساس پیدا ہو گیا تھا، ایسا فقید المثال کہ پھر کبھی ہندوستان کی تاریخ میں وہ نمونہ دیکھنے میں نہیں آیا، گو جوش و خروش کے بہت سے مظاہرے آنکھوں نے دیکھے۔

ناکامی کا اثر:

وفد کی ناکام مراجعت نے مسلمانوں میں اور زیادہ اشتعال پیدا کر دیا اور اب اُن کے لیے اِس کی کوئی صورت باقی نہ رہی کہ وہ ایسی گورنمنٹ سے تعاون کر سکیں جس نے پیہم وعدہ خلافیاں کیں، خلاف

ورزیاں کیں، مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالا، اُن کو فریب دیا، اور جب ایفائے عہد کا وقت آیا تو ایک ادائے دِل نوازی کے ساتھ معاملہ ہی کو سرے سے ٹالنے کی کوشش کی گئی۔

مقاطعہ:

اب مقاطعہ کی تحریک پوری شدت کے ساتھ جاری ہو چکی تھی۔ اسکول خالی ہو رہے تھے، کالج کے طلبہ اسٹرائیک کر رہے تھے، یونیورسٹی کے "اسکالر" یونیورسٹی پر لعنت بھیج رہے تھے۔ سرکاری ملازمین دھڑا دھڑ استعفے دے رہے تھے، بڑی بڑی آسامیاں اِس خندہ پیشانی سے چھوڑتے تھے گویا بہت بڑی نعمتِ عظمیٰ پا گئے۔ خان بہادروں نے اپنے خطابات واپس کیے، خان صاحبوں نے اپنے خطابات واپس کیے، حاذق الملک اور دوسرے "سروں" نے اپنے خطابات واپس کیے اور بڑے بڑے حامیٔ تعاون بزرگوں نے گورنمنٹ سے تعاون کا ہاتھ کھینچ لیا۔

لیکن اُسی زمانہ میں چشمِ حیرت نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ کوئی خطاب واپس کر کے مسلمانوں کا سرتاج بنا اور کوئی آستانۂ حکومت پر "سر" ہو گیا! اللہ رے سرکار کے اقبال...

❀❀❀

باب ۱۷

جامعہ ملیہ

محمد علی کے کارنامہ ہائے حیات کا ایک روشن ترین پہلو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس ہے۔

وفدِ خلافت جب یورپ سے ناکام و نامراد واپس آیا تو ہندوستان میں ترکِ تعاون اور ترکِ موالات کے الفاظ ہر ہندوستانی کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔

علمائے کرام بھی ایک عرصہ کے جمود و تعطل کے بعد میدانِ عمل میں اُتر آئے تھے اور نہایت جانبازی اور اخلاص کے ساتھ گورنمنٹ کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔

علی گڑھ کو دعوتِ خیر:

سب سے پہلے محمد علی نے اپنے علی گڑھ کالج کو جس سے اُنہیں محبت تھی اور جس کی تعمیر و استحکام میں وہ نہایت نمایاں حصہ لے چکے تھے، دعوت الی الخیر دی اور بتایا کہ گورنمنٹ کا مسلمانوں کے ساتھ کیا طرزِ عمل ہے، مسلمانوں نے اب ہندوستان میں رہنے کے لیے کیا وسائل اختیار کیے ہیں، اسلامی ہند کس اضطراب و اضطرار کے عالم میں ہے اور اسلامیانِ ہند نے اِس نازک وقت میں اپنی شاہراہِ عمل کیا تجویز کی ہے؟ علی گڑھ جو مسلمانوں کی آرزوؤں کا مظہر اور اُن کی دیرینہ تمناؤں کی تعبیر ہے، اُسے اِس وقت مذہب کی پکار پر سر بکف میدانِ عمل میں اتر آنا چاہیے۔ اُس کی نظر مستقبل کی مصلحت شناسیوں کی طرف نہ ہونی چاہیے بلکہ حال کی روح فرسا، ہمت شکن اور دل و دماغ کو بے چین کر دینے والی کیفیت پر ہونی چاہیے۔ علی گڑھ کے طلبہ اسلام کے سپاہی ہیں، بگل بج چکا ہے، جنگ بھی شروع ہو چکی ہے، پھر وہ کیوں مستِ خوابِ خرگوش ہیں؟

اِس پیامِ حق وصداقت کا علی گڑھ کے طلبہ پر تو ایک حد تک ضرور اثر ہوا، مگر حکام علی گڑھ، خداوندانِ علی گڑھ اور اربابِ علی گڑھ اِس ضرورت کے منکر تھے۔ مسلمان اپنا ہاتھ تعاون سے کھینچ رہے تھے اور علی گڑھ کے اربابِ حل وعقد اپنا دستِ طلب گورنمنٹ ہی کی طرف دراز کر رہے تھے۔

وہ ہنگامہ ختم ہو گیا اور بعد کو یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ اپنے قرطبہ اور غرناطہ کے نقش ثانی سے عملی زندگی میں کس قسم کی توقعات قائم کی جا سکتی ہیں اور اسلام کا درد اُن کے دل میں کہاں تک موجود ہے؟

کورٹ میں تقریر:

سب سے پہلے محمد علی اپنے رفقائے کار ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں وغیرہ کے ساتھ کورٹ کے اجلاس میں شریک ہوئے اور اُس کے ممبروں کو دعوت الی الخیر دی اور اپنی اُمید ظاہر کی کہ اسلام کے نازک وقت میں آپ لوگ جو مسلمانوں کے بھی ناخدا ہیں، اپنی جرأت وہمت سے مسلمانوں کی پیشوائی فرمائیں گے اور گورنمنٹ سے جو سرکاری تعلق علی گڑھ کو ہے، اُسے منقطع فرمائیں گے۔

کورٹ میں اُس وقت مخالف اثر پورے طور سے کام کر رہے تھے۔ چانسلر، وائس چانسلر، پرووائس چانسلر...سبھی مخالف تھے اور کسی طرح اِس تجویز پر غور کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھے اور اِسے بالکل نامنظور کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔

ملامت کا ووٹ:

چنانچہ وہی ہوا جس کی توقع تھی، یعنی اُن رہنمایانِ اسلام کے پیغام عمل کو ٹھکرا دیا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں جیسے عظیم المرتبت رہنماؤں پر ملامت کی تجویز بھی پاس کر دی گئی کہ اِن ''غدارانِ اسلام'' نے علی گڑھ جیسے سدا بہار گلشن تعلیم پر دَورِ خزاں کو دعوت دی! سزا بھی کتنی معقول تجویز ہوئی؟

اِس طرف سے مایوس ہو کر اب سوا اِس کے کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہ گیا تھا کہ طلبہ کو باقاعدہ اور براہ راست دعوتِ الی الخیر دی جائے، کامیابی کی ایک ہلکی سی اُمید یہ بھی تھی!

یونین میں تقریر:

چنانچہ ہر طرح سے طلبہ کو اُن کا بھولا ہوا سبق یاد کرا کے، پرائیویٹ صحبتوں میں نصیحت کر کے اور جامع مسجد کے جلسوں میں وعظ کہہ کے اُنہیں آمادہ کیا کہ اسلام کا سب سے زیادہ نازک وقت یہی ہے، اُٹھو اور میدانِ عمل میں آؤ کہ اِس وقت اسلام کو سرفروش سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ تمہاری تعلیم، تربیت اور نشو و نما اس لیے اور صرف اس لیے ہوئی تھی کہ تم جب اسلام پر کوئی وقت پڑے تو مردانہ وار میدانِ عمل میں اُتر آؤ، نہ اس لیے کہ اپنی ہمت ہار دو اور اغیار کو طعن و تشنیع اور تمسخر و استہزاء کا موقعہ دو۔ مسلمانوں کی شان اِس سے ارفع ہے!

یہ تقریر محمد علی نے اپنی پوری سحر کاریوں کے ساتھ علی گڑھ کالج کی یونین میں کی، پھر دوسرے زعماء اور مولانا شوکت علی صاحب نے بھی ایک درد انگیز تقریر کی۔ اِس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ یونین کے وائس پریذیڈنٹ (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ) جو اِس خیال سے آئے تھے کہ اس تعلیمی مقاطعہ کی مخالفت کریں گے، پورے طور سے مسخر ہو گئے اور اُنہوں نے بھی ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور پورے طور سے آمادگی کا اظہار کیا۔

عمل کا وقت:

لیکن جب عمل کا وقت آیا اور یہ سوال سامنے آیا کہ اب علی گڑھ کو چھوڑ دو تو پھر اس مور و ملخ میں بہت کمی ہو چکی تھی، لیکن الحمد للہ کہ ایک جماعت اپنے عزم و عقیدہ پر استقلال سے جمی رہی اور نہایت استقامت سے جامعہ ملیہ کی تعمیر اور استحکام میں رکن رکین ثابت ہوئی۔

اولڈ بوائز لاج میں قیام:

علی گڑھ کی اِس مخلص جماعت کو لے کر محمد علی اولڈ بوائز لاج میں مقیم ہو گئے، اس لیے کہ اولڈ بوائز لاج پر کالج کا قبضہ نہیں تھا اور وہ محض اولڈ بوائز کی تھی اور محمد علی اور اُن کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی صاحب کی اَن تھک کوششوں اور پیہم اور لگاتار جد و جہد کا نتیجہ!

نکل جاؤ:

لیکن یہاں بھی امن وسکون کے ساتھ اِن علمبر دارانِ صداقت کو بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ کالج کے حکام نے اِن سرکش باغیوں کا حکم دیا کہ اولڈ بوائز لاج خالی کر دو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ جواب میں عرض کیا گیا کہ اولڈ بوائز لاج پر تو سرکارِ علی گڑھ کا کوئی تصرف ہے نہیں، وہ اولڈ بوائز کی ملکیت ہے۔ اُنہیں کو اِس پر تصرف کا حق حاصل ہے اور وہی اِس پر قبضہ رکھ سکتے ہیں، انہیں نکالنے کا حکم آپ کے قبضہ قدرت سے باہر ہے۔

حاکمانہ انداز میں ارشاد کیا گیا کہ اولڈ بوائز لاج کالج کے حدود میں واقع ہے اور چونکہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم علی گڑھ کے باغی اور سرکش ہو، نیز اپنے ساتھ بغاوت اور سرکشی کے بہت سے جراثیم بھی لائے ہو اور انتہائی بے باکی سے تم نے انہیں کالج کی فضا میں چھوڑ بھی دیا ہے اور ان کی اس ''رہائی'' کے بڑے آثار بھی ظاہر ہو رہے ہیں اس لیے ''تحفظِ امن عامہ'' کے قانون کے مطابق تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ فوراً اولڈ بوائز لاج کو خالی کر دو۔

انکار:

لیکن یہ نشہ کہیں ان ترشیوں سے اتر سکتا تھا، ادب والتجا کے ساتھ عرض کر دیا گیا کہ فرمانِ جہاں پناہی سر آنکھوں پر، مگر تعمیل سے معذوری ہے۔

اس انکار اور اس تمرد کا اربابِ علی گڑھ نے جواب یہ دیا کہ بہشتی کو حکم ہوا کہ پانی کا ایک قطرہ اولڈ بوائز لاج میں نہ جانے پائے، لائٹ کیپر کو حکم ہوا کہ ایک بلب اولڈ بوائز میں نہ چلنے پائے، دھوبی کو تہدید کی گئی کہ خبردار ادھر کے لوگوں کا ایک کپڑا بھی گھاٹ پر لے گیا، خاکروب کو بلا کر یہ ہدایت کی گئی کہ اولڈ بوائز لاج کو ملبہ بنا رہنے دے اور کسی چیز میں ہاتھ نہ لگائے۔

لیکن یہ لوگ اتنے سخت جان تھے کہ اندھیرے میں رہے، ''ڈائنگ ہال'' سے خارج ہوئے، دھوبی اور بہشتی کے امتناعی احکام سنے، مگر ٹس سے مس نہ ہوئے اور نہ اپنے چشم وابرو سے ظاہر ہونے دیا

کہ وہ ان شدائد سے کچھ بھی متاثر ہیں! کتنی عجیب بات تھی؟

پولیس کا داخلہ:

دو ایک روز تک حکام کالج ہوا کا رُخ دیکھتے رہے اور اس کے متوقع رہے کہ شاید یہ لوگ خود ان شدائد کی تاب نہ لا کر راہِ افرار اختیار کریں، اس لیے اس کے تمام ضروری انتظامات مکمل کر دیئے گئے تھے۔ لیکن جب اس کا بھی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تو پھر پولیس سے استمداد کی گئی کہ وہی باغیوں کے اس قلعہ کا محاصرہ کرے اور اُنہیں شکستِ فاش دے۔

پولیس اپنی پوری شانِ جبروت وجلال کے ساتھ آئی، ڈنڈوں اور سنگینوں کے ساتھ آئی، بندوقوں اور پستولوں کو لے کر آگے بڑھی!

حکم ہوا کہ اولڈ بوائز لاج خالی کر دو، نیاز مندوں نے اس فرمانِ خسروی پر سر تسلیم خم کر دیا۔

باغیوں کا سردار محمد علی آگے آگے تھا اور عقیدت مندوں اور جاں نثاروں کی فوج پیچھے پیچھے اور پولیس کے ڈنڈے باز اور مسلح دستے ارد گرد اپنے جلو میں اُنہیں لیے ہوئے تھے۔

کتنا عجیب وغریب منظر چشم فلک نے دیکھا ہوگا کہ کل تک جہاں عزت وعظمتِ پیشوائی کے لیے موجود، نعرہ ہائے تحسین اور غلغلۂ مسرت استقبال کے لیے حاضر چشم عقیدت، محبت اور اُلفت سے لبریز۔

آج وہیں سے کشاں کشاں پولیس کے جلو میں دیس نکالا دیا جا رہا ہے اور اتنی مجال نہیں کہ اپنے گلشن میں ایک سانس بھی لے سکیں، آہ!

قیامِ بلبلِ مجبور، رحمِ باغباں تک ہے!

اصغر صاحب کا بیان:

جسٹس سر وزیر حسن کے برادر اصغر جن کا کسی موقع پر ذکر ہو چکا ہے، وہ اُس وقت وہیں موجود تھے اور قاصدِ صلح بن کر محمد علی کے پاس گئے تھے کہ محمد علی کو ''صراطِ مستقیم'' پر لا سکیں۔ ذیل میں اُن کے بیان کا ایک حصہ درج ہے، اُس سے نفس معاملہ پر کچھ روشنی پڑتی ہے، نیز محمد علی کے بلند کردار اور بلند تر عزم اور

اس سے بھی زیادہ دوستوں اور رفیقوں سے برتاؤ کا ایک ہلکا سا خاکہ بھی نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اصغر صاحب فرماتے ہیں:

"آخری موقع جو ملاقات کا ہوا تھا، اُس کا دِل پر نا قابل محونقش ہے۔ نومبر 1920ء میں جب علی گڑھ کالج کو قومی ادارہ کرنے کا ہنگامہ علی گڑھ میں ہوا تھا جو محمد علی کا مطمح نظر تھا، اُس وقت ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے مجھ کو اور سیّد سجاد حیدر صاحب کو مرحوم سے گفتگو کرنے کے لیے بھیجا تھا، باوجود اس کے کہ مرحوم نہایت پر جوش جذبات کے شخص تھے، ہم لوگوں کے ساتھ اِس قدر لطف اور محبت کے ساتھ گفتگو کی کہ باوجود اختلافِ رائے کے پرانی صحبتوں کا لطف تازہ ہوگیا۔ رات زیادہ ہوگئی تھی جب ہم لوگ اولڈ بوائز لاج سے جہاں مرحوم مقیم تھے، اپنی جائے قیام پر جانے لگے تو مرحوم نے کہا، اصغر! تمہاری ملاقات سے سیری نہیں ہوئی ہے، صبح آ کر میرے ساتھ چائے پیو تو ملاقات اور گفتگو ہوگی۔

اُس کی صبح والا وہ دِن تھا جبکہ اُن کے اوپر پولیس کا پہرہ ہوگیا تھا اور اس کے ذریعہ سے وہ وہاں سے ہٹائے جارہے تھے، مجھ کو آتا دیکھ کر دور سے کہا، اصغر تم میرے پاس نہ آؤ، تمہاری بہبودی بوجہ تمہارے ملازم گورنمنٹ ہونے کے اِسی میں ہے، یہ الفاظ آبدیدہ ہو کر کہے گئے تھے۔"

خیام میں قیام:

اولڈ بوائز لاج سے اِس شاندار انداز میں پسپائی اُٹھا کر محمد علی آگے بڑھے اور یونیورسٹی کے حدود سے تھوڑی ہی دور آگے چند خیمے نصب کرا لیے اور وہیں جم کر بیٹھ گئے۔

درختوں کے نیچے تعلیم ہوتی تھی، چٹائیوں پر نشست ہوتی تھی۔

نہ کلاس روم تھے نہ لیبارٹری، نہ ہال تھا نہ گراؤنڈ، نہ روپیہ تھا نہ پیسہ، مگر استقامت تھی اس لیے اِس بے سروسامانی میں بھی بڑے بڑے مزے تھے۔ اِس فقر و فاقہ کے عالم میں بھی عجیب کیف تھا اور اس

بوریہ نشینی میں مسندِ زرکار و زرنگار کا لطف تھا۔

کیا زمانہ تھا، شیخ الہند بانی، محمد علی پرنسپل، تصدق احمد خاں شروانی رجسٹرار، اور جامعہ کا قیام!

بعد کے انتظامات:

کچھ عرصہ کے بعد بیرونِ علی گڑھ سے بھی طلبہ اسٹرائیک کر کر کے اپنے کالج چھوڑ چھوڑ کے جامعہ میں آنے لگے تو خیمے ناکافی ہوئے اور پاس ہی چند کوٹھیاں کرائے پر لے لی گئیں اور اس طرح طلبہ کے قیام میں نسبتاً سہولت پیدا ہوگئی۔

محمد علی کی ''پرنسپل شپ'':

جن خوش قسمت لوگوں نے اُس زمانہ میں تعلیم حاصل کی ہے وہ کبھی کبھی اگر اپنے زمانہ کے بالخصوص محمد علی کے زمانہ پرنسپلی کے حالات بیان کرتے ہیں تو عجیب کیفیت ہوتی ہے۔

علمی حیثیت سے محمد علی کا جو پایہ تھا اُسے ایک دنیا جانتی ہے، اِس تحریک کے زمانہ میں اُن پر مذہب کا رنگ بہت غالب تھا، اس لیے مذہب کے اوپر زیادہ تر اُن کی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔

راویوں کا بیان ہے کہ اُس زمانہ میں محمد علی صبح آٹھ بجے تشریف لاتے تھے اور تقریر کرنا، (بڑی کلاسز کے سامنے) شروع کرتے تھے۔ تقریر کیا ہوتی تھی؟ اسلام کے متعلق بیش بہا معلومات کا ایک خزانہ ہوتی تھی اور بعض بعض دِن ایسے بھی آئے ہیں کہ 12 بجے تک مسلسل اُنہوں نے اسلامیات پر اپنا لیکچر دیا ہے۔ پھر کھانا وغیرہ کھا کے، نماز پڑھ کے اپنا لیکچر شروع کیا، عصر کا وقت ہوگیا، عصر کے بعد پھر تقریر شروع ہوئی اور مغرب کے وقت کہیں جا کر اُٹھے!

جامعہ ملیہ کی اسکیم:

محمد علی نے باوجود اپنے گوناگوں کثیر مشاغل کے اور پھر 1920ء کی مشغولیت کا کیا عالم ہوگا، جامعہ ملیہ پر ایک مختصر سی اسکیم شائع کی تھی، اس میں مقاصد اور طریقۂ تعلیم کے متعلق یوں سمجھئے کہ اشارات ہیں، اس لیے کہ نہ تفصیل کا وقت تھا اور نہ اُنہیں اِس کی فرصت ہی تھی۔ اُس اسکیم میں وہ لکھتے ہیں:

''ہمارا مطمح نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اپنی درس گاہوں سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو نہ صرف حسبِ معیارِ زمانۂ حال تعلیم و تربیت یافتہ شمار کیے جانے کے مستحق ہوں، بلکہ صحیح معنوں میں مسلمان بھی ہوں جن میں اسلام کی روح ہو اور جو اپنے مذہب کی تعلیمات سے اس قدر بہرہ اندوز ہو چکے ہوں کہ مبلغین اسلام کی فوج میں دوسروں کی امداد سے مستغنی و بے نیاز ہو کر خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل کرنے کو ہم نے اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے، چنانچہ ہر منزل میں ہم نے اس امر کا انتظام کیا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم سمجھا کر دی جائے تا کہ مسلمانوں کی وہ جماعت جو اقتصادی یا دیگر وجوہ کی بناء پر منزلِ ابتدائی سے آگے بڑھنے کی استطاعت نہ رکھتی ہو، قرآن مقدس صرف ناظرہ ہی پڑھ لے۔''

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

''بچوں کے دِل میں یہ بخوبی راسخ کر دیا جائے کہ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات عقائدِ اسلامی کی صداقت، احکام اسلام کی عملی سودمندی اور اُن پر سختی کے ساتھ عمل کرنے پر مبنی تھے، اور ہم اگر پھر اپنی گم شدہ عظمت کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف یہی طریقہ ہے کہ عقائد اور احکام اسلامی پر کاربند ہو جائیں اور رسولِ مقبول ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلیں۔''

اور اپنے اس عقیدہ میں کہ جامعہ کے اندر ہر طالب علم مذہبی احساس سے لبریز ہو اور مذہبی روح اس میں پورے طور سے سرایت کر جائے، وہ بہت زیادہ سختی سے عامل تھے۔

فلسفہ کی پروفیسر شپ:

چنانچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ کا بیان ہے کہ جب جامعہ قائم ہوئی تو محمد علی نے جنابِ ممدوح کو جامعہ تشریف لانے کی دعوت دی اور فلسفہ کی پروفیسری پیش کی۔ لیکن چونکہ اُس وقت تک جنابِ ممدوح کے ''مسلمان'' ہونے کا محمد علی کو علم نہ تھا، اس لیے محمد علی نے یہ بھی لکھ دیا کہ آپ

تشریف لائیے، لیکن اتنا لحاظ رہے کہ مجھے تعلیم سے زیادہ مذہب عزیز ہے۔ تعلیم کو میں چھوڑ سکتا ہوں لیکن مذہب پس پشت نہیں ڈال سکتا۔

بعض اسباب کی بناء پر جنابِ ممدوح جامعہ تشریف نہ لا سکے۔

جامعہ سے بے تعلقی اور تعلق:

تھوڑے عرصہ کے بعد محمد علی سیاسی مشغولیتوں میں ایسے مصروف ہوئے کہ پھر باوجود کوشش کے اس گرداب سے کبھی نہیں نکل سکے اور گو اُن کی یہ خواہش ہمیشہ رہی کہ کبھی اُنہیں فراغِ خاطر حاصل ہو تو وہ جامعہ میں اپنے اوقاتِ عزیز صرف کریں اور وہاں کے طلبہ میں پھر وہی روح پیدا کریں جو اُن کے لیے وہ ضروری سمجھتے تھے، لیکن اُن کی یہ آرزوئے دیرینہ پوری نہ ہو سکی اور عملاً وہ کوئی خدمت نہیں کر سکے۔

لیکن اِس بے تعلقی کے بعد بھی اُن کا قلبی تعلق ہمیشہ جامعہ کے ساتھ رہا، حکیم اجمل خاں کا جب انتقال ہوا تو محمد علی نے مسلسل ''ہمدرد'' میں مضامین لکھے اور لوگوں کو اس کی اعانت کی طرف مائل کیا۔

اِسی طرح جامعہ جب دہلی میں آئی تو اُنہوں نے مسلسل پروپیگنڈا کیا، جامع مسجد میں تقریریں کیں اور لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے بچوں کو جامعہ ہی میں داخل کرائیں!

❁❁❁

باب ۱۸

ناگپور کانگریس

اکتوبر 1920ء میں جامعہ کی تاسیس اور اُس کے اندر نظم وانتظام قائم کر کے محمد علی نے ملک کا دورہ کیا اور ترکِ موالات کی حمایت کی فضا پیدا کی۔

ناگپور کانگریس:

پھر دسمبر 1920ء میں ناگپور میں کانگریس کا مشہور اور تاریخی اجلاس ہوا جس میں ترکِ تعاون کا پروگرام منظور کرلیا گیا اور گاندھی جی کے ہاتھ میں زمام قیادت سونپ دی گئی۔

خلافت کانفرنس:

خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی اُسی زمانہ میں ناگپور میں منعقد ہوا تھا۔ مسلمانوں کے قلوب گورنمنٹ کے طرزِ عمل سے پاش پاش ہورہے تھے، گورنمنٹ کی عالم اسلام پر دراز دستیوں اور وعدہ خلافیوں نے مسلمانوں کو آتش زیرپا کر رکھا تھا۔ اِس سے پیشتر امرتسر، بمبئی اور دہلی کی خلافت کانفرنسوں میں ترکِ موالات کئی بار معرضِ بحث میں آچکا تھا اور رُجحانِ عام اس کے قبول کر لینے پر آمادہ معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ناگپور میں اِس کی توثیق کر دی گئی اور طے کرلیا گیا کہ اب مسلمان بھی ترکِ موالات کی تحریک میں پورا حصہ لیں گے۔ مسلمانوں نے بھی اپنی قیادت کے لیے گاندھی جی کو منتخب کیا کیونکہ اِس سے پیشتر گاندھی جی نے مسلمانوں کے مطالبات اور گورنمنٹ کی روش پر اپنی کارگزاریوں کا نہایت گراں بہار ثبوت دیا تھا اور مسلمانوں کی امداد واعانت کے لیے ہر طرح آمادگی ظاہر کی تھی، پھر جنوبی افریقہ میں

دیں۔ایک رات کو وہ اِسی فکر میں غلطاں پیچاں گاندھی جی کے پاس سے واپس آرہے تھے کہ داس نے محمد علی کا ہاتھ پکڑا اور الگ لے جا کر کہا:

''محمد علی! تمہاری رائے صحیح ہے، میں نے طے کرلیا ہے کہ تحریک کی حمایت کروں اور اپنی پریکٹس چھوڑ دوں۔''

محمد علی یہ سنتے ہی وفورِ مسرت سے داس کے گلے لپٹ گئے اور اُن کے خوب ہی خوب بوسے لیے۔ محمد علی کو آخر عمر تک ہمیشہ اپنی اِس خدمت پر فخر رہا کہ داس جیسی شخصیت کو میدان عمل میں لانے والے وہی تھے۔

رہ گئے مسٹر جناح اور پنڈت مالویہ، اُن سے انہیں کوئی خاص امید نہیں تھی، اس لیے اب وہ بے فکر ہوگئے۔ بڑے ہنگاموں اور بڑے اندیشۂ اختلاف کے بعد یہ تجویز کانگریس نے منظور کی۔

نتیجہ:

اِس سے ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ سارے ہندوستان میں ایک روحِ عمل تازہ ہوگئی اور ہر شخص کے دِل میں آزادی کی تڑپ اور سر میں آزادی کا سودا پیدا ہوگیا، بچہ بچہ آزادی کا علمبردار تھا۔

دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس معتدلین اور عافیت پسند ممبران سے خالی ہوگئی۔وہی تاریخی کانگرس ہے جس کے بعد سے پھر مسٹر جناح اور دوسرے متعدلین کبھی کانگریس میں شریک نہ ہوئے، گو ملک پر بڑے بڑے نازک دور آئے اور گزر گئے۔

تحریک کا آغاز:

اب تجویز کے منظور ہو جانے کے بعد گاندھی جی نے محمد علی اور شوکت علی کے ساتھ سارے ملک کا دورہ کرنا شروع کیا۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ گاندھی جی اور علی برادران کی غیر معمولی کوششوں اور سرگرمیوں کا یہ مفید نتیجہ نکلا کہ انگریزوں کا ڈر عوام کے دِل سے کافور ہو گیا،قید خانہ ایک مذاق رہ گیا اور گرفتاری

اُنہیں قیادت کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ اِس لیے مسلمانوں نے بلا پس وپیش گاندھی جی کی رہنمائی قبول کر لی اور اِس طرح عدم تشدد کے وہ بھی پابند ہو گئے۔

اختلاف:

اُس وقت تک کانگریس سے لبرل حضرات علیحدہ نہیں ہوئے تھے اور وہ بھی اُس میں شریک ہوتے تھے۔ اُنہیں چونکہ یہ "غیر آئینی" روش پسند نہیں تھی، اس لیے وہ بھی پوری طاقت کے ساتھ کانگریس میں شریک ہوئے اور تجویز ترکِ موالات وترک تعاون کو نامنظور کرانا چاہا۔

ہندوؤں میں پنڈت مالویہ اور مسلمانوں میں مسٹر جناح پیش پیش تھے۔

سی۔آر۔داس:

مسٹر سی۔آر۔داس بھی اُس وقت تک پریکٹس کر رہے تھے اور مقاطعہ اور ترکِ موالات کے وہ بھی شدید مخالفین میں تھے، اس لیے بظاہر بڑی پریشانی تھی کہ دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے؟

محمد علی کی کوششیں:

محمد علی نے اپنے آپ کو اس تجویز کے منظور کرانے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ کبھی گاندھی جی سے گفتگو کر رہے ہیں، کبھی مالوی جی سے مل رہے ہیں، کبھی مسٹر جناح کو سمجھا رہے ہیں اور کبھی سی آر داس کو مجبور کر رہے ہیں۔ کبھی اور دوسرے لوگوں سے تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں اور اُنہیں تجویز کی اہمیت سمجھا رہے ہیں، غرض اُس زمانہ میں محمد علی کا کھانا پینا بند ہو گیا تھا اور رات کی نیند حرام ہو گئی تھی۔

سی آر داس کی رضامندی:

محمد علی کو سب سے زیادہ فکر سی۔آر۔داس کی تھی۔ اُن کی نگاہِ دُور رس نے بھانپ لیا تھا کہ یہ جوہر قابل ہے، اگر ہاتھ آ گیا تو تحریک کو چار چاند لگ جائیں گے۔ اس لیے محمد علی کا سارا زور سی آر داس پر صرف ہو رہا تھا۔ وہ اُنہیں دلائل سے، براہین سے، محبت سے، پیار سے، خفگی سے، دلاسے سے، غصہ سے، خوشامد سے ہر طریقہ سے ہموار کر رہے تھے کہ وہ اپنی لاکھوں روپیہ سالانہ کی پریکٹس پر لات مار

ایک کھیل۔ یاد ہوگا، وہی وہ تحریک تھی جس میں انگریزوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوا اور ہندوستانیوں میں مرنے کی تڑپ پیدا ہوگئی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو بھی اپنے اندر مر مٹنے کی آرزو پانے لگے۔

ویلنٹائن شرل کا خیال:

مشہور ماہر سیاست و فلسفہ ویلنٹائن شرل اپنی کتاب Unrest in India کے آخری ایڈیشن میں کتنی سچی بات لکھتے ہیں:

''مسلمانانِ ہند کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری علی برادران کی گردن پر ہے جنہوں نے کانگریس میں دخیل ہو کر امن پسند ہندوؤں میں جرأت کے عناصر پیدا کیے اور اُدھر مسلمان فوج کو بغاوت پر آمادہ کیا۔''

باب ۱۹

تحریکِ خلافت

ناگپور کانگرس کے بعد محمد علی کی زندگی کا وہ رُخ شروع ہوتا ہے جس میں محمد علی نے اپنی قوتِ قیادت، قوتِ فیصلہ اور قوتِ عمل کا دوست دشمن، موافق مخالف، سب سے اعتراف کرالیا اور جس بے نظیر اور عدیم المثال قوتِ ایمان و عمل کا تذکرہ ہندوستان کے آئندہ مؤرخ کے لیے ناگزیر ہے۔

دورہ:

محمد علی نے اُس زمانہ میں تقریباً سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور جہاں بھی وہ گئے، اُن کے یمن قدم سے ہر جگہ ایک نئی فضا اور ایک تازہ حرکت پیدا ہوگئی جس نے ملوکیت کے قصر فلک بوس میں تزلزل پیدا کردیا۔

اُنہوں نے لکھنؤ، اجمیر، علی گڑھ، دہلی، بمبئی، الٰہ آباد، مدراس، بنگال، آسام، پنجاب تمام مقامات کا دورہ کیا اور جہاں بھی وہ گئے، کامیابی اُن کے قدم لینے کو بڑھی اور اقبال نے اُن کے آگے سر جھکایا۔

جوش وخروش:

جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ وہ دیہاتی جنہیں ''لال پگڑی'' کو دیکھ کر تپ ولرزہ کی شکایت پیدا ہو جاتی تھی، وہ مردانہ وار استقبال کرتے تھے۔ جلسوں میں شریک ہوتے، جلوسوں میں حصہ لیتے تھے۔ پولیس اور فوج کے سامنے 'اللہ اکبر' اور 'ہندو مسلم اتحاد کی جے' کے روح پرور نعرے لگاتے تھے، ڈنڈے کھاتے تھے اور گولیاں اپنے سینہ پر روکتے تھے۔ نہ اُنہیں موت سے ہراس تھا نہ جیل کا ڈر، نہ بال بچوں

کی پروا۔

وہ جب جیل جاتے تھے تو اُن کے گھر والے انہیں مبارکباد دیتے تھے، اُن کے دوست احباب خوش ہوتے تھے اور اُن کے اہل وعیال اِس کارنامہ پر فخر سے اپنا سر اُٹھاتے تھے۔

بچوں کا یہ حال تھا کہ خلافت اور خلیفہ کے معنی سے نا آشنا تھے، اسلام اور اسلامیت کے مفہوم سے ناواقف تھے، تحریک اور تحریک کے محرکین سے بے خبر تھے، وہ تو بس گاندھی جی کو جانتے تھے اور ''مولی شوکلی (محمد علی، شوکت علی) سے واقف تھے۔

صبح ہوئی اور اُن کا قافلہ چلا، شام ہوئی اور اُنہوں نے بازار کا رخ کیا۔ کوئی گاندھی جی کی جے کے نعرے لگا رہا ہے، کوئی علی برادران کے جیکارے بھر رہا ہے۔ کوئی سودیشی کا پرچار کر رہا ہے، کوئی گورنمنٹ کے متعلق سر راہ پیشین گوئیاں کر رہا ہے اور جب گرفتاری کا وقت آتا ہے تو ہنسی خوشی مسرت سے سر بلند ہو کر سپاہیوں کو مجبور کر رہا ہے کہ ہمیں بھی گرفتار کرو اور اگر سپاہی بچہ سمجھ کر چھوڑ گیا ہے تو وہ وہیں مچل جاتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ اُس کا رونا جب ہی بند ہو سکتا تھا جب وہ گرفتار کرلیا جائے، اسیر زنداں کر دیا جائے۔

شوقِ گرفتاری:

بڑے بڑے ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ بعض مشہور شہروں میں جب فوج یا پولیس کی جماعت لاریاں لے کر گرفتار کرنے آتی تھی تو بے تابی اور اشتیاق کا یہ عالم ہوتا تھا کہ لاری میں بیٹھنے کی جگہ نہیں رہتی تھی اور گرفتار ہونے والے وفورِ شوق میں لاری کے پائیدان پر کھڑے ہو ہو کر اپنی تئیں گرفتاری کے لیے پیش کرتے تھے اور جب تک عروسِ تمنا سے ہم کنار نہیں ہو جاتے تھے، اُن کی حالت دیوانوں کی سی رہتی تھی۔

چندہ:

اُسی زمانہ میں کانگریس فنڈ اور خلافت فنڈ کے لیے چندہ کی تحریک شروع ہوئی اور شاید ایک کروڑ کا مطالبہ ایک نہایت ہی مختصر اور محدود زمانہ میں کیا گیا کہ اتنے عرصہ تک یہ چندہ ضرور جمع ہو جائے۔

والنٹیر وں کے دستے گھومنے لگے اور غریب فاقہ مست، مزدوری اور کام کرنے والوں سے چندہ مانگنے لگے۔ اُس زمانہ میں کسی خاص تحریک کی ضرورت نہیں تھی، صرف ذرا سا اشارہ کر دیجیے اور اتنا چندہ جمع کر لیجیے کہ چندہ دینے والوں کو ابھی چندہ دینے سے سیری نہ ہو اور آپ کو ''تنگیٔ داماں'' کی شکایت ہو جائے۔

جو غریب تھے اُنہوں نے اپنی مزدوری کاٹ کاٹ کر پیسے جمع کیے اور چندہ دیا، جو محتاج تھے اُنہوں نے اپنے گھر کی چار پائیاں، لوٹے اور برتن رہن رکھے اور چندہ دیا۔ جو اُس وقت خالی ہاتھ تھے اُنہوں نے اپنی بیویوں سے اُن کا زیور مانگا، اُنہوں نے ہنسی خوشی زیور اُتار، پوٹلی باندھ شوہر کے سامنے لا کر رکھ دی، شوہر صاحب گئے اور چندہ دیا، ''سرخرو'' ہو آئے۔

یہ تو تھا غریب طبقہ کا حال، اگرچہ اُس زمانہ میں سرمایہ داروں نے کوئی خاص مدد نہیں پہنچائی لیکن طبقہ متوسطہ نے ایثار و قربانی، فدائیت اور جاں نثاری کی انتہا کر دی۔

ترکِ ملازمت:

اسی طبقہ کے افراد تھے جنہوں نے ملازمتیں چھوڑیں، فاقہ کیے، میلے کچیلے کپڑے پہنے اور لاکھ لاکھ اصرار کی بعد بھی اُن کا انکار برابر قائم رہا اور وہ اپنے ارادہ سے نہ ہٹے۔

ترکِ تعلیم:

طالب علم جو تھے اُنہوں نے اسکول بند کرائے، کالج خالی کرا دیئے، یونیورسٹیوں میں قفل لگوا دیئے اور جوق در جوق اللہ کے رستے میں شدائد و مصائب برداشت کرنے کے لیے چل کھڑے ہوئے، نہ راہ کے مصائب کا خوف نہ فقر و فاقہ کا ڈر، ایک عزم تھا جو سب کچھ کرائے جا رہا تھا! کیا زمانہ تھا۔

اور اس سارے نظام کا محور، ایک ذات تھی، محمد! جس کی طرف اشارہ کر دیا اُس نے وکالت چھوڑ دی، جس کی طرف دیکھ لیا اُس نے نوکری چھوڑ دی اور جس سے کہہ دیا وہ جیل خانہ ہو آیا۔

اتفاق و اتحاد:

ایک یہ زمانہ ہے کہ ہندو مسلمان سے متنفر اور مسلمان ہندو سے بیزار، اور ایک وہ مبارک و مسعود زمانہ تھا کہ ہندو مسلمان دونوں بھائی بھائی معلوم ہوتے تھے۔عید ہوئی اور ہندوؤں نے سبیل لگادی، شربت پلا رہے ہیں اور راہ گیر مسلمانوں کی ہر طرح سے خاطر تواضع کر رہے ہیں، کبھی پان کھلاتے ہیں، کہیں پوریاں پیش کی جاتی ہیں، کبھی الائچی۔

ہولی آئی اور مسلمانوں نے اظہارِ مسرت شروع کر دیا، اپنے ہندو بھائیوں کی دعوتیں کیں، اُن کی خوشی پر خوش ہوئے اور ہر طرح سے اُن کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کی کوشش کی! وہ زمانہ ہوا کی طرح آیا اور بادل کی طرح نکل گیا۔

باب ۲۰

معافی کا افسانہ

علی برادران کی ''معافی'':

اُسی زمانہ میں کہ محمد علی کا طوطی بول رہا تھا، ہر شخص اُن کے نام کا کلمہ پڑھ رہا تھا اور وہ یلغار کرتے ہوئے سارے ہندوستان کو ''فتح'' کر رہے تھے کہ ہندوستان بھر میں یہ افواہ مصدقہ طور سے اُڑی اور بڑی شہرت کے ساتھ اُڑی کہ علی برادران نے گورنمنٹ سے معافی مانگ لی! ہر شخص انگشت بدنداں رہ گیا کہ علی برادران اور معافی! مگر بڑے زور شور سے یقین دلایا گیا کہ ہاں علی برادران نے معافی مانگ لی! گورنمنٹ کے سامنے توبہ کر لی!

مقصد:

اِس افواہ کا مقصد یہ تھا کہ علی برادران کا بڑھتا ہوا اثر زائل ہو جائے اور رائے عامہ ان سے برگشتہ ہو جائے، تا کہ علی برادران اپنے مقاصد ''مشئومہ'' میں کامیاب نہ ہو سکیں اور جس ''پبلک'' کے بل پر وہ اتنا ہنگامہ برپا کر رہے ہیں، وہی اُن کے خلاف ہو کر اُن کی زندگی دوبھر کر دے۔

اثر:

لیکن اس خبر کو جس عیارانہ سرعت کے ساتھ پھیلایا گیا، اُسی قدر اِس میں ناکامی ہوئی۔ سننے کو تو ہر شخص نے سن لیا، مگر یقین کسی کو بھی نہ آیا۔ ہر شخص نے خندہ استحقار سے ''مخبر کاذب'' کی اس خبر کی تکذیب کی اور علی برادران کے اثر ورسوخ میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ سارے ہندوستان کے اُسی طرح سر

تاج رہے اور سارے ہندوستان نے اُسی عقیدت و محبت کا اُن سے برتاؤ کیا جس کے وہ مستحق تھے۔

محمد علی کا بیان:

خوش قسمتی سے اِس مسئلہ کے متعلق خود محمد علی نے ضمناً نہایت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے جس سے ساری حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے، اہم اقتباس یہ ہے:

گاندھی جی کی لارڈ ریڈنگ سے ملاقات:

''مہاتما گاندھی، لارڈ ریڈنگ سے جو اُس وقت نووارد وائسرائے تھے، شملہ میں ملے۔ اُن پر اِس ملاقات سے اثر ہوا کہ لارڈ ریڈنگ ہندوستان کو آزادی دِلانے اور خلافتِ ترکیہ کے اقتدار و قوت کو بحال کرانے میں مدد دیں گے، مگر وہ فقط اِس کے خواہاں ہیں کہ ترکِ تعاون کی تحریک تشدد سے بری رہے۔''

سازش کا الزام:

''ہمارے خلاف یہ خبر مشہور تھی کہ ہمارے پاس اعلیٰ حضرت شاہِ افغانستان کا بھیجا ہوا ایک آدمی آیا تھا اور ہم ہندوستان پر افغانستان کا قبضہ کرا دینا چاہتے ہیں، افغانی ہوّے سے بعض ڈرنے والے ہنود نے مہاتما جی کو پریشان کر رکھا تھا کہ آپ اِن دونوں بھائیوں پر اس قدر اعتماد کیوں کرتے ہیں؟''

''انڈی پینڈنٹ'' کے نمائندہ کے سوالات:

''اُن کو مطمئن کرنے کی غرض سے مہاتما جی نے مجھ سے چند سوالات کرائے اور میرے جوابات افغانی حملہ اور قبضہ ٔ ہندوستان کے متعلق حاصل کیے اور ''انڈی پینڈنٹ'' اخبار میں شائع کرا دیئے۔'

شبہ مالوی اور سپرو کو تھا:

''پھر مالوی جی اور ڈاکٹر سپرو نے اُنہیں ہماری تقریروں کے چند جھوٹے سچے سیاق و سباق سے بے تعلق اقتباسات اِس غرض سے دکھائے کہ اُنہیں ہم سے بدظن کر دیں۔''

لارڈ ریڈنگ کا مواد:

''یہی اقتباسات لارڈ ریڈنگ نے اُنہیں دکھائے تھے اور مہاتما جی کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ اِن کے متعلق ہمارا ایک بیان شائع کر دیا جائے کہ مہاتما گاندھی کی ترکِ تعاون کی تحریک میں رہ کر ہمارا ارادہ نہیں ہے کہ ہم تشدد سے سوراج حاصل کریں، لیکن بعض احباب پر ہماری تقریروں کا یہ غلط اثر پڑا ہے اس لیے ہم اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ ہم نے کیوں ایسے الفاظ استعمال کیے جن سے یہ غلط مطلب بھی نکل سکتا ہے۔ ہمارا خیال کبھی بھی نہ تھا کہ لارڈ ریڈنگ اسلام کا بھلا چاہتے ہیں لیکن ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہم ایک ایسا بیان شائع کرنے سے انکار کریں اور ہمارے ہندو دشمن مہاتما جی کو ہم سے یہ کہہ کر بدگمان کر دیں کہ یہ مسلمان سوراج چاہتے ہی کب ہیں؟ اُن کو تو مسلمان راج مطلوب ہے اور یہ تشدد اور افغانی مدد سے ہندوستان کو غلام بنانا چاہتے ہیں، اسی لیے ایسا بیان دینے سے انکار کرتے ہیں اور یہ تو بہت ممکن تھا کہ مہاتما جی بعد کو کہتے کہ لارڈ ریڈنگ ہندوستان کو سوراج دلاتے دلاتے صرف اِسی وجہ سے رک گئے کہ ہم نے بیانِ مطلوبہ نہ دیا۔ اِس خیال سے ہم بیان دینے پر اُسی وقت راضی ہو گئے، مگر میں نے کہا کہ پہلے وہ اقتباسات تو دیکھوں جن کی اس طرح تاویل کی گئی ہے۔ مہاتما جی اُس کی معقولیت کے قائل ہو گئے اور وائسرائے کو تار دیا کہ وہ اقتباسات بمبئی ارسال کر دیئے جائیں۔ احتیاطاً مالوی جی کو بھی اِسی مطلب کا تار دیا گیا۔''

وائسرائے کا انکار:

''وائسرائے مالوی جی سے بھی زیادہ کائیاں تھے، اُنہوں نے ہماری تقریروں کے اقتباسات بھیجنے سے قطعاً انکار کر دیا مگر مالوی جی نے ارسال فرما دیئے۔ میں نے جب یہ اقتباسات پڑھے تو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ بعض تو غلط فہمی یا غلط سننے یا غلط نویسی کا نتیجہ ہیں اور بعض کو صریحاً غلط معنی پہنچائے جا رہے ہیں۔ ایک بھی اقتباس ایسا نہیں ہے جس سے تشدد کی ترغیب یا نیت ثابت ہوتی ہو۔''

بیان دینے سے انکار:

''اس لیے ہم نے انکار کر دیا کہ ہم ایسا بیان ہرگز نہ دیں گے، البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ گو نہ ہمارا یہ مقصد تھا نہ ان تقریروں ہی سے یہ مطلب سمجھ میں آ سکتا ہے، تاہم چونکہ بعض سربرآوردہ حضرات نے اِس کے یہ معنی نکالے ہیں۔ افسوس ہے کہ ایسا ہوا اور ہم ہر شخص کو اس کا یقین دلاتے ہیں کہ ہماری نیت نہیں ہے کہ ترکِ تعاون کی تحریک میں ہم کسی کو تشدد کی ترغیب دیں چنانچہ ہم نے یہی بیان شائع کر دیا اور اُس کے شائع کیے جانے کے بعد مہاتما جی نے وائسرائے کو بھی اس کی اطلاع دے دی۔''

وائسرائے کے لیے نہیں:

''اشاعت سے پہلے اس ترمیم کی جس پر ہمیں اصرار تھا، وائسرائے کو اطلاع نہ دی گئی تھی، اس لیے کہ مہاتما جی نے فرمایا تھا کہ یہ بیان تمہارا ہے، جو جی چاہے لکھو، وائسرائے کے حکم سے کچھ نہیں لکھا جا رہا ہے کہ اُن کی منظوری ترمیم کے متعلق پہلے حاصل کر لی جائے، اور نہ یہ بیان تم وائسرائے کو اطمینان دلانے کے لیے دے رہے ہو بلکہ اپنے ہندوستانی بھائیوں کی غلط فہمی رفع کرنا مقصود ہے، تو اُن کے اطمینان کے

ساتھ وائسرائے کو بھی اطمینان ہو جائے گا۔ نہ مہاتما جی نے مجھ سے فرمایا نہ مجھے اِس کا وہم و گمان تھا کہ ہمارا بیان اس لیے شائع کیا جانے والا تھا کہ ہم سزا سے بچا لیے جائیں۔"

وائسرائے کی گاندھی جی سے گفتگو:

"وائسرائے نے جس وقت مہاتما جی کو وہ اقتباسات دکھائے تھے جو مالوی جی اور ڈاکٹر سپرو پہلے ہی اُنہیں دکھا چکے تھے تو مہاتما جی نے ارشاد فرمایا تھا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں اس قسم کا بیان ان دونوں بھائیوں سے کہہ کر شائع کرا دوں، تا کہ اُن کے بعد پھر کسی کو بے اطمینانی کے لیے کوئی عذر بھی باقی نہ رہے۔ اِس پر وائسرائے نے کہا تھا کہ یہ بہت ہی اچھا ہو گا، حکومتِ ہند نے فیصلہ کیا تھا کہ علی برادران پر مقدمہ چلایا جائے لیکن اگر یہ بیان شائع ہو جائے گا تو پھر مقدمہ چلانے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔"

گاندھی جی کا جواب:

"یہ سن کر مہاتما گاندھی نے فرمایا کہ مقدمہ چلانا یا نہ چلانا آپ کا کام ہے، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں، ہمیں تو ایک ضروری بیان شائع کرانا ہے اور وہ ہمارا ہر حالت میں فرض ہے، خواہ آپ مقدمہ چلائیں یا نہ چلائیں، یہ سب سے آخری وائسرائے سے ملاقات تھی۔"

مقدمہ چلانے کا ذکر:

"اور مقدمہ چلانے کا اس سے پہلے کبھی بھی ذکر نہیں آیا تھا، ورنہ شبہ ہوتا کہ وائسرائے کی اس دھمکی پر مہاتما جی نے ہمارے بچانے کی یہ صورت نکالی تھی، تاہم جب ہمارا بیان شائع ہوا تو وائسرائے کا تار مہاتما جی کے نام کچھ اس انداز کا آیا کہ گویا ہمارا یہ

بیان وائسرائے کے حکم سے شائع کیا گیا تھا اور ہماری ترمیم اُنہوں نے کرم فرما کر منظور فرمائی تھی۔ ہم اُس وقت بھڑوچ جا رہے تھے، مہاتما جی نے خاموشی کا دن شروع کر دیا تھا۔ وہ تو نہ بول سکتے تھے مگر تار دیکھ کر میں کھٹکا کہ اس کے غلط معنی تو نہیں پہنائے جا رہے ہیں اور مہاتما جی سے عرض کیا کہ یہ تو کچھ اور ہی فرما رہے ہیں، انہوں نے مسکرا کر سر ہلا دیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ایسا ہی خیال کرنے لگے۔''

لارڈ ریڈنگ کی تقریر:

''بہر حال بھڑوچ میں میرے ایک دوست رات کے دس گیارہ بجے بمبئی سے خاص اسی غرض سے آئے کہ مجھے بمبئی کرانیکل کا وہ پرچہ دکھائیں جس میں لارڈ ریڈنگ کی چیمسفورڈ کلب والی تقریر تھی جو مہاتما جی کی ملاقاتوں اور ہمارے اس بیان کے متعلق دی گئی تھی اور جس کی غرض سے سر محمد شفیع نے لاٹ صاحب بہادر کو دعوت دی تھی تا کہ اپنے دو مسلمان بھائیوں کو ذلیل و خوار کر سکیں۔ اس تقریر میں مہاتما جی کی بہت تحقیر کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ وہ ملاقات کے سائل بن کر آئے تھے، حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ دراصل لاٹ صاحب بہادر کی طرف سے مالوی جی نے اپنی علالت کا عذر کر کے اور یہ کہہ کر کہ اگر آپ مجھ سے ملنے نہ آسکیں تو اسی حالت میں میں آپ سے ملنے الٰہ آباد آؤں، مہاتما جی کو بلایا تھا۔''

لارڈ ریڈنگ کی عیاری:

''لارڈ ریڈنگ سے زیادہ کوئی چالاک وائسرائے اس صدی میں تو ہندوستان آیا نہ تھا، انہوں نے یہ چالاکی کی کہ اپنی تقریر میں ملاقاتوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا کہ پہلے اپنی ساری گفتگو سنا دی، پھر مہاتما جی کا جواب۔ حالانکہ گفتگو چھ ملاقاتوں میں ہوئی تھی اور اس کا مجموعی دورانیہ پندرہ گھنٹے تھا اور ظاہر ہے کہ نہ سات آٹھ گھنٹے لاٹ

صاحب تقریر فرماتے رہے تھے نہ اتنی ہی دیر اس کے بعد مہاتما جی، بلکہ چند منٹ ایک بولتا ہوگا چند منٹ دوسرا، اس طریقہ پر گفتگو کا خلاصہ کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ سمجھے کہ وائسرائے نے مہاتما جی سے کہا کہ ہم علی برادران پر مقدمہ چلانے والے ہیں اور مہاتما جی نے جواب دیا کہ میں اُن سے کہہ کر اظہارِ افسوس کرائے دیتا ہوں اور اس طرح ہم دو غریبوں کی جان بخشی ہوئی اور ہم نے سزا کے ڈر سے لاٹ صاحب سے معافی مانگ لی۔''

حسرت کا خط:

''چنانچہ میرے جلد باز بھائی مولانا حسرت موہانی نے اِس تقریر کو پڑھتے ہی مجھے ایک کارڈ لکھا جس میں درج تھا کہ اگر مہاتما جی نے تمہیں اس بیان کو شائع کرنے سے پہلے اطلاع دے دی تھی کہ وائسرائے نے اِس شرط پر تمہیں معاف کیا ہے تو تم سے بڑھ کر بزدل کوئی نہیں اور اگر اُنہوں نے اس کی اطلاع تمہیں نہ دی تھی تو اُن سے بڑھ کر کوئی بے ایمان نہیں۔

لیکن میرے ان جوشیلے بھائی کو یہ نہ سوجھا کہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ لارڈ ریڈنگ نے ملاقات کا خلاصہ غلط دیا ہو۔''

تقریر سے تاثر:

''بہر حال جب میں نے چیمسفورڈ کلب والی تقریر سنی تو سارا بدن پھنک گیا اور میں نے مہاتما جی سے اِسی قدر کہا کہ اجازت ہو تو اِس کا جواب دے دوں، جلسہ خلافت کا تھا، تقریر صدارت کچھ اور ہونے والی تھی، مگر اس کے بعد میں نے صرف لارڈ ریڈنگ کی تلبیس کا پردہ چاک کیا اور مشکل ہی سے میں نے ساری عمر میں اس سے زیادہ سخت کوئی اور تقریر کی ہوگی۔

غالباً جون 1921ء کے بمبئی کرانیکل میں اس کی مفصل رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کے بعد لاٹ صاحب بہادر کو بھی جواب دینا پڑا کہ باوجود اس دعوے کے جو لاٹ صاحب کی تقریر ہی میں موجود تھا کہ اگر تشدد کی ترغیب نہ دی گئی اور محض حکومت سے لوگوں کو بددل کیا گیا تو دفعہ 124 الف کے جرم میں کسی تارکِ تعاون کو ماخوذ کر کے مقدمہ نہ چلایا جائے گا۔"

لارڈ ریڈنگ کی تحریک:

"انہوں نے (وائسرائے نے) حکومتِ بمبئی کو مجبور کیا کہ مجھ پر کراچی خلافت کانفرنس کے ایک ریزولیوشن کی بنا پر مقدمہ چلائے اور احتیاطاً کراچی کی ایک اور تقریر پر بھی دفعہ 124 الف کے ماتحت مقدمہ چلایا جائے اور وعدہ خلافی سے بچنے کے لیے یہ عذر بھی تلاش کر لیا گیا، گو تشدد کی ترغیب نہ تھی لیکن کراچی کانفرنس کی تجویز مسلمان سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنے کی طرف مائل کرتی تھی اور یہ تشدد سے بھی بدتر ہے۔"

سر سپرو کی "مساعی حسنہ":

"سب لوگ جانتے ہیں کہ کس طرح ڈاکٹر سپرو بمبئی گئے اور ایڈووکیٹ جنرل کو پیروی کرنے پر آمادہ کرنا چاہا اور بالآخر الہ آباد ہی کے ایک انگریز بیرسٹر مسٹر آلسٹن کو اٹھارہ ہزار دے کر ہمارے حبس دوام کی سزا کا سامان کیا گیا، مگر کسی طرح جیوری کے عیسائی اور انگریز اراکین نے بھی حق کی حمایت کی اور ہم کو بری کر دیا، مگر جوڈیشنل کمشنر نے ایک اور الزام پر ہم کو دو دو برس کی سزا دے دی۔"

گاندھی جی کی وائسرائے کے نام تحریر:

"اس مقدمہ سے پیشتر مہاتما جی نے وائسرائے کو زچ کر دیا تھا اور باوجود مالوی جی

کی اس عنایت کے کہ اُنہوں نے لاٹ صاحب کی طرف سے حق وکالت پوری طرح ادا کیا، مہاتما جی نے وائسرائے کو صاف لکھدیا کہ علی برادران کا روئے سخن تمہاری طرف نہ تھا بلکہ اپنے اہل وطن (مثلاً مالوی جی اور ڈاکٹر سپرو) کی طرف تھا اور اُن کے اظہارِ افسوس کے ہرگز یہ معنی نہ تھے کہ وہ تم سے معافی مانگ رہے تھے اور اپنا ایک علیحدہ بیان شائع کرنے کی دھمکی دے کر وائسرائے کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک متفقہ بیان شائع کریں جس میں صاف اقبال ہو کہ ہمارا بیان کسی سمجھوتہ کی بناء پر اور مول تول کرنے کی غرض سے ہرگز نہ دیا گیا تھا اور مقدمہ چلانے کا ذکر وائسرائے نے اُسی وقت کیا تھا جب مہاتما جی خود پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ وہ ہم سے ایک بیان شائع کرنے کے لیے کہنے والے ہیں۔"

یہ ہے اس معافی کی حقیقت جسے اس زمانہ میں ہر ہر دیہات اور قصبہ کے لور پرائمری اسکولوں تک میں پہنچایا گیا تھا اور مشتہر کیا گیا تھا کہ دیکھو تمہارے سب سے بڑے سورما اور بہادر گورنمنٹ بہادر سے اس طرح لرزتے ہیں کہ ذرا سی گرفتاری کی دھمکی پر معافی مانگنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

دُنیا یہ حقیقت خوب معلوم ہے کہ اس فریب کارانہ جدوجہد کا کیا نتیجہ ہوا؟ اور علی برادران کی رفعت و عزت میں فرق آیا یا اضافہ ہوا؟

اس پر لطف "معافی" کے بعد اب اُن کی گرفتاری اور سزایابی کا زمانہ آتا ہے یعنی مشہور مقدمہ کراچی کے حالات، اُس کی ضروری تفصیل اور اسباب و علل پر بحث آئندہ سطور میں ہو گی۔

❀❀❀

باب ۲۱

کراچی خلافت کانفرنس اور گرفتاری

تحریکِ خلافت کا اثر کراچی میں بھی پورے طور سے نفوذ کر چکا تھا اور ہندو مسلمان، بوڑھے بچے، سب ہی اِسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ترکِ تعاون اور عدم تشدد کا ترانہ ہر شخص کی زبان پر تھا اور علی برادران کی وقعت و محبت سے ہر دِل لبریز تھا۔

علماء کا فتویٰ:

اُسی زمانہ میں علمائے کرام نے ایک فتویٰ شائع کیا تھا جس پر فرنگی محل، دیو بند اور دوسرے مقامات کے پانچ سو علماء کے دستخط تھے، فتویٰ میں تعاون اور موالات کو حرام بتلایا گیا تھا اور اسکول، کالج چھوڑ دینا فرض قرار دیا گیا، کچہریوں کی ملازمت اور وکالت کا پیشہ حرام قرار دیا گیا تھا، خطابات اور اعزاز کا قبول کرنا کافروں کا پیشہ بتلایا گیا تھا۔ اس تحریک حقہ میں نہ شریک ہونے والا میدانِ جہاد سے مفرور کی حیثیت میں ثابت کیا گیا تھا، اور جان و مال کی قربانی اسلام کی نشانی بتائی گئی تھی۔

خلافت کانفرنس:

خلافت کانفرنس کا اجلاس کراچی میں منعقد کرنے کی تیاریاں کی گئیں اور محمد علی کو اس کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا کہ اس نازک وقت پر وہی ایک شخصیت تھی جس سے مسلمانوں کو صحیح رہنمائی کی توقع تھی۔

شرکاء:

کانفرنس میں اسلامی ہند کا عطر موجود تھا، ایک طرف تو عوام میں ہندو مسلمان بلاتفریق مذہب و ملت نہایت کثرت سے شریک ہو کر کانفرنس کو کامیاب بنا رہے تھے، دوسری طرف زعمائے اسلام کی ایک اچھی خاصی جماعت وقت کے اس سب سے اہم مسئلہ کی خاطر سفر کے شدائد و مصائب برداشت کر کے شرکت کے لیے آتی تھی۔

مخصوص شرکاء میں جو بعد کو اسی جرم کی پاداش میں سزایاب بھی ہوئے، علی برادران کے علاوہ ڈاکٹر کچلو، مولانا حسین احمد اور پیر غلام مجدد اور سری سوامی شنکرا چاریہ جی تھے۔ اِن سب بزرگوں نے کانفرنس کے کامیاب کرنے میں پورا پورا حصہ لیا۔

صدارت کی طرف سے تجویز:

کانفرنس کی اور وقتی مگر ضروری تجاویز کے بعد صدارت کی طرف سے اہم تجویز پیش ہوئی۔ تجویز کا مفاد یہ تھا کہ مسلمان فوجیوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کی پکار پر لبیک ہیں اور گورنمنٹ کی ملازمت پر لات مار دیں، اس لیے کہ فوج میں ملازمت کرنے سے اُنھیں مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنائیں اور اُن مقاماتِ مقدسہ کو جن کی حفاظت و صیانت کے لیے اُنھیں اپنی جاں نثار کر دینا چاہیے۔ وہ خود مجبور ہوتے ہیں کہ وہاں اپنے ہاتھوں سے گولیاں چلائیں، توپیں چلائیں اور ان مقدس مقامات کو محض چند روپیوں کی خاطر تباہ کر کے اپنی عاقبت خراب کریں اس لیے کہ قرآن میں آیا ہے جس نے جان بوجھ کر اپنے مسلمان بھائی کو قتل کیا تو اس کی جزا جہنم ہے۔

تقریر صدارت:

صدارت کی طرف سے یہ تجویز ایک معرکۃ الآرا تقریر کے ساتھ پیش کی گئی اور بتلایا گیا کہ اس تجویز کی مذہبی حیثیت کیا ہے اور نصیحت کی گئی کہ جو لوگ اس کانفرنس میں شریک ہیں، انھیں پورے غور و فکر اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ بغیر کسی خاص جوش و خروش کے اسے منظور کرنا چاہیے اور اگر وہ منظور کر لیں تو اس کے کامیاب بنانے میں اور فوج والوں کو تو نوکری سے مستعفی کرنے میں اُنھیں اپنی ساری طاقت خرچ کر دینی چاہیے۔

تائید:

تجویز کی تائید تمام بڑے بڑے علماء اور زعماء نے نہایت پُر جوش اور مدلل طریقہ سے کی اور مذہبی دلائل، آیاتِ قرآنی، احادیثِ رسول، اقوالِ فقہاء اور حوالہ جات کتبِ اسلام سے اسے ثابت کیا کہ بحالتِ موجودہ برطانیہ کی فوج میں ملازمت کرنا بدترین گناہ ہے، انگریزوں کو خوش کر کے اپنے خالق کو خفا کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ چند روپیہ کی خاطر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں اپنا گھر بنالینا کون سی عقلمندی ہے؟ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ وہ اسلام پر اپنے ماں باپ، بھائی بہن، خویش واقارب، بال بچے... سب قربان کر دے اور جو سچے مسلمان تھے، اُنھوں نے ایسا کیا بھی، مگر تم کیسے مسلمان کہ تم سے چند روپیوں کی بھی نہیں چھوڑی جاتی۔ حیف ہے تمھارے اسلام پر اور تصف ہے تمھاری اسلامیت اور مذہبیت پر۔

اس تجویز اور تائید کا اثر یہ ہوا کہ مجمع نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس تجویز کو منظور کیا اور نہایت ہمت کے ساتھ اِس کے تمام اجزاء پر اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔ اِس کے بعد کانفرنس برخاست ہوگئی اور لوگ منتشر ہو گئے۔ باہر کے جو لوگ آئے تھے، وہ بھی اپنے اپنے مقامات پر واپس جانے لگے۔

محمد علی بھی دوسرے زعماء کی طرح کراچی سے واپس چلے گئے۔

وہ گاندھی جی کے ساتھ دورہ کر رہے تھے کہ دفعتاً 14 دسمبر 1921ء کو بمقام والٹیر گرفتار کر لیے گئے اور گرفتار کر کے کراچی پہنچا دیئے گئے۔

❀❀❀

باب ۲۲

مقدمہ کراچی

کراچی میں سب سے پہلے مجسٹریٹ کے روبرو محمد علی اور دوسرے ملزمان کا مقدمہ پیش ہوا، مقامِ عدالت کراچی کا تاریخی ہال ''خالق دینا ہال'' تھا۔

منظر عدالت:

عدالت کا کیا منظر تھا اور ملزمان کس طرح عدالت میں آئے، اِس کی ضروری تفصیل یہ ہے جو ''مقدمہ کراچی'' سے لیا گیا ہے جس کے مرتب و مترجم اجمیر کے مشہور قومی کارکن مرزا عبدالقادر بیگ ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی (علیگ) ہیں۔

> ''ہال کے احاطہ کے اردگرد خاردار تار لگائے تھے اور چاروں طرف مسلح پولیس اور فوج استادہ تھی، احاطہ کے اندر ڈیڑھ سو ہندوستانی اور ڈیڑھ سو انگریزی فوج تھی۔ ایک مشین گن بھی ہال کے شمالی جانب لاکر نصب کردی گئی تھی۔ جو لوگ ہال کے اندر تماشا دیکھنے گئے، ان میں اکثر وکلا اور بیرسٹر صاحبان، طلبہ و دیگر حضرات تھے۔''

ملزمان کی آمد:

ملزم لیڈران بند موٹر لاری میں لائے گئے، ان کی موٹر کے آگے ایک موٹر لاری میں مسلح ہندوستانی پولیس تھی اور پیچھے دو موٹر لاریوں میں مسلح فوجی گورے بھرے ہوئے تھے۔ جس وقت ان کی موٹر سڑک پر پہنچی، لوگوں نے نعرہ ہائے اللہ اکبر بلند کیے جس سے ہال کے اندر بیٹھنے والوں کو ان کی آمد کی خبر ہوئی۔

آمد کا انتظار:

ٹھیک گیارہ بجے ملزمان خالق دینا ہال کے اندر داخل ہوئے، جملہ حاضرین تعظیماً کھڑے ہوئے اور سلام و نمسکار کرنے لگے جس کا لیڈران نے نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ سب سے پہلے مولانا محمد علی صاحب ایک ہاتھ میں قرآن شریف اور دوسرے ہاتھ میں روشنائی کی بوتل لیے ہوئے داخل ہوئے، اُن کے پیچھے مولانا شوکت علی ہنستے ہوئے اور سر اور ہاتھ کے اشارے سے مخلص اور مشتاق نگاہوں اور جوشیلے سلاموں کا جواب دیتے ہوئے داخل ہوئے۔ اُن کے پیچھے مولوی حسین احمد صاحب (تحریک خلافت کے سلسلہ میں علی برادران کے رفیق حرم) کمال وقار اور متانت کے ساتھ تشریف لائے۔ جگت گرو صاحب نہایت حزم اور احتیاط کے ساتھ عصا ہاتھ میں لیے ہوئے تشریف لائے، اُن کے بعد ڈاکٹر کچلو اور مولوی نثار احمد صاحب باتیں کرتے، مسکراتے اور اشاروں سے سلاموں کا جواب دیتے ہوئے، اُن کے پیچھے پیر غلام مجدد صاحب مسکراتے ہوئے اور قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہوئے تشریف لائے۔ جب تک تمام لیڈر اپنی اپنی جگہ نہ بیٹھ گئے، سب لوگ کھڑے رہے۔

مجسٹریٹ کا خطاب:

مجسٹریٹ نے آتے ہی ملزمان سے اُن کی ولادت وغیرہ دریافت کی۔ محمد علی نے کہا، یہ سب کچھ وارنٹ میں لکھا ہے۔

اس کے بعد پھر استغاثہ کے گواہ گزرنا شروع ہوئے۔ سی، آئی، ڈی افسروں کی شہادتیں ہوئیں، سب ہی کچھ ہوا، مگر ان لوگوں نے عدالت کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

محمد علی اور اُن کے رفقاء پر دو الزام تھے، ایک تو ترغیبِ تشدد کا اور ایک ترغیبِ بغاوت کا، دونوں الزام اپنی اپنی جگہ پر نہایت سنگین تھے۔

استغاثہ کا ثبوت:

استغاثہ نے جب اپنا ثبوت پیش کرنا شروع کیا تو محمد علی کی مختلف تقریروں، تحریروں اور تجو...

کے اقتباسات پیش کیے اور اُن پر ہر طرح سے یہ الزام چپکانے کی کوشش کی۔ گواہوں کے علاوہ استغاثہ نے تقریروں میں سب سے اہم ثبوت محمد علی کے خلاف یہ پیش کیا تھا کہ 21 جولائی 1921ء کو ملزم نے کراچی میں عیدگاہ کے میدان میں ایک اور تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''مجھے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی اُمید اُسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ آپ کے دِلوں میں ہمت ہو، مردانگی ہو اور آزادی کی محبت ہو۔ اگر آپ کو غلامی پسند نہیں، اگر آپ غلامی سے بھاگتے ہیں، اگر آپ آزادی کے متمنی ہیں...تو آپ کو اِن کے راج سے اُکتا جانا چاہیے اور آپ کے دِلوں میں اِس طرزِ حکومت کی طرف سے نفرت، برائی اور بدخواہی ہونی چاہیے، کیا یہاں کوئی دلیل ہے؟ کیا کسی کو دفعہ ۱۴۴۔الف کے الفاظ یاد ہیں؟ اگر مجھ سے کوئی لفظ چھوٹ گیا ہو تو مجھ کو بتاؤ! دفعہ ۱۴۴ میں نفرت، بد دِلی اور بدخواہی کا ذکر ہے اور اگر دفعہ میں کچھ اور بھی ہو تو وہ بھی اِس گورنمنٹ کی طرف سے آپ کے دِلوں میں ہونا چاہیے۔''

مجسٹریٹ کا سوال:

گواہوں اور استغاثہ کے اِس ثبوت کے متعلق مجسٹریٹ نے اُن کو جرح کرنے کی یا کچھ اور کہنے کی اجازت دی، مگر محمد علی نے اور اُن کے تمام رفقاء نے عدالت کی کسی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ ہاں، ایک بیان دینے پر آمادگی ظاہر کی جو اِس ''تماشے'' کے بعد دیا گیا۔

مجسٹریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے محمد علی نے فرمایا:

''اسلام میں صرف ایک ہی بادشاہت تسلیم کی گئی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی بادشاہت ہے جو غیر مشروط، غیر منقسم اور غیر منتقل ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس حکومت سے تصفیہ کرنے کے لیے ذرا بھی مؤثر قوت ہوتی تو احکام اسلامی کی رو سے حکومت کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے پر وہ مجبور ہوتے اور موجودہ قضیہ کا تصفیہ خالق دینا ہال کے بجائے کسی اور جگہ ہو رہا ہوتا۔ گو ایسی قوت نہ ہو جو ایک قابل افسوس امر

ہے تو (مسلمانوں کو) ہجرت کرنی چاہیے، جہاں اُن کو مذہبی عقائد کی بنا پر کوئی وکیل سرکار ستانے اور پریشان کرنے والا نہ ہو۔" (قہقہہ)

مجسٹریٹ نے باری باری ہر جرم پر مقدمہ چلایا، یعنی پہلا مقدمہ تو خلافت کانفرنس کراچی کی تقریرو تجویز اور دوسرا عیدگاہ والی تقریر پر جو اوپر درج کی جا چکی ہے اور ہر دو الزامات پر عدالتی کارروائی کر کے محمد علی اور اُن کے رفقاء کو سشن سپرد کر دیا۔

سشن سپرد:

اس کے بعد باقی کارروائی عدالت سشن میں اتمام تک پہنچی اور وہاں بھی اِسی طرح گواہانِ استغاثہ کی شہادتیں، لختِ حسین انسپکٹر کی رپورٹ اور دوسرے محکمہ سی۔آئی۔ڈی کے افسرانِ اعلیٰ کی تقریروں کے بعد عدالت سشن نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔

محمد علی کا بیان:

عدالت سشن میں بھی محمد علی نے ایک بیان دیا تھا اور گورنمنٹ کی وعدہ خلافیوں، ملکہ وکٹوریہ کے اعلان، تعزیراتِ ہند کے نقائص، وکیل سرکار کی غیر آئینی حماقتیں، مجسٹریٹ کی قانونی غلطیاں، گرفتاری کے آئینی نقائص پر خاصی بحث کی تھی، پھر اُنھوں نے خود اپنے خلاف گورنمنٹ کو مواد دینا شروع کیا اور اپنی تمام کارگزاریوں پر ایک مختصر سی تقریر کر ڈالی کہ ہاں، میں مجسٹریٹ ہوں اور جو کچھ الزامات مجھ پر لگائے گئے ہیں، اُن سے کہیں زیادہ میں نے جرم کیے ہیں، میں ان کا اعتراف کرتا ہوں! عدالت جو سزا چاہے، تجویز کرے۔

چناں چہ اُنھوں نے جج اور جیوری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"میرے دوست مولانا حسین احمد... فرض کر لیجیے کہ اپنے گھر کے باہر بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کریں اور ان ہی آیات کو پڑھیں، ومن قتل مومنا متعمداً فجزاء ہٗ جھنم خالداً فیھا و غضب اللہ علیہ ولعنۃ وعداللہ علیہ ولعنۃ وعداللہ عداباً عظیماً ، اب دورانِ تلاوت میں ایک مسلمان سپاہی اُن کے پاس

سے گزرتا ہے تو کیا آپ کہیں گے کہ مولانا حسین احمد صاحب نے دفعہ 505 تعزیراتِ ہند کے ماتحت کسی جرم کا ارتکاب کیا، اگر ایسا ہے تو پھر رواداری کے یہ لمبے چوڑے دعوے کیوں ہیں؟

ہم آج عدالت کے سامنے قیدیوں اور ملزموں کی حیثیت سے کھڑے کیے گئے ہیں، مگر جس دِن خدا کی مسندِ عدالت کے سامنے جج اور جیوری، ملزم اور اُن کے شرکاء، وکیل سرکار اور اُن کے اسسٹنٹ، سب لوگ اور خود بادشاہ کھڑے ہوں گے۔ اُس وقت خدا سوال کرے گا، **لمن الملک الیوم**؟ تو بتلایئے، آپ کا کیا جواب ہوگا؟ میں ذاتی عناد کے باعث تو ایک مچھر کو بھی نہیں مار سکتا، اپنے خدا کے واسطے میں سب کو قتل کر دوں گا، میں کسی کو جان کی امان نہ دوں گا، میں اپنے بھائی کو ذبح کر ڈالوں گا، میں اپنی پیاری بوڑھی ماں کو، اپنے بیوی بچوں کو، سب کو خدا کی راہ میں ذبح کر ڈالوں گا۔ خدا میری مدد کرے۔"

جس وقت مولانا نے آخری فقرات ادا فرمائے، اُن کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی، آنسوؤں کے قطرے رُخساروں پر ڈھلک رہے تھے، اور آخر بالکل بے اختیار ہو کر وہ بیٹھ گئے۔

فیصلہ عدالت:

بالآخر اس ڈرامہ کا خاتمہ ہوا، عدالت نے سب کچھ سن کر جیوری نے سب کچھ معلوم کر کے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا۔

"اسیسرس کی کثرت رائے سے اتفاق کرتے ہوئے میری رائے میں دیگر ملزموں نے بھی اور محمد علی نے دانستہ ایسی تقریر کی جس کو فوجی ملزمین تک پہنچا دیں۔

ملزم نمبر 1 (محمد علی) میں تمھیں دفعہ 505 تعزیراتِ ہند کا مجرم پاتا ہوں اور دو برس قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔"

اس طرح باستثناء سوامی شنکر اچاریہ جی، باقی تمام ملزموں کو دو دو سال کی سزا ہو گئی۔ سننے والوں کے

کانوں میں آج تک ؎

ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

اور

بولیں اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

کے ترانے گونج رہے ہوں گے، جس نے بھی نہیں سنا ہے وہ انھیں بھول سکتا ہے؟

عدالت کے اندر جرأت و بے باکی:

محمد علی اور اُن کے رفقاء نے جس بے باکی، جس جرأت اور جس بے پروائی کا ثبوت دیا، ممکن ہے وہ آج کچھ زیادہ اہم نظر نہ آتا ہو لیکن اس زمانہ کے اعتبار سے یقیناً عجیب وغریب چیز تھی۔ مجسٹریٹ اور جج کے سامنے محمد علی کے نعرۂ صداقت میں کوئی فرق نہیں آیا اور اسی طرح سے جس طرح ایک شیر دِل زعیم کو عدالت کے کٹہرہ میں دھاڑنا چاہیے، اُن کی گرج کمرۂ عدالت میں گونجی اور گو مجسٹریٹ اور جج سب ہی زچ ہوئے، مگر متاثر ہوئے کہ آخر سب ہی خاموش ہو رہے۔

اِس جگہ عدالت سے اُن کی آئینی جنگ کو طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن جن لوگوں نے مقدمہ کراچی پڑھا ہے، وہ محمد علی کی شجاعت و بسالت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ اس وقت جب وہ ایسے الزام میں ماخوذ تھے جس میں پھانسی اور کم از کم حبس دوام کی سزا باآسانی دی جاسکتی تھی، اس وقت بھی ان کی زبان کلمہ حق سے خاموش نہیں ہوئی۔

سزا کا اثر:

محمد علی اور اُن کے رفقاء کی سزایابی نے ہندوستان کے جواں ہمت فرزندوں میں ایک اور ولولہ پیدا کر دیا اور تحریک کی رفتار میں بہت زیادہ خلافِ توقع اضافہ ہوگیا۔

وہی زمانہ تھا جب ہر گھر خلافت کمیٹی کا دفتر اور ہر فرد خلافت کمٹی کا ممبر تھا۔ بیگم محمد علی اور بی اماں محیر العقول طریقہ پر سارے ہندوستان کا دورہ کر رہی تھیں اور خلافت فنڈ کے لیے چندہ جمع کر رہی تھیں،

مسلمان خواتین میں اتنی جوشِ عمل کا اندازہ بعد کو ہوا۔

احباب پر اثر:

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ محمد علی کو اور ان کے رفقا کو سزائے با مشقت ہوئی تھی۔

محمد علی کے احباب محمد علی کے طرزِ ماند و بود سے پورے طور سے واقف تھے، اس لیے جب اُن کے کانوں میں یہ خبر پڑی کہ سزا با مشقت ہوئی ہے اور بعد کو پھر قید تنہائی کا بھی اضافہ ہوا ہے تو اُن کے قلق و اضطراب کی انتہا نہ رہی۔

ایک یادگار واقعہ:

چنانچہ اِسی حکم سزا کو جب محمد علی کے ایک عزیز، مخلص اور ''سچے'' دوست نے سنا تو اُسی دن سے اُنہوں نے چار پائی پر استراحت کرنا ترک کر دیا۔

چونکہ ایک مباح چیز کو وہ حرام نہیں کر سکتے اس لیے کبھی کبھی تو چار پائی ضرور استعمال کر لیتے، لیکن اکثر و بیشتر فرشِ خاک ہی اُن کا فرشِ خواب ہوتا! خلوص و محبت کی ایسی روح پرور مثالیں آج کل کس قدر کمیاب ہیں؟

تاثراتِ ماجد:

اُسی زمانہ میں، یعنی اسیری کے بعد ''سچ'' کے فاضل ایڈیٹر نے محمد علی پر ایک دوسری تقریب کے سلسلہ میں خیالات و تاثرات ذیل کا اظہار فرمایا تھا:

''کارسازِ عالم کی کارسازیوں میں شاید یہ سب سے عجیب تر حقیقت ہے کہ کائنات کے اہم ترین حوادث و نتائج کے وجود کا ذمہ دار ایسے ذرائع و اسباب کو بنایا جاتا ہے جو بہ ظاہر اس کے قطعی منافی اور عقل بشری کے اعتبار سے بالکل بعید از قیاس ہوتے ہیں۔

بجلی کا خزانہ پانی کے دھارے میں مخفی نکلتا ہے، آتش سوزاں کے شرارے ہری ہری

شاخوں کی رگڑ سے پیدا ہوتے ہیں، خلیل بت شکن علیہ السلام کی صدائے توحید بت پرستی کے مرکز سے بلند ہوتی ہے، آزادی کی شعاعیں استبداد کی گہری تاریکیوں سے پھوٹ کر نکلتی ہیں۔

یہ ایسی لطیف وخبیر صناع کی صنعت گری تھی جس نے بیسویں صدی عیسوی کی روشن خیال، علم پرور اور شائستگی نواز دُنیا کو ایک بار پھر صحابہ کرام کے صدقِ عمل، خلوصِ قلب و پختگیٔ ایمان کا زندہ نمونہ دکھا دیا اور اس غرض کے لیے انتخاب ایسے شخص کا کیا جس کی ایک عمر اِس طرح گزری کہ ہر ہر سانس فرنگیت کی فضا میں آتی اور جاتی تھی، ورنہ چند سال پیشتر کس انسانی دماغ کو یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ علی گڑھ کی روشن خیالی فرنگی محل کی مولویت کے ہاتھ پر بالآخر بیعت کرے گی؟

انگریزی زبان کا سحر نگار انشا پرداز اپنے بہترین اوقات کو حفظِ قرآن کے لیے وقف کرے گا۔ مارگولیس کا شاگرد شہنشاہِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں بلال واویس رضی اللہ عنہم کے جوشِ جنوں کی یاد تازہ کرے گا۔ مل و مارلی گلیڈ اسٹن و بریڈ لا کے مدرسۂ تحقیق کے فاضل کو قصباتی قوالوں کی غیر مہذب صدائیں رقص و وجد میں لائیں گی، آکسفورڈ کے آنرز میں گریجویٹ سلسلہ عالیہ قادریہ کی غلامی پر فخر کرے گا۔ نفیس اور بیش بہا سوٹ پہننے والا جیل خانہ کی پھٹی پرانی، میلی کچیلی کملی شوق سے اوڑھے گا، مخمل کے کوچ اور پرتکلف مسہری پر لیٹنے والا کھری زمین کے مرطوب فرش پر چلّے کے جاڑے ہنسی خوش کاٹ دے گا اور صوبہ کے گورنروں، پارلیمنٹ کے ممبروں اور امرائے ہند و انگلستان کا وہ عزیز دوست جس کا ایک دِن بھی بغیر سرکاری ضیافتوں اور پارٹیوں کے بہ مشکل گزرتا تھا، وہ ایک دو وقت نہیں مدتوں وہ غذا کھا کر رزّاقِ مطلق کا شکر ادا کرے گا جس کی جانب انسان تو الگ رہے، ان احکام والا مقام اور امرائے نامدار کے کتے بھی شاید رُخ نہ کرتے۔"

مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ کے اِس پر اثر تاثر نے محمد علی کی زندگی کے ہر رُخ کو ''ظاہر و باہر'' کردیا ہے۔ وہ بھی جب وہ ''مسٹر'' تھے اور وہ بھی جب وہ ''مولانا'' ہو گئے، اِس مرقع میں اُن کی عیش و عشرت اور پھر بعد کو شدائد و مصائب کا پورا اندازہ کر لیا جا سکتا ہے۔

❀❀❀

باب ۲۳

سزا کے بعد

ملک کی عام حالت:

یہ بتایا جا چکا ہے کہ محمد علی اور اُن کے رفقاء کی گرفتاری کے بعد تحریک میں کسی قسم کا اضمحلال نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ اُس کی رفتار میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

جس ریزولیوشن پر محمد علی کی گرفتاری اور سزایابی کا ''حادثہ'' وقوع میں آیا تھا، اُس کو ملک کے ہر طبقہ نے عام جلسوں میں ایک بار نہیں متعدد بار دہرایا۔

گاندھی جی کا اعادہ:

گاندھی جی نے اور کانگریس کے دوسرے زعماء نے، مولانا ابوالکلام آزاد نے اور خلافت کے دیگر کارکنان نے بکرّات ومرّات بالاعلان اسی ریزولیوشن کا اعادہ کیا اور گورنمنٹ کو دعوت دی کہ اُس نے صرف علی برادران کو کیوں گرفتار کیا، ہمیں کیوں نہیں گرفتار کرتی؟ سارا ہندوستان اسی ریزولیوشن کا اعادہ کررہا ہے، وہ کیوں آزاد ہے؟

علی برادران کی گرفتاری کے وقت تک صرف دو تین لاکھ روپیہ چندہ جمع ہوا تھا لیکن اُن کی گرفتاری اور سزایابی کے بعد ایسا جوش وخروش پیدا ہوا اور ایسا بے پناہ جذبۂ عمل ظاہر ہوا کہ نہایت تھوڑے عرصہ میں پچیس تیس لاکھ چندہ کا ڈھیر لگ گیا جس میں بیگم محمد علی اور بی اماں کی اِن تھک کوششوں کو بہت دخل تھا۔

سول نافرمانی کا ارادہ:

علی برادران کی گرفتاری کے وقت تک گاندھی جی صرف مقاطعہ اور تحریکِ ترکِ موالات کے اجرا پر زور دے رہے تھے، لیکن پھر وہ اس کے لیے پورے طور سے آمادہ ہو گئے کہ سول نافرمانی کی مہم کا بردولی سے آغاز کر دیں اور ملک کے اس جذبہ عمل کو کسی ایک مخصوص و متعین راستہ پر لگا دیں۔

واقعۂ چوری چورا:

ملک نے بھی اس تحریک کے شروع کر دینے پر اپنی پوری آمادگی کا اظہار کر دیا تھا کہ اسی زمانہ میں چوری چورا کا منحوس واقعہ پیش آ گیا جس میں چند ہندوستانیوں نے پولیس کے ظلم و جبر سے تنگ آ کر پولیس کے پورے تھانہ کو مع سپاہیوں کے نذر آتش کر دیا تھا جس سے گورنمنٹ بھی بہت پریشان ہوئی۔

مالوی جی کی کوششیں:

مالوی جی شروع ہی سے اس تحریک کے، علی برادران کے اثر و رسوخ کے اور مسلمانوں کی اس شرکتِ عمل کے سخت مخالف تھے۔ اُنہیں کی شخصیت تھی جس نے افغانستان کا ہوا اپنی تصور آفرینی کی قوت سے لا کھڑا کیا تھا اور وہی تھے جو یہ سمجھ رہے تھے کہ علی برادران تو ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت چاہتے ہیں اور وہی تھے جن کا محورِ عمل ''فرام الٰہ آباد ٹو شملہ اور فرام وائسرائز ہاؤس ٹو بنارس'' رہ گیا تھا۔

اِس واقعہ نے اُنہیں موقع دیا کہ وہ گاندھی جی کو نشیب و فراز سمجھائیں اور جس چیز کو گاندھی جی شروع میں ماننے سے انکار کر رہے تھے، اُسے اُن کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کر دیں۔

پروگرام کا التواء:

نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی پورے طور سے متاثر ہو گئے اور اُنہیں یقین آ گیا کہ تحریک اگر جاری رہی تو تشدد سے محفوظ نہیں رہ سکے گی، اس لیے وہ بار دولی پہنچے اور وہاں پروگرام کے التوا کا اعلان فرما دیا کہ کسی مناسب موقع کا انتظار کیا جائے۔

مولانا حسرت موہانی شروع سے گاندھی جی کی قیادت کی مخالفت کر رہے تھے مگر اُس وقت اس نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا؟

التواء کا اثر:

اِس اعلانِ التواء کے بعد بھی جوش وخروش میں کوئی کمی نہیں آئی، لیکن صوبوں اور ضلعوں کی کانگریس کمیٹیوں نے گاندھی جی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو متنبہ کرنا شروع کیا کہ التواء کا اثر برا پڑے گا، جوشِ عمل سرد ہو جائے گا۔ چوری چورا کا حادثہ ایک اتفاقی اور مقامی حادثہ ہے تمام ملک عدم تشدد کے اصول پر عامل ہے اور اسی عقیدہ کا قائل ہے۔ مگر گاندھی اِس واقعہ سے اتنے گھبرا چکے تھے کہ وہ کسی طرح بھی نظر ثانی کرنے پر راضی نہ ہوئے، انہیں یہی یقین رہا کہ تشدد کی بلا سے اب اس تحریک کا محفوظ رہنا مشکل ہے۔

تحقیقاتی کمیٹی:

بہر حال حامیانِ خلافت، رضا کارانِ کانگریس اور صوبہ اور ضلع خلافت کمیٹیوں اور کانگریس کمیٹیوں کے پیہم اصرار اور احتجاج سے گاندھی جی نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرائی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ملک بھر کا دورہ کرے اور یہ معلوم کرے کہ آیا ملک سول نافرمانی کرنے کے لیے تیار ہے یا نہیں اور اِس میں اس کی صلاحیت واستعداد ہے یا نہیں اور آیا تشدد کا مرض ''متعدی'' تو نہیں ہو رہا ہے۔

اس تحقیقاتی کمیٹی کو سارے ہندوستان میں دورے کے لیے حکم دینا، بیان لینا، شہادت لینا اور دوسرے حوادث وواقعات کو اس کے احاطۂ تحقیق میں کرنا جس مقصد کے ماتحت تھا، وہ پورا ہو گیا یعنی دیکھتے دیکھتے تحریک میں انحطاط شروع ہوا اور چند ہی مہینہ کے بعد تحریک فنا ہو گئی۔

گاندھی جی کی گرفتاری:

اس اضمحلال کے باوجود گاندھی جی کچھ نہ کچھ کام کیے ہی جا رہے تھے۔ اُن کے دورہ اور تقریر کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک بار اجمیر میں ایک تقریر کرنے کے بعد گاندھی جی بھی گرفتار کر لیے گئے اور اس طرح رہی سہی جان کا بھی خاتمہ ہو گیا اور جو تسمہ لگا رہ گیا تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔

سوامی شردھانند کی رہائی:

سوامی شردھانند جو اس تحریک میں سزایاب تھے اور جنہیں مسلمانانِ دہلی نے جامع مسجد کے مکبّر پر دعوتِ تقریر دی تھی اور گوشِ ہوش سے اُن کی تقریر سنی تھی دفعتاً وبغتتاً میعادِ اسیری ختم ہونے سے پیشتر غیر مشروط طور سے رہا کر دیئے گئے، اِس رہائی کی وجہ بعد میں معلوم ہوئی!

فساداتِ ملابار:

بدقسمتی سے اُسی زمانہ میں ملابار کے پرجوش اور مجاہد مسلمانوں میں طرح طرح سے اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اُنہیں گورنمنٹ کے خلاف بھی اُکسایا گیا اور ہندوؤں کے خلاف بھی۔

وہ ایک ایسی جماعت تھی جس کے اندر تعلیم کم اور جوش زیادہ تھا۔ چونکہ تعلیم سے ناآشنا تھی اس لیے اُس کے اندر مصلحت بینی، دُور اندیشی اور نکتہ سنجی کا مادّہ بہت کم تھا اور چونکہ مسلمان تھی اور جنت کو تلواروں کے سایہ میں سمجھتی تھی اس لیے جوشِ جہاد، موت سے بے خوفی، شہادت کی تمنا اور اسلام پر مر مٹنے کی ہوس موجود تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہوں نے انگریزوں کو بھی پیٹا اور ہندوؤں کی خبر بھی لی اور اِس کی پاداش اُنہیں یہ ملی کہ وہ جلاوطن کر دیئے گئے، مفلس اور فقیر کر دیئے گئے، تباہ اور نادار کر دیئے گئے، ذلیل اور بے عزت کر دیئے گئے۔

وہ دِن ہے اور آج کا دِن، گورنمنٹ کا عتاب اُن پر بدستور ہے۔ وہ اِسی طرح جلاوطن ہیں، اِسی طرح فقر وفاقہ میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں، اِسی طرح اپنی املاک وجاگیر سے محروم ہیں۔

ملکانہ راجپوتوں کی شدھی:

سوامی شردھانند کی غیر مشروط اور قبل از وقت رہائی کا حال آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔ اُنہوں نے آتے ہی اپنی کارگزاریوں کا ایک ثبوت جو آئندہ کے عزائم کا آئینہ دار تھا، یہ دیا کہ ملکانہ راجپوتوں پر چھاپہ مارا۔

وہ بے چارے نام کے مسلمان تھے۔ نہ کسی مولوی نے اُنہیں کلمہ پڑھایا نہ کسی صوفی نے اُنہیں

مرید کیا، نہایت آسانی سے قابو میں کر لیے گئے اور شدھ ہو گئے۔

اثر:

اِس خبر سے کہ ملکانہ راجپوت ہزاروں کی تعداد میں شدھ کر لیے گئے اور ابھی بہت سے شدھ کیے جائیں گے، مسلمانوں میں اِک آگ لگ گئی اور اُن میں ایک تازہ حرکت پیدا ہو گئی، لیکن اس حرکت کا رُخ دوسری طرف تھا اور یہ جذبۂ عمل کوئی دوسرا نتیجہ ظاہر کر رہا تھا۔

تبلیغ:

فوراً مسلمانوں نے دفاعی طور سے تبلیغ مہم جاری کر دی اور بڑے زور و شور سے تبلیغ کے ''قد آدم پوسٹر'' میدان میں نظر آنے لگے۔

اب مسلمانوں کے دِل سے بھی آزادی کا سودا نکل چکا تھا اور وہ پوری طور پر مستعد تھے کہ پہلے ہندوستان میں اپنے قیام و بقا کا کوئی انتظام کر لیں اور شدھی اور سنگٹھن کا جو یہ طوفان اُٹھا ہے اُس کا مقابلہ کر لیں، پھر آزادی کا دیکھا جائے گا! مسلمانوں کو یہ احساس بھی تھا کہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے، اس کی تبلیغ تو نہ ہو اور جس مذہب کے لوگ سمندر پار جانے سے کافر ہو جاتے ہوں اور جہاں تبلیغ ایک جرم ہو وہاں تبلیغ ہو رہی ہو۔ یہ بات اُن کے سمند غیرت پر ایک تازیانہ ثابت ہوئی۔

انقلاب:

اِن تحریکوں کے شروع ہو جانے سے ملک میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ پہلے ہندو مسلمان اس لیے ایک مقام پر مجتمع ہوتے تھے کہ پیمانِ محبت مستحکم کریں، لیکن اب دونوں کی ملاقات اس لیے ہوتی تھی کہ قوت آزمائی کریں۔ پہلے ہندو مسلمان گورنمنٹ کے خلاف صف آرا تھے، لیکن اب وہی ایک دوسرے کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے للکار للکار کر دعوتِ مبازرت دے رہے تھے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر خوش ہوتے تھے اور اسی کو سب سے بڑی معراج اور سب سے بڑی کامیابی سمجھتے تھے۔ پہلے اگر جلسہ اور جلوس غیر معمولی سے ہو گئے تھے تو اب فسادات کی خبر میں کوئی ندرت، کوئی اہمیت اور کوئی

حیرت نہیں تھی۔

جو کانگریسی تھے اور آزادیٔ وطن کے لیے ہر قسم کے مصائب برداشت کرنے کو تیار تھے، اُنہوں نے اب اپنی قامت پر لباسِ مہا سبھائیت چست کر لیا۔

جو خلافتی تھے وہ بھی تبلیغی بن کر میدانِ عمل میں نظر آ رہے تھے۔

لیکن اس حیرت انگیز واقعہ کو ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی کہ آزادی کی جنگ میں سب سے پہلے اختلال انہوں نے پیدا کیا جو اکثریت میں تھے، سب سے پہلے ہندو مسلمانوں میں تفریق انہوں نے پیدا کی جو اکثریت میں تھے۔ شدھی و سنگٹھن کی ضرورت سب سے پہلے انہوں نے محسوس کی جو اکثریت کے بل پر زور والے، طاقت والے اور اقتدار والے تھے۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نمایاں حصہ شدھی و سنگٹھن میں اُنہوں نے لیا جو یاد رکھئے! جو کانگریسی تھے۔

کانگریس کے عقیدہ پر، اصول پر اور پالیسی پر انتہائی استقامت اور استقلال سے جو جماعت قائم رہی، وہ خلافت کی تھی! نہ وہ شدھی سے متاثر ہوئی نہ سنگٹھن سے، نہ تبلیغ نے اُسے اپنی طرف مائل کیا نہ تنظیم نے۔ وہ جماعت 1928ء میں نہرو رپورٹ کے بعد برگشتہ ہوئی! صبر کی کوئی انتہا ہے؟

سرمایہ خلافت کیا ہوا؟

اوپر جو اسباب و واقعات عرض کیے ہیں۔ اصل میں وہی تحریک کے زوال و انحطاط کے موجب ہیں، جب یہ تحریک بالکل ختم ہوگئی اور آثارِ حیات مفقود ہو گئے تو اب مسلمانوں کو یاد آیا کہ خلافت کا سرمایہ کیا ہوا؟ بے کاری کا ایک دلچسپ مشغلہ یہ بھی سہی، چھوٹانی سیٹھ پر غبن کا الزام ثابت کر دیا گیا!

محمد علی کی گرفتاری کے بعد فضا اِس درجہ مسموم و ناموافق ہوگئی تھی!

❁❁❁

باب ۲۴

رہائی اور کانگریس کی صدارت!

اپنے ایام اسیری پورے کر کے کم وبیش دو سال کے بعد محمد علی کو پھر رہائی نصیب ہوئی۔ مرغِ اسیر کو شاخِ چمن پر پھر نغمہ سرائی کا موقع حاصل ہوا۔

آمنہ بیگم کی علالت:

محمد علی کو جیل ہی میں اپنی منجھلی صاحبزادی آمنہ بیگم کی علالت کی تشویش انگیز اطلاع مل چکی تھی اور وہیں سے اُنھوں نے اپنی بیمار لڑکی کو ''یہ پیام زندان'' بھیجا تھا۔

تیری صحت ہمیں منظور ہے، لیکن اُس کو
نہیں منظور، تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

جب وہ جیل سے رہا ہوئے تو دہلی میں اسپیشل کانگریس کی شرکت کے بعد سیدھے کوہِ بھوالی شریف لے گئے جہاں سینی ٹوریم میں وہ بستر علالت پر دراز تھیں۔

رہائی کے بعد بیان:

محمد علی نے رہائی کے بعد پریس کے نمائندہ کو ایک بیان دیا جس میں کہا:

''میں ایک چھوٹے جیل سے نکل کر بڑے جیل خانہ میں آ گیا ہوں، مجھے یرودا جیل کی کنجی کی تلاش ہے تاکہ میں گاندھی جی کو رہا کر سکوں اور اس کے حصول کا انحصار آزادی پر ہے۔''

صدارت کے لیے نامزدگی:

اُسی سال محمد علی کو تمام صوبہ کانگریس کمیٹیوں نے بالاتفاق انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ جلسہ کے کلمت صدر منتخب کیا اور اگرچہ وقت کم رہ گیا تھا لیکن پھر بھی محمد علی نے نہایت دلنشین اور کامیاب خطبۂ صدارت پڑھا جو اپنے مغز و تعلیم کے اعتبار سے اپنی زبان وانشاء کے لحاظ سے ہمیشہ یادر ہے گا۔

عہدِ صدارت:

محمد علی کا عہدِ صدارت بہت پر آشوب تھا۔ اُسی زمانہ میں شدھی و سنگٹھن اور تبلیغ و تنظیم نے کانگریس کی گرمیٔ بازار سرد کر رکھی تھی، ہندوؤں نے مہا سبھا قائم کر لی تھی اور مسلمانوں نے تبلیغ کانفرنس۔ آزادی کی منزلِ مقصود بعید تر ہوتی چلی جا رہی تھی اور کامیابی کی اُمید روز بروز موہوم۔

ایک طرف تو یہ حالت تھی، دوسری طرف خود کانگریس کے اندر تفریق پیدا ہو چکی تھی۔ ایک مختصر سا گروہ تھا جو ''نوچینجر'' تھا، یعنی کانگریس کے اصولوں سے بغاوت کرنا نہیں چاہتا تھا اور اُنہیں اسلوب پر اپنی مستعدی اور جذبہ کار کو صرف کرنا چاہتا تھا جنہیں کانگریس نے متعین کر دیا تھا یعنی گورنمنٹ سے قطع تعلق کر کے، بے نیاز ہو کے۔

دوسری جماعت تھی جو کانگریس کی کسی زمانہ میں سرگرم کارکن رہ چکی تھی، وہ اب جوابی تعاون کی پالیسی اختیار کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ کونسل اور اسمبلی کے خوش نما اور خوش مزہ لیکن ''خواب آور'' مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ اس جماعت میں کانگریس کے وہ تمام لیڈر تھے جن پر غیر معمولی اعتماد کیا جا سکتا تھا، یعنی پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، مسٹر سی آر داس۔

موتی لال تو اسمبلی میں جانے کے لیے اِس قدر مصر تھے کہ وہ فرماتے تھے، اگر کانگریس نے یہ تجویز منظور نہیں کی تو میں کانگریس میں جھانکنے تک کا نہیں۔ اِس طرح دھمکا کر وہ اپنا مقصد بڑی حد تک 'گیا' کانگریس میں حاصل کر چکے تھے اور اب کوکناڈا میں پھر حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ایسے نازک دور میں صدارت کرنا اور کامیابی سے اسے اتمام تک پہنچا دینا کچھ محمد علی ہی کا کام تھا۔

اُس نے اُن سب کی تالیفِ قلب کی، سب کو سمجھایا اور جو لوگ اُس کے نقطہ نظر پر نہیں آسکے اُنہیں بھی اُس نے کانگریس سے جدا نہیں ہونے دیا۔

گاندھی جی کی رہائی:

کچھ عرصہ کے بعد گاندھی جی جو چھ سال کے لیے اسیر زندان کیے گئے تھے، اپنی شدید علالت کی وجہ سے رہا کر دیئے گئے۔

گاندھی جی جب رہا ہوئے تو حسبِ توقع اپنے عقائد میں بہت سخت تھے اور اس پالیسی سے سخت متنفر جس کا مقصد یہ تھا کہ کونسلوں میں جا کر گورنمنٹ کو شکست دی جائے، عہدے نہ قبول کیے جائیں لیکن صدارت قبول کی جائے اور کسی سرکاری کمیٹی کی ممبری نہ قبول کی جائے، ہاں کبھی کبھی اگر ''اسکین کمیٹی'' کی ممبری قبول کر لی جائے تو زیادہ مضائقہ نہیں۔

محمد علی کی روش:

محمد علی خود تو عقیدتاً سخت کانگریسی تھے اور کسی طرح اس پر رضا مند نہیں تھے کہ کونسل یا اسمبلی میں جائیں، لیکن اُن کے جو غلط کار دوست اس میں جا رہے تھے، اُن کی راہ میں وہ حائل بھی نہیں ہوئے اور اُنہیں اپنی جماعت سے خارج بھی نہیں کرنا چاہا۔ گاندھی جی کی ہم خیال و عقیدت مند جماعت نے ''سوراج پارٹی'' کے خلاف کانگریس کے ایک جلسہ میں سخت جدوجہد کی اور محمد علی نے حسبِ معمول نرم گرم خود برداشت کر کے معاملہ ختم کر دیا اور سورج پارٹی کے خلاف کوئی آئینی اقدام نہیں کیا۔

گاندھی آشرم میں بوچھاڑ:

اِس پر جب وہ گاندھی جی کے آشرم میں پہنچے تو اُن پر بہت سخت تنقید ہوئی کہ اُنہوں نے کیوں ایسا نرم رویہ اختیار کیا اور کیوں نہیں اُنہوں نے سوراج پارٹی کے خلاف جدوجہد میں کوئی عملی حصہ لیا؟ محمد علی نے اِسے برداشت کیا اور اپنی صلح کل پالیسی میں فرق نہیں آنے دیا اور دونوں پارٹیوں سے اپنی ہمدردی کا اظہار اور ہر جماعت سے انصاف کا برتاؤ کرتے رہے۔

کارنامہ:

اُس زمانہ میں سب سے بڑا کارنامہ جو محمد علی سے ظہور پذیر ہوا وہ یہ کہ جب کانگریس اور سوراج پارٹی میں سمجھوتہ ہو گیا اور لوگ کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی اور کونسل میں جانے لگے تو پنجاب خلافت کمیٹی اور احرارِ پنجاب نے مجلس مرکزیہ خلافت کو بہت مجبور کیا کہ وہ بھی خلافت کے ٹکٹ پر لوگوں کو اسمبلی اور کونسل میں جانے کی اجازت دے دیں تا کہ اُن جگہوں پر بھی ہمارا اثر و اقتدار رہے اور اُن مقامات پر وہی لوگ جا سکیں جو ہمارے یعنی جمہور کے معتمد علیہ ہوں۔

پنجاب خلافت کمیٹی نے اس تجویز کے منظور کرانے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی، لیکن محمد علی نے اس سے سخت اختلاف کیا اور کہا کہ جس چیز کو خوب سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد ہم چھوڑ چکے ہیں، اس کے نقائص و مصائب معلوم ہو چکے اور اُس کے محامد و محاسن کے ہم قائل نہیں ہوئے تو پھر کانگریس کی تقلید میں ایسا کرنا کہاں کی دانائی ہے؟

اور بالآخر یہی فیصلہ ہوا کہ ذاتی اور شخصی طور سے جس کو جو جی چاہے کرے مگر خلافت کے ٹکٹ پر، خلافت کے نام پر اور خلافت کی حمایت میں کوئی شخص بھی کونسل یا اسمبلی کی امیدواری کے لیے نہیں کھڑا ہو سکتا۔ محمد علی کا یہ نہایت قابل فخر کارنامہ ہے کہ انہوں نے محض کانگریس کی پیروی اور اتباع کے جوش میں خلافت کمیٹی کو اُن مفاسد سے بچایا جو اِس صورت میں پیدا ہونے والے تھے۔

ممبر ہو سکتے تھے:

حالانکہ اگر چاہتے تو وہ بہت آسانی کے ساتھ اسمبلی کے ممبر ہو سکتے تھے، اس لیے کہ زیادہ سزا یافتہ شخص کی ممبری کے لیے شرط یہ تھی کہ وہ اجازت لے لے اور اجازت کی نوعیت ایسی تھی جیسے اخبار کے ڈیکلریشن کی جس کا ملنا یقینی ہے۔ چنانچہ لالہ لاجپت رائے وغیرہ کو بغیر کسی دقت کے اجازت مل ہی گئی اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ انہیں ''کانسٹی ٹیوشنل'' معاملات سے بڑی دلچسپی تھی، پھر تو وہ اور زیادہ جانے کے حامی ہو سکتے تھے، مگر اپنی اس ''دلچسپی'' کے باوجود اُنہوں نے اپنے اصول میں فرق نہیں آنے دیا۔

باب ۲۵

عہدِ تعطل یا ردِّ عمل

عام حالت:

محمد علی کی رہائی کے بعد ملک کی جو حالت ہوگئی تھی اور اُنہوں نے ملک کو جس حالت میں پایا تھا، اس کا سرسری اندازہ آپ کو سطورِ بالا سے ہو گیا ہوگا۔

اصل علت:

اس سارے جمود و خمود اور اس سارے تعطل اور فراموشی کی اصل علت یہ ہے کہ ملک کے سامنے اس وقت کوئی پروگرام نہیں تھا جس پر وہ عمل پیرا ہو کر اپنے عمل کو سنوارتا اور کوئی صحیح اقدام کر سکتا۔ یہی وجہ تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق پیدا ہوئی اور کانگریس و خلافت کے بجائے تبلیغ و سنگٹھن نے اُن کی جگہ لے لی۔

استقامت:

محمد علی نے اپنی غیر معمولی استقامت کا ثبوت دیا اور اس ردِ عمل کا نہایت استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو انہیں تبلیغ میں شریک ہونے کے بعد، کانگریس کا مخالف ہو جانے کے بعد پھر سر آنکھوں پر بٹھایا جا سکتا تھا۔ لیکن اُنہوں نے رائے عامہ اور میلانِ عام کی بالکل پروانہیں کی اور جو علاج قوم کے لیے مفید سمجھتے تھے، اُسی کا تجربہ قوم پر کرتے رہے۔

چالیس ہزار ''لیڈروں'' کو جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، انگریزی تعلیم یافتہ، مولوی اور پنڈت سبھی شامل تھے، جیل خانوں میں بھر دیا اور عوام ایک بے سری فوج کی طرح رہ گئے تو حکومت کے گرگے اور وہ لوگ جن کی ''لیڈریاں'' اِس عجیب وغریب ہنگامہ میں ماند پڑ گئی تھیں، نکلے اور عوام کو اُن کے صحیح رہنماؤں سے جو قید و بند میں گرفتار تھے، بدظن کرنا اور اُنہیں گمراہ کرنا شروع کیا۔ ایک طرف شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں نے زور پکڑا دوسری طرف تبلیغ و تنظیم کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوئیں اور زیادہ تر وہ لوگ سربرآوردہ نظر آنے لگے جو آزمائش کے وقت گوشۂ عافیت سے کبھی باہر نہ نکلتے تھے۔ اب یہی سب سے بڑے قائد تھے اور اُنہیں کے لیے جے کارے لگائے جاتے تھے اور اُنہیں کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے تھے۔ جب ترکِ تعاون کی آزمائش والے زمانہ کے قید خانوں سے نکلے تو انہوں نے اصلاح کی بہت کچھ کوشش کی، مگر اب طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔

ہر شخص ''لیڈر'' تھا، مقتداؤں کی اتنی کثرت تھی کہ مقتدی مشکل ہی سے کسی کو میسر آتے تھے۔ عوام پریشان تھے کہ کس کو رہنما سمجھیں؟ ایک، ایک راستہ پر لے جانا چاہتا تھا تو دوسرا، دوسرے راستہ پر اور ایک رہنما دوسرے رہنما کو رہزن بتا رہا ہے، سب الگ الگ سر الاپ رہے تھے۔ ''ذوقِ نغمہ'' کی شدت اور کثرت اب کہاں میسر آتی؟ بہت سی طوطیوں نے اس نقار خانہ میں اپنی صدا کو بند کر دیا جن کی غرض نمائش تھی۔ اُنہوں نے اس غرض کو پورا ہوتا ہوا نہ دیکھ کر خاموش اختیار کی، بعض نے اس چیخ پکار میں اپنی صدا بلند کرنے کو ازراہِ فرزانگی بے سود سمجھا اور اقبال کی طرح کہنا شروع کیا:

مزاجِ اہل عالم میں تغیر آ گیا ایسا
کہ رُخصت ہو گئی دُنیا سے کیفیت وہ سیمابی
فغاں نیم شب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے

نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطف بے خوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

مہاتما گاندھی خاموش ہو گئے اور ہمارے بعض ساتھیوں نے تو سکوت ہی اختیار نہ فرمایا بلکہ ایک نقارہ لے کر اسی نقار خانے کے نقارچی وہ بھی بن بیٹھے۔

لیکن ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے نہ سکوت اختیار کیا، نہ کوئی نیا سرالاپنا شروع کیا اور سامعین کی قلت اور بے پروائی کا مطلق پاس نہ کر کے ہم نے حافظ ہی کے شعر پر اپنا عمل جاری رکھا۔

حافظ وظیفۂ تو دُعا گفتن است و بس
در بند ایں مباش کہ نشنید یا شنید

ہم نے اور ہمارے چند ساتھیوں نے ذوقِ نغمہ میں کمی محسوس کر کے جس قدر تلخ نوائی کی اور محمل کو گراں پا کر جس قدر حدیٰ کو تیز تر کیا، اسے یا ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا۔ سب سے حیرت انگیز جو چیز ہے وہ یہ کہ ہم مسلمانانِ عالم کی موجودہ ذہنیت کو بدل کر اُنہیں از سر نو تاسیس خلافتِ راشدہ کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک بار پھر تمام مسلمانانِ عالم ایک ہی رشتہ میں منسلک ہو جائیں اور خلافت کمیٹیوں کا سلسلہ ہر ضلع کے ہر گاؤں اور ہر شہر کے محلّہ سے لے کر ہر صوبہ، ہر ملک، ہر براعظم میں پھیلتا ہوا مرکز خلافتِ راشدہ تک پہنچ جائے اور ہم یورپ کی شہنشاہیت یا امپریلزم کی جڑ بنیاد کو ادھیڑ کر پھینکنا چاہتے ہیں اور نہ صرف ہندوستان کو بلکہ تمام مشرقی ممالک اور بالخصوص اسلامی ممالک کو اس کے پنجہ سے نکال کر آزاد کرانا چاہتے ہیں اور تمام عالم اسلام میں پھیلانا چاہتے ہیں۔"

رائے:

یہ ہے محمد علی کا وہ سچا خاکہ جو اُنہوں نے خود پیش کیا ہے اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اپنی زندگی بھر اُنہوں نے اپنے اس بیان کردہ اصول کو نبھایا۔ تغیر محمد علی میں نہیں ہوا، بلکہ گرد و پیش کے ان حالات میں ہوا جنہوں نے محمد علی کو مجبور کر دیا کہ وہ اب مدافعت کریں اور صلح جوئی کا دروازہ بند کریں۔

اس عنوان کے بعد محمد علی کے اس کارنامہ کا ذکر آئے گا جو ہندوستان کے لیڈروں میں بہت نادرالوجود ہے اور جس نے محمد علی کی قدر و قیمت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا۔

یعنی کانگریس سے وفاداری! محمد علی کی وفاداری ''بشرطِ ستواری''، تھی، جب تک یہ شرط پائی گئی اُن کی وفاداری غیر متزلزل رہی، لیکن جب یہی چیز مفقود ہو گئی تو بے شک اُن کی وفاداری بھی ختم ہو گئی۔ ورنہ اُن کے معتقداتِ سیاسی وہی تھے جو 1920-21ء میں اور اس کا بہترین ثبوت اُن کی گول میز کانفرنس کی تقریر ہے۔

❀❀❀

باب ۲۶

کانگریس سے وفاداری

کانگریس کی تاریخ اور محمد علی کی زندگی کا یہ نہایت روشن صفحہ ہے۔

کانگریس میں اب پختگی آ گئی ہے اور اس کے حامیوں میں سنجیدگی کے ساتھ جذبۂ آزادی پیدا ہو گیا ہے، لیکن تحریکِ شدھی و سنگٹھن کے زمانہ کا رنگ بالکل جداگانہ تھا۔ اُس وقت سرداری و سرفرازی کا تاج اُس کے سر ہوتا تھا جو ہندو مسلمانوں میں لڑائی پیدا کر دے اور حقارت و ذلت کا برتاؤ اس کے ساتھ جو اتفاق و اتحاد کی تلقین کرے۔ اُس زمانہ میں محمد علی پہاڑ کی طرح اپنے مقاصد و داعیات کے علمبردار رہے اور کسی طرح بھی جادۂ حق سے اُن کے قدموں کو جنبش نہ ہوئی۔

تبلیغی جماعتوں کی دعوت:

ہندوستان کی تبلیغی جماعتوں نے محمد علی کو دعوت دی۔ اُن کے عقیدت مندوں اور پیروؤں نے اُنہیں مجبور کرنا چاہا کہ وہ بھی تبلیغ کے میدان میں قدم رکھیں لیکن محمد علی نے ایسا نہیں کیا۔

یہ ایک حل طلب سوال ہے:

اپنی مشہور اور مسلمہ مذہبیت کے باوجود علی نے کیوں تبلیغ کے میدان میں قدم نہیں رکھا؟

جواب بالکل صاف ہے۔ اُس وقت تبلیغی ادارے اور تبلیغی پوسٹر جس انداز سے چل رہے تھے، وہ ایک سنجیدہ مسلمان کے شایانِ شان نہیں تھے، نیز تبلیغ کا جو اصل مقصد ہے وہ بعید تر ہوتا جا رہا تھا۔ نظر صرف اس پر تھی کہ غلغلہ کس کا بلند ہو رہا ہے؟ شور کس کا ہو رہا ہے، شہرت کے میدان میں جیت کس کی

ہوئی؟ ان شطحیات سے محمد علی الگ رہے۔

پھر تبلیغ کا وہ انداز بھی محمد علی کو پسند نہیں تھا جس انداز پر کام شروع کیا گیا تھا۔ وہ اس تبلیغ کے مخالف تھے کہ صرف خارجی مؤثرات سے اسلام کی دعوت دی جائے۔ وہ اس کے حامی تھے کہ اسلام ایسے رنگ روپ میں پیش کیا جائے کہ ہر شخص میں خود طلب و جستجو پیدا ہو، اس کے بعد جو اسلام لائے گا وہ سچا مسلمان ہوگا اور وہی اپنے اسلام پر مستقیم ہوگا۔

جمعیت تبلیغ انبالہ:

ہندوستان میں صرف ایک تبلیغی ادارہ ایسا پیدا ہوا جو صحیح معنوں میں تبلیغ کا اہل تھا، یعنی میر نیرنگ کی جمعیت تبلیغ۔ اس انجمن کے ساتھ محمد علی کی ہمدردیاں ہمیشہ رہیں اور ہمیشہ اُنہوں نے اِس کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔

بلگام خلافت کانفرنس:

بلگام خلافت کانفرنس کے صدر صاحب محمد علی کے ''یکے از اسیرانِ کراچی'' رفیق تھے جو اُس وقت ہندوؤں سے سخت بیزار تھے اور تنظیم کا علم جہاد لے کر کھڑے ہوئے تھے۔

اُس زمانہ میں یہ دستور ہو گیا تھا کہ قومی مجالس کے خطبہ ہائے صدارت بہت زیادہ آتشیں ہوتے تھے۔ ہندو سبھا، آریہ لیگ، جمعیت تنظیم، مسلم لیگ اِن تمام جماعتوں کے خطبہ صدارت اُٹھا کر ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک مستقل دعوتِ جنگ ہے جو ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو نہایت رُستمانہ انداز سے دے رہا ہے۔

خلافت کانفرنس بلگام کے صدرِ منتخب بھی اِن جذبات سے متاثر تھے، اُن کا خطبہ صدارت نرم کیسے ہو سکتا تھا؟ اُنہوں نے بھی ایک نہایت آتشیں خطبہ صدارت تیار کیا تھا اور ہندوؤں کے طرزِ عمل پر نہایت تلخ انداز میں نکتہ چینی کی تھی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اُن کے ''مقابلہ'' کے لیے صف آرا ہو جائیں۔ اِسی مفہوم کو اگر نرم و ملائم الفاظ میں ادا کیا جاتا تو زیادہ مضائقہ نہیں تھا، لیکن غضب یہ ہوا کہ اسے

نہایت ہی سخت لہجہ میں ادا کیا گیا تھا۔

محمد علی کی اصلاح:

وقت بہت کم رہ گیا تھا، صبح خطبۂ صدارت پبلک میں آنے والا تھا۔ محمد علی خلافت کانفرنس کو میدانِ جنگ بنانے پر راضی نہیں تھے، اس لیے رات بھر جاگ کر محمد علی نے خلافت کانفرنس کے صدر کے خطبۂ صدارت میں قطع و برید کی اور اُس کے ناقابل برداشت اور سخت جملوں کو خارج کر دیا۔ پھر بھی وہ ایک حد تک سخت رہا، لیکن اب پہلے سے بہت کم ہو گیا تھا۔

بلگام کانگرس:

1924ء میں بلگام کانگرس کے گاندھی جی صدر تھے، اس میں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا کانگریس کی ممبری کے لیے کھدر کاتنے کی شرط رکھی جائے یا نہ رکھی جائے؟

''نوچینجر'' اس کے حامی بلکہ زبردست محرک تھے اور سوراج پارٹی کے محترم ارکان کو سخت اختلاف تھا۔

مولانا حسرتؔ موہانی تو کھدر ہی کی شرط کے نہیں قائل تھے مگر دوسرے لوگ یعنی وٹھل بھائی پٹیل، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر سی۔ آر۔ داس، لالہ لاجپت رائے وغیرہ کھدر کے تو حامی تھے لیکن ہر ممبر کے لیے اِس کے کاتنے کی شرط کو ''مضحکہ خیز'' تصور کرتے تھے۔ محمد علی کا تعلق پہلی جماعت سے تھا اور وہ اس شرط کے سخت حامی تھے، چنانچہ اُنہوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> ''چرخہ کو شرطِ ممبری ہونا چاہیے جو انتہائی مقدار کی کم از کم قربانی ہے۔ اگر کوئی جرمن پروفیسر اپنے طول طویل نام کے ساتھ کہہ دے کہ چرخہ آزادی حاصل کرنے کا تنہا ذریعہ ہے تو چرخہ کاتنے میں کافی جوش پیدا ہو جائے اور اُس وقت ہندوستان بلا پس و پیش چرخہ کو قبول کر لے، مگر چونکہ یہ بات ایک ہندوستانی نے کہی ہے اس لیے لوگ شک کرتے ہیں۔''

سنا ہے کہ اس تقریر نے بعض لوگوں کے چہروں پر نہایت نمایاں تغیر پیدا کر دیا!

فسادات کوہاٹ:

کوہاٹ کا فساد وہ پہلا واقعہ ہے جب گاندھی جی اور اُن کے جنرل مولانا شوکت علی میں اختلافِ رائے پیدا ہوا اور یہی وہ پہلا دِن ہے جب سے ہندوؤں نے بالخصوص ہندو پریس نے علی برادران کی مخالفت کرنے کی ٹھان لی۔

مختصراً واقعہ یوں سمجھئے کہ کوہاٹ میں فساد ہوا۔ ہندوؤں کو شکایت تھی کہ مسلمانوں نے زیادتی کی، مسلمانوں کا بیان تھا کہ ''چھیڑ'' کا آغاز ہندوؤں کی طرف سے ہوا۔

کانگریس کا وفد:

کانگریس کا ایک وفد جو گاندھی جی اور مولانا شوکت علی پر مشتمل تھا، کوہاٹ کے قصد سے روانہ ہوا۔ مگر گورنمنٹ نے وفد کو ہاٹ جانے کی اجازت نہیں دی، اس لیے وفد نے اپنی کارروائی غالباً راولپنڈی میں جاری رکھی۔ مسلمان بیان دینے نہ آسکے، صرف دو ایک آدمی آئے اور ہندوؤں کی کافی جماعت آئی اور اُس نے شہادت دی۔ جب رپورٹ شائع ہوئی تو گاندھی جی نے مسلمانوں کو قصوروار ثابت کیا۔

مولانا شوکت علی نے اس الزام کو قبول کرنے سے اس لیے انکار کیا کہ جانبین کے بیانات مساوی اور قابل قبول طور پر نہیں حاصل ہو سکے۔

تنہا پیش قاضی روی راضی آئی

کوئی انصاف کا اصول نہیں ہے۔

گاندھی جی نے اِس اختلاف کو شرافت کے ساتھ برداشت کیا اور شوکت صاحب نے وفاداری کے ساتھ اختلاف کیا، مگر ہندو پریس میں اِک آگ لگ گئی اور آفت برپا ہوگئی۔

محمد علی کا نظریہ:

لیکن محمد علی کا نظریہ اُن دونوں سے مختلف تھا، وہ یہ کہتے تھے کہ فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ

فسادات کا ہونا لازمی ہے۔قوم کے لیڈروں نے اگر اس وقت یہ روش اختیار کی کہ اپنی قوم کو بے قصور بتلایا اور دوسری قوم کو قصور وار تو اس سے اختلاف کے بڑھنے کا اور زیادہ امکان ہے، اور ہمیں اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے اختلافات کم کریں اور آزادی کی منزل مقصود کی طرف کوچ کریں۔ لہٰذا بہترین صورت اُنہوں نے یہ پیش کی کہ ہر لیڈر اپنی قوم کی غلطیوں پر اُسے سرزنش کرے، اس لیے کہ یہ تو مسلم ہے، تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ چنانچہ اِس فساد کے بعد پنجاب پروونشل خلافت کانفرنس میں محمد علی نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''یہ وقت نہیں ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے سر الزام تھوپے، بلکہ موزوں یہی ہے کہ ہر شخص اپنے ہم مذہبوں کو متنبہ کرے۔ اس لیے فسادات کوہاٹ کی جتنی ذمہ داری مسلمانوں کے سر ہے، میں اُنہیں ملامت کرتا ہوں۔''

صرف اِسی موقعہ پر نہیں بلکہ ہمیشہ محمد علی نے یہی کیا اور مسلمانوں میں غیر ہر دلعزیز ہوتے رہے اور صرف اِسی موقع پر نہیں، بلکہ ہمیشہ ہندو زعماء نے یا تو ''سکوتِ مصلحت شناس'' پر عمل کیا اور یا پھر ''سچی سچی باتیں'' بالکل ''مجبور'' ہو کر اُن کو مسلمانوں کے متعلق بیان کرنا پڑ گیا۔

دھرم شالہ چھیدی لال کا جلسہ:

13 اپریل 1925ء کی رات کو قومی ہفتہ کے سلسلہ میں دھرم شالہ چھیدی لال میں کانگریس کی طرف سے ایک جلسہ منعقد ہوا، حاضرین کی تعداد بہت کم تھی لیکن محمد علی اس مدوجزر سے واقف تھے۔ اُن پر اس کا بالکل اثر نہیں ہوا، اُنہوں نے اپنی تقریر شروع کی:

> ''آج کے جلسہ میں بہت کم حاضری ہے مگر اِس افسردگی کا اثر اُن لوگوں پر کچھ نہیں پڑ سکتا جو اپنے عقیدہ اور رائے پر پہاڑ کی طرح قائم ہیں۔ اگر آج یہاں صرف دو آدمی ہوتے تب بھی جلسہ کیا جاتا۔ اُس وقت تک ہم لوگ برابر اپنی کوششوں میں مصروف و مشغول رہیں گے جب تک ہم اپنی رائے اور عقیدہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔
>
> آج جو افسردگی و اضمحلال آزادی کی تحریک میں پیدا ہو گیا ہے، یہ کوئی نئی چیز نہیں

ہے، ہمیشہ ہر ملک میں تحریکِ آزادی کو نشیب و فراز سے گزرنا اور پستی و بلندی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔''

موتی لال سے اختلاف کی وجہ:

اپنے اور پنڈت موتی لال نہرو کے اختلاف پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد علی کہتے ہیں:

''میرا اُن کا سارا اختلاف اِسی باعث ہے کہ اوّل تو اُنہوں نے مہاتما گاندھی کے قید و بند کے زمانہ میں اُن کے خلاف بغاوت کی اور کانگریس کے دو ٹکڑے کر ڈالے، دوسرے اُنہوں نے ایک اور باغی لالہ لاجپت رائے کی امداد حاصل کرنے کی اُمید پر صوبہ سرحد اور سوراج پارٹی دونوں کے مسلمانوں کی حق تلفی کو گوارا کیا اور حق پر ثابت قدم نہ رہے۔''

محمد علی کی یہ تحریر اُس وقت شائع ہوئی تھی جب 1925ء میں موتی لال نہرو صاحب نے اسمبلی کے اندر صوبہ سرحد کو مساوی حقوق دینے سے اختلاف کیا تھا۔

ایک غیر مسلم اخبار کا اعتراف:

ایک غیر مسلم اخبار جس نے ہمیشہ کسی نہ کسی نہج پر محمد علی سے اختلاف کیا، محمد علی کی اِس خوبی کا وہ بھی مداح تھا کہ جب کانگریس سے لوگ کٹ رہے تھے، محمد علی نے اپنے تعلقات اور زیادہ مستحکم کر لیے۔ وہ لکھتا ہے:

''گو آج عدم تعاون کی تحریک کمزور ہو جانے کے باعث ہندوستان کے سیاسی آسمان پر مہاتما گاندھی اور اُن کے رفیقوں کا علم بلند نہیں ہو رہا ہے اور ملک کے اندر شدھی و تبلیغ کی موجودہ افسوسناک گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، مگر ملک کے محترم لیڈر مولانا محمد علی کی قابلیت، خلوص اور قومی خدمات کی یاد لوگوں کے ذہن میں اُس وقت تک محفوظ رہے گی جب تک کہ ہندوستان کے رہنے والوں میں حریت و آزادی کے

خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے۔''

ایک اہم اختلاف:

1927ء میں پنجاب کے ایک لیڈر اور اسلامی ہند کے ایک شاعر نے پنجاب کونسل میں ایک تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں ہندو مسلم افسران کے بجائے انگریز افسران کا خیر مقدم کروں گا۔

محمد علی کو اِن خیالات سے قدرتی طور پر سخت اختلاف ہونا چاہیے تھا، چنانچہ اُنہوں نے اِس تخیل سے سخت اختلاف کیا اور اِس موضوع پر اپنے گرانقدر خیالات پیش فرمائے جو''ہمدرد'' کی کئی اشاعتوں میں کئی کئی کالم میں شائع ہوئے۔ ہم اُس مضمون کے اہم حصص کا خلاصہ محمد علی ہی کے الفاظ میں درج ذیل کرتے ہیں:

''وہ آج ہمارے مرض کا علاج اِسے نہیں سمجھتے کہ ہندوؤں کو غیرت دلانے کی کوشش کی جائے کہ اقلیت کے ساتھ ناانصافی نہ کرو، جب تک اس کو رام نہ کرگے سوراج نہ لے سکو گے، اس کے استیصال کا خیال حمایت نہیں جنوں ہے۔''

تاریخی تمثیل:

''جب محمد بن قاسم مٹھی بھر مسلمانوں کو لے کر سندھ میں داخل ہوا تھا تب اُس کے استیصال کا اچھا موقع تھا، تم نے اُس موقع کو ہاتھ سے جانے دیا۔ جب محمود غزنوی سترہ بار ہندوستان آیا اور سارے ملک میں گھوما گھوما پھرا، مگر وہی چند ہزار فوج کے ساتھ تب بھی موقع تھا کہ اس اقلیت کا استیصال کر دیا جائے، اُس وقت بھی تم نے اُس کا استیصال نہ کیا۔ اِس کے بعد شہاب الدین غوری آیا، تم نے اُس موقع کو بھی ہاتھ سے جانے دیا۔ غلاموں تک کے خاندان نے یہاں بادشاہی کی اور بہ ظاہر تم نے اُسے بھی قبول کر لیا، پھر ایک فرغنہ (فرغانہ) سے بھاگا ہوا مغل بابر یہاں آیا اور تم نے سارا گھر بار اُسے دے ڈالا۔ اُس کے بیٹے کو یہاں سے نکالا بھی تو اُس کے

بھائیوں نے یا مسلمان پٹھانوں نے اور اُن پٹھانوں کے ہاتھ سے بھی عنانِ حکومت نکلی تو پھر اُس کے ہاتھوں آ گئی، اور اس کے بعد بھی بنئے بقال اِس ملک کی حکومت کو اُن مغلوں کے ہاتھ سے نہ چھین سکے جو رانا سانگا جیسے راجپوت پر غالب آئے تھے۔ ایک اور مغل اکبر نامی پھر اِس ملک پر حکمراں ہو کر رہا۔تم نے سکھوں کو بھی جو اسلام سے بہت ہی قریب آ گئے تھے، مغلیہ حکومت سے بھڑ وا دیا۔تب بھی سوا اس کے کچھ نتیجہ نہ نکلا کہ بجائے دو بڑی مذہبی جماعتوں کے تین بن گئیں۔

جب اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد چند ہی سال میں کئی بار بھائیوں، بھائیوں میں پھر تخت کے لیے جنگ چھڑی اور جو جیتا، وہ بھی عیاشی میں پڑ گیا اور وہ مرہٹوں کی قوت جس کو اپنا مطیع ومنقاد بنانے کا عزم بالجزم کر کے اورنگ زیب دہلی کو چھوڑ کر دکن گئے تھے اور 26 برس تک جب تک کہ وہ اور زندہ رہے، اس میں مصروف رہے اور بالآخر اس قوت کو دبا کر ہی اُنہوں نے دم لیا، وہ قوت پھر بڑھنے لگی اور ایک سیوا جی کی جگہ چار چار مرہٹے راجہ برہمن پیشوا کے درباری بنے اور جب نادر شاہ نے مغلیہ سلطنت کو بالکل ضعیف چھوڑ دیا تو سب نے مل کر اتنی ہمت کی کہ دہلی پر دھاوا بول دیا۔ اُس وقت بھی ایک غریب الوطن پٹھان احمد شاہ ابدالی نے بھاؤ کو اِس طرح شکست دی کہ پھر کبھی اِس قوم نے شمال کا رُخ نہیں کیا۔ بھاؤ جی سندھیاں ایسا بہادر پانی پت سے اِس طرح بھاگا کہ ساری عمر وہ اُس تعاقب کرنے والے پٹھان کو نہ بھولا جس کا چھوٹے قد کا گھوڑا اُس کے پیچھے برابر چلا آ رہا تھا اور اُس کے نتھنوں سے نکلتی ہوئی بھاپ جسے وہ بار بار مڑ کر دیکھتا تھا تو لرز جاتا تھا، ساری عمر اُسے خواب میں ستاتی رہی۔ وہ آخری موقع تھا کہ تم اِس اقلیت کا استیصال کر سکتے تھے مگر تم نے اس کو بھی ہاتھ سے کھو دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے غضب کیا کہ تم کو تباہ بھی کیا اور خود قیام بھی نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی سلطنت نکل گئی اور تمہیں

بھی نہ مل سکی، سات ہزار میل کے فاصلہ سے سات سمندر پار کر کے کچھ سوداگر جہانگیر کے دربار میں تجارت کرنے کی اجازت لینے آئے تھے۔اُنہوں نے جہانگیر کے وارث اَندھے شاہ عالم کو دوسو برس کے بعد اپنی ''حفاظت'' میں لے لیا اور اُس کی اور تمہاری دونوں کی رہی سہی طاقت کو مٹا کر اپنی سلطنت قائم کر لی۔''

راہِ عمل کیا ہو:

''اب اگر غلامی سے نکلنا ہے تو اِس کا یہی طریقہ ہے کہ ہم تم ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں۔ایک دوسرے کی طرف سے جو اذیت زبان سے یا ہاتھ سے پہنچتی ہے اس پر صبر کریں، مگر اس غلامی کو ہرگز نہ برداشت کریں جس میں تم بھی سوڈیڑھ سو برس سے مبتلا ہو اور ہم بھی، اور جو یقیناً ہندو راج سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے اور مسلم راج سے بھی۔''

دشمن منتخب کرلو:

''نہ ڈاکٹر... صاحب اِسے ہمارے مرض کا علاج سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو صبر کی تلقین کریں اور اُن سے کہیں کہ گو یہ یقینی امر ہے کہ تمہیں خدا کی خاطر ساری خدائی سے لڑنا پڑے گا لیکن تم ایک ہی وقت میں ساری دنیا سے نہیں لڑ سکتے، دشمنوں میں سے ایک کو چھانٹ لو جسے تم الدالخصام سمجھتے ہو، جو تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ قوی ہے۔اگر ہو سکے تو اس کے خلاف اوروں کو اس طرح اپنا حلیف بنا لو جس طرح رسولِ اکرم ﷺ نے یثرب کے یہودیوں تک کو مشرکین مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنایا تھا۔ اگر کوئی جماعت بھی تمہارے سیاسی تدبر سے رام ہو کر تمہاری حلیف نہ بن سکے، تب بھی ہر محاذِ جنگ پر یکساں زور نہ لگاؤ اور محاذوں پر صرف مدافعت کرتے رہو اور جس محاذ پر جہاں جنگ کا فیصلہ ہونے والا ہے، پورا زور صرف کر دو اور جگہ صبر وضبط سے

کام لو۔ جب سب سے بڑے محاذِ جنگ پر فتح حاصل ہو جائے تو دوسرے محاذوں پر آپ ہی فتح حاصل ہو جائے گی اور اُس وقت ایک ایک کر کے ہر دشمن سے دِل کھول کر انتقام لے لینا، یہ نامردی نہیں ہے بلکہ اِسی کو ''عزم'' کہتے ہیں۔''

الدالخصام کون ہے:

''اگرچین وعرب بھی تمہارا ہے اور ہندوستان بھی تمہارا ہے اور تم سب مسلمان ہو اور سارا جہان تمہارا وطن ہے تو اُسی دشمن کو الدالخصام سمجھو جو سارے جہان پر حاوی ہونا چاہتا ہے، یقیناً وہ دشمن ہندو نہیں ہے۔ اس غریب کی تگ ودو تو سمندر کے کنارہ تک ہے، یہ تو گولر کا بھنگا ہے جس کی ساری دنیا اِسی گولر میں محدود ہے۔ ایمان سے کہو کیا تم اِس سے خائف ہو؟ ریل پر کسی ڈبہ میں چھ سات ہندو ہوں اور اُن میں تم بھی جا کر بیٹھ جاؤ تو کیا تمہیں اُن سے ڈر لگے گا۔ بعض اوقات تو اُنہیں کو تم سے ڈر لگتا ہے، البتہ اگر اُس ڈبے میں دو چار گورے ہوں تب تو تم کو اور اُن کو، دونوں کو ڈر لگا ہے کہ یہ ماریں گے یا سامان پھینک دیں گے یا گالی دیں گے یا پاؤں دبوائیں گے۔ آج اگر ہندو تم پر ظلم کرتے ہیں، تمہارے سیاسی و مذہبی حقوق پامال کرتے ہیں، تمہاری عبادتوں میں خلل ڈالتے ہیں تو اس لیے کہ حکومت تمہاری اور تمہارے حقوق کی حفاظت میں کوتاہی کرتی ہے۔ خیر اگر تمہیں اس سے لڑنا ہی ہے تو کس ہتھیار سے لڑو گے؟ لٹھ پونگے میں تم اب بھی در رہتے ہو۔ اگر آج انگریز بیچ میں نہ کود پڑیں تو تم اب بھی ان سے بھگت لے سکتے ہو۔ ایک جگہ بھی تو آج تک دِن بھر لڑائی نہ ہونے پائی۔ پولیس آ جاتی ہے، فوج آ جاتی ہے اور بالآخر اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے ہو، پھر پکڑ دھکڑ شروع ہوتی ہے۔ جن مسلمانوں کے لیے تم گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخا کرتے تھے کہ سرکاری نوکریاں اُنہیں دی جائیں، وہ تو اِس خوف کے مارے کہ کہیں سرکار اُنہیں متعصب اور طرف دار سمجھ کر برخاست نہ کر دے، بعض اوقات خود

ناکردہ گناہ مسلمانوں تک کو پھنسوا دیتے ہیں۔ سہارنپور میں کیا ہوا؟ علی گڑھ میں کیاہوا؟ وہ تو ہندو ہی ہیں جو خود تمہارے قول کے مطابق اپنے مجرموں تک کو چھٹوا لیتے ہیں اور جو (ہندو پولیس افسر) ہندومہاسبھا کے صدر سے بقرعید کی صبح کو ٹیلیفون پر احکام لیا کرتے ہیں کہ کس محلّہ اور کس گلی اور کس بازار میں پولیس زیادہ لگوائی جائے اور کس میں کم؟ جب مقدمات کچہری میں پہنچ جاتے ہیں تو تمہارے یہاں وکیلوں کا کال پڑ جاتا ہے، خود تمہارا بیان ہے کہ عبدالرشید کے مقدمہ پر ایک بیرسٹر نے چار سو روپیہ روز رکھوا لیے اور اگر شب ماقبل آٹھ بجے سے پہلے یہ رقم وصول نہ ہوگئی تو بوریا بدھنا باندھ اُسی وقت اسٹیشن کا رُخ کرنے کی دھمکی دی۔ نہ سیشن میں نہ ہائیکورٹ کی اپیل میں کسی نامور مسلمان بیرسٹر نے پوری فیس نہ لے کر پیروی کرنا قبول کیا؟ اِندور میں آج بھی مسٹر آصف علی جن کے لیے انتخاب میں بوڑھے اور مفلوج مسلمان تک پالکیوں میں پڑ پڑ کر ووٹ دینے کے لیے آئے تھے، غریب مل کے مزدوروں سے دس ہزار اپنے لیے اور ایک ہزار اپنے منشی کے لیے ٹھہرا چکے تھے اور بنگلہ کا کرایہ ستر ماہوار علیحدہ اور کھانے کا خرچ ڈیڑھ سو ماہوار مستزاد اور ڈیڑھ سو ماہوار موٹر کا خرچ سونے پر سہاگہ۔

جب حالت یہ ہو تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ فسادات سے جہاں تک ہو سکے، بچا جائے!"

کانگریس کی حمایت، انگریزوں کی مخالفت میں، ہندو مسلم اتحاد کی موافقت میں اِس سے بڑھ کر کچھ کہا جا سکتا ہے؟ یا کسی بڑے سے بڑے مدبر نے ایسے نفسیاتی دلائل کبھی پیش کیے ہیں؟

بمبئی تحقیقاتی کمیٹی:

1929ء کے فساد بمبئی میں محمد علی نے جو کچھ کیا، وہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ پھر اِس کے بعد جب تحقیقاتی کمیٹی بیٹھی تو محمد علی نے اپنی علالت اور کانگریس کی مخالفت کے باوجود اس میں بیان دیا اور

کانگریس کو ہندو مسلمانوں کا ادارہ بتایا۔ اپنے اختلافات کو فروعی اور خانگی ظاہر کیا اور لاہور کے اجلاسِ کانگریس میں شرکت پر آمادگی کا اظہار کیا۔ گورنمنٹ، پولیس اور فوج پر پوری تنقید کی، حالانکہ محض ایک ''فرقہ وارانہ'' لیڈر کا فرض یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے اپنی ملت کو مظلوم اور دوسری کو ظالم ثابت کر کے چلا آتا۔

مسٹر پٹیل کی ٹوپی:

سوراج پارٹی کے رکن کی حیثیت سے جب مسٹر وٹھل بھائی پٹیل نے پہلے اسمبلی کی ممبری اور پھر صدارت قبول کی اور صدارت قبول کرنے کے بعد جس طرح وہ پورے سرکاری لباس میں سر پر ''وگ'' ڈال کر تشریف لائے ہیں، اُس پر سبھی متحیر و متعجب ہوئے تھے اور اس طرزِ عمل کو ''تعاون کا درمیانی قدم'' بتایا تھا۔

مگر محمد علی نے نہ صرف یہ کہ اِس روش کی مخالفت کی بلکہ مسٹر پٹیل کو ہر طرح سے آمادہ کیا کہ صدر ہو جانے سے آدمی کے عقائد میں فرق نہیں آنا چاہیے، آپ کو اپنا قومی لباس ہی زیب تن کرنا چاہیے اور ''وگ'' کے بجائے اپنی وہی ٹوپی جو اِس سے قبل آپ کو محبوب تھی۔

چنانچہ مسٹر پٹیل نے اِس نصیحت کو قبول کیا اور اُن کی قبولیت کی خبر اِن الفاظ میں شائع ہوئی:

> ''معلوم ہوا ہے کہ مسٹر پٹیل پریذیڈنٹ لیجسلیٹیو اسمبلی نے مولانا محمد علی کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے ''وگ'' کو اُتار پھینکا اور اپنی اصل کھدر کی ٹوپی پہن کر کرسی صدارت کو زینت دینے لگے۔''

الحمد للہ!

☆

باب ۲۷

''یونٹی کانفرنس''

ملک کی عام حالت:

تحریکِ ترکِ موالات کے التواء اور پھر گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد ہندوستانی سیاسیات میں جو انقلابِ عظیم پیدا ہوا وہ ''ظاہر و باہر'' ہے۔ ہندو مسلمانوں کے الگ الگ محاذِ جنگ قائم تھے اور ہر فریق کی پوری کوشش اِس میں صرف ہوتی تھی کہ دوسرے فریق کو نیچا دکھایا جائے۔

سنگھٹن:

پھر ایک نئے ولولہ کے ساتھ سنگھٹن کی تحریک شروع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ چند ہی دِنوں کے اندر ہندوؤں میں اتنی توانائی آ جائے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال کر حجاز تک میں ''اوم'' کا جھنڈا لہرائے۔

اس آرزو کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے!

اور اس مقصد کے حصول کے لیے کیا یہ گیا کہ اکھاڑے قائم کیے گئے جہاں کشتی کی تعلیم کے لیے پہلوان مقرر کیے گئے۔ ہندوؤں میں یہ احساس پیدا کیا کہ ''حفاظتِ خود اختیاری'' کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بانکا، بنوٹ، پھری، گتکہ اِن تمام فنون میں مہارت حاصل کریں تا کہ یہ سب چیزیں ''بوقت ضرورت کام آویں۔''

دوسری طرف مالوی جی، لاجپت رائے اور سوامی شردھانند کی علی الاعلان تعلیم ہندو خواتین کو یہ تھی

کہ وہ بھی اپنے پاس کم از کم ایک ''قرولی'' ضرور رکھیں، کیا معلوم کون وقت کیسا ہوتا ہے؟

مسلمانوں میں جوش:

اِن باتوں سے مسلمانوں میں ایک جوش تو ضرور پیدا ہو گیا، لیکن الحمد للہ کہ اُنہوں نے اِس قسم کی نمائشی حرکتیں نہیں کیں جن کا مقصد صرف تخویف وترہیب تھا۔

نتیجہ:

اِن تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فسادات کا ایک موسم مقرر ہو گیا۔ جہاں کوئی مذہبی تقریب آئی اور فسادات کا موسم شروع ہو گیا۔ مسلمان اپنی لاٹھیاں لے لے کر نکلے اور ہندو اپنی! چلئے ایک بار خوب خونریز جنگ ہو گئی۔ کچھ مرے، کچھ زخمی ہوئے، کچھ جیل خانے گئے اور کچھ پھانسی کے تختہ پر لٹکے۔

اِس تمام ہنگامۂ دار و گیر میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہوتا تھا، اس لیے کہ ان بے چاروں کو پیروی کے لیے وکیل بھی نہیں ملتے اور بڑی بڑی فیسیں دے کر اگر اپنے کو بچا سکتے تو جان ہتھیلی پر رکھ کر ''میدانِ جہاد'' میں کیوں اُترتے؟

لکھنؤ کا فساد:

اُسی زمانہ میں لکھنؤ میں ایک نہایت خونریز فساد بغیر کسی امید کے دفعتاً و بغتۃً ایک جماعت نے کر دیا، یہ فساد اتنا خونچکاں تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کئی روز تک مسلمانوں کے محلّہ میں ہندوؤں کی اور ہندوؤں کے محلّہ میں مسلمانوں کی جان کی خیر نہیں تھی۔ سیکڑوں راہ گیر، مسافر غریب الوطن نذرِ تیغ بے دریغ کر دیئے گئے اور کشتوں کے پشتے لگ گئے۔

اسبابِ فساد:

لیکن اِس خونریزی، اِس کشت و خون اور اِس قتل عام کے اسباب و محرکات کیا تھے؟ باجہ، گائے اور دسہرہ، ہولی!

مذہب کے نادان دوست مذہب کے نام پر کتنا بدنما دھبا لگا رہے تھے؟

یونٹی کانفرنس:

اِن حالات میں ایک یونٹی کانفرنس دہلی میں طلب کی گئی جس میں ہندو مسلمانوں کے ''متفقہ'' اور مسلمہ زعماء نے کوشش کی کہ راہِ صلح و امن پیدا کی جا سکے، لیکن یہ مقصد صرف پر جوش اور دھواں دھار تقریروں سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی! کئی روز تک اجلاس ہوتا رہا، تقریریں ہوتی رہیں، صلح و امن کی راہ تلاش کی جاتی رہی مگر وہ مل نہ سکی!

محمد علی کا حصہ:

محمد علی بھی اُس ''ملاپ کانفرنس'' میں شریک ہوئے تھے، اُنہوں نے اپنی پوری قوت صرف کر دی کہ کوئی ایسا حل نکل آئے کہ جانبین کا فساد پسند عنصر راضی ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ محمد علی نے اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا:

'اگر کوئی ہندو میری بیوی کی بے عزتی کرے جب بھی میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، میری ماں کو قتل کرے جب بھی میں عدالت مقدمہ نہیں لے جاؤں گا، لیکن اب اِس بدترین صورت حال کا علاج ہونا چاہیے۔ ذرا ذرا سی بات پر ہم کو چاہیے کہ تلواریں میان سے نہ نکال لیا کریں، ورنہ ہم آزادی کی منزل سے دُور ہوتے چلے جائیں گے اور اغیار برابر ہمارا مضحکہ اُڑائیں گے، اور ہم پر زبانِ طعن دراز کریں گے۔''

لیکن وہ فضا ایسی تھی کہ ہندوؤں نے تو اِس تقریر سے کوئی ہمدردانہ اثر نہیں لیا، مسلمان مخالفین نے محمد علی کی اسلام دشمنی کے ثبوت میں اُن کی یہ تقریر البتہ اُچھالنا شروع کر دی۔

ایک بات پر اگر شردھانند اپنی ''نیم رضامندی'' کا اعتراف کرنے پر آمادہ ہوتے تھے تو مالوی جی کڑک کر ایک ڈانٹ بتا دیتے تھے۔ اگر مالوی جی کچھ صلح پسندی پر مائل ہوتے تھے تو ''شیر پنجاب'' لالہ لاجپت رائے کی ایک دہاڑ اُن کا پتہ پانی کر دیتی تھی۔

غرض کئی روز کی کوششوں کے بعد معلوم ہوا کہ ''نشستند، گفتند و برخاستند'' کا ہمہ گیر کلیہ یہاں بھی

حاوی ہے۔

التواء کے بعد:

''ملاپ کانفرنس'' کے التواء کے بعد اس لیے کہ وہ برخاست نہیں کی گئی تھی، ہندو مسلم زعماء پھر اپنی اپنی قوم کو ''مستقبل'' کے لیے تیار کرنے لگے۔ فساد کی گرم بازاری میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور ہندو مسلم اختلافات میں اضافہ ہوتا رہا۔

محمد علی کا طرزِ عمل:

اِس التواء کے بعد محمد علی نے نہ گوشۂ عافیت اختیار کی نہ خاموشی اختیار کی اور نہ فساد پسند طبائع کو اُبھارنا شروع کیا، بلکہ اُنہوں نے مسلسل دورے کیے، تقریریں کیں، مضامین لکھے، پرائیویٹ ملاقاتیں کیں، جلسے طلب کیے، گاندھی جی کو سمجھایا، مالوی جی کی منت کی، مگر! نتیجہ؟ ناکامی!

شملہ یونٹی کانفرنس:

آخر فسادات میں اضافہ ہوتا رہا اور ہندو مسلم تعلقات بد سے بدتر ہوتے رہے۔ گاندھی جی یہ کہہ کر کہ ''اب میری بات کوئی نہیں سنتا'' اپنے آشرم میں معتکف ہو گئے لیکن محمد علی کی کوششوں کا اب بھی خاتمہ نہیں ہوا۔

1926ء میں شملہ میں اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، وہیں مجلس مرکزیہ خلافت نے اپنا جلسہ طلب کیا۔ تقریباً تمام ممبران شریک ہوئے۔ مہاسبھا کی مجلس بھی اُس زمانہ میں وہیں ہو رہی تھی، خلافت کے اکثر ممبران کا اصرار تھا کہ آخر ہم کب تک ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگائیں گے؟ ہم تو یہ نعرے لگا رہے ہیں اور دشمن ہماری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر ہمیں تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے، ''لہٰذا کم از کم ہمیں دفاعی پروگرام پر تو عمل کرنا چاہیے''، مگر خلافت کمیٹی نے پھر اِس پرجوش عنصر کو قابو میں رکھا۔

قاصدِ امن:

مولانا شوکت علی نے مرکزیہ کی طرف سے مسٹر شعیب قریشی اور ڈاکٹر انصاری کو اپنا سفیر بنا کر

ہندو مہا سبھا کے قائد ڈاکٹر مونجے کے پاس بھیجا کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے، حالات نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے ہیں، ہم اپنے مقصدِ حریت کی خاطر دفاعی کارروائی کرنا بھی نہیں چاہتے۔ لہٰذا اب اِن اختلافات کو ختم کیجیے اور ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھئے اور دِل جوڑ کر اُٹھئے، پھر جب خدا وہ دِن کرلے کہ ہم عروسِ حریت سے ہم کنار ہوں، تب پھر جتنا جی چاہے لڑ لیجیے گا۔

کانفرنس شروع ہوگئی:

آخر شملہ کی بلندیوں پر ایک بار پھر ''ملاپ کانفرنس'' کی کارروائی کا آغاز مسٹر جناح کی صدارت میں ہوا اور اس میں خلافت اور ہندو مہا سبھا کے اور بعض دوسری انجمنوں کے نمائندے اور بعض حضرات شخصی حیثیت سے شریک ہوئے۔

بیگم بھوپال کا تار:

اُسی زمانہ میں بیگم صاحبہ بھوپال نے ایک تار اس ''ملاپ کانفرنس'' کے نام بھیجا اور بڑی پرزور استدعا کی کہ اب فسادات و اختلافات کا خاتمہ ہونا چاہیے، نیز ممدوحہ نے ''بآنِ'' پیرانہ سالی اپنے خدمات پیش کیے! دوسرے لوگ بھی جو نہ آسکے، اُنہوں نے ہمدردی کے تار دیے اور وقتاً فوقتاً شرکت پر آمادگی ظاہر کی۔ اِس اُمید افزا فضا میں ''ملاپ کانفرنس'' کا آغاز ہوا۔

محمد علی کی کوششیں:

محمد علی نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کی جتنی کوشش کی، کسی لیڈر نے کم کی ہوگی۔ تجویزوں کا مسوّدہ تیار کرنے میں، الفاظ گھٹانے بڑھانے میں، معاملات کو رو براہ کرنے میں، لوگوں کو ایک نقطۂ نظر پر لانے میں محمد علی نے اپنی ساری قابلیت اور ساری کوشش صرف کردی کہ کسی طرح اس افتراق و انشقاق کا خاتمہ ہو اور ایک بار پھر وہ مبارک زمانہ آجائے کہ ہندو مسلمانوں کی تعریف کررہا ہو اور مسلمان ہندو کی منقبت۔

مجلس مرکزیۂ خلافت کا جلسہ ختم ہوگیا، اُس کے ممبران چلے گئے۔ مولانا شوکت علی واپس گئے، مگر

''ملاپ کانفرنس''، ختم نہیں ہوئی وہ ہفتوں ہوا کی۔

شاہد کی علالت:

محمد علی شملہ میں ہندو مسلم اتحاد کی گرہ کشائی کر رہے تھے اور دہلی میں اُن کا عزیز بھتیجا شاہد علی مرگ و زیست کی کشمکش میں گرفتار تھا۔ حالت بہت زیادہ نازک ہوگئی تھی۔ بھتیجے کی یہ تمنا کہ وہ آخری وقت اپنے شفیق چچا کا دیدار کر لے اور چچا کی یہ کوشش کہ وہ آخری بار اپنے بھتیجے کو پیار کر لے، مگر ملکی و ملّی خدمت کی زنجیر ایسی پڑی ہے کہ قدم نہیں اٹھانے دیتی، آخر

مند گئیں دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں، ہے ہے!

مگر چچا کو موقع نہ مل سکا کہ وہ جنازہ ہی میں شرکت کر سکتا یا کم از کم مٹی ہی دے سکتا۔

پھر التواء:

ہفتوں کی اس مسلسل نشست اور تگا پو کے باوجود پھر بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے ہوئے یہ کانفرنس ملتوی ہو گئی کہ کسی آئندہ موقع پر دیکھا جائے گا، اِس وقت فضا مناسب نہیں ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے اقلیت میں ہونے کے باوجود جس جس طرح ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ کہ کوئی صحیح راہِ عمل متعین ہو سکے، اُس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ لیکن اس کی نظیر بھی اس سے زیادہ ملنا دشوار ہے کہ ''اکثریت'' کو اپنے متعلق اتنا خطرہ ہو کہ ہمیشہ صلح کی کوششوں سے بھاگے، اتحاد کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرے اور اشتراکِ عمل کا نام سننا بھی پسند نہ کرے۔

اِس التواء کے بعد پھر دوسرے نام سے جو کوششیں ہوئیں اور محمد علی نے اُن میں جو حصہ لیا، اُس ذکر بعد کو آئے گا۔

❀❀❀

باب ۲۸

مسئلہ حج وحجاز

عالم اسلام سے بالعموم اور حجازِ مقدس سے بالخصوص ہمیشہ محمد علی کو ایک گہرا تعلق رہا اور جب بھی کوئی نازک موقع پیش آیا، اُن کے قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹے بلکہ ہمیشہ اُنہوں نے ملتِ اسلامیہ کی صحیح رہنمائی کی۔

شریف حسین کی غداری:

جنگِ عمومی میں جس طرح حسین شریفِ مکہ نے صرف ترکوں ہی سے نہیں بلکہ اسلام اور قبلۂ اسلام سے اپنی غداری کا ثبوت دیا، وہ ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیے۔

جنگِ عمومی میں یہی وہ ''مرغِ زرّیں بال'' تھا جسے شاطر فرنگ نے اپنے دام استعمار میں اپنی بساطِ سیاست کا ایک اہم مہرہ سمجھ کر لانا چاہا تھا اور اس دشمن اسلام کو ''وحدتِ عربیہ'' اور ''حکومتِ متحدۂ حجاز'' کے سبز باغ دِکھا کر ترکوں سے بغاوت کروائی اور اپنا کام نکالا، اور پھر جنگ کے بعد جس طرح اُس سے وعدہ خلافیاں کی گئیں اور رفتہ رفتہ اُس غریب کو جس طرح اپنی ''حفاظت'' میں لے لیا گیا، وہ ایک عجیب وغریب داستان ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ حجاز ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ شام میں فرانس کا انتداب اور عراق وشرقِ اُردن پر برطانیہ کی نظر عنایت ہوئی، البتہ یمن اور نجد دو مقامات ایسے تھے جو گورنمنٹ کے اثر سے کلیتاً آزاد تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ حجاز کو اس عالم کسمپرسی میں رہنے دیں۔

حملے کے ارادے:

آخر نجد کے جواں ہمت شہزادہ عبدالعزیز ابن سعود نے حجازِ مقدس کو اِن گندگیوں سے پاک کرنا

چاہا، اس لیے کہ عالم اسلام کی ہمدردی شریف حسین کھو چکا تھا اور خود حجاز کے باشندے اُس کے مظالم اور عجیب عجیب ٹیکسوں سے تنگ آ چکے تھے۔ اس لیے سب کو یہ حملہ ایک آیتِ رحمت معلوم ہوئی کہ وہاں سے ایک صحیح العقیدہ اور پختہ مذہب شخص اِن تمام گندگیوں کا استیصال کرنا چاہتا ہے۔

گورنمنٹ کا طرزِ عمل:

جنگ شروع ہوئی تو گورنمنٹ کی دِلی ''ہمدردی'' ظاہر ہے کہ شریف حسین کے ساتھ تھی، وہ کیوں چاہتی کہ اُس کا ایک شکار مفت میں ہاتھ سے نکل جائے اور حجاز پر ایک ایسی حکومت قائم ہو جائے جو اُس کے اثر سے کلیتاً آزاد ہوا اور آزاد رہنا چاہے، اس لیے گورنمنٹ نے چاہا کہ کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ صورت حال میں تغیر پیدا کر دیا جائے۔

التواءِ حج کی تجویز:

اِس کا نتیجہ یقیناً حسبِ دِل خواہ نکلے گا اور چونکہ علیٰ الاعلان وہ کسی کی طرفداری یا مخالفت کر نہیں سکتی تھی ورنہ ہندوستان کے مسلمان ایک آفت برپا کر دیتے، اس لیے اُس نے یہ تجویز تیار کی کہ اس سال 1925ء میں ہندوستان سے حاجیوں کو حج کرنے جانے ہی نہ دیا جائے۔ چنانچہ گورنمنٹ کی طرف سے ایک کمیونکے شائع ہوا جس میں حجاز کی حالت نہایت خطرناک اور دہشت ناک بتائی گئی اور حاجیوں کو حکم تو نہیں دیا جا سکتا تھا، اس لیے ''مشورہ'' دیا گیا کہ وہ حجاز کا رُخ نہ کریں ورنہ ہم اُن کے جان و مال، کسی چیز کی حفاظت کے ذمہ دار اور جواب دہ نہ ہوں گے! اس کمیونکے کی خوب اشاعت ہوئی۔

محمد علی کا ردِّ عمل:

محمد علی اس کمیونکے کی اشاعت کے بعد کس طرح چین سے بیٹھ سکتے تھے، انہوں نے اِس مسئلہ میں گورنمنٹ کی خوب مخالفت کی اور حاجیوں کو ''حکم'' دیا کہ وہ حج کرنے ضرور جائیں۔ دوسری طرف خلافت کا ایک وفد حجازِ مقدس بھجوانا چاہا جو شریف حسین اور علی سے مل کر حالات میں اصلاح کرائے۔ ان کوششوں کا اثر یہ ہوا کہ خلافِ توقع حاجیوں کے قافلے کے قافلہ بمبئی میں پہنچنے لگے، شمع حرم کے ا

پروانوں کو جان و مال کی پرواہی کیا تھی۔

چونکہ جدہ پر گولہ باری ہو رہی تھی اس لیے حکومتِ سعود نے رابغ، قنقدہ، لیت جدید بندرگاہوں کو اِس قابل بنادیا کہ حجاج وہاں سے جاسکیں اور سب سے بڑھ کر گورنمنٹ کے لیے ستم یہ ہوا کہ حکومتِ سعود نے حاجیوں کی جان و مال کی حفاظت وصیانت کی ذمہ داری بھی لے لی۔

سر حبیب اللہ سے خط کتابت:

اُس زمانہ میں سر حبیب اللہ حکومتِ ہند کی ''ایگزیکٹو کونسل'' کے ممبر تھے، اُن سے محمد علی نے نہایت پرلطف خط کتابت کی اور اُنہیں بہ دلائل معقول باور کرایا کہ ایسی صورت میں حج کا التواء قطعاناجائز ہے، اِس اہم فریضہ مذہبی کو ضرور پورا ہونا چاہیے۔

ایک طرف یہ خط کتابت، دوسری طرف جدید بندرگاہوں کا انتظام، پھر ہندوستان ڈیرے ڈال دینا... یہ سب اسباب ایسے ہوئے کہ گورنمنٹ اجازت دینے پر مجبور ہوگئی۔

''مسلمانوں'' کی مخالفت:

ایک طرف تو محمد علی یہ کوشش کررہے تھے کہ حاجیوں کو حج سے نہ روکا جائے اور گورنمنٹ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ ایسی صورت پیدا کرے کہ حاجی جاسکیں، دوسری طرف سرکار پرست مسلمانوں کا ایک جم غفیر میدان میں تو نہیں آسکا، ہاں اسمبلی کے ایوان میں اور اخبارات کے صفحات میں اُس نے بھی اپنے زورِ بازو اور زورِ زبان و زورِ قلم کا پورا مظاہرہ کیا، اور کوئی ایسی ذلیل سے ذلیل تہمت نہیں تھی جو محمد علی پر نہ لگائی گئی ہو۔ یہاں تک کہا گیا کہ اس معاملہ میں محمد علی خواہ مخواہ اس لیے دخل دے رہے ہیں کہ کانگریس اور کانگریسی لیڈروں کی وقعت جاچکی، یہ اپنا اقتدار اِسی طرح بحال کرنا چاہتے۔

فرار:

اور پھر جب محمد علی نے اپنے اس ناقد کو دعوتِ مقابلہ دی کہ بھائی اگر واقعہ یہ ہے کہ میں آبرو باختہ لیڈر رہوں اور تم لوگ صحیح رہنمائی کررہے ہو، کانگریسی لیڈر بے وقعت ہوچکے ہیں اور اُن کی بات سنی نہیں

جاتی اور تم لوگ ماشاءاللہ باوقعت ہو اور تمہاری باتوں پر خوب عمل کیا جاتا ہے تو بسم اللہ۔

ہمیں میداں، ہمیں چوگاں، ہمیں گوئے

جامع مسجد ہی میں آجاؤ، میں بھی تقریر کروں گا، تم بھی اپنی صحیح رہنمائی سے لوگوں کو مستفید کرنا۔ پھر جس کے حق میں فیصلہ ہو جائے، وہ لیڈر اور جس حق میں نہ ہو وہ ''آبرو باختہ'' لیڈر۔

یہ چیلنج اگرچہ منظور کرلیا گیا لیکن جمعہ کے دن وہ بزرگ اپنی ''صحیح رہنمائی'' سے مستفید کرنے حسبِ اطلاع وخلافِ وعدہ تشریف نہ لا سکے، حاضرین کو بہت سخت اشتیاق وانتظار رہا۔

کامیابی:

بہر حال اِس تمام شور وشغب اور اِس تمام ہنگامہ کے باوجود گورنمنٹ کو اجازت دینی پڑی اور حجاج سوئے بیت اللہ گورنمنٹ کی نہیں بلکہ خدا کی حفاظت میں روانہ ہوئے۔

خیر وعافیت:

ایک طعنہ محمد علی کو اور اُن کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی کو یہ بھی دیا جا رہا تھا کہ اتنے حاجیوں کو بھیج تو رہے ہو مگر اِن سب کا خون ناحق تمہاری ہی گردن پر رہے گا۔ لیکن اللہ کو اپنے اُن سپاہیوں کی عزت رکھنی منظور تھی، ایک حاجی کی نکسیر تک نہیں پھوٹی۔ سب بخیریت گئے اور بعافیت واپس آئے، ذٰلک فضل اللہ!

❁❁❁

باب ۲۹

آویزشِ نجد و حجاز

محمد علی کی زندگی ایک عالم رُست خیز تھی، اُنہیں اپنی زندگی میں بڑے بڑے معرکوں سے دوچار ہونا پڑا اور سب میں دُنیا نے اُن کے استقلال و استقامت کا ایسا نمونہ دیکھا جس نے ہمیشہ لوگوں کو متحیر کر کر دیا۔

شریف کی بدکرداریاں:

حسین، شریفِ مکہ کے متعلق اجمالاً بتایا جا چکا ہے، یہاں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں، اتنا ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ اُس کی اُن بدکرداریوں کے باوجود عالم اسلامی کے اُس سے بیزار ہونے کے باوجود اور وحدتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کر دینے کے باوجود ہندوستان میں ایک بہت بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو اُس سے عقیدت و محبت رکھتی تھی اور گو اُس کے افعال و اعمال سے نالاں تھی مگر پھر بھی حجاز پر وہ اُسی کا اقتدار چاہتی تھی۔

شریف کے حامی:

اُس کی حمایت میں سب سے بڑی دلیل یہ لائی جاتی تھی کہ وہ آلِ رسول ہے، نجیب الطرفین سیّد ہے اور اِس کا مستحق ہے کہ حجاز کی زمام قیادت اُسی کے ہاتھ میں رہے۔

ابن سعود کے خلاف اُن لوگوں کے دلائل کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ ''وہابی'' تھا!

ہندوستان میں اسلام پیروں اور مرشدوں کے ذریعہ پھیلا، اس لیے ہمیشہ سے ایسے گروہ چلے

آتے رہے جنھوں نے مقدس اسلاف کے غیر مقدس اخلاف کو اُن کا صحیح جانشین سمجھا اور اُن کی ہر بدعت کو، ہر گمراہی کو اور ہر خباثتِ نفس کو اسلام سمجھا۔

جب ہندوستان میں یہ خبریں کہ ابن سعود حجاز پر قابض ہوا چاہتا ہے اور شریف حسین اپنے کردار کی سزا پایا چاہتا ہے تو اُن کی رگِ حمیت جوش میں آئی اور اُنھوں نے اپنی ''پبلک'' یعنی عوام کو لے کر ایک ہنگامۂ انتشار برپا کر دیا۔ شریف حسین کی حمایت ہونے لگی اور ابن سعود کی مخالفت، یعنی حق سے اعراض کیا جانے لگا اور باطل سے رغبت... دو مرکز خاص اہمیت رکھتے تھے، ایک بریلی، دوسرا فرنگی محل۔

رضا خانی جماعت کا اختلاف:

رضا خانی جماعت (بریلی) کا اختلاف بے انتہا سخت تھا لیکن وہ ایک ہی حلقہ میں محدود تھا، زیادہ متعدی نہ تھا، پھر وہ لوگ بے چارے چند کفر کے فتوے اور چند پمفلٹ شائع کر کے بیٹھ رہے کہ اس سے زیادہ اُن کے امکان میں نہیں تھا۔ لیکن فرنگی محل کا اختلاف بہت زیادہ مؤثر تھا، اس لیے کہ اُس کی مذہبی عظمت ہر جماعت کے دِل میں تھی۔ تحریکِ خلافت میں اس نے جو نمایاں حصہ لیا تھا، اس کا ہر شخص معترف تھا۔ اس لیے عوام کو اور خواص کو اس سے بدعقیدگی نہیں تھی بلکہ عقیدت، خوش عقیدگی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔

محمد علی کا نظریہ:

محمد علی کا نظریہ تھا کہ شریف حسین کو اس کی بدکرداریوں کی سزا ملے، بہت اچھا... اور ابن سعود حجاز کو فتح کر لے، بہت خوب... لیکن حجاز میں اب حکومت حجازیوں کی ہونی چاہیے اور سیادت عالم اسلام کی!

ابن سعود نے بھی یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا اور یہ کہ اُس کا ارادہ وہاں شخصی حکومت قائم کرنے کا بالکل نہیں ہے، ایسی تاریک فضا میں محمد علی نے ابن سعود کے وجود کو ایک روشنی سمجھا اور خیال کیا کہ اب حجاز مقدس کے دِن پھر آئے، اب وہاں یہود و نصاریٰ کے ''کابینۂ وزارت'' کے فیصلوں پر عمل نہیں ہوگا، بلکہ کتاب و سنت کی روشنی میں ہوگا۔ اب وہاں حکومت کسی شخص کی نہیں ہوگی، بلکہ اُمتِ اسلامیہ کی ہوگی۔

آزمائش:

محمد علی کے لیے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ایک تو یہ کہ اُنہیں جمہور مسلمین کی رائے سے اختلاف کرنا تھا،قبہ پرستی کے جذباتِ فاسد کو دُور کرنے کی کوشش کرنا تھی۔

دوسری طرف بڑے بڑے گہرے دوستوں اور بزرگوں سے اختلاف کرنا تھا۔وہ دوست اور وہ بزرگ جو اُن کے قوتِ بازو تھے،جن پر اُنہیں سب سے زیادہ اعتماد تھا،جنہیں وہ اُمت اسلامیہ کے لیے بے حد مفید سمجھتے تھے اور جو گزشتہ تحریکِ خلافت میں بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے چکے تھے۔

تیسری طرف اُنہیں اپنے محسنوں سے بھی اختلاف کرنا تھا اور پبلک کو ہموار کرنا تھا کہ وہ اُن کی رائے کے خلاف عمل پیرا ہو۔

عقیدت اور تعلقات کی زنجیریں بہت مضبوط ہوتی ہیں،ان کا توڑنا رسم ورواج کی زنجیروں کے توڑنے سے کہیں مشکل ہے۔ایک آدمی بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتا ہے لیکن جب اُس سے یہ کہو کہ اپنے عزیز کی مخالفت کرے تو کیا کرے گا؟ دُشمنوں کے خلاف صف آرا ہو جائے گا،ماں باپ کے خلاف کرو،ایسا بھی کرے گا،لیکن جب اس سے یہ کہو کہ اپنے ''مرشد'' کے خلاف لب کشائی کرو تو اُس کی زبان گنگ ہو جائے گی،جب اُس سے یہ کہو کہ اپنے مخلص ترین شرکاء کار سے اختلاف کرو تو اُس کے پیروں میں لغزش کی لرزش تم ضرور دیکھو گے۔

محمد علی نے یہ سب کچھ کیا!اور انتہائی استقلال واستقامت کے ساتھ کیا،مردانہ وار کیا،جھکے ہوئے سر اور نیم وا آنکھوں سے نہیں کیا بلکہ تنے ہوئے سینے اور چشمِ نگران کے ساتھ کیا!حق کے مقابلہ میں اُس کے نزدیک یہ زنجیر کوئی زنجیر تھی؟

محمد علی نے اپنے پیر ومرشد مولانا عبدالباری مغفور سے اختلاف کیا اور سخت اختلاف کیا،اپنے شریکِ کار،معتمد خاص اور مخلص دوست مولانا عبدالماجد بدایوانی سے اپنے رفیق زنداں مولانا نثار احمد صاحب کانپوری سے،اپنے محسن دیرینہ مہاراجہ محمود آباد سے مخالفت کی۔اپنے عقائد کا اعلان کیا اور اُن کے عقائد کو باطل کیا،اپنے دعوے کو دلائل مبرہن سے کیا اور اُن کے ادعاء کو دلائل سے پارہ پارہ!

پھر یہ اختلاف کوئی معمولی اختلاف نہ تھا کہ چند ہی روز میں ختم ہو جاتا بلکہ اس کی نوعیت مذہبی تھی، مذہب کے پیچھے آدمی اپنے باپ پر تلوار سے حملہ کر سکتا ہے، محمد علی تو ایک دوست ہی تھے... اُن کے خلاف کیا کچھ نہ ہوا، اور کیا کچھ نہ کیا گیا؟

گالیاں اُن کو دی گئیں، پٹوانے کا سامان اُن کے لیے کیا گیا۔ ذلیل و رسوا ہی نہیں کیا گیا، اُن کی جان تک لینے کی کوشش کی گئی! لیکن محمد علی نے اِن باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی، وہ برابر اپنے عقائد کی تلقین کرتا رہا۔ اُس کا قلم، اُس کی زبان، اُس کے اخبار اِسی مقصد کی تعلیم و تبلیغ کے لیے وقف تھے۔ اُسے ہر طرح نقصان پہنچا لیکن خندہ پیشانی کے ساتھ اُس نے اُنھیں برداشت کیا۔

وہ ''شاعر'' تھا لیکن ''یقولون مالا تفعلون'' والے گروہ میں نہیں تھا بلکہ اُس نے ایک بار کہا کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے　　یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف　　کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اور اس پر عمل کر کے بھی دکھلا دیا، ایک خدا کے لیے وہ ساری خدائی سے بھر بھر کر لڑا اور بلاشبہ اُس نے استحقاق پیدا کر لیا کہ میدانِ حشر میں وہ سرخرو ہو، شانِ ربوبیت اُس کی پردہ پوش ہو، اور وہ جھوم جھوم کر وہاں ایک بار اپنے مخالفین کو پھر یہ اشعار سنا رہا ہو!

افواہیں:

ایک طرف تو یہ ہنگامۂ اختلاف برپا تھا، دوسری طرف مخالفین طرح طرح کی افواہیں مشتہر کرتے تھے۔ کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ ابن سعود نے نعوذ باللہ گنبدِ خضریٰ کو ڈھا دیا اور کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ جنت البقیع کو خدانخواستہ ملبہ بنا دیا گیا۔ کبھی یہ خبر اُڑتی تھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مدفن شہید ہو گیا، کبھی یہ افواہ گرم ہوتی تھی کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مکان ڈھا دیا گیا۔ کبھی یہ اعلان ہوتا تھا کہ تمام بزرگوں کے مزارات سرے سے مسمار کر دیئے گئے۔

محمد علی اگر قبہ پرست نہیں تھے تو اِن کوششوں کے حامی بھی نہیں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ حجازِ مقدس اور بالخصوص کعبۃ اللہ پر شیعہ، سنی، وہابی، شافعی، مالکی سب کا یکساں حق ہے، اس لیے مختلف فیہ مسائل

میں حکومت کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ آج حکومت ابن سعود قبور کو اپنے عقائد کی بنا پر ڈھا سکتی ہے، کل اگر وہاں شیعوں کی حکومت ہو جائے تو وہ مزارِ رسول ﷺ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جسدِ مبارک اپنے عقائد کی بنا پر الگ کر سکتے ہیں، لہٰذا وہاں ایسی مختلف فیہ چیزوں میں دخل ہی نہیں دینا چاہیے جن کا تعلق اور جن کے جواز کا پہلو فقہ و تفقہ سے کچھ بھی نکلتا ہو، اس لیے انہدام قبور و مقابر کے وہ سخت خلاف تھے۔

خلافت کمیٹی کی تجویزیں:

اسی لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت اور احرارِ پنجاب کی موجودگی میں اُنھوں نے خلافت کمیٹی سے ایسی تجویزیں منظور کرائی تھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ حجاز پر ملوکیت نہ ہو، موتمر اسلام منعقد کی جائے، جس میں عالم اسلام کے نمائندے شریک ہوں۔ اگر وہ فیصلہ کر دیں کہ مسمار شدہ مقابر کی مرمت کر دی جائے تو ابن سعود کو لازم ہوگا کہ وہ اُن کی مرمت کر دیں۔

ان باتوں کا ابن سعود نے اپنے ''بلاغِ عام'' میں وعدہ کیا، احرار پنجاب اور مولانا ابوالکلام صاحب کی موجودگی اور رضامندی سے یہ تجویزیں پاس ہوئیں اور چوں کہ ابن سعود نے یہ عذر کیا کہ ایسی حرکتیں میرے علم و حکم کے خلاف داخلہ کے وقت فوج سے اضطراراً سرزد ہو گئیں، اس لیے میں اُن کا عذر خواہ ہوں اور اگر موتمر فیصلہ کر دے تو میں اُن کی مرمت کر دینے کے لیے تیار ہوں۔

ابن سعود کے اس بیان سے مخالفین اور موافقین دونوں نے اپنے اپنے مقصد کے موافق نتیجہ نکالا، مخالفین نے کہا کہ چوں کہ اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں لہٰذا وہ کشتنی اور گردن زنی ہے اور موافقین نے کہا کہ چوں کہ وہ تلافی پر آمادہ ہے اس لیے کی لغزش قابلِ معافی ہے اور اس صورت میں اور زیادہ کہ اس کے علم و حکم کے بغیر یہ حرکت فوج کے ایک جوشیلے دستے سے سرزد ہو گئی۔

بہر حال یہ خبریں ایسی نہیں تھیں کہ خاموشی کے ساتھ سن لی جاتیں بلکہ انھوں نے اسلامی ہند میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا، ہر شخص اپنے اپنے عقیدہ کے ماتحت جوش و خروش سے لبریز ہو گیا اور پوری شدت کے ساتھ ہر فریق اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ہی خدام الحرمین کا مرکز ہے۔ یہیں ہمیں اپنا پورا زور صرف کرنا چاہیے۔

محمد علی کا ارادہ:

اُس وقت محمد علی پراونشل کانگریس سیتا پور میں شریک ہونے کے لیے گئے تھے، وہیں سے مولانا عبدالماجد دریابادی نے اُنہیں لکھنؤ چلنے پر مجبور کیا۔ جب انہوں نے یہ حالات سنے تو وہ فوراً آمادہ ہو گئے اور لکھنؤ تشریف لائے۔

جلسہ کے حالات:

جلسہ کے صدر چوہدری خلیق الزماں تھے۔ محمد علی کے ساتھ توفیق شریف بھی آئے تھے، محمد علی نے پہلے اُن کا ایک مختصر تعارف کرایا اور پھر اُن سے تقریر کرائی۔ وہ عربی میں تقریر کرتے جاتے تھے اور مولانا عبدالرحمٰن مرحوم اُردو میں اُس کا ترجمہ فرماتے جاتے تھے۔

توفیق شریف کی تقریر:

توفیق شریف کی تقریر جب تک ہوتی رہی، لوگ خاموشی کے ساتھ اُن کی تقریر سنتے رہے۔ اُن کی تقریر کے اختتام کے بعد صاحبِ صدر نے اعلان کیا کہ محمد علی تقریر کریں گے اور اُن کی تقریر کے بعد مخالفین میں جو لوگ تقریر کرنا چاہیں گے، اُنہیں پورا موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

خلل اندازی:

محمد علی جیسے ہی اس قرارداد کے مطابق تقریر کے لیے کھڑے ہوئے، خدام الحرمین جماعت کے بعض افراد نے ایک ایک کونے سے شور کرنا شروع کیا کہ ''ہم نہیں سنتے''، ''بیٹھ جاؤ''، ''پہلے مولانا حسرت موہانی تقریر کریں۔''

محمد علی ایسے ہنگاموں کے وقت خود درود شریف پڑھتے تھے اور چاہتے تھے کہ سب پڑھیں تاکہ اختلاف کم ہو، چنانچہ اُنہوں نے لوگوں کو خاموش کرنا چاہا مگر وہ چند آدمی جو اس پر تلے بیٹھے تھے کہ آج

جلسہ نہ ہونے دیں گے، وہ خاموش نہیں ہوئے۔

اصحابِ جلسہ یعنی وہ لوگ جو محمد علی کی تقریر سننے آئے تھے، سخت پریشان اور متردّد تھے کہ جس مقصد کے لیے آئے ہیں وہ فوت ہوا جاتا ہے۔ جواب میں انہوں نے بھی ہنگامہ بپا کرنا چاہا مگر جلسہ کے منتظمین نے انہیں خاموش رکھا۔

بعض لوگوں نے محمد علی سے کہا کہ مولانا حسرت موہانی سے کہیے وہ اگر کہیں گے تو یہ شور ختم ہو جائے گا، مگر محمد علی نے اُن سے استدعا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ایسا جلسہ کرانا نہیں چاہتے تھے جو دوسروں کے رحم و کرم پر منحصر ہو۔

بہر حال پندرہ بیس منٹ سے زیادہ تک یہ ہنگامہ برپا رہا اور باوجود کوشش کے یہ شور ختم نہیں ہوا، جنابِ صدر نے دوسرے آدمی کی مدد سے جلسہ کو قائم رکھنا نہیں چاہا اس لیے کہ جلسہ جس کی صدارت میں ہو رہا ہو، اُسی کو جلسہ پر قابو ہونا چاہیے۔

اِس خیال کے ماتحت اُنہوں نے کچھ دیر انتظار کیا، جب دیکھا کہ یہ لوگ باز نہیں آئیں گے تو جلسہ برخاست کر دیا۔

برخاستگی کا اثر:

محمد علی کے حامیوں اور معتقدوں کو اِس حرکت سے سخت اشتعال پیدا ہوا، اگر اُس وقت اُنہیں قابو میں نہ رکھا جاتا تو یقیناً بہت سخت ہنگامہ ہو جاتا، مگر داعیانِ جلسہ کی مصلحت بینی اور مآل اندیشی ان وقتی جذبات پر غالب آئی۔ اُنہوں نے اپنے حامیوں اور معتقدوں کو پورے طور سے قابو میں رکھا اور کسی قسم کا ہنگامہ نہیں ہونے دیا۔

اثرات:

لیکن یہ رخنہ اندازی بالکل بے اثر بھی نہیں رہ سکتی تھی، اب اُنہوں نے اور زیادہ عزم صمیم کے ساتھ طے کر لیا کہ وہ جلسہ کریں گے اور ابن سعود کی حمایت میں کریں گے۔ یہ سب کچھ دِن کی روشنی میں

ہو گا، مخالف و موافق سب مدعو ہوں گے اور مکائد کو تار تار کر کے رکھ دیا جائے گا، چنانچہ منتظمین پورے طور سے آئندہ جلسہ کی تیاریوں میں منہمک ہو گئے۔

محمد علی کی روانگی:

محمد علی دہلی واپس چلے گئے، اس لیے کہ وہ بہت مجبوری کے عالم میں تشریف لائے تھے اور وعدہ کر گئے کہ آئندہ جلسوں میں پھر آئیں گے۔

دو اور جلسے:

مولانا ظفر الملک صاحب علوی نے اب پھر بڑے انتظامات کے ساتھ جلسہ کا اعلان کیا، مولانا محمد علی کو دعوت دی گئی اور وہ تشریف لائے۔ عام خیال یہ تھا کہ اس جلسہ کا کامیاب ہونا بھی مشکل ہے۔

خدام الحرمین کے انتظامات:

انجمن خدام الحرمین نے بھی جلسہ کے درہم برہم کرنے کے پورے انتظامات کر لیے تھے۔

جلسہ کا منظر:

بعد نماز عصر ممتاز دار الیتامی لکھنؤ میں جلسہ کا اعلان ہوا۔ ندوہ سے کچھ طلبہ انتظامات کے لیے طلب کیے گئے تھے۔ راقم الحروف اُس وقت اگرچہ ندوہ کی ایک نیچی جماعت میں پڑھتا تھا لیکن پھر بھی اُسے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ جلسہ کی خدمت بجالا سکے۔

جیسے جیسے جلسہ کا وقت قریب آتا گیا، حاضرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور ممتاز دار الیتامی میں لوگ داخل ہونے لگے۔ مگر وہاں داخلہ کی شرط یہ تھی کہ لاٹھی لے کر کوئی جلسہ میں نہ جائے۔ جنہوں نے تعمیل کی وہ داخل ہوئے، جنہوں نے انکار کیا وہ روک دیئے گئے۔ اتنے میں ہزاروں کی تعداد میں چماروں اور پاسیوں کا ایک لٹھ بند گروہ آیا، سینہ پر ''خدام الحرمین'' کے بلّے لگے ہوئے تھے۔

وہ سب بدزبانیاں کرتے ہوئے آئے اور ہال اور پارک کو گھیر لیا اور داخلہ کی کوشش کی جس کی مدافعت کی گئی اور وہ داخل نہ ہو سکے۔ علی برادران اب تک نہ آئے تھے، اب بہت زیادہ ہنگامہ پیدا ہو رہا

تھا اور نہایت صاف الفاظ میں محمد علی، شوکت علی کے متعلق مغلظ سے مغلظ گالیاں سنی جا رہی تھیں۔

محمد علی کی آمد:

اتنے میں محمد علی مع اپنے برادر بزرگ مولانا شوکت علی کے چوہدری خلیق الزماں کے ساتھ تشریف لائے۔ ایک بھگدڑ مچ گئی، مشتاقانِ زیارت دیدار حاصل کرنے کو بڑھے اور مخالفین ''حملہ'' کرنے کو، اس یورش کی تفصیل بیان نہیں کی جاسکتی۔ یہ سارا لٹھ بند گروہ اور دوسرے لوگ اِسی طرح ٹوٹ پڑے۔ یہ دونوں بھائی نہایت وقار و متانت سے آہستہ آہستہ بڑھے۔ یا تو یہ عالم تھا کہ یہ لوگ محمد علی پر یورش کرنے کے لیے بڑھے تھے، اُن کا جلسہ درہم برہم کرنے آئے تھے اور اُنہیں ''مزہ'' چکھانے آئے تھے، یا یہ عجیب وغریب منظر بھی دیکھنے میں آیا کہ لاٹھیاں جھک گئیں، سر خم ہو گئے اور تقریباً سب نے ''محمد علی، شوکت علی کی جے'' کے نعرے لگانا شروع کیے، کہ اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج گئی۔ ہر شخص بے تاب ہو ہو کر بڑھ رہا تھا کہ مصافحہ کا فخر حاصل کرے۔

لیکن خدام الحرمین کے مخصوص لوگ اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور اُنہوں نے اُسی حالت میں جلسہ میں جانا چاہا، پھر بھی داعیٔ جلسہ مولانا ظفر الملک علوی نے مخالف جماعت کے صلاح کار شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی سے استصواب کیا کہ اگر وہ امن وامان کی ذمہ داری لیں کہ جلسہ میں کسی قسم کا اختلال نہیں پیدا ہوگا تو پھر ان مسلح آدمیوں کو آنے کی اجازت بھی دی جاسکتی ہے مگر یہ ذمہ داری لینے سے اُنہوں نے انکار کیا، اور پھر بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے ہوئے یہ جلسہ بھی ملتوی کر دیا گیا۔

دوسرا جلسہ:

لیکن دوسرے روز امین الدولہ پارک میں اور اس سے پہلے ممتاز حسن مرحوم کی کوٹھی میں ایک نہایت عظیم الشان اور کامیاب جلسہ ہوا جس میں محمد علی نے کئی گھنٹہ تک تقریر کی اور اپنے خیالات ودلائل لوگوں کے سامنے پیش کیے۔ جلسہ کی یہ حالت تھی کہ ہزاروں کی تعداد میں انسانوں کا ایک سمندر معلوم ہو رہا تھا اور سب لوگ گوشِ ہوش سے یہ تقریر دِل پذیر سن رہے تھے۔

اگر کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ اللہ اکبر کے فلک رسا نعرے تھے یا محمد علی، شوکت علی کی جے تھی جو فضائے آسمانی میں گونجتی تھی۔ اس کے بعد پھر دو روز تک محمد علی لکھنؤ میں اور مقیم رہے اور اُنہوں نے خوب دھواں دھار تقریریں کیں، نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کا اسلامی طبقہ ان کے ساتھ ہو گیا۔

غیر معمولی کامیابی:

اِس طرح محمد علی نے اپنی ساحرانہ شخصیت کے ساتھ سارے اسلامی ہند کے جوش کو ٹھنڈا کیا اور اُنہیں آمادہ کیا کہ وہ مستقبل کا انتظار کریں کہ کیا ظاہر ہوتا ہے؟ اس کے بعد وہ اپنے طرزِ عمل میں آزاد ہوں گے۔ اُن کی کوششوں کا حاصل یہ ہوا کہ ایک بار پھر اسلامی ہند میں سکون کی فضا پیدا ہو گئی اور وہ ہنگامہ جس نے شریفوں اور سنجیدہ طبائع کو لب کشائی سے محروم کر دیا تھا، ایک بار کچھ عرصہ کے لیے پھر فرو ہو گیا۔

خلافت کمیٹی کی مستعدی:

اِس عرصہ میں خلافت کمیٹی برابر اپنے پروگرام پر عامل رہی اور ابن سعود سے مفصل اور مسلسل اطلاعات حاصل کرتی رہی۔ اپنی مجلس مرکزیہ کے اجلاس منعقد کر کے اُس نے ایک پورا لائحہ عمل تیار کر لیا، حجاز کی حکومت کے متعلق اپنی پالیسی متعین کر دی اور بالاتفاق یہ طے ہو گیا کہ خلافت کمیٹی حجاز پر ملوکیت اور شخصیت نہیں چاہتی ہے، نیز منہدم شدہ مقابر وقبب کی تعمیر کی حامی ہے اور مؤتمر اسلامی میں اس کی طرف سے اس پر زور دیا جائے گا کہ اُن کی از سر نو مرمت کرائی جائے تا کہ اختلافات کا حقیقتاً خاتمہ ہو۔

خلافت کمیٹی کا یہ وہ بنیادی اصول تھا جس کی تائید اس کے ہر گروہ نے مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی صدارت میں کی۔

ابن سعود کا اعلانِ ملوکیت:

کچھ عرصہ کے بعد خبر آئی کہ سلطان ابن سعود نے حجاز کے باشندوں کے ''مجبور'' کرنے سے وہاں کی ''بادشاہت'' قبول کر لی ہے!

''ہمدرد'' نے اس خبر کو سیاہ جدول میں شائع کیا اور محمد علی چونکہ فطرتاً اور عقیدتاً شخصیت اور ملوکیت کے سخت دشمن تھے، اس لیے اب وہ ابن سعود کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

محمد علی کی مخالفت:

اب محمد علی ابن سعود کے مخالف ہو چکے تھے اور اُس کے اعلانِ ملوکیت سے بیزار و متنفر تھے!

لیکن غور فرمایئے، اُس کی زندگی کن کن سخت ترین آزمائشوں میں پڑی ہے۔ اب تک خدام الحرمین سے اختلاف تھا اور محمد علی اس کا مقابلہ کر رہا تھا، اب اپنے کیمپ میں پھوٹ پڑ گئی۔ کل جن لوگوں کے ساتھ اُس نے غنیم کا مورچہ فتح کیا تھا، آج وہی لوگ اُس کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ اب اسی شدت، اسی زور شور اور اسی نامعقولیت سے حامیانِ ابن سعود نے مخالفت شروع کی۔ پنجاب کی خلافت کمیٹی باغی ہوگئی اور اس نے ابن سعود کی حمایت اپنا مقصد بنالیا۔ صدرِ کانفرنس نے ان تمام تجویزوں کو پس پشت ڈال دیا جو اُنہیں کی صدارت میں ملوکیت اور قبور و قبب کے متعلق منظور ہو چکی تھیں اور سب نے بالا علان محمد علی کی مخالفت شروع کر دی۔

جس شخص کی زندگی عبارت ہو مجاہدہ سے، حربِ فی سبیل اللہ سے، اُس نے اِن مخالفتوں کو بھی برداشت کیا۔ ان دوستوں کی بدگوئی پر بھی خورسند ہوا، اپنے مداحوں اور معتقدوں کی بھی گالیاں خندہ پیشانی کے ساتھ سنیں! خدا شاہد ہے کہ اِس ظرف اور اِس اِس استقلال کے لوگ کم پیدا ہوئے!

باب ۳۰

مؤتمر عالم اسلام

اُسی زمانہ یعنی 1926ء میں سلطان ابن سعود نے ایک ''بلاغِ عام'' کے ذریعہ سے ایک مؤتمر کے انعقاد کا اعلان کیا۔

محمد علی کی آمادگی:

محمد علی نے اتمام حجت اور واقعات کے برائی العین مشاہدہ کے لیے اپنے افلاس کے باوجود مؤتمر جانے پر آمادگی ظاہر کی اور اپنے مصارف سے تشریف لے گئی۔ خلافت کمیٹی پر اپنے خرچ کا بار نہ ڈالا۔

وفد:

جب محمد علی آمادہ ہوئے تو تجویز یہ ہوئی کہ ایک وفد بھی خلافت کمیٹی کی طرف سے حجاز بھیجا جائے، وہ مؤتمر عالم اسلام میں شرکت کرے اور خلافت کمیٹی کا نظریہ پیش کرے اور سلطان ابن سعود کو اُن کے مواعید یاد دلائے۔

وفد کے ارکان:

مولانا سیّد سلیمان ندوی صدرِ وفد مقرر ہوئے، مسٹر شعیب قریشی سیکریٹری اور علی برادران ممبر! اس طرح یہ وفد مؤتمر کی شرکت کے لیے حجازِ مقدس روانہ ہو گیا!

علالت:

محمد علی کی صحت یہیں سے بہت خراب تھی، وہاں پہنچے تو آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے علیل ہو گئے، شاید بائیں حصہ جسم پر خفیف سا فالج کا حملہ بھی ہوا، لیکن محمد علی اِن چیزوں کو خاطر میں نہیں لائے اور اپنا کام برابر پورے استقلال سے جاری رکھا۔

مؤتمر میں شرکت:

مؤتمر میں عالم اسلامی کے اکثر نمائندے شریک ہوئے تھے۔ خود سلطان ابن سعود نے مؤتمر کا افتتاح کیا تھا، اکثر نمائندے ''جلالۃ الملک'' کے جلال و جبروت سے متاثر و مرعوب تھے! لیکن محمد علی کا ایک حق گو وجود ایسا تھا جو سلطان کے خدم و حشم، جاہ و جلال، عظمت و جبروت، کسی چیز سے بھی متاثر نہیں ہوا۔

محمد علی کا نعرۂ حق:

اُس نے وہیں مؤتمر میں سلطان ابن سعود سے پورے آزادانہ لہجہ میں تخاطب کیا:

''یہ ملوکیت کیسی؟ اِسلام میں تو شخصیت کی بیخ کنی کی گئی ہے، شوریٰ اور جمہوریت کو تفوق حاصل ہے۔ تم کتاب و سنت کے تمسک کے مدعی ہو، پھر یہ قیصر و کسریٰ کی پیروی کیوں؟''

محمد علی کے اِس آوازۂ حق نے تمام لوگوں کو چونکا دیا اور یہ احساس پیدا کرا دیا کہ ابھی عالم اسلام حق گو اور حق پرست شخصیتوں سے خالی نہیں ہے، گو آج صحابۂ کرام کا وجودِ گرامی ہمارے درمیان نہیں لیکن پھر بھی ایسی ہستیاں ابھی موجود ہیں جو حق کے لیے سارے عالم سے دشمنی مول لے سکتی ہوں اور کسی شاہ و شہریار کو خاطر میں نہ لائیں۔

محمد علی کی رائے میں تغیر کے اسباب:

لیکن ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس ہماہمی کے ساتھ جب اُنہوں نے ابن سعود کی حمایت کی تھی تو پھر اِس زور شور سے اختلاف کیوں کیا؟

اس سلسلہ میں اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ مقابر وقبب کی جتنی خبریں ہندوستان میں پہنچیں، اُن میں سے اکثر کو ابن سعود کی طرف سے ''مبالغہ آمیز'' قرار دیا گیا۔ پھر یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ مؤتمر عالم اسلام کے فیصلہ کے مطابق ان کا آئندہ انتظام کیا جائے گا۔ بالاعلان بکرّات ومرّات یہ کہا گیا کہ حجاز میں شخصی حکومت مقصود نہیں ہے بلکہ جمہوری طرز پر وہاں خلفائے راشدین کا سا عہدِ حکومت ایک دفعہ پھر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ مواعید حکومتِ ابن سعود کی طرف سے برابر جمعیتِ خلافت سے کیے گئے، نیز محمد علی کے نام ذاتی مکاتیب ومراسلات میں بھی اِن کا اعادہ کیا گیا۔

لیکن جب اِس وفد کے ارکان (جو مسٹر شعیب قریشی، مولانا عرفان اور ظفر علی خاں صاحب پر مشتمل تھا) اور مسٹر شعیب قریشی نے اپنے مشاہدات کی بناء پر مظالم سلطان کی توثیق کی اور مزید احتیاط کے لیے منہدم شدہ مقامات کی تصویریں بھی اُنہوں نے بھیجیں اور پھر بعد کو محمد علی نے بھی برائی العین اُن مقامات کا معائنہ کیا اور معلوم کر لیا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہ صحیح ہے اور سلطان تلافی پر آمادہ نہیں ہیں تو پھر مجبوراً اُن کا جام صبر لبریز ہو گیا۔ وعدے یاد دِلا کر اُن کے ایفاء کی کوشش کی اور ناکامیابی کی صورت میں علم مخالفت اب محمد علی کے ہاتھ میں تھا۔

سب سے زیادہ تعجب خیز یہ بات ہے کہ خلافت کمیٹی کی پالیسی، ہدایات اور نصب العین سے جن لوگوں کا مل اتفاق تھا، جن کی صدارت اور جن کی تائید سے یہ چیزیں پاس ہوئی تھیں اور ابن سعود کو بھیجی گئی تھیں، اُنہیں نے نہایت شد و مد سے اختلاف کیا اور ملوکیت کی حمایت کی، وعدہ خلافیوں پر پردہ ڈالنا چاہا۔

یہ تھے محمد علی کے اسبابِ اختلاف اور اُن کے رفقاء کا طرزِ عمل!

اِن تمام ہنگاموں میں ہمیں اس کا صاف طور سے احساس ہوتا ہے کہ محمد علی کا طرزِ عمل یقیناً حق بجانب تھا۔ ایک مومن کی طرح ایک مومن کے خلوص مساعی استخلاص حجاز کا اُنہوں نے خیر مقدم کیا اور پھر ایک مسلم کی طرح تعلقات کی زنجیروں کو توڑ کر اُنہوں نے سب کی مخالفت کی پروانہ کی اور جو حق سمجھتے تھے اس کا اعلان کر دیا۔ اس جگہ نفس مسئلہ کے صواب وعدم صواب پر گفتگو مقصود نہیں، صرف محمد علی کے طرزِ

عمل اور نیت کار پر تبصرہ اور غیر جانبدارانہ اظہارِ رائے مقصود ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا فیصلہ:

محمد علی کے اِس اتفاق و اختلاف کے متعلق خواجہ حسن نظامی صاحب نے نہایت بے لاگ رائے دی ہے۔ محمد علی جب موتمر اسلامی کی شرکت کے بعد ہندوستان تشریف لائے تو جامع مسجد دہلی میں مسلمانانِ دہلی کی طرف سے خواجہ صاحب نے محمد علی اور اُن کے رفقاء کو ایک سپاس نامہ دیا تھا۔ جلسہ میں محمد علی نے تقریر کی تھی، واپس جا کر اپنے 22 اگست 1926ء کے روزنامچہ میں وہ اس جلسہ کے متعلق اور محمد علی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

> ''بعد مغرب جلسہ شروع ہوا، جامع مسجد کے جلسوں میں اتنا مجمع میں نے کبھی نہیں دیکھا، پندرہ بیس ہزار آدمی تھے۔ مولانا محمد علی صاحب کی تقریر کا حاضرین پر بہت اچھا اثر ہوا۔ میرا اعتماد تو یہ ہے کہ علی برادران اسلام کے سچے عاشق ہیں، اُنہوں نے پہلے جب ابن سعود کی مخالفت شروع ہوئی تو محض اس وجہ سے ابن سعود کی حمایت کی کہ اُن کو یقین تھا کہ ابن سعود برا آدمی نہیں ہے اور قبہ شکنی کی خبریں مبالغہ آمیز اور غلط ہیں اور اس مقابلہ میں وہ اتنے ثابت قدم رہے کہ اپنے مرشد مولانا عبدالباری صاحب سے بھی موافقت پر راضی نہیں ہوئے، لیکن جب اُنہوں نے خود حجاز میں جا کر اپنی آنکھوں سے سب واقعات کو دیکھ لیا تو اب وہ ایمانداری کے ساتھ ابن سعود کی مخالفت کر رہے ہیں۔''

تہمت تراشیاں:

اختلاف و مخالفت ہی پر اگر قناعت کی گئی ہوتی تو غنیمت تھا اور اگر اس پر بھی دل کا بخار نہیں نکلا تھا تو سب و شتم کی بوچھاڑ اس غریب کی سرکوبی کے لیے کافی تھی۔

ستم یہ ہے کہ اُس پر مہمل سے مہمل اور غلط سے غلط تہمتیں لگائی گئیں۔

مصری محمل کا قبضہ:

اُسی زمانہ میں مصری محمل کا قضیہ پیش آیا تھا اور ایک بار نجدیوں نے وفورِ وحشت سے مصر کے ایک گروہ پر گولی بھی چلا دی تھی، مگر مصری دستہ خاموش رہا اور اُس نے کوئی انتقامی یا جوابی کارروائی نہیں کی۔ محمد علی کی شاید مصری کماندار سے شناسائی تھی، وہ اُس سے ملے، ملاقاتیں کیں۔ اگر نہ بھی شناسائی ہوتی تو بھی ایک مسلم حکومت کے مسلم عہدہ دار سے ملنا کوئی اخلاقی یا قانونی یا شرعی جرم نہیں تھا، مگر اِس ملاقات کے طرح طرح سے معنی پہنچائے گئے اور ہندوستان میں یہ مشہور کیا گیا کہ محمد علی نے مصری کماندار کو ترغیب دی کہ وہ ایک اسلامی فوج کے حصہ پر گولیاں چلائے۔

اِس واقعہ کو کئی کئی سرخیاں دے کر شائع کیا گیا اور مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عرفان اور مولانا عبدالحلیم کو ''دھمکی'' دی گئی کہ تم شاہد ہو، اپنا بیان دو۔ اگر بیان نہیں دیا تو ہم سمجھیں گے کہ تم اس واقعہ سے واقف ہو اور ہماری تائید میں ہو۔

جب اُن بزرگوں کی بہ حلف تردید شائع ہوئی اور اُن لوگوں نے اِس واقعہ سے اپنی قطعاً لاعلمی اور بے تعلقی اور نفسِ واقعہ کے عدمِ وقوع پر بیان دیا تو ذرا تلاطم کم ہوا۔

❀❀❀

باب ۳۱

حدیث ''حسن'' صحیح

محمد علی کی معرکہ آرائیوں میں ایک نہایت اہم اور معرکۃ الآرا جنگ وہ تھی جو اُنہیں مشہور انشاء پرداز خواجہ ''حسن'' نظامی صاحب سے کرنی پڑی۔

وقت اور مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس قسم کے مسائل سے اجتناب کیا جائے اور آئندہ مؤرخ کو موقع دیا جائے کہ وہ ایسے نزاعی مسائل پر بحث کرے، لیکن محمد علی کے سوانح نگار کے لیے واقعات سے قطع نظر بھی ممکن نہیں۔ محمد علی ایک جنگجو زعیم تھے، اسلام کی خاطر، قوم وملت کی خاطر، استقلالِ وطن کی خاطر ''دراز دستی کوتہ آستینان'' کے ''کشف غطا'' کی خاطر، اپنے ''ازالۃ الخفا'' کی خاطر اور اپنے نظریات و اعتقادات کی خاطر بارہا انہوں نے علم جہاد بلند کیا، پھر ان سب چیزوں سے آنکھ کیونکر بند کی جاسکتی ہے؟

ذوالفقار علی تو ہمیشہ باطل کے سر پر صاعقۂ موت بن کر چمکی، ایسا کب ہوا ہے کہ اس نے مرہم کا کام دیا ہو؟ محمد علی کی زبان وقلم بھی شمشیر آبدار بن کر اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اپنا کام کرتی رہی۔

مہذب ڈاکو:

ہاپوڑ کے ضیاء الحق صاحب کے نام خواجہ حسن نظامی صاحب نے خط بھیجا:

''۷۸٦

از درگاہِ شریف حضرت محبوب الٰہی، دہلی

12 اگست 1918ء

مکرمی... السلام علیکم!

دو خط پہنچے، ابھی دو چار دن کی اور مصروفیت ہے، اس کے بعد لکھنے کی کوشش کروں گا، لکھائی کا حساب رجسٹر میں دِکھوا کر مطلع کروں گا۔

کیا عجب ہے کہ گورنمنٹ نے لکھا ہو، میں نے چیف کمشنر صاحب دہلی سے مفصل حالات بیان کر دیئے تھے اور نظام کو پان اسلام ازم کے جو سبق دیئے جاتے تھے، اُن کی باضابطہ اطلاع دے دی تھی اور مجھے معلوم ہے کہ اُنہوں نے پنجاب گورنمنٹ کو اِس خطرہ سے آگاہ بھی کیا تھا۔ (یہ خط بالکل خانگی ہے، اس کو چاک کر دیجیے یعنی میرے اس کام کی خبر سوائے آپ کے کسی کو نہ ہو۔ حسن نظامی!''

ایک عرصہ دراز تک یہ خط ہاپوڑی صاحب نے اپنے پاس محفوظ رکھا، اکتوبر 1926ء میں وہ یہ دہلی لائے اور مولانا محمد علی اور پیشوایانِ قوم کو یہ خط دکھا کر ''چارہ جوئی'' چاہی، اس کی اطلاع خواجہ صاحب کو بھی ہوئی اور اُنہوں نے اپنے اخبار ''منادی'' میں ''مہذب ڈاکو'' کے عنوان سے یہ نوٹ لکھا:

''مہذب ڈاکو کو معلوم ہو کہ میں اُن کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوں گا۔''

محمد علی کے نام خط:

16 نومبر 1926ء کو خواجہ صاحب نے محمد علی کو مکتوبِ ذیل لکھا:

''آپ کی شخصیت اور آپ کی مصروفیت اِن فضولیات سے بالاتر ہے جب آپ... والے صاحب کی خصلت اور تمام زندگی سے خود ہی واقف ہیں تو پھر میں نہیں جانتا کہ آپ کو اس معاملہ سے اس قدر دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟ میری آرزو ہے کہ آپ... صاحب کے قصہ سے علیحدہ رہیں تو مناسب ہے کیونکہ آپ کی عظمت اِن ادنیٰ معاملات سے بہت اونچی ہے۔''

لیکن محمد علی اس خط سے متاثر نہیں ہوئے، انہوں نے ''منادی'' والے نوٹ کے بعد اِس خط کو ''ہمدرد'' میں شائع کر دیا، اس لیے کہ لارڈ ریڈنگ کے مراسلہ سے حضورِ نظام کی منزلت کو جو نقصان

پہنچا تھا وہ محمد علی کے نقطۂ نظر کے مطابق نتیجہ تھا اسی قسم کی ریشہ دوانیوں کا۔

محمد علی کا جواب:

چنانچہ محمد علی نے خواجہ صاحب کے مکتوب گرامی کا جواب یہ دیا:

''میں ایک اخبار نویس ہوں اور اِس پیشہ کے باعث چند فرائض میرے ذمہ عائد ہوتے ہیں، ان سے کس طرح سبکدوش ہوسکتا ہوں؟ رہی ان صاحب کی شخصیت، سو یہ معاملہ ان صاحب کی شخصیت کا نہیں ہے بلکہ خود آپ کی شخصیت کا ہے اور جو کارروائی آپ خود اقبال فرماتے ہیں کہ آپ نے کی ہے، وہ ان صاحب کی شخصیت سے بے نیاز ہے اور اس قدر اہم ہے کہ میں اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔''

مفادِ عام:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد علی نے یہ ''پردہ دری'' کیوں کی؟ وہ خود کہتے ہیں:

''خواجہ صاحب سے میرے تعلقات کچھ بھی ہوں، جہاں مفادِ عام کا موقع ہو وہاں میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔''

خواجہ صاحب کی صفائی:

اِس مسئلہ کے متعلق خواجہ صاحب نے خود اپنی صفائی بھی اِن الفاظ میں دی تھی:

''مولانا ظفر علی خاں کا اخبار ''ستارۂ صبح'' نکل رہا تھا اور اس میں تصوف کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے، اِس واسطے مجھے بھی مولانا ظفر علی خاں صاحب سے سخت اختلاف تھا۔ اُسی زمانہ میں مولانا ظفر علی خاں حیدر آباد میں بلائے گئے تھے اور اعلیٰ حضرت حضورِ نظام کی اُن پر بہت مہربانیاں ہو رہی تھیں۔ ان مہذب ڈاکو صاحب نے مجھے لکھا کہ مولانا ظفر علی خاں صاحب اعلیٰ حضرت کو پان اسلام ازم کے سبق پڑھا رہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ اعلیٰ حضرت اِس کی وجہ سے کسی بلا میں نہ مبتلا ہوں

جائیں۔ جب مجھے یہ خط ملا تو سلطنتِ آصفیہ اسلامیہ کی حمایت اور مولانا ظفر علی خاں صاحب کے اثر کے نقصانات سے اعلیٰ حضرت کے بچانے کے لیے میں نے دہلی کے چیف کمشنر صاحب سے اِس کا ذکر کیا اور اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ میں پنجاب گورنمنٹ کو اِس کی اطلاع دوں گا، اس کے بعد میں نے ایک خط مہذب ڈاکو صاحب کو اُن کے خط کے جواب میں لکھا کہ میں نے چیف کمشنر صاحب کو اطلاع دے دی ہے کہ حضورِ نظام کو پان اسلام ازم کے سبق پڑھائے جا رہے ہیں اور اُنہوں نے غالباً پنجاب گورنمنٹ کو اطلاع دے دی ہوگی۔''

محمد علی کا اظہارِ رائے:

خواجہ صاحب نے خط کی اشاعت سے پیشتر احتیاطاً جو صفائی دے دی تھی، محمد علی اِس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اُن کا خیال تھا:

''یاد رکھئے کہ یہ زمانہ جنگ عظیم کا تھا، یہ بھی یاد رکھئے کہ اس جنگ عظیم میں بھی یہ وقت توڑ کا تھا جبکہ جرمن فوج جنرل گاف کی فوج (پانچویں فوج) کا سین کانٹین کے موقف پر قلع قمع کر کے درّاتی ہوئی آگے بڑھ چکی تھی، پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ غریب ظفر علی خاں صاحب کو کرم آباد میں نظر بند رہتے ہوئے تین چار سال گزر چکے تھے کہ اُنہیں کتے نے کاٹا اور یہ کسولی جانے کے بعد کسی طرح شملہ میں پہنچ گئے اور بہ ہزار دقت اڈوائر کو راضی کر کے رہا ہوئے اور حیدر آباد پہنچے۔ ترک جرمنوں کے حلیف اور برطانیہ سے برسرِ پیکار ہیں اور ''ٹائمز آف انڈیا'' کا ایڈیٹر سابق کوٹ فریزر انگلستان کے اخبار ''ڈیلی میل'' میں وہ مضمون شائع کرا چکا ہے جس میں مشرقی دھمکی کو واضح کرنے کے لیے دُنیائے مشرق کا ایک نقشہ دیا گیا تھا کہ اِس پر ایک سیدھا تیر قسطنطنیہ سے لے کر دہلی تک کھینچ کر ظاہر کیا گیا تھا کہ ترکی کے پایہ تخت سے لے کر ہندوستان کے پایہ تخت تک دورویہ فقط مسلمانوں ہی کی آبادی ہے یا مسلمانوں کی اکثریت ہے

اور ہندوستان کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ اِسی خوف سے دہلی میں زعمائے ہند کا وہ اجتماع کر چکے ہیں جس میں نہ صرف مہاتما گاندھی جیسے اُس وقت کے انگریز دوست شریک کیے گئے تھے بلکہ تلک مہاراج کا ایک نائب بھی مدعو کیا جا چکا تھا تاکہ سب مل کر اور بالخصوص زعمائے ہنود وہ تدابیر سوچیں اور انہیں اختیار کرنے کا حتمی وعدہ کریں جن سے ترکوں کی اسلامی فوج افغانستان ہوتی ہوئی ہندوستان میں داخل اور یہاں فتح یاب نہ ہو سکے، اور باوجودیکہ مسز بیسنٹ اور اُن کے دو رفقاء نظر بندی سے رہا کیے جا چکے ہیں۔علی برادران اُن کے متعلق کونسل میں صاف کہہ دیا جا چکا ہے کہ اُن کی صورت مسز بیسنٹ سے مختلف ہے۔ایسے وقت میں خواجہ صاحب چیف کمشنر کے پاس جاتے ہیں کہ ''مولانا ظفر علی خاں صاحب حیدر آباد بلا لیے گئے تھے''،''اور اعلیٰ حضرت کی اُن پر بہت مہربانیاں ہو رہی تھیں'' چیف کمشنر سے کہتے ہیں کہ ''مولانا ظفر علی خاں صاحب اعلیٰ حضرت کو پان اسلام ازم کے سبق پڑھا رہے ہیں۔''

دھمکی کا جواب:

ہاپوڑی صاحب نے ایک بار اور کسی موقعہ پر پان اسلام ازم والے خط کی خواجہ صاحب کو ''یاد دہانی'' کرائی تو خواجہ صاحب نے یہ جواب دیا:

''دہلی

۲رصفر ۱۳۴۲ھ

مکرمی... السلام علیکم!

''آپ نے آخری خط میں کسی تحریر کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق حضور نظامی سے ہے، میں بالکل نہیں سمجھا کہ اِس میں کیا ہے اور وہ کس کی تحریر ہے؟ خواجہ صاحب کے اس جواب کو محمد علی نے ''تجاہل عارفانہ'' سمجھا اور اصل خط اور یہ خط دونوں ہمدرد میں شائع کر دیئے اور مزید تصدیق کے لیے خطوط کے بلاک بنوا کر بھی ہمدرد میں شائع کرا

ہوا۔ میرا اعتقاد تو یہ ہے کہ علی برادران اسلام کے سچے عاشق ہیں، اُنہوں نے پہلے جب ابن سعود کی مخالفت شروع ہوئی تو محض اس وجہ سے ابن سعود کی حمایت کی کہ اُن کو یقین تھا کہ ابن سعود برا آدمی نہیں ہے اور قبہ شکنی کی خبریں مغالطہ آمیز اور غلط ہیں اور اس معاملہ میں وہ اتنے ثابت قدم رہے کہ اپنے مرشد حضرت مولانا عبدالباری صاحب سے بھی موافقت پر راضی نہیں ہوئے لیکن جب اُنہوں نے خود حجاز میں جا کر اپنی آنکھوں سے سب واقعات کو دیکھ لیا تو اب وہ ایمانداری کے ساتھ ابن سعود کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اب اُن کا سب سے بڑا اختلاف ابن سعود کی ملوکیت اور ابن سعود کی قبہ شکنی اور مزار شکنی سے ہے اور اِس معاملہ میں تمام دُنیا کے مسلمان اُن کے ساتھ ہیں..." کیا فرماتے ہیں شیخ المشائخ وقطب الاقطاب وقاضی القضاۃ مرشدی و مولائی حضرت خواجہ حسن نظامی طول زلف پیچ اس مسئلہ کے کون سا حسن نظامی سچا ہے اور کون سا حسن نظامی جھوٹا ہے۔ وہ جو کہتا ہے کہ "حضرت مولانا محمد علی کو مذہب پیارا نہیں ہے، محض سیاست پیاری ہے ('غریبوں کا اخبار'، 27 نومبر، صفحہ 1، کالم 2) یا وہ جو اپنے کو چوٹی کا دِلّی والا سمجھ کر" اتنے بڑے مجمع میں جو جامع مسجد میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا"، اس "آبرو باختہ" لیڈر کو سپاس نامہ پڑھ کر سناتا ہے اور اُس کی بے انتہا تعریف وتوصیف کرتا ہے اور جامع مسجد سے واپس آ کر اپنے شب نامچہ میں لکھتا ہے کہ میرا تو اعتقاد ہے کہ علی برادران اسلام کے سچے عاشق ہیں۔ بینوا وتوجروا۔"

اِسی قبیل کے بیسیوں بلکہ سیکڑوں الزامات محمد علی پر لگائے گئے اور اُنہوں نے اُن کے جوابات بھی دیئے۔

لب ولہجہ کی شکایت:

سطورِ بالا سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ محمد علی کا لب ولہجہ بہت سخت ہے، اس کا ایک جواب تو "غریبوں کا اخبار" کا ایک ایک حرف ہے اور دوسرا جواب خود محمد علی کے الفاظ میں یہ ہے:

''خواص مجھے معاف فرمائیں، اگر اُن کے نزدیک طرزِ تحریر میں ہر وقت وہ متانت و سنجیدگی اُنہیں نہیں نظر آتی جس کے وہ عادی ہیں، وہ ''عوام'' کی کمزوریوں کو نہیں جانتے۔ اگر عوام کو خواجہ صاحب کا شکار ہونے سے ہمیں بچانا ہے تو اِس تلخ کونین کی گولی پر شکر کی ایک تہ چڑھانی پڑے گی یا یوں کہیے کہ باوجود ''چٹخارے'' کی خود شکایت کرنے کے مجھے ان مریضوں کو اُبلی کھچڑی کے ساتھ کم از کم آلو بخارے اور سیاہ مرچ کی چٹنی دینا ہوگی اور نہ اس غذا کو حلق سے اُتارنا کیسا، منہ تک نہ لے جائیں گے۔''

طوالتِ کلام:

اِس موضوع پر مسلسل مضمون دیکھ کر لوگ گھبرا اُٹھتے تھے، کچھ انسانی فطرت ہی ایسی ہے کہ ایک ہی موضوع پر مسلسل نہ تقریر پسند کرتی ہے نہ تحریر۔ اس کا جواب بھی محمد علی کے الفاظ میں یہ ہے:

''ایک دو مضامین لکھ دینے سے کام نہیں چلے گا، مسلمانوں کی خود فراموشی اور غفلت سے آپ بے خبر ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ مسئلہ برابر اُن کے پیش نظر رہے، یہاں تک کہ اُن کو اِس کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہو جائے، اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے:

می شود ہر مو درازے خرقہ پوش آہ زیں سوداگرانِ دیں فروش
با مریداں روز و شب اندر سفر از ضرورت ہائے ملت بے خبر
دیدہ ہا بے نور مثل نرگس اند سینہ ہا از دولتِ دِل مفلس اند
واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست اعتبارِ ملت بیضا شکست
واعظ ما چشم بر بت خانہ دوخت مفتیِ دین متین فتویٰ فروخت
چیست یاراں بعد ازیں تدبیر ما رخ سوئے مے خانہ دارد پیر ما''

ایک اور حقیقت

ہاپوڑی صاحب نے ایک کتاب ''پولیٹیکل گرگٹ'' لکھی تھی جس کا دیباچہ غلام نظام الدین صاحب نظامی پریمی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ محمد علی نے انکشاف یہ کیا کہ وہ خواجہ صاحب کا ہے اور اسے بہ دلائل وثبوت ''ہمدرد'' میں شائع بھی کیا، چنانچہ ایک مقام پر وہ تحریر فرماتے ہیں:

''پولیٹیکل گرگٹ نامی پمفلٹ کا دیباچہ از غلام نظام الدین صاحب ظاہر کیا گیا ہے مگر ہے وہ ''از جناب خواہر زادہ حضرت نظام الدین اولیا، مصورِ فطرت، سابق مجاور و سارق گولک درگاہِ شریف و مصنف مچھر کا اعلانِ جنگ و پسو کا پیغام صلح و ہزاران ازیں قبیل خرافات از فرام قبلہ ٹو شملہ تا کم ٹو موت وغیرہ وغیرہ شریکِ لوٹ کھسوٹ نظام المشائخ توحیدِ رعیت، مرشد پیر بھائی، گرو سیوک، پیشوا، مولوی، درویش، فقیر، قلندر، مداری، سادھو جوگی وغیرہ وغیرہ حال جاسوسوں کے خواجہ، جھوٹی تبلیغ کے راجہ، سیدی، مرشدی و مولائی پیدائشی علی حسن، خود ساختہ حسن نظامی، غریبوں کے اخبار والے وغریب نواز ثانی، جٹادھاری گیسو دراز ثانی، پوسٹر بازی و پروپیگنڈے میں لاثانی وغیرہ وغیرہ کثر اللہ حقہ وقلل اللہ باطلہ ساکن غیاث پور حال وارد رین بسیرا اور دلیش خانہ، حسین خانہ، ایمان خانہ وغیرہ وغیرہ دِلّی والے بڑے متوالے، سب سے نرالے، خدا اُن کے پنجہ میں کسی کو نہ ڈالے۔''

آپس کی گالیاں:

''غریبوں کے اخبار'' کا جس صاحبِ ذوقِ سلیم نے ایک صفحہ بھی دیکھ لیا، اُس نے اخبار دیکھنے سے قسم کھالی۔ طرفین سے ہر قسم کے الفاظ کا تبادلہ ہوا، اب اگر ان نمونہ آپ کے سامنے پیش کیا جائے تو یہ کون سی علمی، ادبی یا سیاسی خدمت ہوگی۔ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری کے سلسلہ میں ان چند باتوں کا پیش کرنا ناگزیر تھا، اس لیے صرف اتنا مواد پیش کر دیا گیا کہ حقیقت حال واضح ہو جائے، اصل مسئلہ

سمجھ میں آجائے، صورتِ مسئلہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

ورنہ محمد علی پر جو تہمت تراشیاں کی گئیں، اُنہیں جس طرح ہدفِ مطاعن بنایا گیا، طرح طرح کے بے بنیاد واقعات اُن کے متعلق مشہور کیے گئے اور ہر طرح سے اُنہیں ذلیل و رسوا کرنے کی کوششیں کی گئیں، کس کا دِل ہے کہ اُنہیں پڑھے اور کس کا قلم ہے کہ اُنہیں لکھے، فیصلہ کیا ہوا؟ اسے ان صفحات میں نہ تلاش کیجیے بلکہ زبانِ خلق سے پوچھئے جسے نقارۂ خدا کہتے آئے ہیں۔

اب یہ عنوان ختم کیا جاتا ہے لیکن خاتمہ سے پیشتر یہ گزارش ضروری ہے کہ حتی الامکان پوری کوشش کی گئی ہے کہ نفس مسئلہ کے متعلق مواد فراہم کیا جائے اور ذاتیات پر جو خامہ فرسائیاں کی گئی ہیں، نیز غیر متعلق مباحث پر جو زبردست پروپیگنڈا کیا گیا ہے اُسے قطعاً نظر انداز کر دیا جائے اور صرف نفس مسئلہ کو پیش کیا جائے۔

مزید تفصیل آئندہ مؤرخ کے لیے چھوڑ یئے۔

❀❀❀

باب ۳۲

اسپیشل خلافت کانفرنس

مئی 1926ء میں اسپیشل خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس نے ہندوؤں کو محمد علی سے بہت برانگیختہ کر دیا تھا اور یہ خیال ظاہر کیا جانے لگا تھا کہ اب خلافت کمیٹی اور محمد علی میں بھی فرقہ وارانہ جراثیم سرایت کر گئے ہیں، اُن کے پیش نظر اب ملکی آزادی نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں افتراق و اختلاف کی خلیج کو زیادہ سے زیادہ وسیع کر دینا ہے۔

اس کانفرنس کے بعد اُن پر اور حکیم اجمل خاں مرحوم پر جس جس طرح کے رکیک حملے کیے گئے ہیں اور جس جس طرح سے اُنہیں ذلیل و بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ ایک دردناک داستان ہے اور ایک ایسا آئینہ ہے جس میں بہت سے نام نہاد قوم پرستوں اور وطن پرستوں کی ''قومیت'' اور ''وطنیت'' کا چہرہ بے نقاب دیکھا جا سکتا ہے اور حقیقت معلوم کر لی جا سکتی ہے۔

ملک کی فضا:

پچھلے صفحات میں اِس پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے کہ محمد علی کی گرفتاری کے بعد ملک میں کیا حالات و انقلابات رونما ہوئے تھے؟ ملک کے امن و امان کو شدھی و سنگٹھن کی تحریکوں سے کس طرح تاراج کیا گیا اور ہندو مسلمانوں کے اس عنصر کو جو صلح و سلام، اتحاد و اتفاق اور خلوص و محبت کا داعی تھا، کس طرح گوشۂ عزلت اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا؟ نیز ہندوستان کے بڑے بڑے زعماء نے عافیت اِس میں سمجھی کہ وہ اس وقت ایک تماشائی کی حیثیت سے ملک و قوم کی اس دردناک کشمکش کا معائنہ کریں اور جب حالات

سازگار ہو جائیں تو پھر پبلک اُن کی ہے، پلیٹ فارم اُن کا ہے، اسٹیج اُن کا ہے۔

محمد علی کا رویّہ:

لیکن محمد علی نے گوشۂ عزلت نہیں اختیار کیا، اُنہوں نے اپنے آپ پر تعطل نہیں طاری کیا اور نہ اپنے تئیں بے بس اور مفلوج ثابت کیا۔ وہ مردانہ وار میدانِ عمل میں آئے، اُنہوں نے اپنی قوم میں ایک محاذِ جنگ قائم کر دیا اور مسلمانوں میں جن لوگوں نے اتحاد کش اور امن سوز سرگرمیوں کا بازار گرم کر رکھا تھا، اس سے وہ برسرِ پیکار ہو گئے۔ اپنے اقتدار، اپنی وجاہت اور اپنی "بلند پوزیشن" کا اُنہوں نے بالکل خیال نہیں کیا۔ وہ ہر اُس شخص سے لڑے جس نے ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، جس نے "تبلیغ کا راجہ" بن کر قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہا اور جس نے "تنظیم" کے داعی کی حیثیت سے مسلمانوں کو آزادی کی منزلِ مقصود سے دُور کرنا چاہا۔

مشکلات:

محمد علی کو اپنی کوششوں میں سخت حوصلہ شکن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، خود مسلمانوں میں اُنہیں ذلیل ہونا پڑا اور جن لوگوں سے وہ اپنی قیادت کی داد لے رہے تھے اُنہیں کے خلاف میدانِ جنگ میں اترنا پڑا۔

حالانکہ اگر وہ چاہتے تو خاموش رہ کر اپنی قیادت کو برقرار رکھ سکتے تھے لیکن اُن کے سامنے ایک لائحہ عمل تھا، ایک مطمحِ نظر تھا اور وہ قوم کو اس پر گام فرسا کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اُن سے خاموش نہیں بیٹھا گیا اور جو بھی سنگِ راہ بن کر میدان میں آیا، اُس کے اُنہوں نے پرزے پرزے کر ڈالے۔

کامیابی:

سخت جدوجہد، مسلسل کوشش اور پیہم مبارز طلبیوں کے بعد محمد علی کو اتنی کامیابی ہوئی کہ اب اُن کا حریفِ راہ کوئی باقی نہیں رہ گیا۔ اُنہوں نے مسلمانوں کے دِلوں میں یہ بات راسخ کر دی کہ آزادی حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے، غلامی سے تنفر ہر مومن کا امتیازی نشان ہے۔ یہ اُنہیں کی اَن تھک

کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں اُن لوگوں کا اثر پھر باطل ہو گیا جو قیادت کی عبا پہن کر لوگوں کو گمراہ کرنے آئے تھے، لیکن جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ قوم کو قعر ہلاکت میں گرائیں اور ذاتی و شخصی منافع حاصل کریں، قوم کے سرتاج بھی رہیں اور گورنمنٹ کے منظورِ نظر بھی۔

تصویر کا دوسرا رُخ:

لیکن یہ تو تھا تصویر کا ایک رُخ جو خدا کے فضل سے جاذبِ نظر معلوم ہو رہا ہے، لیکن دوسرا رُخ تاریک تھا اور اس کی تاریکی میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ محمد علی نے تبلیغ و تنظیم کے مقابلہ میں جس سرگرمی اور خلوص کا مظاہرہ کیا تھا، وہ چاہتے تھے کہ اس سرگرمی اور خلوص کا مظاہرہ ہندو زعماء کی طرف سے بھی وہو۔ جس طرح اُنہوں نے میدانِ عمل میں آ کر مسلمانوں کی مخالفت کی اور جمہور کو غلط رہنمائی سے بچایا، اُسی طرح برادرانِ وطن کے سنجیدہ رہنما یعنی کانگریسی قائدین بھی میدانِ عمل میں اُتریں اور ہندو جمہور کی مخالفت کریں، اُن کو غلط رہنمائی سے محفوظ رکھیں اور کوشش کریں کہ افتراق کی خلیج پٹ سکے۔

جواب:

لیکن اُن کی طرف سے جو عملی جواب دیا گیا وہ بہت زیادہ عجیب و غریب اور حد درجہ افسوس ناک تھا۔ ہندو زعمائے کانگریس نے شدھی و سنگھٹن کے خلاف ایک محاذِ جنگ تیار کرنے سے انکار کر دیا۔ اکثر نے اُن لوگوں کی کوئی مخالفت نہیں کی جو امن و امان کے دشمن ثابت ہو رہے تھے۔ اُنہوں نے سوامی شردھانند، لالہ ہردیال، بھائی پرمانند، پنڈت مالویہ اور لالہ لاجپت رائے کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جو چاہیں کریں اور خود خاموشی کی قسم کھالی۔

سنگھٹنی جماعت نے آل پارٹیز کانفرنسوں کو ناکام کرایا، یونٹی کانفرنسوں کو ملتوی کرایا، اتحاد و اتفاق کی کوششوں سے اعراض کیا، پھر بھی اُن کے خلاف کانگریسی حلقہ سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔

کانگرسی زعماء:

اکثر زعمائے کانگریس کا یہ عالم تھا کہ وہ اِس تخیل سے لرزتے تھے کہ وہ ہندو مہا سبھا یا اُس کے محترم

کارکنوں کی مخالفت کریں، بلکہ اپنے طرزِ عمل سے اُن کی مدح وستائش اور تعریف وتوصیف اور تائید و اشتراکِ عمل کا ثبوت دیتے رہتے تھے۔

گاندھی جی کی روش:

گاندھی جی اگرچہ گوشہ تنہائی اختیار کر چکے تھے اور کسی میدانِ عمل میں آنے پر رضا مند نہیں ہوتے تھے، لیکن پھر بھی سوامی شردھانند کا اُن سے بڑھ کر ''معترف'' کوئی نہیں تھا۔ وہ برابر سوامی جی کے خلوص اور اُن کی ملکی خدمات کا اعتراف کرتے تھے اور اُنہیں ہندو مسلمانوں کا سچا ہمدرد ثابت کرتے تھے۔

مالوی جی کے تقدس کے وہ ہمیشہ قائل رہے، اُنہیں اپنا بزرگ اور ہندوستان کا قائدِ اعظم اُنہوں نے ہمیشہ سمجھا۔

امرتسر پراونشل کانگریس:

امرتسر پرانشل کانگریس کے موقعہ پر جب مولانا ظفر علی خاں نے مالوی جی کی اسلام آزار اور اتحاد سوز مساعی پر رنج وافسوس کا اظہار کیا تو گاندھی جی نے اُن سے کہا کہ تم نے تو آج میرے سینہ پر گھونسہ مار دیا۔ مالوی اور یہ سنگین الزمات! العجب ثم العجب!

موتی لال کا روّیہ:

پنڈت موتی لال نہرو سے محمد علی کو یہ شکایت تھی کہ وہ ہندو مہا سبھا سے مرعوب ہو گئے اور اس کا اثر کانگریس کے طرزِ عمل پر پڑ رہا ہے۔

یہ ہندو مہا سبھا کا اثر ہی تھا جس نے موتی لال اور اُن کی سوراج پارٹی کو مجبور کر دیا کہ وہ صوبہ سرحد کو مساوی اصلاحات دیئے جانے کے خلاف ملک میں آواز اٹھائیں اور اسمبلی ہال میں ہاتھ!

کانگریس کے بعض ہندو لیڈروں نے حکیم اجمل خاں کی تنبیہ وسرزنش کے باوجود اِس سے صاف انکار کر دیا کہ ہندو مہا سبھا کے خلاف ایک حرف بھی کہیں گے، اس لیے انتخابات کا زمانہ قریب آ رہا تھا اور اُنہیں ''ووٹ'' حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنی تھی اور پھر وہ یہی لوگ تھے جنہیں لاجپت رائے اور

مالوی جی نے اُس وقت سخت شکست دی تھی جب اسمبلی کی ممبری کے لیے اُنہوں نے کانگریس کے ٹکٹ پر مسٹر آصف علی کو دہلی کی طرف سے کھڑا کیا، باوجود منت سماجت کے ایک مہا سبھائی کو مالوی جی نے اُن کے مقابلہ میں کھڑا کیا اور آصف علی کو شکست دلوائی!

اُن حضرات میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ مہا سبھا کے خلاف کچھ کہہ سکتے یا ہندو مہا سبھا کے کارکنوں میں سے کسی سے اختلاف کرتے۔

محمد علی اور کوشش ''صلح'':

محمد علی نے اِن حالات کے برعکس اپنی قوم میں سب کی مخالفت مول لے کر فضا کو ہموار کیا، بہت سی یونٹی کانفرنسیں منعقد کرائیں، زیادہ سے زیادہ اپنے درجہ سے گرے ہوئے الفاظ میں ہندوؤں کی منت کی کہ خدا کے لیے راہِ راست اختیار کرو اور اسی پر اپنی قوم کو چلانے کی کوشش کرو۔

گاندھی جی سے گفتگو:

آخر مجبور ہو کر اُنہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بزرگوں کی معیت میں کانپور کانگرس کے موقع پر یہ التجا کی کہ اب وہ اپنا قفل خاموشی توڑیں اور اس مخالف فضا کا مقابلہ کر کے نسبتاً اچھی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اِسی طرح محمد علی نے دوسرے زعماء سے بھی گفتگو کی اور اُنہیں آمادہ کرنا چاہا کہ وہ مہا سبھا کے خلاف کچھ کارروائی کریں تاکہ پھر وہی فضا قائم کی جا سکے جس کے وہ متمنی ہیں اور جو آزادی کی طرف پہنچانے والی ہے۔

لیکن یہ تمام کوششیں بے نتیجہ رہیں۔ پرائیویٹ گفتگوؤں میں مہا سبھائیوں کو برا کہنے میں تو شاید ہی کسی کانگریس لیڈر کو تامل ہو، لیکن پبلک میں! زبان یاری نہیں دیتی تھی اور دِل کے خلاف زبان سے کام لیا جاتا تھا۔

محمد علی کا فیصلہ:

اب محمد علی نے یہ فیصلہ کیا! ذرا اُس دل گروہ اور اُس عزم کو ملاحظہ فرمائیے کہ وہ خود ہندو لیڈروں کا

مقابلہ بھی کریں گے اور اُن کی امن سوز جدوجہد کی مدافعت پوری طاقت سے کریں گے، اور بالآخر اُنہیں بھی اِسی طرح بے نقاب کر کے چھوڑیں گے جس طرح مسلمانوں کے بعض ''لیڈروں'' کے ساتھ وہ کر چکے تھے!

چنانچہ اُنہوں نے ڈاکٹر مونجے، پنڈت مالوی اور دوسرے بزرگوں کے نفاق انگیز روّیہ پر سخت نکتہ چینی کی اور اُن کی نقصان رساں اور مضرت دہ پالیسی کا پردہ چاک کیا اور جن مقاصد کے ساتھ یہ حضرات مصروفِ عمل تھے، اُنہیں پبلک سے روشناس کرایا۔

محمد علی کے یہ مضامین نکلے اور ہندو پریس میں آگ لگ گئی۔ اتنا وسیع، اتنا مستقل اور اتنا مسلسل ''پروپیگنڈا'' محمد علی کے خلاف کیا گیا کہ حد بیان سے باہر ہے!

اِس سلسلہ میں سب سے زیادہ پرلطف بات یہ ہے کہ جب تک محمد علی مسلمان لیڈروں کی پردہ دری کرتے رہے اور گمراہ رہنماؤں کی مخالفت کرتے رہے، اُس وقت تک تو وہ کانگریس کی آنکھ کا تارا بنے رہے اور جب اُنہوں نے مالوی اور لاجپت رائے، ہر دیال اور مونجے کی پردہ دری کی تو مہاسبھا تو مہاسبھا، خود کانگریسی حلقوں کی چین پیشانی چھپائے نہ چھپ سکی۔

اسپیشل خلافت کانفرنس:

اِن تمام باتوں کے بعد مجبور ہو کر اُنہوں نے اسپیشل خلافت کانفرنس کا مئی 1926ء میں دہلی میں اجلاس منعقد کرانا چاہا اور اس کے انتظامات شروع کر دیئے۔ مقصد یہ تھا کہ آخر مسلمانوں کو برا بھلا کہنے کی کوئی حد ہے؟ فسادات کم نہیں ہوتے، اختلاف کم نہیں ہوتا۔ ہندو، مہاسبھائیوں کی مخالفت کرتے نہیں۔

پھر اُسی زمانہ میں کلکتہ میں مسلسل فسادات ہوئے تھے جن سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا تھا، تو مجبور ہو کر اُنہوں نے ایک اجلاس منعقد کرنا چاہا جس میں مسلمانوں کے آیندہ طرزِ عمل کا فیصلہ کیا جائے اور غور کیا جائے کہ وہ کیا تدابیر ہیں جن سے پھر ہندو مسلمانوں میں امن قائم کرایا جا سکتا ہے اور اُن کی حفاظت ہو سکتی ہے۔

محمد علی کا بیان:

چنانچہ محمد علی کانفرنس کے انعقاد کی غرض وغایت یوں بیان کرتے ہیں:

''جب پنڈت موتی لال نے مہا سبھائیوں کو ایک حرف بھی کہنے سے انکار کیا تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے مجبور ہو کر اُن سے صاف کہہ دیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کچھ توقع نہ رکھیں!

جب ہماری سعی لاحاصل رہی اور ایک ہندو لیڈر بھی ہندو مہا سبھائیوں کے خلاف کچھ نہ بولا تو ہم نے دہلی میں اسپیشل خلافت کانفرنس کا اجلاس طلب کیا، اُس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کی صدارت حکیم اجمل خاں نے فرمائی اور کانفرنس کی صدارت مولانا سیّد سلیمان ندوی نے۔''

کانفرنس کا اجلاس:

بالآخر دہلی میں اسپیشل خلافت کانفرنس کا اجلاس حکیم اجمل خاں کی تحریک اور مولانا ابوالکلام و شوکت علی زبردست تائید سے مولانا سیّد سلیمان کی صدارت میں منعقد ہوا۔

خلافت کانفرنس کا خطبہ صدارت ہندو مہا سبھا کا ''ایڈریس'' نہیں تھا، بلکہ اس میں نہایت متانت وسنجیدگی سے ملک کی حالت زار کا نقشہ کھینچا گیا تھا اور اتفاق واتحاد کی تمنا ظاہر کی گئی تھی، اور صاف صاف یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ اب ہم میدانِ عمل میں اتر چکے ہیں اور اپنے ہندو دوستوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ اب یہ اُنہیں اختیار ہے کہ وہ اس ہاتھ کو وہ ہاتھ سمجھیں جو ایک دوست دوسرے دوست کو مصافحہ کے لیے بڑھاتا ہے یا وہ جو ایک پہلوان دوسرے پہلوان کی طرف اکھاڑہ میں بڑھاتا ہے۔

کانفرنس کی تجاویز:

کانفرنس میں کئی اہم تجاویز منظور ہوئیں لیکن ایک تجویز بھی ایسی نہیں تھی جس سے نفاق کی بو آتی ہو، جس سے مقابلہ کی تمنا ظاہر ہوتی ہو، جس سے کانگرس اور ہندوؤں سے بیزاری کا اظہار ہوتا ہو، جس

میں اعلانِ جنگ ہو!

ہر تجویز نہایت معتدل، نہایت معقول اور اِس تمنا سے لبریز کہ ملک میں پھر امن وامان قائم ہو، اور ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں کہ فسادات کی یہ گرم بازاری ختم ہو جائے اور نہایت شرافت واطمینان کے ساتھ ہندو مسلمان دونوں اپنے اپنے فرائض بجا لاسکیں، اُن پر کوئی مانع نہ ہو اور نہ کوئی ان کارروائیوں میں خلل انداز ہو!

محمد علی کی تقریر:

اس کانفرنس کے بعد ہی محمد علی وفد حجاز کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر جو مسلمان الوداع کہنے کے لیے آئے تھے، اُن سے محمد علی نے فرمایا:

> ''یہ ملک کے لیے سخت ترین ابتلا وآزمائش کا زمانہ ہے۔ نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہل ہنود کو مشتعل ہونے کا موقع دیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر چھری دکھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔''

یہ الفاظ محمد علی کی زبان سے اُس وقت ادا ہو رہے ہیں جب مہا سبھا کیمپ سے اُنہیں غدارِ وطن کا خطاب مل چکا ہے اور کانگریسی حلقہ اُنہیں چڑھے ہو رہے ہوئے تیوروں سے دیکھ رہا ہے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ اِس سے زیادہ کشادہ دِلی اور رواداری کا اظہار کبھی کسی نے کیا ہو!

ہندوؤں کی مخالفت:

اِس امن پرور بیان اور ان صلح جو تجاویز کے باوجود اسپیشل خلافت کانفرنس کو طرح طرح سے بدنام کیا گیا اور حکیم اجمل خاں اور محمد علی کو ہندو پریس نے ایسے ایسے الفاظ سے یاد کیا کہ اُن کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بہرحال یہ تھی وہ اسپیشل کانفرنس جس نے کانگرس کو خلافت سے بد دِل اور بدظن کرنا شروع کیا۔

باب ۴۴

قانونِ حج

اِس سے پیشتر اجمالی طور سے اس کا ذکر آچکا ہے کہ گورنمنٹ نے ایک بار جب ٹرنر ماریسن کمپنی کو حجاز کی جہاز رانی کا ٹھیکہ دینا چاہا ہے تو حاجیوں پر واپسی ٹکٹ کی شرط بھی لازم کر دینا چاہی تھی۔ مگر محمد علی کی بر وقت مخالفت لارڈ ہارڈنگ سے تحریک اور خود لارڈ موصوف کے تدبر کی بدولت حکومتِ بمبئی کی یہ ''سفارش'' وائسرائے بہادر منظور نہیں کر سکے اور یہ تجویز معرضِ التواء میں پڑ گئی اور ایک عرصہ تک کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آیا۔

قانون حج مسوّدہ:

لیکن جس قانون سے گورنمنٹ کو بالواسطہ بھی فائدہ پہنچتا ہو اور انگریز تاجروں کو نفع ہو رہا ہو، وہ زیادہ عرصہ تک وقفِ طاقِ نسیاں نہیں رہتا، کبھی نہ کبھی اُسے منظر عام پر آنا ہی پڑتا ہے۔

چنانچہ گورنمنٹ کی طرف سے 1926ء میں پھر یہ تحریک پیش ہوئی کہ ایک ایسا قانون وضع کر دیا جائے جس کی رو سے حج کو جانے والے زائرین مجبور ہوں کہ وہ واپسی ٹکٹ لے کر جایا کریں اور کم از کم اتنی رقم جمع کرایا کریں تا کہ معلوم ہو سکے کہ یہ ''سرمایہ دار ہیں'' مفلس وقلاش نہیں۔ اِس طرح گورنمنٹ کو بھی اپنے نظم وانتظام میں سہولت ہوگی اور حجاج کو بھی ہر طرح کی آسانی ہوگی۔ موجودہ صورت میں دونوں کو سخت نقصان اور اس سے زیادہ تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔

دلائل:

دلیل یہ پیش کی گئی کہ اکثر حجاج نادار ہوتے ہیں۔ اپنے مذہبی جوش میں وہ ہندوستان سے روانہ ہو جاتے ہیں، لیکن چونکہ بہت کم رقم لے کر چلتے ہیں اس لیے راستہ ہی میں وہ مفلس ہو جاتے ہیں اور دوسروں کی مدد پر اُن کی گزران ہوتی ہے۔ اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس کرایہ تک کے دام نہیں رہتے ہیں اور وہ فاقہ مستی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھومتے ہیں۔ تب مجبور ہو کر گورنمنٹ اُن کو وطن پہنچانے کا انتظام کرتی ہے۔ اس لیے اصولاً ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں کہ وہی لوگ حج کا قصد کریں جو جیب میں دام بھی رکھتے ہوں۔

محمد علی کی مخالفت:

محمد علی نے اس قانون کی سخت مخالفت کی اور اس کے معائب بتلائے، حاجیوں کی ناقابل برداشت دقتوں کا ذکر کیا اور گورنمنٹ کو مجبور کیا کہ وہ اِس قسم کا یک طرفہ قانون نہ بنائے جس سے صرف حاجیوں کو تکلیف تو پہنچ سکتی ہو، لیکن جو اُن کی اِس تکلیف اور فاقہ مستی کے اسباب ہیں اُن کا انسداد نہ کیا جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ حاجیوں کے افلاس اور عسرت کی اصل علت خود گورنمنٹ کا تغافل اور جہاز ران کمپنیوں کا حاجیوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا اور تباہ کرنا ہے۔

مضامین:

اِس موضوع پر محمد علی نے ''ہمدرد'' و ''کامریڈ'' میں مسلسل اور پیہم مقالات و مضامین کے ذریعہ سے گورنمنٹ کو خبردار کیا، چنانچہ ایک مضمون میں وہ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے حاجی سب حجاج سے زیادہ نادار ہوتے ہیں، لیکن اس کی ذمہ داری ہندوستان کی حکومت پر ہے۔ اوّل تو ہندوستان کے لوگ مفلس ہیں، دوسرے حکومت اُن کا خاطر خواہ انتظام نہیں کرتی۔''

مصر میں حج کا طریقہ:

''مصر میں حج کا طریقہ یہ ہے، وہاں کی حکومت حجاج کی تعداد تخمیناً معلوم کر لیتی ہے، پھر جہاز ران کمپنیوں سے ٹینڈر طلب کرتی ہے۔ اِس طرح جو جہاز کم کرایہ پر اور بہتر طریقہ پر لے جانا منظور کریں، ان میں مصر کے حجاج جاتے ہیں۔''

ہندوستان کی حالت:

''یہاں یہ حالت ہے کہ جہاز ران کمپنیاں جن کے زیادہ تر انگریز مالک ہیں، پہلے کم کرایہ کا اعلان کرتی ہیں۔ حجاج اعلان سے کچھ زیادہ روپیہ لے کر بنگال اور سندھ وغیرہ دُور دراز مقامات سے بمبئی آتے ہیں۔ جہاز کی روانگی کا وقت مقرر نہیں ہوتا اس لیے اُن کو عرصہ تک بمبئی میں رہنا پڑتا ہے۔ جہاز ران کمپنیاں یہ کہہ کر کہ حاجیوں کی ابھی کافی تعداد نہیں آئی ہے، ان غریبوں کو انتظار کراتی ہیں اور پھر جب حاجی کافی تعداد میں بہت زیادہ آجاتے ہیں اور زیادہ کرایہ دے کر روانہ ہونا چاہتے ہیں تو کمپنیاں جہاز کا کرایہ بڑھا دیتی ہیں، اس طرح بہت سارو پیہ بمبئی ہی خرچ ہو جاتا ہے اور (حجاج) واپسی کے وقت بھکاری اور نادار بن جاتے ہیں۔
اگر گورنمنٹ کو واقعی حجاج کی سہولت مقصود ہے تو اس کا علاج بمبئی میں ہونا چاہیے، جہاں اُن کا روپیہ ناواجب طریقہ سے لوٹ لیا جاتا ہے۔''

اِسی طرح بہت پرزور دلائل کے ساتھ محمد علی نے اِس لغو قانون کی مخالفت کی مگر (غالباً) نتیجہ کچھ نہیں نکلا اور وہ قانون حاجیوں کی مشکلات میں اضافہ کرنے کے لیے اب تک موجود ہے اور جب تک گورنمنٹ موجود ہے، وہ بھی موجود رہے گا۔

باب ۳۴

موپلہ بچوں کی عیدی

تحریکِ خلافت کے زمانہ میں اور اس کے بعد موپلہ قوم پر پیہم آفات و مصائب کا جو پہاڑ ٹوٹا اور جس طرح اس بہادر اور شجیع قوم کو صفحہ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی کوشش کی گئی، وہ سب کو معلوم ہے لیکن بہادر لوگ سخت جان بھی ہوتے ہیں۔ اُن کا مٹانا اور برباد کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا سمجھا جاتا ہے، وہ تلواروں کے زخم اور سنگینوں کے چرکے کھا کر بھی زندہ رہتے ہیں اور اپنی شجاعت کا ثبوت دیتے ہیں۔

تحریک کے بعد:

پھر جب اُن کا ''قتل عام'' شروع ہوا اور اُن کی جائدادیں ضبط کی گئیں۔ اُن کی املاک سے اُنہیں محروم کیا گیا تو کوئی نہیں تھا جو اُن کی دستگیری کرتا، کوئی نہیں تھا جو اُن جلاوطن، غریب الدیار لیکن اسلام جانباز و سرفروش سپاہیوں کی اعانت کرتا اور کوشش کرتا کہ اُن کے مصائب و آلام میں کچھ تخفیف ہو جائے۔

زعماء کا تغافل:

جاڑے آتے تھے، لوگ نفیس نفیس لحافوں میں آرام کرتے تھے اور وہ ٹھٹھر ٹھٹھر کر اپنی زندگی کے دن کاٹتے تھے۔ گرمیاں آتی تھیں اور لوگ خس پوش کمروں میں یا پہاڑوں کی بلندیوں پر موسم بہار کا لطف

اٹھاتے تھے، مگر وہ غریب اپنے گلخن میں سلگتے تھے۔ برسات آتی تھی، لوگ موسم برشگال سے شاعرانہ کیف حاصل کرتے تھے۔ برآمدوں اور سائبانوں میں تقاطر اور ترشح کا مزا اٹھاتے تھے، لیکن وہ بے چارہ بھیگ بھیگ کر نزلہ اور زکام کو دعوت دیتے تھے۔ عید آتی تھی، لوگ زرق برق کپڑے پہنتے تھے، اچھے اچھے کھانے کھاتے تھے، دوست احباب کی دعوت کرتے تھے، سیر و تماشہ سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ میلہ ٹھیلہ کی سیر کرتے تھے، بال بچوں کو طرح طرح کے کھلونے لا کر دیتے تھے۔ مگر ایک قوم کی قوم ایسی تھی جہاں عید ماہِ محرم کا حکم رکھتی تھی، نہ ستر پوشی کے لیے اُن کے پاس کپڑے تھے نہ گرسنگی کے علاج و دفاع کے لیے اُن کے پاس خوش ذائقہ اور لذیذ کھانے خود تو بے چارے اس موسم ابتلا کو برداشت بھی کر لیتے تھے۔ لیکن بچے بلک بلک کر، تڑپ تڑپ کر، ہمک ہمک کر ماں باپ کو مجبور کر دیتے تھے کہ وہ ان کے لیے اچھے کپڑوں کا انتظام کریں، عمدہ کھانے مہیا کریں، میلہ اور تفریح کے لیے کچھ دام دیں تو ان مامتا کے مارے فاقہ مست لوگوں پر کیا کچھ گزر جاتی ہوگی؟ مگر کون تھا جو اپنے عیش و آرام کو منغص کر کے اُن تباہ حال اور افلاس پیشہ لوگوں پر ایک نظر بھی ڈالتا، مدد کرنا تو خیر بعد کی چیز ہے۔

ایک دردمند دِل:

لیکن ایک ہستی تھی جو اپنے عیش و آرام کو منغص کر کے ان دکھ کے ماروں پر ترس کھاتی تھی۔ اُس کے سامنے جب کھانا آتا تھا تو موپلہ قوم کے بھوکے بچے یاد آ جاتے تھے۔ اُس کے سامنے جب کپڑے آتے تھے تو موپلہ قوم کے برہنہ اور عریاں لوگوں کی تصویر اُس کے سامنے پھر جاتی تھی۔ وہ جب افطار کرنے کا ارادہ کرتا تھا تو وہ صائم الدہر اُسے بے قرار کر دیتے تھے جن کی افطاری آشوبِ چشم، جن کا کھانا غم دل اور جن کی سحری فغانِ نیم شب تھی۔ جب عید کی نشاط افزا فضا میں لوگ مست ہو ہو کر عید گاہ کا رُخ کرتے تھے اور نماز کے بعد جب دھوپ کی تابش اور گرمی کی شدت سے بے قرار ہو ہو کر جلد سے جلد نکلنا چاہتے تھے تو ایک ذات تھی جو عید گاہ کے دروازہ پر ذیابیطس اور دوسرے امراض کے باوجود دھوپ کی تابش میں اور لوگوں کی سرد مہری میں بھی چٹان کی طرح عید گاہ کے دروازہ پر کشکولِ گدائی لیے کھڑی ہوتی تھی۔ عام خاص، جاہل عالم، امیر غریب ہر شخص کو وہ مخاطب کرتی تھی اور ایک ایک پیسہ، دو پیسہ بڑی خوشی

سے لے کر اپنے چنبل میں ڈالتی جاتی تھی۔

تقابل:

نماز پڑھنے دوسرے لیڈر بھی آتے تھے لیکن وہ موٹر میں آئے اور موٹر میں واپس چلے گئے۔ایک فرض تھا جو اُنہوں نے ادا کیا اور پھر اپنے اپنے ''دولت کدہ'' پر واپس تشریف لے گئے!

لیکن یہ ایسا ''لیڈر'' تھا جو خود بھی فاقہ مست تھا اور دوسرے فاقہ مستوں کو بھی فکر رکھتا تھا، خود بھی تباہ حال تھا اور دوسرے تباہ حال افراد کا درد بھی اپنے دل میں رکھتا تھا، خود بھی نادار تھا اور دوسروں کی ناداری پر دِل میں رحم و محبت کی ایک خلش بھی محسوس کرتا تھا۔

اِس طرح کئی گھنٹے دھوپ میں کھڑے ہو کر اور ہر شخص سے بے تکلفی کے ساتھ تقاضا کر کے اُن سے اپنے کشکول میں کچھ رقم جمع کر لی، کچھ رمضان کی دعوتوں میں وہ اپنے میزبانوں اور دوستوں سے وصول کر چکا تھا۔

ایک عرصہ بعد لُو کی لپٹ میں تھکا ماندہ جھلسا اور تمتمایا واپس ہوا، اور گیارہ سو کی ایک رقم جب تک اُن مصیبت زدہ لوگوں کو نہ بھیج لی، چار پائی پر پیٹھ بھی نہیں لگا سکا۔

❁❁❁

باب ۳۵

خلافت کمیٹی کا غبن

جب محمد علی کی عام مخالفت شروع ہوئی تو ان کے تمام عیوب و نقائص جن کا ذہن کے سوا خارج میں بہت کم وجود تھا، پبلک میں لائے گئے اور انہیں ایک عیاش، فضول خرچ، مسرف اور سب سے بڑھ کر چندہ کا ہضم کر لینے والا ثابت کیا گیا۔

اِس سلسلہ میں سب سے زیادہ پرلطف بات یہ ہے کہ اس غریب پر یہ الزام بھی عاید کیا گیا کہ خلافت کمیٹی کے مشہور غبن کے ذمہ دار تم ہو اور کیا عجب کہ تمہارا ہاتھ بھی اِس میں کارفرما ہو۔

حقیقت واقعہ:

واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ محمد علی جب جیل میں اسیر تھے، اُس وقت یہ ''غبن'' ظاہر ہوا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ غبن اتفاقی طور پر ہوا، یعنی بالا رادہ نہیں بلا ارادہ!

اجمال کی تفصیل:

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چونکہ جمعیت مرکزیہ خلافت ایک باغی اور قانون شکن جماعت تھی اس لیے وہ ''رجسٹرڈ باڈی'' نہیں تھی، دوسرے اُس وقت کے مصالح کے اعتبار سے بھی یہی مناسب معلوم ہوا کہ خلافت کا روپیہ بنک میں نہ رکھا جائے۔ سیٹھ چھوٹانی صاحب چونکہ نہایت ہمت و استقلال اور نہایت اخلاص و ایثار سے تحریک کے ایک بہت بڑے علمبردار ثابت ہوئے تھے، اِس لیے اُنہیں

خلافت کمیٹی کا خزانچی مقرر کر دیا گیا۔ سارے ملک کو اُن پر اعتماد تھا، اس لیے عوام یا خواص کسی میں سے بھی کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، سب مطمئن رہے۔

غبن:

تحریک پورے زور شور سے جاری تھی اور تمام رہنما دھڑ ادھڑ گرفتار ہو رہے تھے، لیکن جس سرعت سے گرفتاریاں ہو رہی تھیں اُسی سرعت سے چندہ بھی وصول ہو رہا تھا۔ تا آنکہ وہ وقت آیا کہ تمام قابل ذکر افراد و اشخاص جیل میں تھے، صرف دو ایک آدمی باہر تھے۔

سیٹھ چھوٹانی صاحب کو پورا موقع حاصل تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اس روپیہ کو صحیح مصرف میں خرچ کر سکتے تھے، لیکن اُنہوں نے اِس روپیہ کو اپنے کاروبار میں لگا دیا اور خلافِ توقع اِس میں سخت نقصان اُٹھایا اس لیے وہ روپیہ حسب الطلب مجلس خلافت کو ادا نہ کر سکے۔

لیکن اُنہوں نے اپنے چند کارخانے جو اُن کے بیان کے مطابق سترہ اٹھارہ لاکھ کی ملکیت کے تھے، مجلس خلافت کو بجائے نقد روپیہ کے حوالہ کر دیئے۔

تنقیح:

اِس ساز و سامان کی جب جانچ کی گئی تو وہ مطلوبہ رقم سے بہت کم نکلا، لیکن اب ہو کیا سکتا تھا؟ اسے واپس تو کیا نہیں جا سکتا تھا اور نہ خلافت کمیٹی اپنے مسلک کے اعتبار سے کوئی قانونی کارروائی کر سکتی تھی، اور نہ ''اَن رجسٹرڈ باڈی'' ہونے کی وجہ سے غالباً مقدمہ چل سکتا۔

درگزر:

علی برادران جیل ہی میں تھے کہ اُن کی اِس حرکت کا راز فاش ہو گیا اور جو کچھ اُن سے مل سکا، وہ وصول کر لیا گیا۔

علی برادران اِس کے کہاں تک ذمہ دار ہیں؟ اِس کے متعلق خود محمد علی کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

محمد علی کا بیان:

جب ستمبر 1921ء میں والیٹر اسٹیشن پر خلافِ توقع محمد علی کی گرفتاری وقوع میں آئی اور بعد کو پھر وہ کراچی اور بے جاپور جیل میں تبدیل ہوتے رہے تو محمد علی کا بیان ہے:

''میری بیوی نے کہا، تم ہماری فکر نہ کرنا، خدا پہلے بھی رزّاق تھا اور وہی اب بھی رزّاق ہے۔ ہماری والدہ نے اور میری بیوی نے ہماری دو برس کی قید میں تقریباً چالیس پینتالیس لاکھ روپیہ وصول کیا جس کی ایک ایک پائی کا حساب دفتر خلافت میں آڈٹ کیا ہوا موجود ہے، یہ تو چندہ جمع کرنے کا حال ہے لیکن خرچ کا حال وہ بتائیں جو اپنے گھروں میں اپنے اہل و عیال کے پاس سوتے تھے اور ہماری طرح قید اور بالخصوص میری طرح خلافِ قاعدہ وقانون قیدِ تنہائی میں مبتلا نہ تھے۔''

کتنا روپیہ چھوڑا تھا:

''یہ سچ ہے کہ ہم نے خلافت کے خزانہ میں فقط تین لاکھ چھوڑے تھے اور ہمارے پیچھے 40 یا 45 لاکھ روپیہ ہماری والدہ اور میری اہلیہ اور ہم سے محبت رکھنے والے بھائی بہنوں نے جمع کیا تھا۔''

ذمہ دار کون ہے؟:

''لیکن اگر یہ بڑی اور محیر العقول رقم ہم نے جمع نہ کی تھی تو اس کی ایک پائی ہم نے خرچ بھی نہ کی۔ سیٹھ چھوٹانی نے جو کچھ کیا اُس کے جواب دہ پہلے وہ خود ہیں اور پھر وہ حضرات جو قید و بند سے آزاد رہے تھے نہ کہ ہم جنہیں خود اپنے ایک پیسہ پر بھی تصرف کی اجازت نہ تھی۔ اگر ہماری رہائی پر ہمیں خلافت کا خزانہ خالی ملا اور چھوٹانی سیٹھ کے سوا اُس کے تمام کارکنوں کی پوری دیانت داری اور سخت محنت و کوشش کے باوجود خلافت کی ساکھ بگڑی ہوئی ملی تو اس کی جواب دہی ہم پر نہیں ہے بلکہ سبکسارانِ ساحل پر۔''

یہ بصیرت افروز بیان اُن لوگوں کے لیے پوری تسلی کا باعث ہو سکتا ہے جو علی برادران اور بالخصوص محمد علی پر اس قسم کے مکروہ ناپاک اور رکیک الزامات لگاتے ہیں۔

لیکن رونا تو اِسی کا ہے کہ قوم کی قدر شناسی گھٹ گئی ہے اور شاید اسی تناسب سے قوتِ تنقید میں اضافہ ہو گیا ہے!

باب ۳۶

کتاب راجپال

راجپال کی وہ رُسوائے عالم کتاب جب شائع ہوئی جس میں سرکارِ دو عالم ﷺ پر نہایت رکیک اور ذلیل خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، اور حضور ﷺ کی حیاتِ قدسی پر نہایت ناپاک اور غلط الزامات لگائے تھے تو سارا اسلامی ہند آتش زیر پا ہو گیا اور جولائی 1927ء میں اتنا زیادہ ہنگامہ برپا ہوا کہ حدِ بیان سے خارج ہے۔ وہ کتاب بھی درحقیقت اِس ہنگامہ کی مستحق تھی کہ ساری اسلامی آبادی اُس کے مطالعہ کے بعد یا خلاصۂ کتاب معلوم ہونے کے بعد آرزوئے شہادت اور تمنائے جہاد سے لبریز ہو گئی۔

زعمائے اسلام کی حالت:

مسلمانوں کو سرورِ عالم ﷺ سے جو محبت و اُلفت ہے اُس سے مسلمان زعماء میں سے اکثر کے دل اگرچہ خالی ہوں لیکن جانتے سب ہیں۔ پھر مسلمانوں نے جس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا، جلسے کیے، جلوس نکالے، قانون شکنی کی، توہین عدالت کی، جسٹس دلیپ سنگھ کو مستعفی ہو جانے پر مجبور کیا اور گورنمنٹ کے تشدد کا جس طرح مقابلہ کیا وہ منظر بھی قائدین ملت سے پنہاں نہیں تھا۔

گرفتاریاں ہو رہی تھیں، سزایابیاں ہو رہی تھیں اور مسلمان پروانہ وار اپنی تئیں قید و بند کے لیے پیش کر رہے تھے مگر مسلمانوں کے یہ ''فقید الشرق'' اور ''زعیم ملت'' سب کے سب خاموش تھے۔

ان مسلمان لیڈروں میں جو کانگریسی کہے جاتے ہیں اور جو ''آل انڈیا'' سمجھے جاتے ہیں، ایک تنفس بھی ایسا نہیں تھا جس نے اس ناپاک کتاب کے مصنف سے بیزاری ہی کا اعلان کیا ہوتا۔ اس گندہ

کتاب کے متعلق اپنے تاثراتِ قلب ہی بیان کر دیئے ہوتے یا کم از کم مسلمانوں کے جوش و خروش کو صحیح راستہ پر لانے کی کوشش ہی کی ہوتی، مگر یہ کچھ نہیں ہوا۔ یہ حضرات اس طرح خاموش رہے گویا ہندوستان میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہوا ہی نہیں۔

ہندو زعماء کی کیفیت:

ہندوستان میں جو جماعت مہاسبھا کہلاتی ہے، اس کے متعلق کسی قسم کی اُمید ہی فضول تھی۔ ہاں جو طبقہ کانگریسی، وطن پرور اور غیر متعصب کہا جاتا ہے، اس کے متعلق یقیناً یہ اُمید تھی کہ وہ اس کتاب اور اس کے طابع و ناشر کے خلاف کم از کم ''ملامت'' ہی کا اظہار کر دے گا، مگر یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ مہاسبھائی عنصر نے تو دلیپ سنگھ کے فیصلہ رُہائی راجپال پر گھی کے چراغ جلائے اور کانگریسی عنصر جو تھا وہ بالکل خاموش ہو گیا، گویا گاندھی جی کی طرح اُس نے بھی ''مون برت'' رکھ چھوڑا ہے۔

گاندھی جی اور موتی لال کی خاموشی:

گاندھی جی نے ضرور اس کتاب کی اشاعت کے وقت اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا، لیکن مقدمہ اور فیصلہ رہائی راجپال کے بعد وہ بھی خاموش تھے۔ دوسرے زعماء جو تھے وہ بھی ایک حرف نہیں کہنا چاہتے تھے۔ سوئے اتفاق سے ایسوسی ایٹڈ پریس کا نمائندہ پنڈت موتی لال سے ملنے گیا اور اس کتاب کے متعلق اُس نے اُن سے ایک بیان لینا چاہا، اُنہوں نے فرمایا کہ اس مسئلہ پر ''میں بیان دینا نہیں چاہتا!''

یہ سکوت کس لیے تھا؟

حیرت ہوتی ہوگی کہ یہ سکوت کس لیے تھا؟ لیکن تھوڑے غور و فکر سے یہ حقیقت بھی عریاں ہو جاتی ہے۔ آزاد خیال حضرات اپنی ''رواداری'' کے خلاف سمجھتے تھے کہ اس کتاب کے خلاف اظہار رائے کریں، نیز اس سے اُن کی ہر دلعزیزی کا آبگینہ بھی چور چور ہو رہا تھا، غرض یہ اسباب تھے جنہوں نے مہر خاموشی لگا رکھی تھی۔

بعض زعماء اس لیے خاموش تھے کہ اُن کو یقین تھا کہ یہ ہنگامہ تو ختم ہو ہی جائے گا، زعمائے کانگریس بھی جب خاموش ہیں تو خواہ مخواہ ہندو مہا سبھا سے ٹکر لینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ اس لیے وہ اس اضطراب کا جواب خاموشی سے دے رہے تھے۔

محمد علی کی رہنمائی:

لیکن محمد علی جیسا بطل جلیل اس نازک موقع پر خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اپنی ملت اور اپنے مذہب کو وہ ''رواداری'' کے نذر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے نہ گانگریس والوں کی خوشنودی کا تمغہ لینا تھا نہ مہاسبھا والوں کی رضاجوئی اُس کا مقصودِ حیات تھی، اُس کا صرف ایک کام تھا اور وہ اپنے خالق اور اپنے معبود کی رضاجوئی تھی اور بس۔

اس لیے اِن مصالح میں سے کوئی مصلحت بھی اُس کی عنان گیر نہیں ہوئی، نہ اُس نے ان تعلقات کی زنجیروں کو اتنا گراں بار بنالیا تھا کہ وہ ٹوٹ نہ سکیں۔ اُس نے جب اس ہنگامہ کو دیکھا، نفس کتاب کے مضامین سے واقفیت حاصل کی تو اس عاشق رسول اور شیدائے اسلام کی رگِ حمیت جوش میں آئی اور وہ دیوانہ وار میدانِ عمل میں کود پڑا!!

نظریہ:

کانگریس اور مہاسبھا یہاں تک کہ خود اپنے رفقاء سے بے نیاز ہو کر جب وہ میدانِ عمل میں اترا تو کوئی اُس کی پیشوائی کے لیے موجود نہیں تھا، سب اُس کی مخالفت پر آمادہ تھے اس لیے کہ وہ ''جمہور'' کے نظریہ کا قائل نہیں تھا بلکہ مخالف تھا۔ ''پبلک'' کہتی تھی، دلیپ سنگھ مستعفی ہو جاؤ۔ ''پبلک کا قائد'' کہتا تھا قانون بدلواؤ، قصور قاضی کا نہیں ہے، قانون کا ہے۔

جو لوگ ''نفسیاتِ اجتماعیات'' سے واقف ہیں، وہ خوب سمجھتے ہیں کہ عقیدۂ عالم کی مخالفت کرنا اور وہ بھی علی الاعلان، کس قدر مصائب اور شدائد کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ محمد علی اس حقیقت سے نا آشنا نہیں تھے، وہ اس مخالفت اور اس کے نتائج سے پورے طور سے باخبر تھے اور مقابلے کے لیے تیار۔

پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصص میں ''توہین عدالت'' کے الزام میں گرفتاریاں شروع ہو چکی تھیں اور سارے ہندوستان میں جوش وخروش کی ایک لہر دوڑ گئی تھی، اس حالت میں عقیدۂ عالم کی مخالفت کرنا محمد علی ہی کا کام تھا۔

اثرات:

جس وقت لوگوں نے یہ معلوم کیا کہ محمد علی اس نازک موقع پر اپنی رہنمائی سے قوم کی ہدایت کریں گے تو سب خوش ہوئے تھے، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ رہنمائی تو کریں گے لیکن جمہور کے نظریہ سے اتفاق نہیں کریں گے تو سب کے دل رنج وافسوس سے لبریز ہو گئے۔ اہل پنجاب نے اُن کی مخالفت میں حصہ لیا اور محمد علی کو اُن کے عقائد سے پھیر دینا چاہا۔ لیکن وہ ایک کوہِ استقامت تھا، جمہور سے وہ رہنمائی کا متمنی نہیں تھا نہ جمہور کی حمایت کے بل پر اس کی قیادت قائم تھی، بلکہ وہ زعیم تھا اور یہ اس کا کام تھا کہ لوگوں کے خیالات کا رُخ بدل دے۔

ایک دلچسپ خط:

اُسی زمانہ میں محمد علی کے ایک دیرینہ دوست، قوم کے مخلص خدمت گزار اور انبالہ کے مشہور شاعر اور وکیل نے محمد علی کو ایک نہایت تند وتیز خط لکھا جس میں محمد علی کی روش سے اپنی سخت بیزاری کا اظہار کیا۔ اُس مکتوب کا ایک حصہ یہ ہے:

> ''خدا کے واسطے اب مقدمۂ راجپال کی بحث کو اور ہر ایسے مضمون کو جو اس بحث سے لفظاً یا معناً، ظاہراً یا باطناً، صراحتہً یا اشارۃً یا کنایتہً، بالواسطہ یا بلاواسطہ، کوئی تعلق قریب یا بعید، حقیقی یا فرضی، واقعی یا وہمی، اصل یا مصنوعی رکھتا ہو، بند اور قطعاً بند کر دیجیے۔ آپ کے تمام راسخ العقیدت نیاز مند پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے تھک گئے کہ مسٹر دلیپ سنگھ نے بد دیانتی نہیں کی۔''

جوابِ لاجواب:

محمد علی نے اپنے ان عزیز دوست کو جو اس وقت جذبۂ اسلام سے بے تاب ہو کر اس قدر برہم تھے، ایک نہایت دلچسپ جواب دیا اور اپنی پوزیشن صاف کی۔ جواب کے اہم اجزا یہ ہیں:

''آپ سر محمد شفیع کا واسطہ دیتے... کا واسطہ دیتے، ''رواہ البخاری'' کا واسطہ دیتے، ڈاکٹر سر علامہ... کا واسطہ دیتے، تو میں ہر ایسے مضمون کو جو توہین رسول اکرم ﷺ کے انسداد کی تدابیر سے لفظاً یا معناً، ظاہراً یا باطناً، صراحتاً یا اشارتاً یا کنایتاً، بلاواسطہ یا بالواسطہ، قریبی یا بعیدی، حقیقی یا فرضی، واقعی یا وہمی، اصل یا مصنوعی، پنجابی یا دیسی، تعاونی یا عدم تعاونی، ہندومہاسبھائی یا مسلم لیگی، شدھوی یا تبلیغی، سنگٹھنی یا تنظیمی، سوراجی یا جوابی تعاونی، منفیانہ یا مثبتانہ، ایشائی یا یورپی، مشرقی یا مغربی، حامی یا سامی غرض کسی قسم نوع، بھانت، وضع، طریقہ، انداز کا تعلق رکھتا... اس کو ''بند اور قطعاً بند'' کر دیتا۔

پنجاب کے لیڈر، غریب پنجابی مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں اور آپ خدا کا واسطہ دیتے ہیں کہ ''ان کو گمراہ کرنے دو۔''

یہ خط تو خیر ایک مخلص دوست کی طرف سے تھا لیکن اس کے علاوہ اور نہایت غیر مہذب خطوط جو گالیوں سے لبریز تھے، وہ آئے اور انہیں ''رجوع'' کرنے پر مجبور کیا گیا۔ مگر کسی مخالفت، کسی ہنگامہ، کسی دِل آزار حرکت سے محمد علی کو جنبش نہیں ہوئی!

سرگرمیاں:

محمد علی کا نظریہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ جسٹس دلیپ سنگھ کو بے قصور سمجھتے تھے، البتہ تعزیراتِ ہند کو قصور وار سمجھتے تھے کہ اس میں ایک صاف، واضح اور غیر مشتبہ دفعہ انسداد و توہین انبیاء و بزرگان دین کے لیے کیوں نہیں جب کہ توہین عدالت اور توہین ملکِ معظم کے لیے ہر طرح کی قانونی آسانیاں موجود ہیں؟ اسی مقصد کی خاطر اُنہوں نے سارے ہندوستان کا بالعموم اور پنجاب کا بالخصوص دورہ کیا، اور اپنا نقطۂ نظر سمجھا سمجھا کر لوگوں کو راہِ راست پر لائے اور اُن کے مساعی کو ایک سیدھے راستہ پر ڈال دیا۔

لکھنؤ کا ایک جلسہ:

جولائی 1927ء کے زمانۂ شورش میں بہ مقام لکھنؤ ایک نہایت عظیم الشان جلسہ ہوا، مسلمانوں کی اتنی زبردست تعداد رفاہِ عام کے میدان میں مشکل ہی سے کبھی نظر آئی ہوگی۔

محمد علی کو خاص طور سے اس جلسہ کی صدارت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ جلسہ میں مہاراجہ محمود آباد، ٹھاکر نواب علی اور دوسرے تعلق دارانِ اودھ، وکلاء، بیرسٹر، معززین "غرض ہر طبقہ، ہر نوع، ہر بھانت" کے لوگ موجود تھے۔ محمد علی نے اپنی صدارتی تقریر کی جس کا حاضرین پر بہت اچھا اثر ہوا، مغرب کی نماز کے بعد پھر نشست ہوئی اور اب دوسرے مقررین کو تقریر کا موقع ملا اور تجویز کی تائید ہونے لگی۔

مولانا ظفر الملک کی تقریر:

اتنے میں حاضرین میں سے بعض حضرات کے پیہم اصرار سے مولانا ظفر الملک نے ایک نہایت پر جوش تقریر کی، اتنی ولولہ انگیز کہ اس وقت تک جلسہ میں ایسی کوئی تقریر نہیں ہوئی تھی۔ محمد علی اپنی صدارتی تقریر میں غیر ضروری جوش ٹھنڈا کر کے لوگوں کو ہموار کر چکے تھے کہ مولانا کی اس تقریر نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ اللہ اکبر کے فلک فرسا نعرے اور بے تاب ہو ہو کر بار بار مجمع میں تلاطم، کسی خطرناک جوش کا اظہار کر رہا تھا۔

محمد علی کا تدبر:

لیکن یہ محمد علی کا تدبر تھا کہ اُنہوں نے آدمیوں کے اِس سمندر کے اتنے بڑے طوفان کو اپنے قابو میں رکھا اور پھر ایک نہایت پر جوش تقریر کی اور اس سلسلہ میں اپنی جان تک قربان کر دینے کا عہد کیا۔ تب جا کے مجمع ذرا ٹھنڈا ہوا اور مولانا ظفر الملک نے بھی اعلان فرما دیا کہ وہ محمد علی کی اس تقریر کے بعد اب پورے طور سے مطمئن ہیں۔

یہاں سے واپس جا کر محمد علی نے اپنی پوری قوت ایک قانون کے بنانے اور اسے پاس کرانے میں صرف کر دی، اچھا ہوا اگر وہ قانون بھی ایک دفعہ نظر سے گزر جائے جو محمد علی نے خود تیار کیا تھا اور اسمبلی

میں پیش کرایا، حالانکہ وہ نہ وکیل تھے نہ بیرسٹر اور پنجاب کے ایک بیرسٹر کے قول کے مطابق ''محض عطائی''۔ بہر حال قانون یہ ہے:

قانون:

مسودہ دفعہ 7و2 (الف) تعزیراتِ ہند جو فوراً نافذ ہونا چاہیے۔

''جو کوئی شخص کسی کا دِل دُکھانے یا کسی شخص کے مذہب کی توہین کرنے کی نیت سے یا اس امر کے احتمال کے علم سے کہ اس کے ذریعہ سے کسی شخص کا دِل دُکھے گا یا کسی شخص کے مذہب کی توہین ہوگی، ایسی باتوں کے ذریعہ سے جو تلفظ سے ادا کی جائیں، یا لکھی جائیں، یا اشاروں کے ذریعہ سے یا نقوش مرتبہ کے ذریعہ سے یا اور طرح سے۔ کسی نبی، یا ولی یا اور شخص کی جسے لوگوں کا کوئی فرقہ اسی طرح مقدس سمجھتا ہو، توہین کرے یا اس کی نسبت ایسا اتہام لگائے یا مشتہر کرے، جس سے اور لوگوں میں اس کا ملکات کی خفت ہو تو اس کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد تین برس تک ہو سکتی ہے یا جرمانہ کی سزا یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔''

تشریح:

''ایسے شخص کی سیرۃ اور ملکات کی سنجیدہ تنقید اور وہ نکتہ چینیاں جن سے اس کی آراء یا افعال کی ناپسندیدگی کا اظہار ہو۔ اگر وہ شخص ایسی تنقید یا نکتہ چینیاں کرے یا انہیں مشتہر کرے، ثابت کرے کہ اس نے یہ کام بغیر اس نیت یا علم کے کیا تھا جس کا بیان اس دفعہ میں کیا گیا ہے بلکہ نیت نیتی سے کیا ہے اور اس ایمانداری کی نظر سے کہ تاریخی یا مذہبی حقیقت متیقن ہو سکے، حسبِ منشائے دفعہ ہذا جرم نہیں۔''

یہ ہے وہ قانون جسے محمد علی نے تعزیراتِ ہند کی ورق گردانی کے بعد تیار کیا تھا اور سَمال یہ کیا تھا کہ

مختلف دفعات سے الفاظ، فقرے، جملے لے کر اس قانون کو بالکل مکمل کر دیا۔ اگر اپنی طرف سے بنایا جاتا تو احتمال تھا کہ جدید ہونے کی وجہ سے غور و فکر اور اصلاح و تغیر میں ایک عرصہ دراز لگ جاتا، مگر انہوں نے تعزیراتِ ہند کے مختلف دفعات کو سامنے رکھ کر حسبِ منشا ایک قانون کا مسودّہ تیار کر لیا جس کی ہر طرف سے خوب داد ملی اور بے انتہا تعریف کی گئی۔

اسمبلی میں:

اسمبلی میں یہ قانون نواب سر ذوالفقار علی خاں نے پیش کیا اور شکر ہے کہ وہاں اس کے پورے طور سے تائید کی گئی اور تائید کرنے والے لوگوں میں ہندو بھی کافی تھے، مگر افسوس کہ یہ قانون بعینہ اس صورت میں پاس نہ ہو سکا اور اس میں جو ترمیمات کی گئیں، اُنہوں نے اس کے اثر کو کہیں محدود و کمزور کر دیا، پھر بھی کسی نہ کسی حد تک مؤثر ہی ہے۔

خصوصیتِ ممیّزہ:

اس ہنگامہ کے متعلق ضروری اور اہم مواد پیش کر دیا گیا، کچھ اس سے قبل دوسرے عنوانات کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔ اب غور کیا جا سکتا ہے کہ محمد علی نے اپنی قیادت کے جوہر کو کس طرح جلا دی، جس بات کو حق سمجھ لیا اُس کے لیے تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا۔

اس سلسلہ میں محمد علی کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انہوں نے نہایت اطمینان سے ان تمام باتوں کا مقابلہ کیا اور اپنے خیالات و عقائد کی تبلیغ جاری رکھی اور چونکہ وہ نیک نیتی خلوص اور للّٰہیت پر مبنی تھی، اس لیے آخر میں پوری کامیابی محمد علی ہی کو ہوئی اور شروع میں جو بڑھ بڑھ کے مخالفت کر رہے تھے، سب و شتم کر رہے تھے، دست و گریبان ہونے کے لیے تیار تھے وہی اب شریک کار تھے۔ دلیپ سنگھ کو مستعفی کرانے کے بجائے قانون کو بدلوانے کی فکر میں تھے۔

یہ ہوتی ہے اصل قیادت اور کمال رہنمائی جس کا سودا ہر سر میں ہوتا ہے، لیکن اہلیت بہت کم میں!

یہ اُس کی دَین ہے جسے پروردگار دے!

باب ۳۷

آل پارٹیز کانفرنس

''ملاپ کانفرنس'' کی سرگزشت بیان ہو چکی ہے کہ کس طرح ''سبکسارانِ ساحل'' نے قوم کی اس کشتی کو غرق ہوتے دیکھا مگر خاموش ہو رہے!

یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ محمد علی نے اپنی علالت، اپنی خانگی پریشانیوں اور ہندو مسلمانوں کے حوصلہ شکن طرزِ عمل کے باوجود پے در پے اس کی کوشش کی کہ کوئی صورت ایسی نکل آئے جس سے ہندو مسلمان دونوں متفق ہو جائیں اور اختلاف و افتراق سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہندوستان کی غلامی میں جو غیر محدود اضافہ ہو رہا ہے، اسے کم کیا جائے اور جلد سے جلد پھر کوس رحیل بجے اور یہ قافلہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف کوچ کر سکے۔

یہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس قسم کی کانفرنسیں برخاست کبھی نہیں ہوئیں بلکہ ''ملتوی'' ہوئیں اور مناسب موقعے اور وقت کا انتظار کیا گیا کہ جب حالات سازگار ہوں گے تو پھر یہ کوششیں کی جائیں گی اور کامیاب ہونے کی سعی کی جائے گی!

شملہ یونٹی کانفرنس جب ملتوی ہوئی تو اُس وقت ہندو مسلمان لیڈروں کی اور بالخصوص ہندو زعماء کی ذہنیت قطعاً صلح جویانہ نہیں تھی بلکہ مجادلانہ تھی، انہیں حضرات کی بدولت بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے ہوئے وہ کانفرنس مجبوراً ملتوی کی گئی۔

محمد علی کی تگاپوئے دمادم:

لیکن محمد علی کی کوششیں ختم نہیں ہوئیں اور وہ برابر ہندو مسلمان زعماء سے تقاضا کرتے رہے کہ جلد

سے جلد کوئی صورت ایسی نکلنی چاہیے کہ جس پر اتفاق ہو سکے، ورنہ دفتری اقتدار بڑھتا جائے گا اور ہندوستانیوں کی قوتِ عمل اور جذبۂ آزادی میں انحطاط ہوتا جائے گا۔

آل پارٹیز کانفرنس:

1927ء میں آل پارٹیز کانفرنس کے نام سے پھر کوششیں شروع ہوئیں اور تمام قابل ذکر انجمنوں کے نمائندوں کو دعوت شرکت دی گئی، اور چاہا گیا کہ مختلف فیہ مسائل پر کوئی ایسا ''درمیانی'' راستہ نکالا جائے جس کے بعد پھر کسی کو یارائے اختلاف نہ رہے اور یہ سب صلح و محبت کی اسپرٹ میں ہونا چاہیے، اصولی اور آئینی طور سے نہیں۔ یہ سمجھ کر بیٹھنا چاہیے کہ ہم اپنے گھر کے چند اہم مسائل پر غور و فکر کے لیے مجتمع ہوئے ہیں اور اُس وقت تک نہیں اُٹھیں گے جب تک اس قضیہ نامرضیہ کا تصفیہ نہ کر لیں۔

پہلے اجلاس:

ابتدائی جلسوں میں تو ہندو مسلم زعماء کی کافی تعداد شریک ہوئی اور جب تفریح و تبادلہ آب و ہوا اور تنقیہ دماغ کا مقصد پورا ہو گیا تو اب پھر گھر جانے کی کوشش شروع ہوئی کوئی روٹھ کر واپس گیا، کوئی اپنی انجمن کی رائے حاصل کر کے آنے کا وعدہ کر گیا، کسی نے شرکت سے ''معذوری'' ظاہر کی، کوئی اپنی انجمن کی ''ہدایات'' سے مجبور نظر آیا اور کسی کے گھر سے کسی کی علالت کا تار آ گیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ تمام ہندو جماعتوں کے نمائندے رخصت ہو گئے، مسلمان جماعتوں میں سے بھی مسلم لیگ کا روّیہ اسی قسم کا رہا۔ اُنہوں نے بھی غصہ کا جواب غصہ سے دیا، تعصب کا جواب تعصب سے دیا۔ بہر حال پوری ''جوابی کارروائی'' جاری رکھی، لیکن ایک خلافت کمیٹی اور ایک محمد علی یہ دو چیزیں ایسی تھیں جو آل پارٹیز کانفرنس میں جمی رہیں اور جنہوں نے اپنے اشتراکِ عمل اور خلوصِ نیت کا پورا پورا ثبوت دیا۔

محمد علی پر حملہ:

آل پارٹیز کانفرنس کے اکثر جلسے دہلی میں ڈاکٹر انصاری صاحب کے دولت کدہ پر منعقد ہوتے تھے، وہاں ایک بار کانگرس کے ایک ممبر نے چوٹ کی کہ بعض ایسے کانگرس کے ممبر بھی ہیں جو یہاں تو ہندو

مسلم اتحاد کا نعرہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو جائے، کوئی ایسا دستور وضع ہو جائے جس میں سب لوگ متفق ہو سکیں اور پھر جب وہ جامع مسجد یا مندر میں جاتے ہیں تو وہی سب سے زیادہ ہندو مسلم اتحاد کے خلاف کوششیں کرتے ہیں اور اپنی جماعت کو دوسری جماعت کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ حملہ محمد علی ہی پر تھا، کانگرس کے اکثر ممبر مندر کی طرف رخ نہیں کرتے، کوئی مسلمان لیڈر شاید ہی کبھی جامع مسجد میں جاتا ہو تو جاتا ہو۔ ایک محمد علی تھے جو داعی صلح وامن بھی تھے اور اپنے مذہب کے پرستار بھی، وہی وہاں تقریریں بھی کرتے تھے اور یہاں صلح کی کوششیں بھی۔

محمد علی کا جواب:

محمد علی کو یہ حملہ ناگوار ہوا اور اُنہوں نے وہیں جلسہ میں اُن صاحب کو ایک ڈانٹ بتائی اور اس پر بھی ایک مختصر سا اشارہ کیا کہ صلح وامن کی کوششوں کا حقیقتاً کون دشمن ہے اور کس کی طرف سے ''التوا'' کی تحریک موقع بے موقع ہوا کرتی ہے؟

طرزِ عمل:

بہر حال اس قسم کے دِل شکن اور حوصلہ فرسا واقعات کے بعد بھی محمد علی کی روش میں کوئی تغیر نہیں ہوا، وہ برابر آل پارٹیز کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرتے رہے، اپنی ان مساعی سے انہیں اس درجہ شغف تھا کہ سخت علالت اور مرض کی حالت میں بھی طبی مشیر کے مشورہ کے خلاف وہ جلسوں میں شریک ہوئے ہیں اور ان پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کی۔

گاندھی جی:

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گاندھی جی اب تک اپنے آشرم میں معتکف ہیں اور انہوں نے سوا یونٹی کانفرنس دہلی کے، نہ شملہ میں اور نہ پھر دہلی کی آل پارٹیز کانفرنسوں میں باوجود پیہم اور مسلسل التجاؤں کے شرکت کی۔ اُس وقت اُن پر یاس وقنوط کے جذبات طاری تھے اور وہ اس قسم کی کوششوں کو لاحاصل اور بے نتیجہ خیال فرماتے تھے۔

لیکن چند شوریدہ سر مسلمان تھے جنہیں نہ اعتکاف میں لطف آتا تھا نہ مایوسی سے اپنے دل کو تسکین دے سکتے تھے، اُن کے دل آرزوؤں اور تمناؤں سے لبریز تھے اور اُن کی کوششیں فلاحِ قوم کے لیے صرف ہو رہی تھیں۔

پھر التواء:

لیکن محمد علی کی اس اَن تھک کوشش کے باوجود اور خلافت کے اس قابل داد اشتراکِ عمل کے باوجود یہ آل پارٹیز کانفرنس پھر ملتوی ہوئی اور طے پایا کہ چونکہ "یہ وقت مناسب اور موزوں نہیں ہے، اس لیے ایک بار پھر التواء۔"

یہ بھی طے ہوا کہ مئی 1928ء کی (غالباً) آخری تاریخوں میں یہ پھر بمبئی میں منعقد کی جائے اور وہاں کوئی فرقہ وارانہ حل تلاش کیا جائے، اس لیے کہ دہلی اور شملہ میں تو چراغِ رُخِ زیبا لے کر لاکھ لاکھ اس عروسِ تمنا کی جستجو کی گئی، مگر ایسا حسن اتفاق کبھی بھی پیش نہیں آیا کہ مقصد میں کامیابی ہوئی ہوتی۔ فیا للہ سف.

اس التواء کے حالات دوسرے موقعہ پر آئیں گے!

باب ۳۸

چودہ نکات

جب محمد علی کوشش کرتے کرتے تھک گئے مگر مفاہمت اور سمجھوتہ کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو مجبوراً اُنہوں نے یہ چاہا کہ ہم مسلمان چند باتوں پر متفق ہو جائیں اور اِس کے بعد اُنہیں کانگریس سے منوانے کی کوشش کریں، کانگرس اگر منظور کرے تو پھر ہم مطمئن ہو کر اپنا کام جاری رکھ سکیں گے۔ اس لیے کہ اُن کا یہ عقیدہ تھا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اگر مسلمان اور کانگریس متفق ہو کر میدانِ عمل میں اتر آئیں اور کانگریس میں مہاسبھا سے بے نیاز ہو جائے، مسلمان تبلیغی جماعتوں کی پروانہ کریں تو بھی یقیناً ملک کا قابل اعتماد حصہ ہمارے ساتھ ہوگا اور گورنمنٹ بھی ہماری متفقہ آواز کا اثر قبول کرنے پر مجبور ہوگی۔

دہلی پر پوزل:

چنانچہ دہلی میں اسمبلی کے اجلاس سے فائدہ اٹھا کر محمد علی نے کوششیں صرف کرنی شروع کیں۔ خود شریک ہوئے، مسٹر جناح کو شریک کیا اور دوسرے بااثر حضرات کو دعوت دی اور ہفتوں کی مسلسل نشست کے بعد بالآخر چودہ نکات ایسے منظور ہوئے جن پر مسلمانوں کی رائے عامہ نے اتفاق کر لیا اور یہ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمان جو مخلوط انتخاب کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے، اس پر بھی راضی ہو گئے، گو چند شرائط کے ساتھ اور وہ سب شرائط ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ تھے کہ سب نے مل کر تجویز کی صورت اختیار کی تھی۔

خلاصہ:

یہ چودہ اصول کیا تھے، انہیں مختصرأیوں سمجھئے کہ اکثریت کو کسی جگہ اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے۔ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت حقیقی نہیں ہے بلکہ ''عددی'' ہے، اس لیے ان دونوں صوبوں میں ان کی نشستیں محفوظ رکھی جائیں، پنجاب و بنگال میں ان کی اکثریت کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ دوسرے صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، انہیں رعایتیں دی جائیں، جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے وہ ہندو اقلیت کو اسی طرح کی مراعات سے مستفید کریں گے۔ مرکزی لیجسلیچر میں ان کی 33 فیصدی نمائندگی ہو! اکثریت کو برقرار رکھنے کا مطالبہ اس لیے تھا کہ توازن قائم رہے۔

اس کے علاوہ صوبہ سرحد کو مساوی اصلاحات دئے جائیں اور صوبہ سندھ کو ایک مستقل اور جداگانہ صوبہ تسلیم کرلیا جائے، بلوچستان کو الگ صوبہ بنادیا جائے!

محمد علی کی کوششیں:

محمد علی نے دہلی تجاویز کو مقبول عام بنانے میں جدوجہد کی انتہا کردی۔

کانگریس کی تصدیق:

محمد علی نے اسے کانگریس سے منظور کرایا اور کانگرہس نے اسے منظور کرلیا، پھر کلکتہ کانگریس نے ان تجویزوں کو منظور کیا۔ اس کے بعد محمد علی نے ہندو مہاسبھا کے حضرات کو اس نقطہ نظر پر لانے کی اور اپنا ہم نوا کرنے کی کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس جدوجہد کی داستان انہیں کی زبان سے سنئے۔

محمد علی کا اظہارِ خیال:

ایک موقع پر وہ اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اگر برادرانِ ہنود اور حکومت اس پر راضی ہوں کہ پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور اس اکثریت پر ہندو اقلیت قانع اور مطمئن ہوکر رہنے کو آمادہ اور تیار ہو تو مسلمان بھی اس پر راضی ہیں کہ نو صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہو، اس

اکثریت کے انصاف اور رواداری پر مسلم اقلیت بھی قانع اور مطمئن ہو کر رہنے کو آمادہ اور تیار ہے۔

الحمدللہ کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اسے گزشتہ مئی میں قبول کر لیا جس میں ڈاکٹر مونجے اور مسٹر کیلکر بھی شریک تھے۔ بالآخر جیکر نے بہت کچھ گفت وشنید اور لفظی بحث کر کے دہلی کی تجویز کو قبول ہی کر لیا۔ ڈاکٹر مونجے نے فرمایا کہ میں ہندو مہا سبھا میں صوبہ سرحد کو اصلاحات دیئے جانے کے خلاف، رائے دیئے جانے کے خلاف رائے دے چکا ہوں۔ اس لیے صرف اس مد کے خلاف ہوں باقی ہر شے قبول ہے، سندھ کے بعض متعصب ہندو ''ہندستان ٹائمز'' کے سابق ایڈیٹر جے رام داس دولت رام کی سرکردگی میں کانگریس کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے تھے۔''

ہندوؤں کی مخالفت:

کانگریس کی تصدیق وتوثیق کے باوجود ہندو بڑی شدت سے ان اصول کی مخالفت کر رہے تھے۔ ان پر یہ بہت گراں تھا کہ سندھ ایک آزاد صوبہ قرار دیا جائے، سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات مل جائیں، پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور مرکزی لیجسلیچر میں مسلمانوں کی 33 فیصدی نمائندگی ہو۔

علی گڑھ کا ایک جلسہ:

علی گڑھ پروانشل کانگریس کے جلسہ کے حالات ایک دوسرے عنوان کے ماتحت گزر چکے ہیں اور اس کی کارگزاریاں اور مسلم آزاریاں اور ہندونوازیاں بھی آپ کے سامنے آ چکی ہیں۔

کانگریس کے جلسہ میں محمد علی یہ منظر دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ مسٹر شعیب قریشی اور ڈاکٹر انصاری بھی حد درجہ ملول وغمگین تھے کہ کانگریس کے جلسہ کی ذہنیت اس قدر خراب ہو رہی تھی کہ اس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے طے شدہ اور پاس شدہ چودہ اصول جو مسٹر جناح نے مرتب کیے تھے، منظور نہیں ہو سکتے

تھے اور طرح طرح کی مخالفت ہو رہی تھی۔

محمد علی کی تقریر:

بہت زیادہ اصرار و التجا کے بعد محمد علی اس جلسہ میں شریک ہوئے تھے، ورنہ اس دلدوز کیفیت کو دیکھ کر نہ شریک ہونے کا انہوں نے عہد مصمم کر لیا تھا۔

تقریر اُنہوں نے اُنہیں چودہ اصول پر کی اور ثابت کرنا چاہا کہ اس معاملہ میں تم لوگوں کی مخالفت ہندوستان اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی ہے، تمہاری رواداری عدیم النظیر ہونی چاہیے تھی نہ کہ تمہاری تنگ دلی کا چرچا ہو۔ بہر حال اُنہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا:

> ''حقیقتاً یہ مچلکے اور یہ ضمانتیں جو آج ہم ایک دوسرے کو دے رہے ہیں، وہ مچلکے اور ضمانتیں نہیں ہیں جو ہمارے اجنبی حکمراں ہم کو مجرم سمجھ کر ہم سے طلب کیا کرتے ہیں، بلکہ یہ وہی مچلکے اور ضمانتیں ہیں جن کی طرف ہر سچے مذہب کے اس سنہرے قاعدہ نے اشارہ کیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ وہی کرو جو تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں۔''

مالوی جی کی تائید:

پھر جب مدراس کانگرس میں ان اصولوں کی توثیق اور تصدیق ہوئی اور مالوی جی نے بھی تائید کے بعد ایک مؤثر اور دِل نشیں تقریر کی تو فورِ تاثر سے محمد علی نے مالوی جی کے قدم لے لیے اور کہہ دیا کہ تم اگر ایسے ہی ثابت ہوئے جیسا کہہ رہے ہو تو ہم تمہیں اقلیتوں کا امین بناتے ہیں۔

پھر بھی مخالفت:

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہندوؤں کی مخالفت میں کسی طرح کمی نہ ہوئی اور وہ برابر اختلاف کرتے رہے کہ مسلمانوں کو صوبہ سرحد میں مساوی حقوق نہ ملیں، سندھ کو آزاد صوبہ نہ بنایا جائے اور مرکزی مجلس قانون ساز میں انہیں 42 فیصدی نیابت نہ حاصل ہو۔

محمد علی نے ان مخالفتوں کا بھی مقابلہ کیا اور اپنی ساری قوت تقریر اور سارا زورِ قلم دلائل و براہین کے ساتھ صرف کر دیا کہ برادرانِ وطن بھی کسی طرح اس حقیقت کو سمجھ جائیں اور اختلاف ختم کر دیں مگر اُن کو اِس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

دلائل:

ایک مضمون میں اِسی موضوع پر اظہارِ خیالات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آج تک ہندوستان میں اکثریت کی حکومت نہیں ہوئی، نہ اشوکا کے وقت میں نہ بکرم جیت کے عہد میں، نہ محمود غزنوی کے زمانہ میں نہ غوری کے دور میں، نہ پرتھوی راج کی سلطنت اکثریت کی تھی نہ اکبر کی، نہ اورنگ زیب کی نہ سیواجی کی، نہ رنجیت سنگھ کی نہ آج لارڈ ارون کی ہے۔

آج پہلی بار وہ دستورِ اساسی بن رہا ہے جس پر نہ سرٹیفکیشن کا کسی کو اختیار ہوگا نہ ویٹو کا، بلکہ ہر فیصلہ اکثریت ہی کے مطابق ہوگا۔ پھر اس بدعتِ حسنہ کی ابتدا کے وقت اگر ایک جاتی جسے برطانوی ہند میں بھی 66 فیصدی اکثریت حاصل ہے اس دستور اساسی پر پوری پوری طرح مطمئن ہو، لیکن ایک اور ملت جو باوجود اس سے بھی حقیر تر اقلیت کے ہندوستان پر صدیوں تک حکومت کر چکی ہو اور 25 فیصدی کی اقلیت میں ہو اس پر پوری طرح مطمئن نہ ہو تو تعجب کی کون سی بات ہے؟''

ایک اور مضمون:

اس کے علاوہ ایک دوسرے موقع پر وہ فرماتے ہیں، گو یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں وہ پکے کانگریسی ہیں لیکن زبان سے کلمۂ حق بلا کسی مرعوبیت کے نکلتا ہی ہے، فرماتے ہیں:

''یقیناً ہندو جاتی سارے عالم میں اپنی تنگ نظری میں نمایاں ہے، دنیا بھر میں کسی ملت نے خود اس تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ خود اپنے ہی فرقوں کو اچھوت سمجھا

ہو کہ صدیوں سے سب ہنود نہ ایک دوسرے کو بیٹی دے سکتے ہیں نہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھا سکتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ سب ہنود ایک مندر تک میں یکجا نہیں ہو سکتے نہ سب جگہ سب کے لیے عام سڑکیں ہی کھلی ہوئی ہیں۔ جو جاتی اس درجہ خود غرضی کی شکار ہو، اس پر دوسری ملتیں کس طرح اعتماد کر سکتی ہیں؟ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب اس قدر فرقہ بندی کا سبب نہیں بنے جس قدر کہ ہنود کی فرقہ بندی خود اس کا سبب بنی۔"

مسلمانوں کا افہام تفہیم

یہ تو تھی ہندوؤں سے اُن کی معرکہ آرائی لیکن مسلمانوں سے بھی انہیں کم مقابلے نہیں کرنا پڑے، یہ اُنہیں کا دم تھا جس نے ہر ہر مقام پر جا کر ان تجویزوں کو منظور کرایا اور مسلمانوں کو راضی کیا کہ وہ ان تجاویز کی حمایت کریں۔

مسلم لیگ:

مسلم لیگ سے اگر چہ وہ اُس وقت بیزار تھے لیکن اِس مقصد کے حصول کے لیے وہ اس میں بھی شریک ہوئے اور ہنوایا، میرٹھ میں جب مسلم لیگ پراونشل کا جلسہ راجہ صاحب سلیم پور کی صدارت میں منعقد ہوا تو محمد علی اس میں پہنچے۔ اگر چہ وہ اس کے ممبر بھی نہیں تھے، مگر وہیں ممبر ہوئے اور اس کے بعد با قاعدہ اس کے مباحثوں میں حصہ لیا اور بالآخر وہاں سے بھی مہر تصدیق لگوا ہی لی اور کامیاب ہی واپس آئے!

ایک لمحۂ فکریہ:

محمد علی نے چودہ اصول کی تجویز میں، تائید میں، تحریک میں جو حصہ لیا وہ معلوم ہو چکا، یہ ظاہر ہو چکا کہ اُنہوں نے اپنی سحر کار شخصیت سے فائدہ اٹھا کر کس طرح مسلمانوں کو راضی کیا؟
بعض مسلمان اب تک جداگانہ انتخاب کو رحمت اور مخلوط انتخاب کو لعنت سمجھتے ہیں اور بہ دلائل سمجھتے

ہیں لیکن محمد علی اپنے نقطۂ نظر سے مخلوط انتخاب ہندوستان کے لیے باعث فلاح سمجھتے تھے، لیکن یہ اُنہیں کی جاذبِ توجہ شخصیت تھی جس نے اُن کو بالآخر مخلوط انتخاب کی ماننے پر راضی ہی کر دیا۔

مخالفت کا اثر:

ایک عرصہ دراز کے غور وفکر، تلاش وجستجو اور سعی وکوشش کے بعد اُنہیں ایک حل ایسا ملا تھا جس پر اُنہوں نے مسلمانوں کو متفق کر لیا تھا اور کانگریس سے بھی اُسے منظور کرالیا تھا اور یہ منظوری اُس کی مجلس عاملہ ہی میں نہیں ہوئی بلکہ مجلس عام میں ہوئی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں ہوئی اور پھر ہزاروں کی تعداد کے سالانہ جلسہ منعقد مدارس میں ہوئی۔

مسلمانوں نے بھی گو شروع میں مخالفت کی، مگر آخر میں وہ بھی ہموار ہو گئے اور انہیں ماننا ہی پڑا کہ ہمارے درد کی دوا یہی ہے۔ لیکن اسے اُنہوں نے نہایت شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اس توثیق و تصدیق کے بعد بھی نیت کا فتور کم نہیں ہوا تھا۔ مالوی جی، مسٹر جیکر، مسٹر کیلکر اور ڈاکٹر مونجے کی رضا مندی کے باوجود عام ہندوؤں نے ان سب کے اشارۂ چشم سے جس طرح مخالفت کی، وہ اظہر من الشمس ہے۔ جبل پور میں مہاسبھا کے اجلاس میں ڈاکٹر مونجے نے جو کچھ فرمایا تھا اس کی آواز بہت سے سلمانوں کے کانوں میں آج بھی گونج رہی ہوگی۔

اور پھر اس روش سے متاثر ہو کر، ڈر کر، مرعوب ہو کر قوم پرستی کا دم بھرنے والوں نے دفعتۃً وبغتۃً یکن نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنی روش میں تبدیلی کی۔ ہندو مہاسبھا کو ہاتھ میں لیا، اس کی تائید و نمایت حاصل کی اور مسلمانوں کو خود بلا کسی وجہ کے اپنے ہاتھ سے کھویا۔ ان کی ہاں میں ہاں ملائی ہوئی اور طے شدہ توں کو قبول کیا، پھر ''سیاست'' سے کام لے کر ٹھکرا دیا اور اس کی توقع رکھی کہ مسلمان ہاں میں ہاں ملائے ں جائیں گے۔

بہر حال اس سب کے باوجود محمد علی اپنی زندگی کے آخری لمحات تک چودہ اصولوں پر قائم رہے، ض حالات کی تفصیل نہرو رپورٹ کے ضمن میں ملاحظہ فرمائیے۔

باب ۳۹

سائمن کمیشن

ہندو مسلمان کے اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لیبر گورنمنٹ نے حسبِ اصول 1927ء میں ایک کمیشن کا تقرر کر دیا جس کے احاطۂ تحقیق میں یہ بات داخل تھی کہ وہ اس کی تفتیش کرے کہ گزشتہ اصلاحات سے اس وقت تک ہندوستان نے کتنی ترقی کر لی ہے تا کہ اسی کے مطابق جدید اصلاحات کا خاکہ تیار کیا جائے اور ہندوستان کو پھر مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق کا شیریں مگر ''خواب آور'' شربت پلا دیا جائے تا کہ پھر ایک عرصۂ دراز تک یہ مرغِ زرّیں بالِ اسیر دام رہے۔

سائمن کمیشن کی ہیئت ترکیبی:

کانگرس نے اس کمیشن سے اپنی پوری بے تعلقی کا اعلان کر دیا، لیکن لبرل حضرات ابھی تک تذبذب میں تھے۔ مگر گورنمنٹ کی مسلسل بے مہریوں نے اس تذبذب کو عرصہ تک نہ قائم رہنے دیا اور کمشین کی ہیئت ترکیبی اس قسم کی رکھی کہ اس میں ہندوستان کی معتدلین تک کو نہیں رکھا۔ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جناح جیسے اشخاص بھی انتخاب میں نہ آ سکے اور زبانِ حال سے کہہ دیا گیا کہ ہندوستان کی قسمت کے فیصلہ میں ہندوستانیوں کو کچھ دخل نہیں ہو سکتا۔

طوفانِ اختلاف:

جب علی الاعلان گورنمنٹ نے اپنا یہ روّیہ ظاہر کر دیا تو ہندوستان کے معتدلین بھی چیخ اُٹھے اور سب نے بالاتفاق کمیشن کے بائیکاٹ کی صدا بلند کی جن میں سر تیج بہادر اور مسٹر جناح پیش پیش تھے۔

لالہ لاجپت رائے بھی نہایت برہمی کے ساتھ مالوی جی کی معیت میں اس کی مخالفت کر رہے تھے، اس لیے کہ یورپ کی مسلسل سیر و سیاحت کے بعد اور مسٹر میکڈانلڈ اور اُن کی لیبر پارٹی نے نا اُمیدی کے بعد پھر لالہ جی بھی مخالفین کی صف میں نظر آنے لگے۔

مجالس قانون ساز میں:

یہ رنگ دیکھ کر گورنمنٹ کے خلاف ہندوستان کے ہر طبقہ نے اظہارِ خیال کرنا شروع کیا، سب سے پہلے لالہ لاجپت رائے نے اسمبلی میں سائمن کمیشن کے تقرر اور تعاون کے خلاف ایک زبردست تجویز پیش کی جو پنڈت موتی لال کی تائید اور ''ہاؤس'' کے دوسرے ''آنریبل ممبروں'' کی تائیدِ مزید کے بعد منظور ہوگئی، پھر ہندوستان کی ہر صوبہ کونسل میں یہی تجویز پیش ہوئی۔

متعدلین کے علاوہ تعلق داروں کا طبقہ بھی اس کمیشن کے تقرر سے ناخوش تھا، چنانچہ مہاراجہ صاحب محمود آباد اور راجہ صاحب کالا کانکر تعلق داروں کی جماعت سے اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

تالیف قلب:

یہ رنگ دیکھ کر گورنمنٹ نے تالیف قلب کے خیال سے ہندوستانیوں کو پھر ایک تھپکی دی اور اسمبلی کونسل آف اسٹیٹ اور ہر ہر صوبہ کی طرف سے ایک دوسرا ''سائمن کمیشن'' بنا دیا جس کے صدر سر سنکرن نائر تجویز ہوئے۔ اُمید تھی کہ اس ''فراخدلی'' سے لبرل حضرات پھر ''معتدل'' ہو جائیں گے اور اگر کانگریس کی نہیں تو کم از کم اُنہیں کی ہمدردی حاصل ہو جائے گی، مگر اس کا بھی کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا اور ہندوستان کے متعدلین کی طرف سے بھی اس کی اسی شدت سے مخالفت ہوتی رہی جس طرح کانگرس کی طرف سے۔ لیکن اُن کی مخالفت بھی ''متعدل'' تھی یعنی تقریر و تحریر تک محدود اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا تھا وہ اُن کے سنجیدہ طبائع کے خلاف تھا۔

مسلمانوں کی روش:

یہ تو تھی ہندوؤں کے عام طبقات کی حالت، لیکن مسلمانوں کی حالت اس کے برعکس تھی۔ وہ تقریباً

من حیث القوم کمیشن سے تعاون کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ جتنے خطاب یافتہ اور ارکانِ کونسل تھے وہ سب تو کمیشن کے حامی تھے ہی مگر وہ لوگ جن کی عمر گورنمنٹ کی مخالفت میں گزری تھی، وہ بھی ہندوؤں کی ذہنیت سے اتنے بد دِل ہو چکے تھے کہ کمیشن سے تعاون میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ مثلاً مولانا حسرت موہانی، مسٹر جناح اگرچہ بہت مخالف تھے، لیکن وہ بھی حیران تھے کہ اس وقت مسلمانوں کی رہنمائی کس طرح کی جائے اور کیوں کر اُن کے جذبہ تعاون کو ختم کیا جائے؟

محمد علی کی رائے:

محمد علی بھی سائمن کمیشن کے تقرر کے سخت مخالف تھے۔ وہ گورنمنٹ، مسٹر میکڈانلڈ اور اُن کی ساری پارٹی سے خوب واقف تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ اس کمیشن سے ہم مسلمانوں کو کیا مل جائے گا اور اگر تعاون نہ کیا گیا تو نقصان کیا ہوگا؟

بہر حال وہ پوری استقامت کے ساتھ میدانِ عمل میں آئے اور سائمن کمیشن کی مخالفت اُنہوں نے نہایت شدت کے ساتھ شروع کر دی۔ اِس سلسلہ میں پھر انہیں بڑے بڑے لوگوں سے ٹکر لینی پڑی، لیکن جس چیز کو وہ مسلمانوں کے لیے باعث ذلت سمجھ رہے تھے، اسے قبول کرنے کی حمایت کیسے کر سکتے تھے؟ اس لیے اس کی مخالفت میں اُنہوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

سر شفیع کا ''پیام'':

سر شفیع مرحوم کمیشن کے بڑے سخت حامی تھے اور انہوں نے تعاون کے تمام سامان مکمل کر لیے تھے۔ اُسی زمانہ میں مسلم لیگ کی صدارت کے لیے اُن کا انتخاب ہو چکا تھا۔ لیگ کی کونسل کے صدر مسٹر جناح تھے اور اجلاس کے صدر سر شفیع منتخب ہوئے، دونوں کے افکار و آرا میں سخت تضاد تھا۔ ایک کمیشن کا نہایت شدت کے ساتھ حامی تھا اور دوسرا اُسی انداز میں اس کی مخالفت کر رہا تھا۔ سر شفیع سے درخواست بھی کی گئی کہ وہ صدارت سے مستعفی ہو جائیں، لیکن اُنہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ باصدارت اور مسلمانوں کی ''رہنمائی'' پر پوری آمادگی ظاہر کی۔ مقام اجلاس کلکتہ طے ہوا تھا، لیکن شفیع پارٹی لاہور کے لیے مصر تھی۔

لیگ کے دو ٹکڑے:

بالآخر یہ کشمکش ختم نہیں ہوئی، مسٹر جناح نے حسبِ قرار داد کلکتہ ہی میں اجلاس منعقد کرانا چاہا اور سر شفیع نے حسبِ مرضی خود لاہور میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سر شفیع نے لاہور میں اپنا جلسہ کیا اور ''آل انڈیا مسلم لیگ'' نام رکھا اور خود صدارت کی۔ مسٹر جناح نے کلکتہ میں کیا اور سر محمد یعقوب نے اس کی صدارت کی۔

مسٹر جناح اُس وقت سخت پریشان ہو رہے تھے، اُنہیں سخت فکر تھی کہ اجلاس کامیاب کیسے ہوگا؟ موصوف کو عام مخالفت کا سخت اندیشہ تھا اور پھر اس جدید تفریق نے بھی اُن کو اور زیادہ پریشان و مضطر کر رکھا تھا، بہر حال اسی کشمکش میں اجلاس کی معینہ تاریخ آ گئی۔

محمد علی کی جدوجہد:

محمد علی، مسٹر جناح کے پورے طور سے حامی تھے اور کمیشن کو وہ زیادہ سے زیادہ ناکام بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مدراس کانگرس کا اجلاس نامکمل چھوڑ کر وہ کلکتہ روانہ ہوئے اور اگرچہ حکیم اجمل خاں مرحوم کے انتقال کی خبر نے اُنہیں دیوانہ بنا رکھا تھا مگر پھر بھی وہ سیدھے کلکتہ روانہ ہوئے۔ دوسرے یا تیسرے روز ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی ''کمک'' کے لیے پہنچ گئے۔

محمد علی نے اجلاس میں پہنچتے ہی اپنے اثرات سے کامیابی حاصل کرنا شروع کی، اُنہوں نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تجویز منظور کرائی اور پھر ''تجاویز دہلی'' کے سلسلہ میں وہ چیز جس سے مسلمان بہت بھڑک رہے تھے اور جس سے ابھی مسٹر جناح بھی مانوس نہیں ہوئے تھے، یعنی (بشرائط) مخلوط انتخاب کی حمایت۔

مسٹر جناح کی مخالفت

مسٹر جناح نے محمد علی کو بہت سمجھایا کہ وہ اس ''نازک'' موقع پر ایسی تجویز نہ پیش کریں جس سے اختلاف کا اندیشہ ہو۔ اس لیے کہ اس انتشار سے وہ حد درجہ پریشان تھے، مگر محمد علی نے اُنہیں بہت ڈھارس دی اور بتلایا کہ جو تجویز مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہے اور جسے ہم نے مسلمانوں

اور ہندوؤں کے خاص خاص طبقات میں اتنی جدوجہد کے بعد منظور کرایا ہے، اب مسلمانوں کے ایک جلسہ عام میں کیوں نہ پیش کریں؟ اگر کوئی مخالفت کرے گا تو دیکھا جائے گا، اچھا ہے مخالفت کرے تو سمجھ کر رائے دے گا۔

کامیابی:

آخر محمد علی نے مسٹر جناح کو بھی بہت زیادہ تذبذب اور تامل کے بعد راضی ہی کر لیا اور لیگ کے کھلے اجلاس میں اپنی تجویز بھی پیش کی، اپنے خیالات بھی نہایت بسط و تفصیل سے ظاہر کیے اور اس فضا میں جس میں ناکامی کے اندیشہ سے دوسروں کے اوسان خطا ہوئے جاتے تھے، محمد علی نے نہایت کامیابی سے اپنے خیالات کی پذیرائی کرائی اور وہاں سے کامیاب و کامراں یلغار کرتے ہوئے اپنے دار السلطنت دہلی میں داخل ہوئے اور یہاں پہنچ کر پھر تبلیغ و اشاعت میں منہمک ہو گئے اور اس وقت تک چین نہیں لیا جب تک اس مقصد میں پورے طور سے کامیابی نہیں حاصل ہو گئی۔

سر شفیع کو چیلنج:

اگرچہ پنجاب میں اتنے زعماء ہیں جتنے ہندوستان بھر میں مجموعی حیثیت سے ملیں گے اور ان بزرگوں میں سے ہر محترم شخصیت کا یہ خیال ہے کہ پنجاب میں اُس کا طوطی بول رہا ہے اور اس گروہِ عوام سے وہ جو چاہے کرا سکتا ہے، عوام اُن کے اشارہ کے منتظر ہیں۔ اِدھر گوشہ چشم التفات نے کچھ اشارہ کیا، اُدھر اُن کی ''پبلک'' نے فرشِ راہ ہو ہو کر اُن کا استقبال شروع کیا اور اُن کے ارشاداتِ عالیہ کی تعمیل۔

لیکن اِس ادعا کی جب تحلیل کیجیے تو حقیقت دوسری نظر آئے گی۔

ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ان زعماء کے مساعی جمیلہ کے باوجود سارے مسلم پریس کا اُن کے قبضہ اقتدار میں ہونے کے باوجود اور اُن کے مسلمہ اعترافِ قیادت کے باوجود کامیابی پنجاب میں ہمیشہ فریق مخالف ہی کے حصہ میں آئی۔ حیرت جس قدر بھی ہو واقعہ یہ ہے!

سائمن کمیشن کا تقریباً سارے ہندوستان نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ بائیکاٹ کیا لیکن

پنجاب کی آغوشِ تمنا اس کے لیے کھلی ہوئی تھی، وہاں کے ''وفاداروں'' نے بغیر سیاہ جھنڈیوں کے، بغیر کسی مظاہرے کے جو چاہا کیا۔ اخبارات کے صفحات ان ''ٹوڈیوں'' کی ہجو سے لبریز تھے لیکن وہ اپنی کوٹھیوں میں سائمن صاحب اور اُن کے رفقاء کو عین رمضان کے مہینہ میں دِن کے وقت ''ڈنر'' دے رہے تھے۔

سر شفیع کی مسلم لیگ سے سارے پنجاب کے مسلمانوں کو اختلاف تھا اور اسی خیال سے ان زعماء میں سے کلکتہ کے اجلاس میں کوئی نہیں شریک ہوا کہ لاہور کی خدمت مقدم ہے، یہاں رہ کر وہ سر شفیع کی لیگ کو ناکام بنانے کی پوری کوشش کریں گے اور اُن کو اُن مقاصدِ مشئومہ میں ہرگز کامیاب نہ ہونے دیں گے۔ سارا ہندوستان منتظر تھا کہ دیکھئے یہ حضرات وہاں کیا کرتے ہیں؟ مگر اخبار میں صرف یہ آیا کہ سر شفیع نے نہایت اطمینان سے لاہور میں اجلاس کیا، خود صدارت کی اور جو چاہا پاس کرایا جس میں سائمن کمیشن سے تعاون بھی تھا اور کوئی بھی اس ''کامیاب'' اجلاس کو ''ناکام'' نہ کر سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ بعض حضرات نے کچھ بولنا چاہا مگر بعد کو صدر کا ''استبداد'' اور اپنی ''اقلیت'' دیکھ کر وہ ''واک آؤٹ'' یعنی اعلانِ شکست کر کے چلے آئے۔

اِسی طرح ابن سعود کا سارا پنجاب حامی بتایا جاتا تھا لیکن جو گروہ اپنی ''صوفیت'' اور ''حنفیت'' کا بلند بانگ مدعی تھا، اُس نے حامیانِ ابن سعود پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور یہ کچھ نہ کر سکے، حالانکہ سب اُن کے ''ہم خیال'' تھے۔

اِن تمام مواقع پر ہمیشہ محمد علی سے استمداد کی گئی اور ٹیلیفون پر ایک خاص حلقہ کی جانب سے بار بار ''عمِ محترم'' کو بلایا گیا۔

پھر طلبی:

چنانچہ سائمن کمیشن کے زمانہ میں جب پھر پنجاب میں سر شفیع اور اُن کے ''ہم خیال حضرات'' دوسرے لیڈروں اور اُن کے ''ہم خیال'' حضرات پر غالب آئے اور اپنی من مانی کارروائی کرنے لگے تو محمد علی کو پھر طلب کیا گیا اور پھر اُن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کی تمنا کا اظہار کیا گیا۔ محمد علی نے یہ دعوت

قبول کی اور سر شفیع کو چیلنج دیا کہ جس طرح چاہو، تم سائمن کمیشن کے تعاون کی کوششیں کر کے دیکھ لو۔ میں بھی لاہور آتا ہوں، میں بھی تقریر کروں گا۔ اپنے خیالات و معتقدات پبلک کے سامنے پیش کروں گا۔ آپ بھی ایسا ہی کیجیے گا اور پھر فیصلہ پبلک پر چھوڑ دیجیے گا۔ غرض اُنہوں نے پنجاب کے اکثر مقامات کا دورہ کیا اور ہر جگہ کامیابی حاصل کی اور پھر وہاں جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

لکھنؤ میں جلسہ:

مہاراجہ صاحب محمود آباد نے لکھنؤ میں بھی محمد علی کو دعوت دی تھی کہ وہ تشریف لائیں اور وہاں سائمن کمیشن کی مخالفت میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

چنانچہ محمد علی گئے۔ گو وہاں کے مسلمان اُس زمانہ میں امین آباد کے قضیہ میلاد کے سبب ہندوؤں سے سخت بیزار تھے اور وہاں کا مقامی حلقہ جس کا خاصا اثر تھا، مسلمانوں کو بہت متاثر کر چکا تھا۔ مگر محمد علی گئے اور اُنہوں نے ''امر بالمعروف'' کا فرض وہاں بھی ادا کیا۔

مخالفت:

مسلمان چونکہ زخم خوردہ تھے اور وہاں کے ہندوؤں سے سخت شاکی، اس لیے محمد علی سے مطالبہ کیا گیا کہ ہم اُس وقت آپ کا ساتھ اِس معاملہ میں دیں گے جب آپ یہ قضیہ ہمارے موافق فیصل کرا دیجیے۔

جلسہ میں جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی سبھی تھے۔ جلسہ کو درہم برہم کرنے کی بعض مسلمانوں کی طرف سے پوری کوششیں کی گئیں، لیکن الحمدللہ کہ مخالفین کو کامیابی نہیں ہوئی اور محمد علی نے اس خوبی سے یہ مسئلہ سمجھایا کہ مقامی لوگوں کی حماقت کو پوری قوم اور ملک کے معاملہ میں حائل نہیں کر دینا چاہیے۔ پھر سارا مجمع محمد علی کے ساتھ تھا اور اس کے بعد دوسرے روز پھر اُنہوں نے امین آباد پارک میں ایک زبردست تقریر کی۔ وہ تقریر محمد علی کی تاریخی تقریروں میں شمار کی جاتی ہے، اُس میں اُنہوں نے ہندو مسلم تعلقات پر اظہارِ خیال کیا تھا اور دونوں کو اُن کے فرائض یاد دلائے تھے اور بتایا

تھا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا کر رہے ہو؟

پھر دوسرا جلسہ دوسرے روز منعقد ہوا۔ یہ لکھنؤ کے سکھوں نے سردار منگل سنگھ اور سردار کھڑک سنگھ کے اعزاز میں کیا تھا۔ محمد علی بھی اُس میں مدعو تھے اور یہاں بھی اُنہوں نے ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی!

مضامین:

مسلسل تقریروں کے علاوہ اِس مسئلہ پر اُنہوں نے مضامین کا بھی ایک مستقل سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس مسئلہ پر اتنی وضاحت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا تھا کہ بڑے بڑے مخالفین بھی دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

ایک مضمون:

چنانچہ ایک موقعہ پر وہ سائمن کمیشن پر اظہارِ خیالات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حقیقتاً برطانوی پارلیمنٹ کو نہ ازروئے اخلاق ہماری قسمت کے خلاف فیصلہ کرنے کا حق ہونا چاہیے نہ وہ صحیح فیصلہ کرنے کے قابل ہے، یہ جماعت ہندوستان کے متعلق محض جاہلوں کی ایک جماعت ہے، اِن تقریباً سات سو (ممبرانِ پارلیمنٹ) برطانویوں میں سے ستر بھی مشکل سے ایسے نکلیں گے جو ہندوستان کے متعلق کچھ بھی جانتے ہوں گے۔''

نتیجہ:

محمد علی کی مسلسل اور قابل رشک اور غیر فانی جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی بار جب سائمن کمیشن کے قدم ہندوستان میں آئے تو ہندو مسلمان دونوں نے نہایت ہم آہنگی سے بائیکاٹ کیا تھا جس کی یاد غالباً آج تک سائمن صاحب اور اُن کے حامیوں کے دِل سے محو نہ ہوئی ہوگی۔

حالانکہ مسلمانوں کے جذبات اُس وقت ہندوؤں کے سخت خلاف تھے اور وہ ایسی تجویز سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے جس سے ہندوؤں سے اشتراکِ عمل کا ذرا بھی پہلو نکلتا ہو۔ مگر وہ محمد علی کی ساحرانہ

شخصیت تھی جس نے ہنسا ہنسا کر، رُلا رُلا کر لوگوں کو ہموار کیا اور بتایا کہ یہ اختلافات کس قدر نقصان رساں ثابت ہوں گے۔ یہ وقت ایثار کا ہے، اِس وقت اگر ہم نے اپنے اتفاق واتحاد سے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا تو ہمیشہ ہمیشہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمارا نام زرّیں حروف سے لکھا جائے گا۔

اور پھر دوسری دفعہ جب سائمن کمیشن آیا تو ہندوستان میں نہرو رپورٹ تیار ہو چکی تھی۔ ہندو مسلمان میں پھر اختلافات شروع ہو گئے تھے اور جو دِل محمد علی نے جوڑے تھے، وہ پھر برادرانِ وطن کی مسلم آزار روش سے ٹوٹنے لگے تھے۔ جو تعلقات استوار ہو گئے تھے، وہ پھر شکستہ ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوبارہ آمد کے موقعہ پر سائمن کمیشن کا بائیکاٹ اُس شان کے ساتھ نہیں ہوا جس کے خود سائمن صاحب متوقع تھے!

❀❀❀

باب ۴۰

سفر یورپ

ملکی اور ملّی مشاغل نے محمد علی کی صحت پر بہت بڑا اثر ڈالا تھا۔ رفتہ رفتہ اُن کی صحت اُنہیں جواب دینے لگی۔ ڈاکٹروں کے پیہم مشوروں اور ہدایتوں کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو نہ آرام دے سکتے تھے اور نہ مشاغل ملکی وملّی سے بے فکر ہو کر بیٹھ سکتے تھے۔

کئی بار اُنہوں نے بھی نہایت خلوص کے ساتھ یہ چاہا کہ کچھ عرصہ کے لیے قوم سے ''رُخصت'' لے لیں اور ذرا یکسوئی کے ساتھ اپنے کچھ دِن آرام سے گزاریں تاکہ تازہ دم ہو کر ملک وقوم کی خدمت اور زیادہ ہمت وطاقت سے کر سکیں، لیکن یہ موقعہ اُنہیں کبھی نہیں حاصل ہوا۔ جب فراغِ طبع اور سکونِ خاطر حاصل کرنے کے لیے اُنہوں نے گوشۂ تنہائی اختیار کرنا چاہا، کوئی نہ کوئی ایسا حادثۂ ملّی واقع ہو گیا کہ اُن کا سارا سکون درہم برہم ہو گیا۔

کچھ اِن اسباب سے اور کچھ اِس لیے کہ ہندوستان میں اتنے مسلسل علاج کے باوجود ذیابیطس میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا تھا، بلکہ وہ بڑھتا ہی جاتا تھا اور یہ صورت حد درجہ تشویش ناک تھی۔ انہیں اپنی صحت کا احساس ہوا۔

اب ایک صورت تھی کہ بغرضِ علاج وتبادلۂ آب وہوا وہ یورپ جائیں، لیکن اِس کے لیے ضروری تھا کہ جیب میں دام ہوں۔ ناداری اور افلاس کا یہ عالم تھا کہ دہلی میں یہ قیام مشکل تھا نہ کہ یورپ کے مرغزاروں کی سیر وتفریح... یہ تو قطعاً ناممکن تھا۔

''مردے از غیب'':

محمد علی اِنہی ناخوشگوار حالات میں گھرے ہوئے تھے اور صبر و خاموشی سے اپنے یہ دن

شاد باید زیستن نا شاد باید زیستن

کہہ کر گزار رہے تھے کہ مسبب الاسباب نے ایک دوسری صورت پیدا کر دی، یعنی مہاراجہ صاحب اَلور نے خود ہی بغیر کسی تحریک کے، بغیر کسی سابقہ شناسائی کے، بغیر کسی خاص واقفیت کے محمد علی سے ایک ڈنر کے موقع پر عقیدت مندانہ طور سے نیاز حاصل کیا اور چند روز کے بعد وہ محمد علی کے سحر کار شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ محمد علی ہی محمد علی اُن کی نظروں میں رہ گئے۔ مہاراجہ نے محمد علی کی صحت کا یہ زوال و انحطاط دیکھا تو بہت پریشان ہوئے اور فوراً محمد علی کو مشورہ دیا کہ وہ تبادلۂ آب و ہوا اور علاج معالجہ کے لیے یورپ چلے جائیں، اور چونکہ اُن کی تنگدستی سے واقف تھے اس لیے تمام مصارفِ سفر و قیام اپنے ذمہ لیے۔

عزم روانگی:

اِس اصرار اور مخلصانہ اصرار کے بعد بھی محمد علی نے ابتداً انکار کیا اور محترم مدیر ''سچ'' کے بیان کے مطابق اُنہوں نے ڈاکٹر انصاری اور مولانا شوکت علی سے پہلے مشورہ کیا۔ جب اُن دونوں بزرگوں نے بھی اصرار کیا تو محمد علی راضی ہو گئے اور ضروری انتظامات کر کے یکم جون 1928ء کو رختِ سفر باندھ، چل کھڑے ہوئے۔

روانگی سے پیشتر وہ اجمیر شریف کے آستانہ پر حاضر ہوئے، پھر احمد آباد گاندھی جی سے ملنے گئے، پھر آبو پہاڑ پر مہاراجہ صاحب اَلور سے کچھ ضروری باتیں طے کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں سے بمبئی آئے، وہاں دو ایک روز رہ کر عازم یورپ ہوئے۔

پیرس:

پہلے وہ پیرس پہنچے، وہاں ضروری معلومات ڈاکٹروں اور طریقہ علاج کے متعلق حاصل کیے اور چونکہ ابھی تک علاج شروع نہیں کیا تھا، اس لیے خوب جی کھول کر بد پرہیزی بھی کی۔

آخر ایک ڈاکٹر پر رائے جمی۔ بعض دوستوں کے مشورہ کے مطابق اُس ڈاکٹر سے اُنہوں نے رجوع کیا۔ پہلے خیال تھا کہ علاج میں فاقے بہت زیادہ کرائے جائیں گے اور اِس کے علاوہ دوسری مشقیں اور ریاضتیں بھی کرائی جائیں گی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ اندازہ سے فاقے کم کرائے گئے، لیکن غذا میں یہ تغیر کیا گیا کہ پکی ہوئی غذا کی ممانعت کر دی گئی اور کچی غذا کی ہدایت کی گئی۔

بستر علالت:

یہاں کچھ روز واقعی محمد علی نے نہایت استقلال سے اپنی فطرت اور طبیعت کے خلافت بستر علالت پر گزارے۔ چند روز کے بعد اُن کی طبیعت سخت خراب ہوگئی تھی، ایک دنبالہ بھی نکل آیا تھا۔ ذیابیطس میں ذرا سے پھوڑے یا پھنسی کا نکل آنا بھی پیام ہلاکت ہوتا ہے، اس لیے کہ زخم پھر بھرتا نہیں ہے اور رفتہ رفتہ وہ زخم سارے بدن پر حاوی ہو جاتا ہے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں مرض اور مریض دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن محمد علی کو خدا نے بچالیا اور وہ صحت یاب ہو گئے۔

مایوسی:

لیکن اپنی اس علالت سے وہ بہت مایوس ہو گئے تھے، اس لیے اور کہ اُن کی طبیعت نے مطابقت بھی پیدا کر لی تھی۔ یعنی اِس عمر، اِسی مرض اور اسی حالت میں اُن کے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب کا انتقال ہوا تھا، اس لیے محمد علی سمجھے کہ میرا بھی اب وقت آخری ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے بیگم صاحبہ اور مولانا شوکت علی کو بلایا بھی کہ اگر وہ لوگ وہاں پہنچ جائیں تو آخری وقت دیدار تو ہو جائے گا، لیکن اپنی طلبی کے اسباب میں اپنی اتنی سخت اور نازک علالت کا ذکر نہیں کیا کہ مبادا یہ لوگ بہت زیادہ پریشان ہو جائیں اور اُن کی پریشانی محمد علی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

نمازِ جنازہ کا طریقہ:

وہ اپنی زیست سے اتنے مایوس ہو چکے تھے کہ مظفر صاحب اور دوسرے ہندوستانی عزیزوں کو جو وہاں پہنچ گئے تھے، اُنہوں نے نمازِ جنازہ بھی سکھلا دی کہ اِس کفرستان میں کون ہے جو ایک مومن کی

نمازِ جنازہ اُس کے مذہب کے اُصول کے مطابق ادا کرے گا۔ ان نو جوانوں کو نماز ہی مشکل سے آتی ہو گی نہ کہ نماز جنازہ، اس کا تو بہت کم اتفاق پڑتا ہے اس لیے یہ اکثر لوگوں کو نہیں آتی ہے۔

بہر حال اُنہوں نے اُن لوگوں کو نماز جنازہ پڑھنے کا طریقہ، غسل میت دینے کا طریقہ ادعیہ ماثورہ، دفن کرنے کا طریقہ، مٹی دینے کا طریقہ سب کچھ بتا دیا اور اطمینان سے مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

صحت:

لیکن خدا کو ابھی یہ منظور نہ تھا اس لیے کچھ عرصہ کے بعد وہ صحت یاب ہونے لگے۔ اُن کی شکایتیں بڑی حد تک رفع ہو گئیں، صرف چند شکایتیں باقی رہ گئی تھیں۔ اگر چند روز اور جم کے علاج کیا جاتا تو یقیناً اُن میں بھی غیر معمولی فائدہ محسوس ہوتا، مگر جس شخص نے دردِ قوم کے لیے اپنی صحت، اپنی عمر، اپنا وقت سب کچھ وقف کر رکھا ہو، وہ خود کیسے چین سے بستر (علالت ہی سہی) پر آرام کر سکتا ہے۔ اُس کو تو ہر وقت قوم کی فکر، اُس کا غم اور اُس کی تباہی و بربادی پر کڑھتے گزرتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے تئیں بالکل فراموش کر دیتا ہے، یہی محمد علی نے کیا۔

ہندوستان میں تلاطم:

مولانا کے اِسی سفر یورپ کے دوران میں ہندوستان میں نہرو رپورٹ شائع ہو چکی تھی اور جانبین میں سخت پیکار شروع ہو گئی تھی۔ محمد علی کو وہاں بستر علالت پر لیٹے لیٹے سب خبریں مل رہی تھیں۔ بعد کو مسٹر شعیب قریشی بھی وہاں ''ضروری کاغذات'' لے کر پہنچ گئے اور ہندوستان اور مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ اُن کے سامنے کھینچ کر اُن سے مداوا طلب کیا۔ اُن کے پاس بجز اس کے اور مداوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی صحت کی فکر نہ کریں، ڈاکٹروں کے مشورہ کے علی الرغم اُٹھیں اور ہندوستان پہنچ جائیں اور اپنی اُسی جدوجہد کا آغاز کر دیں جس پر تمسخر کرنا آسان ہے، عمل کرنا مشکل۔

انگلستان:

اپنے زمانہ علالت میں بھی وہ دو ایک بار انگلستان گئے۔ ایک بار مسٹر سکلات والہ نے وہاں جلسہ کے انتظامات کیے۔ اس میں محمد علی نے اپنی نقاہت اور علالت کے باوجود سائمن کمیشن پر ایک زبردست تقریر کی اور وہاں اس کی مخالفت میں جو لیگ قائم ہو رہی تھی، اُس میں اپنے افلاس کے باوجود چندہ دیا اور ہر طرح سے امداد واعانت پر آمادگی ظاہر کی۔

روانگی:

بالآخر محمد علی نے ابھی پورے طور سے صحت نہ حاصل کی تھی کہ وطن کی زار ونزار حالت نے اُنہیں اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ بہ عزم ہندوستان روانہ ہو گئے۔

ممالکِ اسلامی:

راستہ وہ اختیار کیا جس سے ممالکِ اسلامی پر بھی ایک ''نظرے خوش گزرے'' پڑ سکے، چنانچہ واپسی میں قسطنطنیہ، بیت المقدس، بغداد، عراق اور دوسرے قابل ذکر مقامات کی زیارت کرتے ہوئے وہ کراچی پہنچ گئے۔

❀❀❀

باب ۴۱

نہرو رپورٹ

آل پارٹیز کے بعد:

آل پارٹیز کے سلسلہ میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ کس طرح مسلسل اور پیہم اس کے اجلاس طلب کیے گئے اور کس طرح برادرانِ وطن کی ہٹ اور ضد سے وہ برابر ملتوی ہوتے رہے اور کام بگڑتا رہا۔

دہلی میں جب آل پارٹیز کانفرنس ملتوی ہوئی تھی تو طے پایا تھا کہ مئی کے آخری عشرہ میں بمبئی میں ایک بار پھر اسے مدعو کیا جائے، چنانچہ جنابِ صدر کی طرف سے تمام انجمنوں کے نمائندوں کو شرکت دعوت اور وقت و مقام کی اطلاع دے دی گئی۔

بمبئی جلسہ:

چنانچہ وقت مقررہ پر جلسہ منعقد کیا گیا، لیکن ہندوستان کی کسی انجمن نے اس میں اپنا نمایندہ نہیں بھیجا اور نہ اس کی کارروائی جاری رکھنے پر آمادگی ظاہر کی۔

مسلمانوں میں مسلم لیگ، مسلم فیڈریشن اور دوسری جماعتوں نے قطعاً اپنے نمایندہ بھیجنے سے انکار کر دیا۔ ان جماعتوں کے ممبروں نے شخصی طور سے شرکت کرنے پر بھی آمادگی نہیں ظاہر کی۔

اِسی طرح ہندوؤں میں ہندو مہا سبھا اور دوسری انجمنوں نے قطعاً انکار کر دیا کہ وہ اس میں کوئی عملی حصہ لینے سے قاصر ہیں۔ شخصی طور پر بھی مالوی جی، لاجپت رائے، ڈاکٹر مونجے، مسٹر جیکر کسی نے بھی نہ شرکت کی نہ شرکت پر آمادگی ظاہر کی۔

کانگریس کا وہ طبقہ جو حقیقتاً مہا سبھائی ظاہر ہو چکا تھا اور مسٹر جے رام داس دولت رام کی سرکردگی میں اپنے اختلافات کا اظہار برابر ایوانِ کانگریس میں کیا کرتا تھا، وہ بھی نہ شریک ہوا۔ کل شرکاء کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ قابل ذکر لوگوں میں گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا شوکت علی اور مسز اینی بیسنٹ! یہ تھی ''آل پارٹیز کانفرنس''، جس کا ''اجلاس'' ہو رہا تھا۔

گاندھی جی کی تجویز:

یہ صورت دیکھ کر گاندھی جی نے پھر تجویز ''التواء'' پیش کی کہ چونکہ حاضرین اور شرکاء اور مندوبین کی تعداد اتنی کم ہے، لہٰذا اسے پھر ملتوی کر دیا جائے۔ بعض لوگوں نے بددِل ہو کر برخاست کر دینے کی رائے پیش کی مگر اسے اِس لیے نہیں مانا گیا کہ اس سے ملک میں مایوسی پیدا ہو جائے گی۔ گاندھی جی نے کہا کہ آل پارٹیز کانفرنس تو ملتوی کر دی جائے اور ایک کمیٹی بنا دی جائے جو لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب تیار کرے، یعنی ایک دستورِ اساسی وضع کرے جس پر سارے طبقے متحد و متفق ہو سکیں اور جب وہ اپنی رپورٹ تیار کر لے تو پھر آل پارٹیز کانفرنس کا ملتوی شدہ اجلاس طلب کیا جائے۔

شوکت کی تائید:

شوکت صاحب موجود تھے، اُنہوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ اِس تجویز کی تائید کی اور اُمید ظاہر کی کہ یہ کمیٹی ہماری تمام مشکلات کو رفع کر دے گی۔ ہم برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب بھی تیار کر لیں گے اور ہمارے پاس خود ہمارا وضع کردہ دستورِ اساسی بھی موجود ہوگا جس میں ہم سب کے حقوق و مراعات کا تعین ہوگا، اور یہ حقوق حقوق کے جو نعرے لگ رہے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ جب سب کو مناسب اور معقول حقوق وہ دستورِ اساسی دے دے گا تو پھر اختلاف کے باقی رہنے کا امکان ہی نہیں ہے، اور اس طرح ہم پھر اپنے کام میں لگ سکیں گے۔

تشکیل:

چنانچہ ایک کمیٹی بنا دی گئی جس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو اور ارکان میں مسٹر شعیب قریشی،

مسٹر اینے، مسٹر جیکر، سبھاش چندر بوس، سردار نگل سنگھ شامل تھے۔ کمیٹی کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ حسب ضرورت اپنے ارکان کی تعداد میں اضافہ کرسکتی ہے۔

کمیٹی کے جلسے ''انند بھون'' میں منعقد ہوتے رہے اور ارکان کے اضافہ کی جو اسے رعایت دی گئی تھی، اُس نے اِس سے پورا فائدہ اٹھایا اور حسبِ ضرورت نہیں تو حسبِ مقصد کمیٹی کے ممبروں میں اضافہ ہوا اور بالآخر ایک ''رپورٹ'' تیار ہوگئی جس نے برکن ہیڈ کے چیلنج کا قابل یادگار جواب دیا!

آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ:

جب رپورٹ تیار ہوگئی تو جنابِ صدر کی خدمت میں پیش ہوئی اور جنابِ صدر نے لکھنؤ میں غالبًا 30-29-28 اگست 1928ء کو اجلاس طلب فرمایا۔

رپورٹ کا خلاصہ اخبارات میں اِس سے پیشتر شائع ہو چکا تھا اور مشاہیر ملک نے اِس پر اظہار رائے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ جب اجلاس شروع ہوا تو خلافِ توقع ہندوستان کی اکثر انجمنوں کے مندوبین موجود تھے جن میں ہندو مہاسبھا کے اقانیم ثلاثہ لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالوی اور ڈاکٹر مونجے بھی تھے۔

کانفرنس کا اجلاس:

کانفرنس کا اجلاس ڈاکٹر انصاری صدرِ کانگریس کی صدارت میں شروع ہوا۔ قیصر باغ کی بارہ دری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، تل رکھنے کو مشکل سے جگہ مل رہی تھی۔ پہلے اجلاس میں تو واضعین دستور کی محنت و کوشش، تلاش و جستجو کا بروقت شکریہ ادا کیا گیا تھا جن میں مولانا شوکت علی بھی شامل تھے۔ سوائے مولانا حسرت موہانی کے کسی نے مخالفت نہیں کی، سو حسرت غریب کی مخالفت ہنسی مذاق میں اُڑا دی گئی۔ اِس کے بعد کانفرنس میں نہرو رپورٹ منظور کی غرض سے پیش ہوئی۔

یہ وقت وہ تھا کہ ہر کارگزار اور کارکن جماعت کو یا مندوب کو موقع ہونا چاہیے تھا اور نہایت فراخدلی سے سہولت بہم پہنچانی چاہیے تھی کہ اگر اختلاف کا اظہار ہو تو اسے اگر جواب کے ذریعہ دفع کیا جا سکتا ہو

تو ایسا کیا جائے اور اگر ترمیم و اصلاح کے ذریعہ سے ممکن ہو تو ایسا کیا جائے!

رپورٹ میں کیا تھا:

رپورٹ میں نکتہ چینی اور دوسرے حالات پر گفتگو ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے، محمد علی کے کارناموں کے سلسلہ میں اتنی تفصیل ناگزیر تھی۔ مخالفین کا خیال تھا کہ رپورٹ میں سب کچھ تھا! مگر کلکتہ بمبئی میں جو فیصلے کانگرس نے کیے تھے، وہ نہیں تھے۔ مسلمانوں نے چودہ نکات جو پیش کیے تھے، اُن میں سے اکثر رد کر دیئے گئے تھے۔ خلافت کانفرنس اور مسلمانوں کے متفقہ و متحدہ مطالبات نامنظور ہو گئے تھے۔ سندھ کی آزادی مشروط کر دی گئی تھی، مسلمانوں کی نشستیں محفوظ نہیں رکھی گئی تھیں۔ بقول سوامی شنکر آچاریہ کے صوبوں کو وہ آزادی بھی نہیں دی گئی تھی جو اَب حاصل ہے اور مرکز کو تمام اختیارات عطا فرما دیئے گئے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ''آزادئ کامل'' کے بجائے ''ڈومینین اسٹیٹس'' کا مطالبہ ''درمیانی راستہ کے طور پر'' منظور کیا گیا تھا۔

یہ چیزیں جو اَب منظور کی گئی تھیں اور مسلمانوں کی متعدد جماعتوں کے علیٰ الزعم منظور کی گئی تھیں، خواہ کتنی ہی مبارک و مستحسن ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ کانگریس اور مسلمانوں کے گزشتہ فیصلوں کے قطعاً مخالف تھیں! اس لیے دیانتاً محمد علی اور اُن کے رفقاء کو پورا حق پہنچتا تھا کہ وہ اُس کی مخالفت کریں اور اُنہیں مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اُس محضر پر دستخط کریں جسے وہ اپنی قوم کے لیے ''محضرِ قتل'' سمجھ رہے تھے۔

علی برادران کا اختلاف:

چنانچہ آل پارٹیز کانفرنس میں شوکت صاحب نے خلافت اور کانگریس کے گزشتہ فیصلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان تجاویز سے اختلاف شدید ظاہر کیا اور ان کے ماننے سے انکار کر دیا۔

دباؤ:

راقم الحروف کا یہ چشم دید واقعہ ہے کہ جس وقت شوکت صاحب نے مخالفت کا ارادہ کیا، اُس وقت مسٹر سین گپتا اور سبھاش چندر بوس نے انتہائی لجاجت اور سماجت سے شوکت صاحب کو اس سے باز رکھنا

چاہا، لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں مسلمانوں کو قتل ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ چنانچہ شوکت صاحب اسٹیج پر تشریف لائے اور اُنہوں نے ان تجاویز کے ماننے سے حسبِ فیصلہ جات ماسبق انکار کر دیا، پھر محمد علی جب یورپ سے اپنے علاج کو نامکمل چھوڑ کر ہندوستان واپس آئے تو اُنہوں نے بھی پوری شدت کے ساتھ نہرو رپورٹ اور اُس کی سفارشات سے اختلاف کیا اور اِس طرح ایک بار پھر ہندوستان معرکہ کارزار بن گیا، اور صلح وسلام کے خوش آیند خواب اپنی تعبیر بد کے ساتھ رونما ہوئے۔

طوفانِ افتراق:

آل پارٹیز کانفرنس کے برخاست ہو جانے کے بعد پھر ہندو مسلم زعماء میں سخت اختلاف رونما ہوا! بلا استثناء تمام ہندوؤں نے نہرو رپورٹ کی تائید کی، مہاسبھائیوں نے بھی اور کانگریس نے بھی۔ لالہ لاجپت رائے، پنڈت مالویہ، ڈاکٹر مونجے سب ہی حمایت کے جوش میں سرگرم کار نظر آ رہے تھے، مگر مسلمانوں میں ماشاء اللہ نااتفاقی کا مرض پھیلا ہوا تھا۔ اُن میں فوراً اُسی آل پارٹیز کے اندر دو ٹکڑے ہو گئے اور اختلافات کا بازار گرم ہو گیا۔ مزے لے لے کر ایک لیڈر دوسرے لیڈر کی ذات پر، نیت پر اور اخلاق وعادات پر حملے کر رہا تھا اور اسے شعارِ اسلامی اور معیارِ تہذیب سمجھ رہا تھا۔ اکبر نے شاید اِسی موقع کے لیے فرمایا تھا:

آپس میں گالیاں ہیں، غیروں میں تالیاں ہیں

چنانچہ ہم میں گالیوں کا تبادلہ ہوتا رہا اور اغیار تالیاں بجا بجا کر ہمارے اِس افتراق واختلاف کا تماشہ دیکھتے رہے۔

صفائی:

اِن اختلافات کے بعد نہرو رپورٹ کے ہندو حامی تو تقریباً سب خاموش ہو گئے، مگر اکثر مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود اس کے منظور ہو جانے سے مسلمانوں میں ایک زبردست اختلاف ہو گیا۔ اُن مسلمانوں نے جو نہرو رپورٹ کے واضعین میں تھے یا حامی تھے، اپنی زبان وقلم کو اس کی حمایت

کے لیے وقف کر دیا۔

نہرو رپورٹ کی حمایت میں ہمیشہ دلیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ وہ کوئی صحیفہ آسمانی نہیں ہے جس میں تغیر و تبدیل نہ ہو سکے، وہ انسانوں کا بنایا ہوا ایک دستورِ اساسی ہے جو نقائص و مصائب سے پاک نہیں ہو سکتا، اُس میں یقیناً غلطیاں ہوں گی، آپ کا یہ فرض ہے کہ ہمیں بتائیں اور ہم سے اُن غلطیوں کی تلافی کرائیں۔

اتحاد و اتفاق کی یہی صورت ہے کہ ایک دوسرے کی غلطیوں کو ظاہر کرے اور اصلاح چاہے۔

ترمیم کی صورت:

لیکن جب مخالف گروہ کہتا تھا کہ نہرو رپورٹ میں یہ نقائص و مصائب ہیں، اِن اِن دفعات کے باعث مسلمانوں کے حقوق کو نقصان پہنچا ہے اور اِن اِن اصولوں کے ذریعہ اُن کی اکثریت کو ہمیشہ کے لیے اقلیت میں تبدیل کر دینے کی کوشش کی گئی ہے، انہیں بدلوائے۔ تو رپورٹ کے حامی ان دعوؤں کو کسی طرح تسلیم نہیں کرتے تھے اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ رپورٹ میں ترمیم کی کوئی صورت نہ نکلتی تھی۔

نتائج:

بہرحال اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان زعماء اور ہندو زعماء میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا اور مسلمانوں مسلمانوں میں بھی ایک جنگ شروع ہو گئی۔

نہرو رپورٹ کی حمایت پر کانگریس تھی، لبرل حضرات تھے، ہندو مہا سبھا تھی، مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔ مخالفین میں مسلمانوں کی اکثر انجمنیں تھیں اور سکھ بھی اپنے فرقے کی اغراض کی بناء پر شدت سے مخالفت کر رہے تھے۔

مقابلہ:

اب جو شدید جنگ چھڑی وہ ملک کے لیے عموماً ہر فریق، ہر جماعت اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً نہایت مضر ثابت ہوئی۔ ہر لیڈر مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔ جتنے جلسے، جتنی تقریریں اور جتنے

مضامین کا اُس زمانے میں غلغلہ ہوا، کم کسی اور زمانے میں ایسا دیکھا گیا۔ اس معاملہ میں جو افسوس ناک اختلافات پیدا ہو گئے تھے، وہ آج تک نہیں مٹے۔

گاندھی جی کی حمایت:

اُس وقت تک گاندھی جی خاموش تھے، حتیٰ کہ وہ لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس تک میں شریک نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ وہ اپنی آواز کو بے اثر اور اپنے آپ کو معذور سمجھ رہے تھے۔ یہی وجہ تھی جو دہلی کی پہلی یونٹی کانفرنس کے بعد کسی ''ملاپ کانفرنس'' اور ''آل پارٹیز کانفرنس'' میں باوجود منت سماجت کے بھی نہیں شریک ہوئے۔ لیکن نہرو رپورٹ کے منظور ہونے کے بعد اُنہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور میدانِ عمل میں اس رپورٹ کے حامی کی حیثیت سے آ گئے۔

ہندوؤں کا سکوت:

اِس کا سب کو احساس تھا کہ مسلمان من حیث القوم نہرو رپورٹ کے ماننے کو تیار نہیں ہیں اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جس نے کانگریس میں شریک ہو کر اُسے بہت قوت پہنچائی اور جس نے اُس خلیج کو جو ہندو مسلمانوں میں عذر کے بعد سے چلی آ رہی تھی، کم کیا اور رفتہ رفتہ بالکل ختم کر دیا، علیحدہ ہو گیا ہے اور اُس کی علیحدگی کانگریس کے مقاصد کے لیے بھی کسی طرح سودمند نہیں۔

باوجود اِس احساس کے کوئی مؤثر تدبیر ایسی اختیار نہیں کی گئی کہ عام مسلمانوں کو جو بدظنی اور بے اعتمادی کانگریس کی طرف سے پیدا ہو گئی تھی، وہ دُور ہو جائے اور ہندو مہا سبھا نے تو قوم پرستی کی آڑ میں مسلمان لیڈروں کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔

محمد علی کا اختلاف:

اِن حالات کو دیکھ کر اگر محمد علی کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تو کوئی تعجب کی بات ہے؟ اُس نے بارہا صلح و امن کی خاطر بے قصور مسلمانوں کو ڈانٹا۔ فسادات کے موقع پر خواہ ان کی خطا ہو یا نہ ہو مسلمانوں کو اُس نے ملامت کی۔ نازک سے نازک مواقع پر جب کانگرس کا اثر ہندو مہا سبھا اور تبلیغ نے زائل کر دیا

تھا اور بڑے بڑے لیڈر گوشہ نشین ہو کر بیٹھ رہے تھے، اُس وقت اُس نے کانگریس سے وفاداری کی، اپنوں کی گالیاں کھائیں لیکن کانگریس سے بگاڑ نہیں کیا۔ تو کیا اس شخص کے ساتھ اخلاقاً کم از کم اگر کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا تو یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ محض دکھانے کے لیے جھوٹ موٹ، پالیسی کے طور پر دو ایک ہندو اُس کے ساتھ ہو جاتے، تو اُس غریب کا دِل تو نہ ٹوٹتا، لیکن ایسا کب ممکن تھا؟

واں وہ غرور عز و ناز، یاں یہ حجاب پاسِ وضع
راہ میں وہ ملے کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں؟

❀❀❀

باب ۴۲

کلکتہ کانگریس

آل پارٹیز کانفرنس کے برخاست ہونے کے بعد نہرو رپورٹ قبول کرانے کی پوری کوششیں کی گئیں، پھر کانگرس کے سالانہ جلسہ کا وقت آیا اور اس کے انتظامات شروع ہو گئے۔

کلکتہ کا انتخاب:

کانگریس کے سالانہ جلسے کے لیے کلکتہ منتخب کیا گیا اور صدارت کے لیے پنڈت موتی لال نہرو کا انتخاب ہوا، اور طے پایا کہ اس اجلاس میں آزادی یا بالفاظ دیگر ''ڈومینین اسٹیٹس'' کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا اور اگر اس معاملہ میں گورنمنٹ کی طرف سے فراخ حوصلگی کا اظہار نہ ہوا تو پھر ہم دوسری صورت پر غور کریں گے۔

خلافت کانفرنس:

دسمبر 1928ء ہی میں خلافت کانفرنس کے انعقاد کے انتظامات بھی کیے گئے، اُس کا مقام بھی کلکتہ قرار پایا۔ صدارت کے لیے مولانا محمد علی تمام صوبہ خلافت کمیٹیوں کے اتفاق سے منتخب ہوئے۔

مسلم لیگ:

مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی اُنہیں تاریخوں میں کلکتہ ہی میں قرار پایا اور سر مہاراجہ صاحب محمود آباد، مسٹر جناح کی پرخلوص مساعی کے سبب اس کے صدر قرار دیئے گئے۔

غرض ہندوستان کی تمام قابل ذکر انجمنوں کے سالانہ اجلاس وہیں ہوئے اور عجیب عجیب صورتیں

بن بن کر بگڑیں جن کی تفصیل آگے آتی ہے اور چونکہ حسن اتفاق سے ندوہ سے راقم الحروف بھی اس ''قومی میلہ'' کی سیر کو کلکتہ پہنچ گیا تھا، اس لیے اکثر واقعات چشم دیدی ہوں گے۔

کنونشن:

مسلمانوں کی پیہم چیخ پکار اور مسلسل جدوجہد کا یہ نتیجہ نکلا کہ صدر کانگریس نے اعلان کیا کہ وہ اسی زمانہ میں ایک ''نیشنل کنونشن'' کا اجلاس بھی وہاں منعقد فرمائیں گے تا کہ ایک بار پھر طے شدہ تجاویز پر غور کیا جا سکے اور نہرو رپورٹ پر ایک نظر ڈالی جا سکے اور اختلافات رفع کیے جا سکیں۔ کنونشن کے متعلق بڑی اُمیدیں تھیں کہ اس اجلاس میں یقیناً تمام شکایتوں کا ازالہ ہو جائے گا اور اتفاق کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

محمد علی کی شرکت:

محمد علی گو کانگریس میں نہیں شریک ہوئے مگر کنونشن میں شریک ہوئے تھے۔

کنونشن میں تمام انجمنوں کو نمائندہ منتخب کر کے بھیجنے کی اجازت دی گئی تھی، مگر خلافت کمیٹی اور جمعیت العلمائے ہند نے متفقہ طور سے اپنا نمائندہ صرف محمد علی کو بنایا اور وہ اس میں شریک ہونے کے لیے تشریف لائے۔

فضا:

اُس وقت کنونشن میں عجیب وغریب فضا تھی۔ محمد علی گو کانگریس کے بڑے مربیوں اور سرپرستوں میں تھے اور ابھی صرف چند روز سے اُنہیں اختلاف ہُوا تھا، مگر حضار مجلس کو یہ بھی ناپسند ہوا۔ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ دِل میں کیا ہے؟

مباحثہ کا آغاز:

مباحثہ کا آغاز ہوا اور غالباً سب سے پہلے ''ڈومینین اسٹیٹس'' کے اصول پر ہوا کہ آیا اِسے قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ اجلاس میں ہر قسم کے لوگ تھے، آزاد خیال بھی، معتدل بھی، کانگریس بھی اور

سوراجی بھی۔ ترکِ تعاون کے علمبردار بھی اور حامی موالات بھی۔

مسٹر سین گپتا کی تقریر:

مسٹر سین گپتا اس اصول کے حامی تھے کہ ''ڈومینین اسٹیٹس'' کو قبول کرلیا جائے، چنانچہ اس پر انہوں نے ایک تقریر بھی کی کہ اگر اسے ایک ''درمیانی منزل'' تسلیم کرلیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ اس کے بعد پھر ہماری منزلِ مقصود آزادی ہوگی اور ہم پھر اسی کی طرف بڑھیں گے۔

محمد علی کی مخالفت:

محمد علی نے ایک تقریر کی، اس نظریہ کی مخالفت کی آزادی کامل کی حمایت کی اور اس پر زور دیا کہ ابھی گزشتہ اجلاسِ کانگریس میں ''آزادیٔ کامل'' کی جو تجویز پاس کی جاچکی ہے اور جسے اپنا آخری نصب العین بنایا جاچکا ہے، اُسے ہرگز نہ بدلا جائے اور کامل آزادی ہی کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی جائے۔

تقریر کی رو میں کہیں اُن کے منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ جو لوگ آزادیٔ کامل کے مخالف اور درجۂ مستعمرات کے حامی ہیں، وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں ہیں بلکہ بزدل Coword ہیں۔

ہنگامہ:

اِس لفظ کا اُن کے منہ سے نکلنا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ لغو اور مہمل شور و غوغا کی اتنی افراط ہوئی کہ کان پڑی بات نہیں سنائی دیتی تھی اور برابر مطالبہ کیا جاتا تھا کہ ''محمد علی بیٹھ جاؤ''، ''بیٹھ جاؤ''، ''ہم نہیں سننا چاہتے۔''

محمد علی کو اس قسم کے پست اختلافات سے ساری عمر سابقہ رہا تھا، وہ اِس ہنگامہ سے متاثر کیوں ہوتے؟ اُنہوں نے اپنی تقریر جاری رکھی، ڈومینین اسٹیٹس کی سخت مخالفت کی اور اِسے ملک کے لیے مہلک قرار دیا۔

اُن کی تقریر کے بعد دوسرے بزرگوں نے اسی موضوع پر تقریر کی اور اُن کے نظریہ کی مخالفت اور

درجہ مستعمرات کی حمایت کی۔

مغرب کی نماز:

مباحثہ ابھی اِسی موضوع پر جاری ہی تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا اور محمد علی مغرب کی نماز پڑھنے باہر چلے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے لیکن ابھی ڈائس پر نہیں پہنچے تھے، ہال کے اندر تھے کہ کسی نے اُن سے کہہ دیا کہ درجہ مستعمرات تو پاس ہو گیا اور اُس پر مباحثہ بھی ختم ہو گیا۔

یہ سنتے ہی محمد علی نے انا للہ پڑھا اور اُلٹے پاؤں واپس آ گئے، پھر اُنہوں نے اِس کے بعد کنونشن میں شرکت نہیں کی، اگر چہ زور بہت ڈالا گیا۔

خلافت کانفرنس:

ہالیڈے پارک میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ خلافت کمیٹی کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا گیا تھا اس کا اقتضا تو یہ تھا کہ خلافت کمیٹی میں حاضرین کی تعداد بہت کم ہوتی، لیکن ایسا نہیں تھا۔

پورا پنڈال حاضرین سے بھرا ہوا تھا اور تمام ہندوستان سے مندوبین کی بڑی تعداد شریکِ اجلاس ہوئی تھی۔

تحریک وتائید کے بعد محمد علی نے اپنا زبانی خطبہ صدارت شروع کیا، اس لیے کہ وہ اُسی زمانہ میں ممالکِ اسلامیہ اور یورپ کے سفر سے واپس آئے تھے اور جب سے آئے، برابر جلسے اور جلوس کی شرکت میں اُن کا وقت گزرتا رہا۔ اتنی مہلت اُنہیں کہاں مل سکتی تھی کہ وہ باقاعدہ اپنا خطبہ صدارت تیار کرتے؟

خطبہ صدارت:

چنانچہ وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور اتنی مؤثر اور دلنشین تقریر فرمائی کہ سارا مجمع مسحور ہو گیا۔ بار بار اللہ اکبر، اللہ اکبر کے دلنواز وروح افزا نعرے بلند ہوتے تھے۔

اپنے خطبہ صدارت میں اُنہوں نے پہلے تو اپنے عالم اسلامی کے تاثرات بیان کیے، پھر اس کے

بعد اُنہوں نے سیاساتِ وطنی پر ایک مفصل تنقید کی اور نہرو رپورٹ پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا، اور اپنی علیحدگی اور کانگریس سے عدم تعاون کے اسباب وعلل بتائے۔

اسباب وعلل:

اسباب وعلل وہی تھے جو اس کتاب میں مختلف مواقع پر مختلف عنوانات کے ماتحت بتائے جا چکے ہیں یعنی ہندو زعماء کا تغافل، برادرانِ وطن کی چیرہ دستیاں، اپنی کوششیں، خود مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے اختلاف، مسلمان لیڈروں سے لڑنا، مسلمانوں کو ''تبلیغ و تنظیم'' کے فریب سے نجات دلوانا۔

اور پھر ہندوؤں کا یہ طرزِ عمل کہ صوبہ سرحد کی اصلاحات کی مخالفت کرنا، کتاب راج پال پر خاموش رہنا، ''تجاویز دہلی'' کو منظور کرنا اور متعدد بار منظور کرنا، اور پھر نہرو رپورٹ کی صورت میں نامنظور کر دینا، مسلمانوں کے مسلسل اور پیہم احتجاج کے باوجود کوئی کوشش اصلاح وتلافی کی نہ کرنا اور اپنا نصب العین یعنی ''مکمل آزادی'' بدل کر مستعمرات کو منزلِ مقصود بنالینا۔

اِن تمام چیزوں کو اُنہوں نے اپنی چار پانچ گھنٹہ کی مسلسل تقریر میں نہایت خوبی سے حاضرین کے ذہن نشین کر دیا اور اعلان کر دیا کہ کانگریس سے اُس وقت تک تعاون ناممکن ہے جب تک وہ ''تجاویز دہلی'' نہ منظور کرلے اور نہ منظور کرے تو اُس سے ہماری جنگ ہے اور اگر منظور کر لے تو پھر اسی طرح اشتراکِ عمل کرنے پر آمادہ اور تیار ہیں جس طرح گزشتہ تحریک میں ہم نے کیا تھا۔

مجمع پر اثر:

کلکتہ اُس وقت مخالفت کا مرکز بنا ہوا تھا، وہاں کانگریس کا جلسہ ہو رہا تھا اور دوسرے زعماء کلکتہ ہی میں مقیم تھے جو محمد علی کی رائے سے سخت اختلاف رکھتے تھے اور خبر کا اثر بھی کلکتہ میں بہت بیان کیا جاتا ہے اس لیے کہ کلکتہ کی امامت واقتداء بھی اُنہیں کے ہاتھوں میں ہے۔

اِس کے علاوہ محمد علی کے دوسرے رفقاء جنہوں نے اپنی کارگزاری، اپنے ایثار، اپنے خلوص اور صداقت سے کلکتہ پر خاصا اثر قائم کرلیا تھا مثلاً اکرم خان صاحب وغیرہ۔ یہ سب محمد علی سے مختلف رائے

رکھتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ نہرو رپورٹ نامنظور ہو جائے۔ اس لیے جلسہ میں اگر کسی قسم کا ہنگامہ ہوتا تو وہ کوئی تعجب خیز بات نہ ہوتی یا اگر کسی ایسی تجویز سے جس کا تعلق کانگریس کی مخالفت سے ہوتا، کوئی مخالفت کرتا تو بھی کوئی حیرت کرنے کی جگہ نہیں تھی۔

پھر جس جلسہ میں 8، 9 ہزار آدمی ہوں وہاں ہر طبقہ، ہر خیال، ہر ذہنیت اور ہر رائے کے افراد ہوتے ہیں، ''ملتِ واحدہ'' وہ نہیں ہوتے ہیں۔ اصول میں اگر اتفاق بھی ہوتا ہے تب بھی بعض فروعات میں اختلاف ہوتا ہے اور اس کے لیے صدر کو ترمیموں کا نوٹس دیا جاتا ہے، تقریریں ہوتی ہیں، یہ سب کچھ ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ مگر خلافت کانفرنس کے اس جلسہ میں یقین کیجیے کہ ایک آواز بھی مخالفت میں نہیں اٹھی، ہر شخص آمنا وصدقنا کہہ رہا تھا۔

بہر حال کانفرنس ہوئی اور نہایت شاندار طریقہ سے ختم ہوئی، اور اس ہزاروں کے مجمع میں نہ کسی نے مخالفت کی نہ ہنگامہ بپا کرنے کی کوشش کی۔ سب نے عقیدت و محبت کے ساتھ اپنے زعیم کے ارشادات کو سنا اور اُن پر عمل پیرا بھی ہوئے۔

دوسرے حالات:

اب یہ عنوان ختم ہو جانا چاہیے تھا، مگر اجمالی طور سے ایک بات کا تذکرہ ضروری ہے۔

ایک اعتراض:

بڑی شد و مد سے محمد علی اور اُن کے رفقاء پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُنہیں کنونشن میں اپنے مطالبات پیش ضرور کرنے چاہئیں تھے، اگر وہ ایسا کرتے تو بہت بڑی اُمید تھی کہ مطالبات منظور ہو جاتے اور یہ اختلاف وافتراق وہیں ختم ہو جاتا، مگر چونکہ محمد علی نے پھر شرکت نہیں کی اس لیے اختلاف کی خلیج اور زیادہ وسیع ہوتی گئی۔

بادی النظر میں یہ اعتراض وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن بہ تامل خفیف یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ محمد علی نے جو کیا، وہی اچھا تھا۔ ڈومینین اسٹیٹس پر کنونشن میں اُن کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا، وہ ایسا

نہیں تھا کہ کوئی خوشگوار اُمید قائم کرنے میں مدد دیتا۔ اِس کے علاوہ اختلافات کے آغاز سے اس وقت تک ہندو زعماء کا جو بے نیازانہ طرزِ عمل ہو گیا تھا، وہ بھی ایک خود دار اور شریف آدمی کو ''طوافِ کوئے ملامت'' کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

مسلم لیگ کی شرکت:

یا اِن سب باتوں کو چھوڑ دیجیے، اِس پر آیئے کہ مسلم لیگ نے اپنے اجلاس تک نہرو رپورٹ کی کوئی مخالفت نہیں کی۔ مسٹر جناح جو لیگ کی کونسل کے صدر تھے، اُس وقت تک بالکل خاموش رہے، ایک حرف بھی اُنہوں نے مخالفت میں نہیں کہا۔ مسٹر چھاگلہ لیگ کے دوسرے سرگرم رکن آل پارٹیز میں شریک تھے، پھر نہرو رپورٹ کی حمایت میں اُنہوں نے سخت جدوجہد کی تھی اور مسلمان قوم کی مخالفت مول لی تھی۔

مہاراجہ محمود آباد رپورٹ کے سخت ترین حامی تھے، اُنہیں کی کوششوں سے آل پارٹیز کا اتنا شاندار جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہو سکا اور اُنہیں نے مسلم لیگ کی کرسی صدارت پر محمد علی کے مقابلہ میں محض اس لیے فتح حاصل کی تھی کہ وہ نہرو رپورٹ کو مسلمانوں سے منوا سکیں۔

سر علی امام بھی نہرو رپورٹ کے بڑے حامی تھے اور اُنہوں نے بھی صرف اِسی حمایت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی بڑی مخالفت اٹھائی۔

ان سب حامیوں نے اپنے دوسرے رفقاء اور شرکاء کا ایک قافلہ مرتب کیا اور وہ مسٹر جناح کی سرکردگی میں کنونشن کے آخری اجلاس میں پہنچا اور ''تجاویز دہلی'' کنونشن کے سامنے منظوری کے لیے پیش کیں۔

مسٹر جناح کی تقریر:

مسٹر جناح نے ایک بہت مؤثر تقریر کی اور اپیل کی کہ محبت و اُخوت کے جذبات کے ساتھ ان تجاویز پر غور کیجیے اور انہیں منظور کر کے اختلافات کا خاتمہ کر دیجیے کہ اس وقت قوم کی ضروریات کا تقاضا

یہی ہے۔

جیکر کی تقریر:

جناح کے بعد جیکر نے تقریر کی اور ان کے خیالات کا تار پود بکھیر کے رکھ دیا۔ ووٹ جب لیے گئے تو مسٹر جناح کو شکست اور مسٹر جیکر کو فتح ہوئی، گو سر تیج بہادر نے کوشش کی کہ ایسا نہ ہو مگر روک کون سکتا تھا؟

مسٹر چھاگلہ کا بیان:

چنانچہ مسٹر چھاگلہ جب کا ذکر آ چکا ہے اور جو آج تک بہت بڑے قوم پرور ہیں، اس واقعہ شکست سے اتنے متاثر ہوئے کہ 8 جنوری 1929ء کو ایسوسی ایٹیڈ پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا:

> ''کنونشن کے اجلاس کے سامنے لیگ کی نمائندگی اس لیے کی گئی تھی کہ مسلمان چند ضروری ترمیمات کے بعد نہرو رپورٹ کو منظور کر سکیں گے۔ میں نہایت افسوس کے ساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہوں کہ کنونشن کو مسلم مطالبات پر نہایت فراخدلی سے غور کرنا چاہیے تھا، بجائے اس کے وہ ہندو مہاسبھا کے زیر اثر اور اُس کی دھمکی میں آن کر یہ صورت اختیار کرتا۔
>
> میں یہ امر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ کے نمائندوں کی اکثریت کنونشن کے اجلاس میں شریک ہوئی تھی اور جنہوں نے مسلمانوں کے جائز مطالبات کو پیش کیا تھا، نہرو رپورٹ کے حامیوں میں سے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے نہ صرف اپنی ملت کے ساتھ جنگ کی بلکہ اپنی جماعت (مسلم لیگ) سے محض نہرو رپورٹ کی تائید کرنے کے سلسلہ میں برائی حاصل کی۔ اگر کنونشن ان 23 منتخب نمائندوں کے ساتھ کسی امر پر گفتگو کرنے سے قاصر ہے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ ہندوستان کے کسی

مسلمان سے بھی فیصلہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اگر ان 23 نمائندوں کو فرقہ پرست سمجھ کر اُن کے ساتھ یہ روّیہ اختیار کیا گیا تو سمجھ لو کہ ہندوستان میں ایک بھی مسلم قوم پرور موجود نہیں۔

جس طرح مسلم لیگ نے شفیع سیکشن کو علیحدہ کر دیا اور جس طرح اس نے پٹنہ کی اس تجویز کو جو علی برادران نے تیار کی تھی، ردّ کر دیا، یا آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں اپنے نمائندوں کے بھیجنے سے انکار کر دیا، اس طرح کنونشن کو بھی چاہیے تھا کہ بہادری کے ساتھ مونجے اور جیکار کے ساتھ بھی یہی عمل درآمد کرتا جو اجلاس کنونشن میں لحظہ بہ لحظہ دھمکی دے رہے تھے کہ وہ اجلاس چھوڑ کر چلے جائے گے۔''

مسٹر چھاگلہ یہ بیان دینے کے بعد بھی وفادار رہے، لیکن مسٹر جناح دِل برداشتہ ہو گئے اور نہرو رپورٹ کی مخالفت میں اسی سلسلہ میں اُن سے اور پنڈت موتی لال نہرو سے اسمبلی میں ایک دلچسپ جھڑپ بھی ہو گئی تھی جس کی تفصیل سے یہاں احتراز کیا جاتا ہے۔

بہر حال یہ اسباب تھے جنہوں نے محمد علی جناح کے علاوہ محمد علی جوہر کو بھی مایوس کر دیا اور وہ بھی بادل نخواستہ

لے، تری بزم سے ناچار چلے جاتے ہیں

کہتے ہوئے کنونشن سے نکل آئے اور پھر نہ گئے۔

محمد علی کا بیان:

اس باب کے ختم کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کنونشن اور اس کے متعلقات پر محمد علی کے جو تاثرات ''روداِدِ چمن'' کے عنوان سے ''ہمدرد'' میں شائع ہوئے تھے، اُن کا بھی ایک خاص حصہ پیش کر دیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں:

''آج کل دیارِ غیر سے زیادہ خود اپنے وطن میں غریب الوطن ہوں۔ انہیں زبانوں جن سے آج اپنی ہجو سن رہا ہوں، اپنی تعریف میں ہزاروں قصیدے بھی سن چکا ہوں،

ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہا سبھائی مہاراسٹر نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کی خلافت علم بغاوت بلند کیا۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دے چکنے کے بعد باردولی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈال دینے کے مترادف سمجھا اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کردیئے گئے۔ ان کے قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آزاد ہوئے اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے کے جس کا یادش بخیر! اب پھر کلکتہ میں نام لیا گیا ہے، گیا میں سوراج پارٹی کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ پھر لطف یہ کہ ہندو مہا سبھائیوں نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شروع کیں جنہوں نے ان مذہبی تعصبات کی آگ کو پھر بھڑکا دیا جنہیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے اور اس کے جواب میں مسلمانانِ پنجاب کے اسی عنصر نے تبلیغ و تنظیم کے نام سے زبانی جمع خرچ دکھانا شروع کیا جو آج وطن پرستی اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے۔

نہ ہم نے ڈاکٹر مونجے، مسٹر آنے اور مسٹر کیلکر کی طرح مہاتما گاندھی کے خلاف اس بغاوت میں حصہ لیا تھا جو بالآخر پنڈت موتی لال کے خلاف بھی جوابی تعاون کے لاجواب نام سے ظاہر ہوئی، نہ ہم نے گیا میں اس تحریک کے خلاف پنڈت موتی لال اور اُن کے سوراجی ساتھیوں کی طرح علم بغاوت بلند کر کے حصہ لیا، نہ پنڈت مدن موہن مالوی اور سوامی شردھانند کی طرح ہندو مہا سبھا کی قائم کردہ سنگٹھن اور شدھی کی تحریکوں میں حصہ لیا اور نہ ڈاکٹر کچلو اور اُن کے رفقاء کی طرح تبلیغ و تنظیم کے نام سے اپنا ڈھنڈورا پیٹا۔ آج یہی حضرات کلکتہ کی تماشا گاہ میں اپنا سوانگ بھر رہے ہیں۔

پنڈت موتی لال نہرو اور اُن کے ساتھیوں کو کونسلوں اور اسمبلی کی شرکت نے جو کچھ سوراج دلوایا، وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس شرکت میں پنڈت جی کو جو آج کانگرس کے صدر ہیں، اتنا اصرار تھا کہ اُنہوں نے خود مجھ سے فرمایا کہ اگر کانگریس نے اس

شرکت کی اجازت نہ دی تو میں کانگریس کے گرداگرد دوسو میل کے احاطہ میں بھی قدم نہ رکھوں گا۔ میں نے اس خیال سے طوعاً وکرہاً اپنی پارٹی سے آج کے خداوند کانگریس وکنونشن کو اجازت دلوائی کہ کہیں یرودہ جیل سے نکل کر مہاتما گاندھی مجھ سے شکایت نہ کریں کہ تم نے کانگریس سے اتنی بڑی اقلیت کو کیوں نکلوا دیا، ورنہ دہلی اور کوکناڈا میں موتی لال جی کو شکست فاش نصیب ہوتی۔

مہاتما گاندھی جب جیل سے چھوٹے تو اُنہوں نے اخبارات کی ذریعہ سے میرے نام ایک پیغام ارسال فرمایا تھا جس میں اشارہ کیا تھا کہ جو تفریق ہندو مسلمانوں میں پڑ گئی ہے اس کے مٹانے ہی سے تم اپنی صدارت کانگریس میں کامیاب سمجھے جا سکتے ہو۔ میں نے اس تفریق کے مٹانے میں جو کیا اس کا فیصلہ خدا ہی پر چھوڑتا ہوں۔ مہاتما جی نے کوہاٹ کی نزاع کی خبر سنتے ہی ہم سے خاص طور سے خطاب کرتے ہوئے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو ظالم اور ہندوؤں کو مظلوم سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد سے تو انہوں نے ہندو مسلم تنازعات اور مناقشات کو چکانے کا کام ہی بند کر دیا اور جب کبھی اُن سے ہم دونوں بھائیوں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر محمود یا اور کسی نے اس بارہ میں عرض کیا تو اُنہوں نے اس میں حصہ لینے سے انکار فرمایا اور اس کام کو کلیتاً خدا ہی پر چھوڑ دیا۔"

یہ تھے وہ اسباب وعلل جن کی بنا پر محمد علی کنونشن سے بیزار ہوئے، کانگریس سے مایوس ہوئے اور بالآخر:

نے پیروئ قیس نہ فرہاد کریں گے
ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

کہہ کر انہوں نے دوسرا "طرزِ جنوں" ایجاد کیا جو سب کو معلوم ہے۔

❁❁❁

باب ۴۳

آل مسلم پارٹیز کانفرنس دہلی

کانگریس سے اور کنونشن سے جب مایوسی ہوگئی تو جنوری 1929ء میں محمد علی اس پر آمادہ ہو گئے کہ وہ مسلمانوں کی ایک ''آل پارٹیز کانفرنس'' منعقد کریں جس میں تمام جماعتوں کے نمائندے شریک ہو کر اپنا لائحہ عمل مرتب کریں اس لیے کہ

باہم سلوک تھا تو اُٹھاتے تھے نرم گرم
کا ہے کہ میز کوئی دبے جب بگڑ گئی

محمد علی کانگریس کے تھے اور کانگریس کا سارا زور شور محمد علی کی ''حدی خوانیوں'' سے قائم تھا، اب کانگریس نے اپنے طرزِ عمل سے اُنہیں پورے طور سے مایوس کر دیا تھا اور جہاں تک امکان میں تھا اُن کی اِس ''بغاوت'' کی سزا بھی دے دی گئی تھی۔

سزا:

یعنی کلکتہ کانگرس میں جب اس کی ''مجلس عاملہ'' کے ارکان کا انتخاب ہو رہا تھا تو مدارس کے ایک صاحب نے بد قسمتی سے محمد علی کا نام بھی پیش کر دیا جواب تک اس کے ممبر چلے آتے تھے، نام منظور تو کا ہے کو ہوتا مگر پھر اس پر بھی ''نہیں، نہیں'' کے شور نے ''گرمی محفل'' کا سامان ضرور پیدا کر دیا تھا۔

لیکن محمد علی نے یہ روش خود نہیں رکھی بلکہ 2 جنوری 1929ء کے ''ہمدرد'' میں یہ خبر شائع ہوئی۔

''ڈاکٹر انصاری، سر علی امام، مسٹر حسن امام، مولانا ابوالکلام آزاد اور اسی طرح بہت

اگر چہ ان زعماء میں سے کوئی بزرگ تشریف نہ لائے لیکن کارکنان نے اپنے خیال کے مطابق اتمام حجت کرلیا۔

انتظامات:

بہر حال ان ہنگامہ آرائیوں کے بعد دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انتظامات شروع ہو گئے، صوبہ کونسلوں اور اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ اور دوسری انجمنوں کو اطلاع دے دی گئی کہ وہ اپنے اپنے نمائندہ منتخب کر کے جلد سے جلد دہلی بھیج دیں۔

صدارت:

صدارت کے بعد قرعہ فال سر آغا خاں کے نام پڑا جنہوں نے ازراہِ عنایت اسے قبول بھی فرمالیا اور فوراً دہلی تشریف لائے۔

شرکاء:

کونسلوں اور اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ کے علاوہ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے مندوبین بھی شریک تھے اور خوشی کی بات ہے کہ اس مجلس میں جمعیت علمائے ہند دہلی کے سر برآوردہ ارکان بھی موجود تھے مثلاً مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب اور دوسرے حضرات۔

سر شفیع کا دعویٰ:

سر شفیع نے کانفرنس کے اس اجلاس میں بالکل صحیح دعوی کیا کہ یہ کانفرنس پوری نمائندہ ہے اس لیے کہ جس کانفرنس میں علی برادران شریک ہوں اور جمعیت العلماء کے محترم بزرگ رونق افروز ہوں وہ سیاسی اور مذہبی دونوں نقطۂ ہائے نظر کی صحیح طور سے نمائندہ کہی جاسکتی ہے۔

بڑا مرحلہ:

کانفرنس میں سب سے بڑا مرحلہ یہ درپیش تھا کہ کانفرنس کا نصب العین کیا ہو؟ سر شفیع اور اُن کے

ہم نوا حضرات کا جہاں تک تعلق تھا، وہ تو اس پر بھی راضی ہو سکتے تھے کہ ''ڈومینین اسٹیٹس'' بھی نہ رکھا جائے، مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کم از کم ''درجہ مستعمرات'' کے طلب گار ضرور تھے۔ اُن کے ذوق کی رعایت بھی ضروری تھی اور ایسا ممکن بھی تھا لیکن سب سے زبردست مرحلہ یہ تھا کہ محمد علی مکمل آزادی کے علمبردار تھے اور یہ وہ چیز تھی جسے کانفرنس میں بطور نصب العین کے پیش ہی نہیں کیا جا سکتا اور یہ فرض اگر ایسا ہوتا بھی ہوتو سر آغا خاں دہلی میں نہ نظر آتے نہ سر شفیع کی یہ سرگرمیاں ظاہر ہوتیں، نہ مسلم لیگ کے سیاست داں بزرگ اس پلیٹ فارم پر تشریف رکھ سکتے تھے اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ محمد علی اس ''درمیانی راستہ'' کو قبول کر سکتے۔ یہ ایک مسئلہ ایسا آن پڑا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں کانفرنس ہی نہ ختم ہو جائے۔

حکمت عملی:

آخر بڑے غور وفکر کے بعد یہ قرار پایا کہ کانفرنس اپنا کوئی خاص نصب العین نہ مقرر کرے اور جو جماعتیں اس کے ساتھ اشتراکِ عمل کر رہی ہیں اُن پر نصب العین کے بارے میں کوئی پابندی کسی قسم کی نہ عاید کی جائے، یعنی اگر مسلم لیگ ''ڈومینین اسٹیٹس'' کی طلب گار ہے تو اسے حق ہے کہ وہ اس کے لیے جدو جہد کرے، اگر جمعیت خلافت آزادیٔ کامل کی علمبردار ہے تو وہ اپنے اِس مقصدِ عالی کے حصول کی کوشش کر سکتی ہے۔ آل پارٹیز کانفرنس کی طرف سے اس پر کوئی پابندی یا کسی قسم کی روک نہیں ہوگی۔

لیکن مسلمانوں کے لائحہ عمل اور موجودہ سیاسی جدوجہد اور اُن کے حقوق کا جہاں تک تعلق ہے وہاں سب جماعتیں جو اِس میں شریک ہیں وہ مسلم کانفرنس کے ساتھ اشتراکِ عمل کریں گے۔

کارروائی:

یہ تھی وہ بین بین صورت جس پر محمد علی کا اشتراکِ عمل حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس مرحلہ صعب کے گزر جانے کے بعد کارروائی شروع ہوئی اور اس میں جو تجویز منظور ہوئی وہ درج ذیل ہے:

تجویز:

''جبکہ ہندوستان کی وسعت اور اس کی نسلی، لسانی، انتظامی، جغرافی یا ملکی تقسیمات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستانی حالات کے مطابق صرف وفاقی طرزِ حکومت ہے جس میں ان ریاستوں کو جو اس وفاقی حکومت' کے اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتی ہوں، کامل خود مختارانہ اور فیصلہ کن اختیارات حاصل اور مرکزی حکومت کو صرف ان امور کے متعلق قطعی اختیارات حاصل ہوں جو مشترکہ مفاد سے تعلق رکھتے ہوں اور جو دستورِ اساسی کی رو سے خاص طور سے اسے تفویض کیے گئے ہوں۔

اور

جبکہ یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا مسودۂ قانون، قرارداد، تحریک یا ترمیم جو بین الملّی معاملات کے متعلق ہو، کسی مجلس مقنّنہ میں خواہ وہ صوبہ دار ہو یا مرکزی، پیش نہ کیا جائے یا زیر بحث نہ لایا جائے، یا منظور نہ کیا جائے۔ اگر اس ملت سے جن پر اس کا اثر پڑتا ہو خواہ وہ ہندو ملت ہو یا مسلم ملت، تین چوتھائی ارکان کی اکثریت اس مجلس مقنّنہ میں اس کے پیش کرنے، اس پر بحث مباحثہ کرنے یا اس کو منظور کرنے کی مخالفت کریں۔

اور

جبکہ مسلمانوں کا یہ حق کہ مختلف ہندوستانی مجلس مقنّنہ میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندہ منتخب کریں، ملک کا مروّجہ قانون ہے اور مسلمان اپنے اس حق سے بغیر اپنی رضامندی کے محروم نہیں کیے جاسکتے۔

اور

جبکہ ان حالات کے ماتحت جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں اور جب تک یہ حالات موجود رہیں گے، مختلف مجالس مقنّنہ اور دیگر آئینی خود مختار انجمنوں میں مسلمانوں کی نیابت اپنے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ ضروری ہے تاکہ حقیقی

نمائندہ جمہوری حکومت قائم کی جائے۔

اور

جبکہ اس وقت تک جب تک کہ مسلمانوں کو یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ دستورِ اساسی میں اُن کی حقوق اور مفاد کی مناسب حفاظت کی گئی ہے، وہ کسی صورت میں بھی اس پر رضا مند نہ ہوں گے کہ خواہ مشروط یا غیر مشروط طریقہ پر مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قائم کیے جائیں۔

اور

جبکہ مذکورۃ الصدر مقاصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمان مرکزی اور صوبہ جاتی کابینوں میں اپنا جائز حصہ حاصل کریں۔

اور

جبکہ یہ ضروری ہے کہ مختلف مجالس مقننہ اور آئینہ خود مختار انجمنوں میں مسلمانوں کی نیابت ایک ایسے طریقہ پر مبنی ہو جس سے اُن اصولوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں ہے، مسلمانوں کی اکثریت میں کسی صورت سے بھی فرق نہیں آئے گا اور اُن صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت (یا اقلیت) ہے، کسی حالت میں بھی اُن کی نیابت اس سے کم نہ ہوگی جو اُن کو موجودہ قانون کے ماتحت حاصل ہے۔

اور

جبکہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندہ جمعیتوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہندوستان میں بحیثیتِ مجموعی تمام مسلمانوں کے مفاد کے مناسب تحفظ کی غرض سے مرکزی مجالس مقننہ میں مسلمانوں کو ساڑھے 33 فیصدی نیابت کا حق ملنا چاہیے اور یہ کانفرنس اس مطالبہ کی کامل تائید کرتی ہے۔

اور

جبکہ لسانی، نسلی، جغرافیائی اور انتظامی وجوہ کی بنا پر صوبہ سندھ بقیہ احاطۂ بمبئی سے کوئی بھی مناسبت نہیں رکھتا اور اس کے باشندوں کے مفاد کے لحاظ سے اس کا غیر مشروط طور پر ایک ایسا علیحدہ صوبہ بنانا جس میں ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح اپنا علیحدہ نظام حکومت اور مجلس قانون ساز موجود ہونا ضروری ہے، ہندو اقلیت کو اس کے تناسب آزادی سے زیادہ اسی طرح مناسب اور مؤثر نمائندگی دے دی جائے جس طرح کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں دی جاسکتی ہے جہاں ان کی آبادی اقلیت میں ہو۔

اور

جبکہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اسی طریقہ پر جو ہندوستان کے دیگر صوبوں میں اختیار کیا جائے، آئینی اصلاحات کا نفاذ نہ صرف ان صوبوں کے مفاد کے خیال سے بلکہ بہ حیثیت مجموعی تمام ہندوستان کی آئینی ترقی کے لحاظ سے بھی ضروری ہے، ان صوبوں کی ہندو اقلیتوں کو ان کے تناسب آبادی سے زیادہ اسی طرح مناسب اور مؤثر نمائندگی دے دی جائے جس طرح کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں دی جاسکتی ہے جہاں کہ ان کی آبادی اقلیت میں ہو۔

اور

جبکہ انتظام ہندوستان کے مفاد کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ دستورِ اساسی میں ایسا بندوبست کیا جائے جس کی رو سے سرکاری اور آئینی خود مختار انجمنوں کی ملازمتوں میں اہلیت کے واجبات کا مناسب لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ مناسب حصہ دیا جائے۔

اور

جبکہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی، معاشی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے

کہ ہندوستان کے دستورِ اساسی میں مسلمانوں کے تمدن کے تحفظ اور مسلمانوں کی تعلیم، زبان، مذہب، شخصی قانون اور مسلمانوں کے خیراتی ادارات کے تحفظ اور ترقی اور سرکاری امداد میں اُن کے مناسب حصہ کے لیے مناسب تحفظ شامل کیے جائیں۔

اور

جبکہ یہ ضروری ہے کہ دستورِ اساسی میں یہ قرار دیا جائے کہ ہندوستان کے دستورِ اساسی میں اُس کے نفاذ کے بعد کوئی تغیر وتبدل اُس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک کہ وہ تمام ریاستیں جن پر ہندوستانی وفاقی حکومت (انڈین فیڈریشن) مشتمل ہو، متفقہ اس کی خواہش نہ کریں گی۔

یہ کانفرنس نہایت زور کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی دستورِ اساسی کو خواہ اُس کو کوئی مرتب کرے یا تجویز کرے، اُس وقت تک قبول نہیں کریں گے جب تک وہ اُن اصولوں کی تصدیق نہ کرے جو اس تجویز میں پیش کیے گئے ہیں۔''

یہ تھی وہ ہنگامہ آراء تجویز جو آج تک ''بدنام'' ہے، جسے سر محمد شفیع نے پیش کیا اور شفیع داؤدی صاحب، سر اقبال، سر یعقوب، حاجی عبداللہ ہارون، مولانا عبدالماجد بدایوانی، مولانا کفایت اللہ اور مولانا محمد علی وغیرہ نے تائید کی۔

محمد علی کی تائید:

محمد علی کے ساتھ کنونشن میں جو سلوک ہوا تھا، وہ معلوم ہے۔ پھر نہرو رپورٹ کے بعد اُن پر غداری، قوم فروشی اور تلون مزاجی کے جو الزامات لگے تھے، اُن سے بھی سب واقف ہیں۔ اب اُن کی تائیدی تقریر کا بھی ایک حصہ ملاحظہ فرمالیجیے کہ اعلانِ جنگ کے بعد بھی ایک ''شریف'' دشمن کی زبان سے کیا الفاظ نکل سکتے ہیں۔

''میں انگریزی حکومت سے بیزار ہوں، میں دوسروں کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میرے ہم

خیال بن جائیں، میں تو انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار ہوں کہ اگر مجھے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہندوؤں کی غلامی بھی قبول کرنی پڑے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو تو میں اسے قبول کرلوں گا۔ میں اس مسلمان کو بزدل سمجھتا ہوں جو یہ کہتا ہے کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ مسلمانوں کی زندگی ہندوؤں کے رحم وکرم پر ہوگی۔ میں اس اندیشہ کو اہمیت نہیں دیتا، میرے نزدیک ایک سچا مسلمان دس آدمیوں پر بھاری ہوتا ہے، کیا جنگ بدر اور جنگ احد میں مسلمانوں کی تعداد قلیل نہ تھی لیکن کامیابی وکامرانی کس کو حاصل ہوئی؟ مسلمانوں کو! میری خواہش ہی ہے کہ مصالحت ہو، امن ہو، اتحاد ہو، میری تحریروں اور تقریروں کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں نے ابھی تک صلح کا دروازہ بند نہیں کیا ہے، میں صلح کو پسند کرتا ہوں اور امن واتحاد کا حامی ہوں۔''

مفتی صاحب کی تائید:

مفتی کفایت اللہ صاحب کی تقریر بہت خوب تھی، خاص حصہ یہ ہے:

''میں جس ریزولیوشن کی تائید کے لیے حاضر ہوا ہوں وہ ایک نہایت اہم ریزولیوشن ہے اور یہ ریزولیوشن ایک ایسے جلسہ کی طرف سے ہے جو مسلم قومیت کے حقوق کی حفاظت کا ایک نمائندہ جلسہ ہے، اس میں ہر خیال اور ہر طبقے کے مسلمان شریک ہیں۔

اب کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کو تسلیم کیا ہے، اگر کوئی شخص ایسا کہے گا تو اس کا کہنا غلط ہوگا اور یہ طرزِ عمل ایسا ہی ہوگا جس طرح کوئی شخص آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش وسعی کرے۔ میں جمعیت علمائے ہند کی طرف سے اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔''

باب ۴۴

وائسرائے کا بیان

1924ء میں جب سر مالکم ہیلی اسمبلی کے ہوم ممبر تھے، اُس زمانہ میں انہوں نے ڈومینین اسٹیٹس کی تعبیر و تعیین میں سخت غلط فہمیاں پیدا کردی تھیں، ایسی کہ لبرل حضرات بھی مایوس ہو گئے تھے۔

لارڈ اِرون کا تدبر:

لارڈ ارون نے یہ موقع غنیمت سمجھا کہ وہ ان غلط فہمیوں کو رفع کر دیں کہ اس وقت جو یہ شور وشر ہو رہا ہے، اُس میں بھی کمی ہو جائے گی اور کیا عجب ہے کہ کانگریس کا تعاون بھی حاصل کیا جا سکے۔ چنانچہ وہ یورپ گئے اور واپس آ کر اُنہوں نے اسمبلی کے ارکان کو مخاطب فرمایا جس میں یہ صاف صاف تشریح کر دی کہ ڈومنین اسٹیٹس سے مراد کامل درجہ نو آبادیات ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

زعماء کانگریس کا اجتماع:

وائسرائے جس روز اپنا بیان دینے والے تھے اُس وقت دوسرے مشتاقانِ زیارت کے علاوہ کانگریس کے عمور اور محترم زعماء بھی مختلف مقامات سے زحمتِ سفر برداشت کر کے دہلی میں تشریف لے آئے تھے اور منتظر تھے کہ نائب السلطنت بہادر کے ارشادات کہاں تک مایۂ تسلی ثابت ہو سکتے ہیں؟

بالآخر وہ ساعتِ منتظرہ آئی اور ہز ایکسی لینسی وائسرائے نے ایوانِ اسمبلی میں بقول بعض ''غلط فہمی'' رفع کر دی۔

کانگریس کا بیان:

چنانچہ فوراً کانگریس کی طرف سے ایک محضر تیار ہوا جس میں وائسرائے کے اس بیان کا شکریہ ادا کیا گیا، گول میز کانفرنس میں شرکت کا عزم ظاہر کیا گیا اور دبی زبان سے یہ بھی کہا گیا کہ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ''ہز ایکسی لینسی''، ہمیں کانفرنس میں ہماری طے شدہ رعایتیں بھی مرحمت فرمائیں گے اور اس طرح ہم اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔

وائسرائے کا اعلان:

اِس بیان پر پھر وائسرائے نے یہ اعلان کیا، تعیین منزل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ منزل کی قطع مسافت بھی کر چکے، قطع مسافت اُسی وقت ہوگی جب آپ سفر شروع بھی کریں گے۔ ڈومینین اسٹیٹس آپ کو اُسی وقت ملے گا جب رفتہ رفتہ تدریجی طور سے آپ میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ اس بیان سے کانگریس پھر ''ناخوش'' ہوگئی اور اُس نے ''آزادیٔ کامل'' کا اعلان کر دیا۔

محمد علی کی روش:

وہ بیان محمد علی کے پاس بھی گیا جس پر گاندھی جی، جواہر لال اور دوسرے زعماء کانگریس نے دستخط کیے تھے اور وائسرائے کی تعریف وتوصیف کے بعد ''بہ اقرارِ صالح'' گول میز کانفرنس کی شرکت پر آمادگی ظاہر کی گئی تھی، بشرطیکہ اس میں درجۂ مستعمرات کے ''اصول وضوابط'' بھی متعین کرنے کی اجازت دے دی جائے یا بہ الفاظِ دیگر نہرو رپورٹ کی سرکاری تصدیق کر دی جائے۔

محمد علی نے اس بیان پر دستخط تو کیے لیکن ''یہ شرط'' اُنہوں نے بھی لگا دی، ''اگر میری ملت کو مؤثر نمائندگی دی گئی تو میں گول میز کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہوں، بغیر اس کے اشتراکِ عمل مشکل ہے۔''

بیان کا اثر:

کانگریس یا گاندھی جی کے اس بیان کا ہندو پریس اور مسلم پریس نے خیر مقدم کیا مگر محمد علی کو اس میں بھی شرف ''جہاد'' حاصل ہوا۔ اُن کی خوب مخالفت کی گئی، تمسخر کیا گیا، استہزا کیا گیا کہ اگر کانگریس نے ڈومینین اسٹیٹس کو مان لیا تو خیر، وائسرائے کے بیان پر مرحبا کہہ کر اگر اُس نے گول میز کانفرنس میں

شرکت پر آمادگی ظاہر کی تو یہ بھی زیادہ تعجب خیز نہیں ہے اس لیے کہ وہ تو درجہ مستعمرات کو بطور نصب العین کے بھی طے کر چکی ہے۔ مگر مولانا محمد علی نے اس بیان پر کیسے دستخط فرمائے؟ وہ تو کامل آزادی کے علمبردار تھے۔ اُنہوں نے خلافت کانفرنس کلکتہ میں آزادیٔ کامل کا جھنڈا بلند کیا تھا، ''کنونشن'' میں اُنہوں نے سب سے زیادہ مخالفت تو اِسی درجہ مستعمرات کی کی تھی، اُس کا قلم دستخط کے لیے کیسے چلا؟

''برہانِ قاطع'':

اعتراض بہت وزنی ہے اور بہ ظاہر محمد علی کی شخصیت اور اصول پروری کو بڑی حد تک یہ ''برہانِ قاطع'' مجروح کر دیتی ہے کہ ایک طرف یہ بلند بانگ دعویٰ، یہ زبردست اعلان، یہ زبردست ادعاء آزادیٔ کامل۔ دوسری طرف یہ تائید، یہ آمادگی اور وائسرائے کی دعوت کی یہ پذیرائی، قول وعمل کے تضاد کو کس قدر زیادہ نمایاں کر دیتی ہے اور اتنے دعوے پیش کر کے مزید دلیل یہ بھی پیش کی گئی کہ یہ سب ذیابیطس کا اثر ہے کہ اتنا اچھا دماغ اس طرح خراب ہو جائے، اور مسلمان تقریباً اس سے محروم ہو جائیں۔ چنانچہ ایک دوسرے موقع پر ایک بڑی ذمہ دار جماعت کے اخبار نے ایک مبتذل پرچہ سے لے کر ''بے چارہ'' محمد علی پر لکھا تھا:

کوئی خوبی نظر آتی نہیں تجھ میں ظالم
اے فلک! پیری و صد عیب اِسے کہتے ہیں

غرض اِس قسم کے براہین قاطعہ نے ایک بار پھر اسلامی پریس اور ہندو پریس میں ذرا ہماہمی پیدا کردی۔

''قاطع برہان'':

لیکن اگر سنجیدگی سے اِس اعتراض پر غور کیجیے تو اس کی یہ اہمیت قطعاً باقی نہیں رہتی جس کا اظہار بڑے شدومد سے ترش لب ولہجہ میں چڑھی ہوئی آستینوں اور تنی ہوئی رگوں میں ہوتا ہے۔

محمد علی یقیناً کانگریس کی طرح نہایت دیانت داری اور ایمانداری سے ''کامل آزادی'' کے حامی

تھے، بلکہ علمبردار تھے۔

مدارس کانگریس:

مدارس کانگریس میں جب ماسکو سے واپس آ کر پنڈت جواہر لال نہرو نے ''آزادیٔ کامل'' بطور نصب العین کے کانگریس سے منوانا چاہا تو وہ محمد علی ہی تھے جنہوں نے نہایت زوروں سے اس تجویز کی تائید کی اور پاس کرایا۔

مالوی جی کے اعتراضات:

پھر مالوی جی نے جب اس ''سابق صدر کانگرس'' کی مداخلت سے عاجز آ کر گھبرانا شروع کیا جس نے مالوی جی کو پریشان کر دیا تھا اور مالوی جی جو بڑی شد و مد سے اس تجویز کی مخالفت کے لیے اُٹھے تھے، بالآخر اُنہیں خاموش ہونے پر مجبور کر دیا اور یہ وہی محمد علی تھا جس نے کانگرس کے کھلے جلسہ میں ملک معظم کو ''قانونی مغالطہ'' کہہ کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی، پھر خلافت کانفرنس کلکتہ میں کامل آزادی کو محمد علی نے منظور کرایا۔ آل پارٹیز کانفرنس میں جو بعد کو ''مسلم کانفرنس'' کہلائی، درجۂ مستعمرات کو پاس نہیں ہونے دیا۔

مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ اس نصب العین نے ایک تفریح و مذاق کی سی حیثیت اختیار کر لی ہے، جب گورنمنٹ کو دھمکی دے کر کام نکالنا ہوا تو فوراً ''آزادیٔ کامل'' کی تجویز پیش ہوگئی اور جب اس کی کسی بات سے خوش ہوئے تو پھر درجۂ مستعمرات پر قناعت کر لی۔

ہندوستان میں یہی ایک جماعت ہے جو سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ مؤثر اور سب سے زیادہ عاملہ جماعت ہے، پھر وہ خود جب ''مصلحت وقت'' سے درجۂ مستعمرات پر راضی ہوگئی تو محمد علی کو کون الزام دے سکتا ہے؟ سیاست کا اقتضاء یہی ہے کہ زمانہ کا ساتھ دو، آزادیٔ کامل کے نصب العین کو ترک کر کے عارضی طور پر محمد علی اگر مستعمرات پر راضی ہو سکتے تھے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہوا۔ عقیدہ اُن کا بھی کانگریس کی طرح وہی تھا جس کا اُنہوں نے گول میز کانفرنس میں بہ بانگ دہل اعلان بھی فرما

دیا تھا:

''میں ڈومینین اسٹیٹس کا قائل نہیں، میں تو آزادیٔ کامل کا خواہاں ہوں اور اس کے علاوہ کسی چیز پر راضی نہیں ہوسکتا۔''

سیاستاً عارضی طور پر طرزِ عمل کی تبدیلی کو نصب العین اور عقیدہ کا تغیر نہیں کہتے اور اگر کہتے ہیں تو

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

باب ۴۵

جنوبی افریقہ

محمد علی کی قیادت کا سکہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بیٹھا ہوا تھا بلکہ بیرونی مقامات پر بھی اس کی قیادت ورہنمائی کی خلقت اسی طرح قائل تھی جس طرح ہندوستان کی۔

دعوت:

چنانچہ جنوبی افریقہ سے مسلسل اور متعدد دعوتیں تشنہ کامانِ زیارت کی آئیں، گو محمد علی وہاں کبھی نہیں گئے تھے لیکن اُن کی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی۔ جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی ماشاءاللہ کافی تعداد ہے اور ہر اعتبار سے وہ اچھی حالت میں ہیں اس لیے اب تک اُن کی خبر نہ لینا تعجب خیز تھا۔

بہر حال جب وہاں سے لگاتار دعوتیں آنے لگیں تو محمد علی کے لیے سوا اِس کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا کہ وہ یہ دعوت قبول کریں اور مسلسل کام کرنے سے اُن کی صحت پر جو برا اثر پڑ رہا تھا، اُس کو اِسی بہانہ سے تبادلہ آب وہوا کا ذریعہ بنائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے دعوت قبول کر لی اور روانگی پر آمادہ ہو گئے، اپنے احباب اور عقیدت مندوں کو اطلاع بھی دے دی۔

شوکت کی روانگی:

چنانچہ ''مقدمۃ الجیش'' کی طرح پہلے مولانا شوکت علی روانہ ہوئے، طے یہ پایا تھا کہ اس کے کچھ روز بعد محمد علی آئیں گے اس لیے کہ محمد علی بیگم صاحبہ کو بھی اپنے ہمراہ لے جانے والے تھے۔

اہانت آمیز حکم:

اِسی خیال سے اکتوبر 1929ء میں محمد علی بمبئی روانہ ہوئے۔ اپنے تمام انتظامات مکمل کیے، اسبابِ سفر تیار ہوا، سامان بندھ گیا، ٹکٹ لے لیے گئے اور وہ بس اب روانہ ہوا چاہتے ہی تھے کہ جنوبی افریقہ کے گورنر نے ایک نہایت اہانت آمیز شرط یہ لگائی کہ جنوبی افریقہ میں اُن کا داخلہ اُسی وقت ممکن ہے جب چند پونڈ بطور ضمانت کے جمع کر دیں، بہ صورت دیگر جنوبی افریقہ کے دارالسلطنت میں اُنہیں داخل ہونے کی اجازت دینا گورنر صاحب کو منظور نہیں۔

انکار:

محمد علی نے اس اہانت آمیز شرط کی تکمیل سے قطعاً انکار کر دیا اور اس صورت میں جانے سے معذوری ظاہر کی، نیز ایک تار فوراً گورنر کو دیا کہ اس قسم کے مہمل شرائط کے بغیر اُنہیں وہاں داخلہ کی اجازت دے دیں اور یہ کہ وہ وہاں کسی سیاسی غرض سے نہیں جارہے ہیں بلکہ صرف اپنے مسلمان بھائیوں سے تبادلۂ خیالات کرنے اور اُن کے حالات کے متعلق مشورہ کرنے۔ چنانچہ محمد علی نے جنرل ہرٹزوگ گورنر افریقہ کے نام ایک تار دیا جس کے الفاظ یہ ہیں:

تار:

> ''بہادر لوگ ہر جگہ بہادری کو پسند کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنی عزت کرتے ہیں وہ دوسروں کی بھی عزت کرتے ہیں۔ ہمیں جو قوم بوئر کی بہادری کے معترف ہیں، ان شرائط کو معلوم کر کے بہت تکلیف ہوئی جن کو کوئی فرد بھی قوم بوئر کا تسلیم نہ کرے گا۔ مہربانی کر کے میرے بھائی کی جماعت کو وہاں اور مجھے اور میرے غمزدہ اہل وعیال کو یہاں موجودہ کشمکش سے نجات دلایئے اور جن امور کا یقین ہم نے دیا تھا اُنہیں کی بنا پر اجازت بذریعہ برقی پیام عنایت فرمایئے۔ یہ اپیل ایک انسان کی طرف سے ایک انسان سے کی جارہی ہے۔
>
> محمد علی، صدرِ خلافت۔''

جواب:

اِس تار کا جنرل ہرٹزوگ کی طرف سے نہایت مہمل اور حسبِ توقع وہی جواب آیا:

''آپ کا تار پہنچا، افسوس ہے کہ شرائط میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

وزیر داخلیہ''

جدوجہد:

اِس تار کے بعد محمد علی نے چاہا کہ گورنمنٹ اپنی اِس ''نوآبادی'' کے اِس احمقانہ طرزِ عمل کی اصلاح کرے، چنانچہ اُنہوں نے وائسرائے کو اس مطلب کا ایک تار دیا کہ وہ جنرل ہرٹزوگ کے اِس غیر شریفانہ رویہ میں کچھ تغیر کرنے کی کوشش کریں۔ نیز ایک تار اپنے دوست میاں سر فضل حسین ممبر حکومت ہند کو دیا کہ وہ بھی اس معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ عرصہ کے غور وفکر کے بعد حکومت ہند نے کسی قسم کی مداخلت سے انکار کر دیا تو اب ظاہر ہے کہ سر فضل حسین کی کیا چل سکتی تھی؟ چنانچہ وہ بھی خاموش ہو رہے اور معذوری ظاہر کی۔

آخری تار:

اِن مسلسل کوششوں کے بعد محمد علی نے جنرل سرٹزوگ کا ایک آخری تار دیا جو یقیناً اُن کے قصر استبداد پر بجلی بن کر گرا ہوگا۔ محمد علی نے لکھا:

''ہندوستان کی حکومت کو یہ سبق دینے پر کہ دوستانہ معروضات سے کس قدر توقع ہو سکتی ہے، بہت بہت شکریہ! ہم اب اُس وقت آئیں گے جب آپ کو یہ سکھا دیا جائے گا کہ اسلام اور ہندوستان کا کس طرح احترام کیا جاتا ہے! محمد علی، صدر خلافت۔''

کانگرس کی تجویز:

اکتوبر 1929ء ہی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ایک جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا جس میں آئندہ

صدارتِ کانگریس کے لیے پنڈت جواہر لال کا انتخاب ہوا تھا۔ اُسی جلسہ میں مسز سروجنی نائڈو نے ایک تجویز پیش کی جس کا مفاد یہ تھا کہ علی برادران کے داخلہ جنوبی افریقہ پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، اُنہیں کانگریس سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔

مسٹر ولبھ بھائی پٹیل اور دوسرے کانگریسی حضرات نے اس تجویز کی پرزور تائید کی اور بالآخر یہ منظور ہوگئی۔

توقعات:

جنوبی افریقہ نہ جا کر محمد علی نے اپنی خودداری کو تو برقرار رکھا اور اُسے کوئی صدمہ نہیں پہنچنے دیا، لیکن ایک دوسرا نقصان بھی کیا۔ مجلس خلافت کی مالی حالت عرصہ سے سقیم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اگر وہاں جاتے تو یقیناً اتنا سرمایہ فراہم کر سکتے تھے کہ کہ مجلس خلافت کی مالی حالت کسی نہ کسی حد تک استوار ہو جائے تاکہ اطمینان کے ساتھ وہ اپنے کام جاری رکھ سکے، چنانچہ اُن کے ایک دوست اُنہیں لکھتے ہیں:

اسپیشل ٹرین کا انتظام:

> ''غلام معین الدین صاحب ابھی آئے ہیں، یہ وہاں کی ینگ مسلم سوسائٹی کے سیکریٹری ہیں۔ انہیں آپ کے افریقہ نہ جانے کا سخت افسوس ہے، وہ کہتے تھے کہ اگر آپ افریقہ پہنچ جاتے تو تین چار لاکھ آسانی سے فراہم ہو جاتا۔ ان کا بیان ہے کہ آپ کے استقبال کے لیے ایک اسپیشل ٹرین کا انتظام کیا جا رہا تھا اور جس عمارت میں آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا وہ پچاس ہزار پونڈ کی لاگت سے تعمیر کی گئی ہے، آپ کے نہ پہنچنے سے مسلمانوں میں مایوسی پیدا ہوگئی ہے۔''

محمد علی پر ایک سنگین اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ ''زر پرست'' بہت زیادہ تھے۔ اس سے انکار نہیں کہ اُن کی ضروریات روز افزوں اور اُن کے افلاس و ناداری نے اُنہیں بہت شکستہ حال اور تہی دست کر رکھا تھا اور وہ دوستوں اور قدردانوں کے عطیوں کو قبول بھی فرما لیا کرتے تھے۔

مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس مالی اعانت نے اُن کے عقائد و خیالات میں کسی قسم کا تغیر کیا ہو، وہ رہین منت ہونے کے باوجود ہمیشہ آزاد رہے اور کسی پابندی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسی افریقہ کے معاملہ میں تین چار لاکھ روپیہ پر اس آسانی سے وہ لات نہ مارتے۔

باب ۴۶

ساردا ایکٹ

محمد علی کی آخری جدوجہد ساردا بل کی تنسیخ پر منتج ہوئی۔ اس بل کے خلاف وہ اگر سخت علیل اور صاحبِ فراش نہ ہوتے تو یقیناً اپنی پوری کوششیں صرف کرتے اور اسے منسوخ کرا کے دم لیتے، لیکن اس سے پہلے اُنہوں نے دم ہی دے دیا!

ساردا بل کیا تھا؟:

اجمیر کے مسٹر ہر بلاس ساردا نے اسمبلی میں ایک تجویز پیش کی کہ چونکہ علی العموم ہندوؤں میں یہ عادتِ قبیحہ پائی جاتی ہے کہ وہ نہایت کمسنی میں بچوں اور بچیوں کی شادی کر دیتے ہیں جس کا اثر بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشو ونما، اخلاق و عادات اور صحت پر بہت برا پڑتا ہے، لہٰذا ایک ایسا قانون نافذ کیا جائے جس سے اس رسم کا انسداد ہو سکے۔

ساردا بل محدود تھا:

مگر اسمبلی کے ایک مسلمان ممبر نے اس بل کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ اس بل کو محدود نہ رکھا جائے بلکہ عام کر دیا جائے اور اسے ہندوستان کی ساری قوموں پر بلا استثنا نافذ کیا جائے، ان کی تحریک پر بل کو ''نتیجہ مجلس'' کے سپرد کیا گیا اور بالآخر ہوا یہ کہ اسے سارے ہندوستان پر نافذ کر دیا گیا اور اب قانوناً کہیں بھی کسی صورت میں بھی کسی نابالغ لڑکے یا لڑکی کا عقد نکاح نہیں ہو سکتا۔

محمد علی کا اختلاف:

پہلے پہل جب یہ بل اسمبلی میں پیش ہوا تو اُس وقت علماء میں سے کسی کو خیال بھی نہیں آیا، لیکن محمد علی نے اُس وقت اِس قانون کی مضرتوں کا اندازہ کر لیا تھا جو اُن کے نقطۂ نظر سے نہایت اہم تھیں، اس لیے اُنہوں نے اُسی وقت ''ہمدرد'' میں اس پر مسلسل مقالات و مضامین لکھے اور قوم کو متوجہ کیا کہ وہ اس قانون کا مقابلہ کرے اور اسے ہرگز نہ منظور ہونے دے۔ اگر ہندو اپنے ہاں اس قسم کے قانون کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو چشم ما روشن دل ماشاد، لیکن مسلمانوں کو الحمد للہ کہ اس قسم کی پابندیوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اس لیے کہ اُن کے ہاں اوّل تو یہ رسم بد پائی نہیں جاتی، اور اگر ان سے ایسا ارتکاب ہوتا ہے تو بالکل ناگزیر حالت میں۔

مسلمانوں میں خاموشی:

لیکن ان مقالات اور صدائے احتجاج سے مسلمانوں میں کوئی حرکت نہیں پیدا ہوئی، وہ اس طرح غافل رہے کہ جیسے ساردا بل پیش ہی نہیں ہو رہا ہے۔

اسی جمود و سکوت کی حالت میں یہ بل ''مجلس نتیجہ'' میں گھومتا رہا اور دوسری کارروائیاں ہوتی رہیں، شہادتیں لی جاتی رہیں اور کسی قسم کی کوئی صدائے احتجاج نہیں بلند ہوئی۔

مولانا احمد سعید کی شہادت:

چنانچہ جمعیت العلمائے ہند کے محترم ناظم جناب مولانا احمد سعید صاحب نے بھی اس ''مجلس منتخبہ'' کے سامنے شہادت دی تھی اور اس بل کی مخالفت نہیں کی تھی۔ بہر حال بل کی غالباً دو خواندگیاں ہو گئیں، اب تیسری خواندگی کا جب وقت آیا تو پھر ایک ہلچل مچ گئی، جمہور مسلمین میں بھی ایک خاص انہماک پیدا ہو گیا اور ملک کی دوسری جماعتیں بھی اس کے خلاف مصروف پیکار ہو گئیں۔

چنانچہ جمعیت العلمائے ہند اور مولانا احمد سعید صاحب نے بھی اس بل کی مخالفت میں بہت زیادہ جوش و سرگرمی کا اظہار کیا۔

محمد علی میدانِ عمل میں:

محمد علی اُس زمانے میں سخت علیل تھے مگر جب اس کی تیسری خواندگی بھی قریب آن پہنچی اور گورنمنٹ کچھ بھی متاثر نہیں ہوئی اور اس کا احتمال پیدا ہو گیا کہ وہ اب ضرور ہی پاس ہو جائے گا تو ایک بار پھر محمد علی میدانِ عمل میں آئے اور تحریر و تقریر سے اور ہر ممکن ذریعہ سے اس کی تنسیخ کی جدوجہد کی، گو نتیجہ کچھ نہیں نکلا!

خواندگی ختم:

آخر تیسری خواندگی بھی ختم ہوگئی اور ساردابل مسلمانوں کی مخالفت اور سوراج پارٹی، پنڈت موتی لال، دوسرے ممبرانِ اسمبلی اور بعض مسلم ممبرانِ سوراج پارٹی کی حمایت سے منظور ہو گیا۔

منظوری کے بعد:

بل کے پاس ہو جانے کے بعد مسلمانوں میں حرکت بھی پیدا ہوئی، جوش بھی پیدا ہوا اور غیظ و غضب کی شکنیں بھی ماتھے پر پڑ گئیں، لیکن اب اس کا منسوخ کرانا اتنا آسان نہیں تھا جتنا سمجھا جا رہا تھا۔

محمد علی کو دوگونہ آفتیں:

محمد علی کی ذات اس وقت اتنی قابل رحم تھی جتنی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بہت سخت علیل وہ تھے، کانگرس کے خلاف مصروفِ پیکار وہ تھے، گورنمنٹ کے خلاف وہ تھے، مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اُن سے الجھ رہی تھیں۔ اُسی زمانہ میں جمعیت علماء بھی حریف کے کیمپ میں تبدیل ہوگئی تھی، غرض ہر طرف سے مقابلہ کی دعوت دی جا رہی تھی اور زور بازو کا امتحان ہو رہا تھا۔

وہ غریب کس کس کو جواب دیتا، کس کس سے لڑتا، لیکن پھر بھی اس کے شبات میں لغزش نہیں آئی اور وہ اسی استقلال سے اپنا کام پورا کرتا رہا جو اس کی خصوصیتِ ممیزہ تھی۔

قائم مقام وائسرائے کے نام خط:

لارڈ اردن اُس زمانہ میں ولایت گئے ہوئے تھے۔ غالباً مدراس پریذیڈنسی کے گورنر لارڈ گوسچن اُن کے قائم مقام تھے، اُنہیں نے اس قانون پر تصدیقی دستخط ثبت کیے تھے۔

محمد علی بمبئی میں اُس وقت صاحب فراش تھے، لیکن اپنی علالت کی اُنہوں نے کوئی پروانہیں کی اور ایک نہایت طول طویل مفصل مراسلہ وائسرائے کی خدمت میں بھیجا۔ اُس میں بہ دلائل مذہبی وفقہی یہ ثابت کیا تھا کہ کوئی مسلمان از روئے شرع مجبور نہیں ہے کہ ایک خاص عمر میں شادی کرے اور ایک خاص سن میں نہ کرے۔

دلائل:

اسلام نے مسلمانوں کو اس باب میں بالکل آزاد رکھا ہے اور انسان کے مصالح اور ضروریات پر چھوڑ دیا ہے، مثلاً ایک ضعیف العمر باپ بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہے، اُس کے صرف 6 سال کی ایک لڑکی ہے اور کچھ جائیداد ہے، وہ چاہتا ہے کہ اپنے سامنے کوئی ایسی صورت پیدا کرے کہ وہ اپنی بچی کی طرف سے مطمئن ہو جائے چنانچہ وہ اس لڑکی کا نکاح ایک لڑکے سے کر دیتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ اب ضروری انتظامات مکمل ہو گئے، وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور مر جاتا ہے۔

اور پھر اس نکاح کے یہ معنی نہیں کہ لڑکی اور لڑکا مجبور ہیں کہ اسے ''بیانِ وفا'' سمجھیں، بلکہ بلوغ کے بعد ان دونوں میں سے ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اگر اپنی اس ازواجی زندگی کو پسند نہیں کرتا ہے تو الگ ہو جائے۔ اس لیے مسلمانوں کو اس قانون کی کوئی ضرورت نہیں ہے جبکہ وہ شرعاً آزاد بھی ہیں، جو پابندیاں یا آسانیاں ضروری تھیں ان کا بھی شرع نے کافی لحاظ رکھا ہے۔ آخر میں اس پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ میاں سر فضل حسین نے مسلمان ہونے کے باوجود اس قسم کے قانون کو کیسے منظور کرانے کی کوشش کی جو صاف طور سے ''مداخلت فی الدین'' ہے؟

وائسرائے کا جواب:

لیکن قائم مقام وائسرائے صاحب نے ان دلائل پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور قانون کو اپنے اختیارات سے منسوخ کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی، حالانکہ اگر بجٹ کا یا تخفیفِ مصارف کا مسئلہ ہوتا تو بغیر کسی تحریک کے ''ہز ایکسی لینسی'' کا قلم ''وٹیو'' کے اختیار سے فائدہ اُٹھا رہا ہوتا، لیکن چونکہ ایسا مسئلہ

تھا جس سے گورنمنٹ کو براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے اس پر ''معذوری'' ظاہر کی گئی۔

لارڈ اروِن سے ملاقات:

کچھ عرصہ کے بعد لارڈ اروِن اپنے سفر یورپ سے واپس آ گئے۔ اب محمد علی کی صحت میں بھی کچھ بحالی آ چکی تھی، چنانچہ اس مسئلہ کے متعلق وہ وائسرائے سے ملے اور اُن کو بھی بہ دلائل سمجھانا چاہا کہ یہ مداخلت فی الدین ہے اور گورنمنٹ کی پالیسی کے خلاف ہے، لہٰذا اسے منسوخ کر دینا چاہیے۔

وائسرائے کا جواب:

لیکن اِن تمام دلائل کو سننے کے بعد ہزایکسی لینسی نے جواب دیا کہ مذہب و معاشرت کی حدود جہاں متصادم ہوں، وہاں ایک مہذب اور متمدن حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشرت کا خیال رکھے اور آخر میں انتہائی خوش فہمی سے یہ اُمید بھی ظاہر کی گئی کہ اُمید ہے آپ لوگ بھی اس ضرورت کا سختی سے احساس فرماتے ہوں گے اور مجھ سے متفق ہوں گے۔

محمد علی کا جوشِ ایمانی:

اس جواب سے محمد علی کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہوا اور اُسی وقت اُنہوں نے نہایت جرأت و بے باکی سے لارڈ اروِن کی غلط فہمی رفع کر دی کہ آپ نے ہم لوگوں کے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے، ہم قطعاً آپ کے ہم نوا نہ ہیں نہ ہو سکتے ہیں اور اگر آپ اپنے اختیارات سے اس قانون کو منسوخ یا کم از کم مسلمانوں کو مستثنیٰ نہیں فرماتے ہیں تو پھر ہماری آپ کی جنگ ہے اور میں جاتے ہی اس قانون کی خلاف ورزی کروں گا اور لوگوں کو اس پر آمادہ کروں گا کہ وہ بھی ایسا کریں۔

اس تقریر سے محدم علی کے بعض ''سرکاری'' رفقاء کی جو حالت ہوئی وہ تو خیر ایک مصور کا موقلم ہی پیش کر سکتا ہے، اس لیے اس سے قطع نظر کر کے اصل مقصد کی طرف رجوع کیجیے۔

لارڈ اروِن کی ''درخواست'':

اس تقریر کے بعد لارڈ اروِن نے ''درخواست'' کی کہ آپ اس قانون کے خلاف جو چاہے کیجیے،

لیکن قانون کے حدود میں رہ کر اور حصولِ مقصد کے لیے وہی زیادہ بہتر صورت ہوگی۔

محمد علی کا جواب:

محمد علی نے جواب دیا کہ مذہب کے معاملہ میں قانون اور آئین میرے سنگِ راہ نہیں بن سکتے۔ اگر ضرورت ہوگی تو میں مذہب کے لیے قانون شکن بن سکتا ہوں، اس لیے اِس قسم کا وعدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس گرما گرم گفتگو کے بعد محمد علی واپس چلے آئے اور اپنی عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا جس کا ابھی پورے طور سے آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ خود محرک داعی اجل کو لبیک کہہ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔

❁❁❁

باب ۴۷

علماء کانفرنس

وفات سے ایک سال پیشتر محمد علی نے ایک جدید ''علماء کانفرنس'' کی تاسیس ''جمعیت علمائے ہند'' کے مقابلہ کی کی تھی، ایسا کیوں ہوا؟ ذیل کے صفحات میں یہی جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے!

علماء پر محمد علی کے احسانات:

غدر سے پیشتر ہندوستان کا یہ گرامی قدر طبقہ جس قدر سرافرازیوں اور قدر دانیوں کا مستحق تھا، اس کا پورا پورا ثبوت ہندوستان کے مسلمانوں نے دیا۔ لیکن غدر کے بعد مسلمانوں کی عقیدت میں کمی آتی گئی اور رفتہ رفتہ علماء کے اقتدار کا انحطاط شروع ہو گیا، اس کے اسباب و علل پر مفصل بحث کرنے کی نہ ضرورت ہے نہ کوئی خوشگوار موضوع، اس لیے اس سے قطع نظر کر کے اجمالاً یوں سمجھ لیجیے کہ علماء کی عام طور سے حالت یہ تھی کہ گوشہ عزلت میں بیٹھے ہوئے وہ صرف درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے اور خود یہ فرائض کس نوعیت کے تھے، اسے بھی چھوڑ دیئے۔

انگریزی تعلیم یافتہ یہ کہتے ہیں کہ سیاست اور چیز ہے اور مذہب دوسری چیز، لیکن ان لوگوں نے اپنے طرزِ عمل سے اس دعوے کی دلیل مہیا کی۔

عموماً سوا اس کے کہ وہ لوگوں کو مسئلہ مسائل کی تعلیم دیں یا صوفی ہو جائیں یا اگر کوئی گستاخی کرے تو اسے کافر کہہ دیں، دوسرے فرائض و واجبات سے بہت کم دلچسپی لیتے تھے، چاہے مسلمانوں پر جتنی بڑی آفت کیوں نہ آ جائے، چند مستثنیات سے قطع نظر کر کے بیشتر کی حالت یہی تھی۔

سر یعقوب کا خیال:

سر محمد یعقوب نے بالکل سچ کہا ہے:

''محمد علی کی زندگی کے سب سے نمایاں اور درخشندہ دو کارنامے ہیں۔ ایک مسلمانوں کی مذہبی جماعت میں بیداری اور سیاسی احساس پیدا کرنا ہے، حاشا وکلا اس سے میرا مقصود حضرات علماء کی کسی طرح کی تحقیر یا تنقیص ہرگز نہیں ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے علماء مذہبی زندگی مساجد اور عربی مدارس میں بسر کرتے تھے اور سیاسی میدان سے وہ کوسوں دور تھے۔ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش سے ندوۃ العلماء کی تحریک کے سلسلہ میں علماء کی ایک جماعت کو ضروریاتِ زمانہ کا کچھ احساس ضرور پیدا ہو گیا تھا اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ میں چند ایسے نوجوان عالم پیدا ہو گئے تھے جو مضطرانہ طور پر قدامت پرستی کی زنجیروں کو توڑنا چاہتے تھے، لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ گوشہ عزلت میں بیٹھنے والے علماء کو سیاسی پلیٹ فارم پر لانا محمد علی ہی کی جادو اثر کوششوں کا نتیجہ تھا۔ علمائے اسلام کی جادۂ عمل میں اس انقلاب کے پیدا ہونے سے جو محشر خیز نتائج آئندہ پیدا ہوں گے، وہ ہمیشہ اس ملک کی تاریخ میں محمد علی کے نام کے ساتھ منسوب کیے جائیں گے۔''

جمعیت العلماء بہ حیثیت متبع کے:

محمد علی کے مرشد مولانا عبدالباری مرحوم نے اس جمعیت کا سنگِ بنیاد اپنے دستِ حق پرست سے رکھا اور رفتہ رفتہ اس جمعیت نے سارے ہندوستان میں اپنا اثر واقتدار پیدا کر لیا اور سارے مسلمان اس کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

سیاست کیا تھی؟

لیکن اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جمعیت کے قیام کے وقت سے 1929ء تک برابر مسلسل، غیر

منقطع طور پر جمعیت العلمائے ہند کا سیاسی نظریہ کیا تھا؟ وہ کس اصولِ سیاست کی پابند تھی؟ کن سیاسی لائنوں پر وہ اپنی قوم کی رہنمائی کرنا چاہتی تھی؟ اس کا مختصر لیکن نہایت جامع و مانع جواب یہ ہے کہ اس کی پالیسی وہ تھی جو محمد علی کی تھی۔ اس کا نظریہ وہ تھا جو محمد علی کا تھا، اس کی سیاسی لائن وہ تھی جو محمد علی کی اختراع کی ہوتی۔ ہر جزئی سے جزئی معاملہ میں، ہر اہم سے اہم معاملہ میں، ہر نازک سے نازک وقت پر جمعیت العلماء نے بلا تامل و بلا تذبذب محمد علی کی رفاقت کی۔

''انکشافِ راز'':

لیکن جس طرح عشق و محبت کا چھپانا مشکل ہے، اُسی طرح تقلید کا راز بھی آخر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ جمعیت العلماء کا یہ نہایت معقول روّیہ کہ وہ محمد علی کو اپنا قائد سمجھ رہی تھی اور چونکہ اس کے محترم ارکان سیاست کے فن سے ناآشنا تھے اس لیے اگر محمد علی کی سیاست پر اُنہوں نے اعتماد کیا تو گناہ کیا ہو گیا؟ محمد علی بھی تو آخر ''عربی نہیں جانتے تھے'' اور وہ برابر اپنے شکوک حضرت مفتی صاحب، مولانا احمد سعید صاحب وغیرہ سے رفع کر لیا کرتے تھے۔

لیکن مخالفین کو تو ایک موقع چاہیے، چنانچہ اُنہوں نے جمعیت علماء کو ''بدنام'' کرنا شروع کیا کہ جمعیت علماء محمد علی کی تابع مہمل ہے، اس کے (محترم) ارکان محمد علی سے لرزتے ہیں اور اُن کے خلاف ایک حرف کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ محمد علی نے اُن سب پر اپنی سیادت قائم کر لی ہے اور جو جی میں آتا ہے جائز ناجائز، مناسب غیر مناسب، سب اُن لوگوں سے کام نکال لیتے ہیں اور یہ لوگ ایسے ''سادہ لوح'' ہیں کہ آلہ کار بن جاتے ہیں۔

غرض اس قسم کے سفیہانہ اور رکیک الزامات سے جمعیت علماء کو زیادہ سے زیادہ مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی۔

''آزادہ روی'' کا فیصلہ:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کے مسلسل اور مکروہ پروپیگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ جمعیت کے محترم

ارکان کے دل میں بھی یہ بات جم گئی کہ یہ بدنامی بڑی حد تک صحیح ہے کہ جمعیت نے اب تک محمد علی کی حمایت ہی کی مخالفت کبھی نہیں کی لہٰذا اب ذرا مخالفت بھی ہو جائے۔

اس پروپیگنڈے کا یہاں تک اثر ہوا کہ راقم الحروف نے خود جمعیت کے ایک محترم رکن سے یہ شکایت سنی کہ کوئی ''عالم'' بھی آج تک خلافت کا صدر رہا ہے؟ پھر ہم جمعیت کا صدر محمد علی کو کیوں بنا دیں؟

بنائے اختلاف:

بدقسمتی سے اُسی زمانہ میں جمعیت کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا اور صدارت کے لیے بعض حضرات کی طرف سے محمد علی کا نام پیش کر دیا گیا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی اور طے کر لیا گیا کہ محمد علی کی صدارت سے اختلاف کیا جائے گا اور اس میں پوری کوشش صرف کر دی جائے گی۔

مراد آباد کا جلسہ:

چنانچہ مراد آباد میں جمعیت کی مجلس مرکزیہ کا جلسہ ہوا اور اس میں صدارت کے لیے کشمکش شروع ہوئی۔ ایک جماعت تھی جو محمد علی کو صدر بنانا چاہتی تھی اور دوسری جماعت تھی جو اُن کو کسی حالت میں بھی اس منصبِ گرامی کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔ پہلے خوب گرما گرم بحثیں ہوئی اور بعد کو پھر فیصلہ یہی ہوا کہ صدارت کے لیے محمد علی کا نام منظور نہیں کیا گیا۔

یہ تھی وہ پہلی مخالفت جو جمعیت العلماء اور اس کے محترم اراکین کی جانب سے علی الاعلان پبلک پر ظاہر ہوئی۔

محمد علی کا روّیہ:

محمد علی ظاہر ہے کہ اِس اختلاف اور اِس فیصلہ سے خوش نہیں ہوئے اور اُنہیں یقیناً صدمہ ہوا کہ ان کو صدارت سے صرف اس لیے محروم کیا گیا کہ وہ سند یافتہ عالم نہیں تھے، ورنہ ''بہت سے عالموں سے

بڑھ کر" تو خود جمعیت کے محترم کارپرداز حضرات بھی مانتے تھے۔

ایک دِل شکن حملہ:

صرف اِسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ محمد علی کی قابلیت اور عربی استعداد پر بھی حملے کیے گئے۔

سنا ہے کہ جمعیت کے ایک محترم رکن نے برسر اجلاس فرمایا کہ محمد علی تو قرآن شریف تک غلط پڑھتے ہیں، وہ صدارت کیا کر سکیں گے؟ گویا صدارت کے لیے صرف ونحو کی قابلیت بھی ضروری تھی؟ بہر حال اِن دِل شکن اور افسوس ناک کارروائیوں کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا اور صدارت کے لیے ہندوستان کے مشہور مخدوم قوم اور خادم اسلام مولانا معین الدین صاحب مدظلہ کا انتخاب ہوا جنہوں نے اِس روش کے بعد صدارت قبول کرنے سے قطعاً انکار کر دیا اور ممبری سے بھی استعفیٰ دے دیا۔

محمد علی کے رفقاء:

لیکن جن لوگوں نے محمد علی کا نام صدارت کے لیے پیش کیا تھا، وہ اِس ناکامی کے بعد جس کی بنیاد صرف تنگ خیالی اور غلط فہمی تھی، خاموش کیسے بیٹھ سکتے تھے؟

اُنہوں نے کہا کہ جب جمعیت العلماء کا دائرہ اس قدر تنگ ہے کہ اُس کے اجلاس کا صدر محمد علی کا سا مجاہدِ راہِ حق، عاشق رسول، شیفتہ مذہب، جانبازِ اسلام اور وسیع النظر عالم نہیں ہو سکتا تو یقیناً ایک جدید جمعیت العلماء کی ضرورت ہے جس میں اِس قدر تنگ دلی کا مظاہرہ نہ ہو سکے۔ اُن کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ علماء کی کثرت اس خیال کی حامی نہیں ہے، وہ ضرور اپنی مجلس کا صدر نشین محمد علی کو بنانا چاہتی ہے۔

کانپور علماء کانفرنس:

چنانچہ کانپور میں ایک جدید جمعیت العلماء کی تاسیس وقوع میں آئی اور اس کے دائرہ عمل کو بہ نسبت اس جمعیت العلماء کے ذرا زیادہ وسیع کر دیا گیا تاکہ مسلمانوں کی ہر جماعت اور طبقہ اس سے اشتراک عمل کر سکے۔ مولانا عبدالماجد صاحب بدایوانی، مولانا عبدالکافی، مولانا قاری شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا قطب الدین صاحب عبدالوالی اور دوسرے مشہور علماء نے ایک دوسری جمعیت کے قیام پر آمادگی کا

اظہار کیا۔

اجلاس:

آخر کانپور میں دسمبر 1929ء میں ''علماء کانفرنس'' کا اجلاس محمد علی کی صدارت میں شریک ہوا اور خیر وخوبی سے ختم ہوا۔

حاضرین:

داخلہ ٹکٹ سے تھا، حاضرین کی تعداد پانچ ہزار سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ اگرچہ بادو باراں کی کثرت نے حواس پریشان کر رکھے تھے، لیکن جوق در جوق کانپور اور دوسرے مقامات سے لوگ آ کر شریکِ اجلاس ہو رہے تھے جن میں سے ایک محمد علی کا یہ سوانح نگار بھی تھا جس نے اس جلسہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

تحریک وتائید:

مولانا عبدالماجد صاحب بدایوانی نے صدارت کے لیے محمد علی کا نام پیش کیا اور جدید جمعیت العلماء کے قیام وتاسیس کی ضرورت اور سابق جمعیت کے طرزِ عمل پر ایک مفصل تقریر کی، پھر محمد علی کا استحقاق جتایا اور بتلایا کہ محمد علی اپنی خصوصیات کی بناء پر اس منصبِ رفیع کے کس قدر زیادہ بہ نسبت دوسروں کے مستحق ہیں۔

تائید کرنے والوں میں مولانا عبدالکافی، علامہ ثقۃ الاسلام (بمبئی)، قطب الدین عبدالوالی صاحب، مولانا اعجاز حسین پرنسپل مدرستہ الواعظین (لکھنؤ)، مولانا فاخر اور ہندوستان کے بیسیوں محترم علماء تھے۔

آپ باور فرمائیے کہ تحریک وتائید کا ایسا عجیب وغریب منظر کم دیکھا گیا ہوگا۔

اتنے علماء نے اپنی مختصر مختصر تقریروں میں محمد علی کی صدارت کی تائید کی کہ پہلے اجلاس میں دوسری کارروائی کا وقت ہی نہیں رہا، سارا وقت اسی تائید میں صرف ہو گیا۔ محمد علی کی عظمت وجلالت کا اندازہ

کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ گروہِ علماء کی اتنی بڑی جماعت نے اُن کی ہم نوائی کی، اُن کو صدارت کا منصب بخشا اور اُن کے مقابلہ میں ایک دوسری جمعیت قائم کردی۔ اتنا بڑا ہنگامہ اُنہیں شخصیتوں کے لیے ہوتا ہے جو غیر معمولی جوہرِ کمال اپنے اندر رکھتی ہیں۔

خطبہ صدارت:

اِس تائید وتحریک کے بعد محمد علی بالکل عربی وضع میں عبا پہنے، عمامہ باندھے، کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے۔ اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ مجمع نے اپنے مسرتِ بے پایاں کا اظہار کیا۔

لیکن اُن کی حالت کیا تھی؟ ایک دوسرے آدمی کے سہارے سے وہ کرسی پر تشریف لا سکے، کمزوری اور ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ خود اپنا خطبۂ صدارت نہ پڑھ سکے، ایک دوسرے صاحب نے سنایا جس کا ایک اہم جزو یہ ہے۔ علماء کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

''کیا تفقہ فی الدین کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا؟ دُنیائے اسلام ائمہ اربعہ کی ہمیشہ ہمیشہ ممنونِ احسان رہے گی کہ اُنہوں نے تفقہ فی الدین سے کام لے کر فقہ اسلام کو مرتب فرمایا لیکن کیا اُنہیں کی درخشندہ مثال ہمارے لیے شمع ہدایت کا کام نہیں دیتی؟

میری غرض صرف اِس قدر ہے کہ آپ کو یاد دلاؤں کہ اجتہاد کا دروازہ آپ لاکھ بند کریں، زندگی کا دروازہ آپ تا قیامت نہیں بند کر سکتے اور جب تک یہ دوسرا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ہزاروں نئے مسائل آپ کے سامنے ایسے آئیں گے کہ اُن کا حل آپ کو کرنا ہو گا اور اگر آپ نہ کریں گے تو ہم جیسے امی اور جہلا اُن کا حل کرنے پر مجبور ہوں گے۔ یہ وہ مسائل نہیں کہ جو ائمہ اربعہ کے سامنے پیش ہو چکے تھے اور جن کا حل اُنہوں نے قرآن کریم اور احادیث نبوی کے تفقہ سے خود فرمایا تھا، یہ وہ نئے مسائل ہیں جو زندگی کی روز افزوں پیچیدگی کے باعث پہلی بار نوعِ انسانی کے سامنے آتے رہتے ہیں اور اُن کے حل کرنے سے خواہ وہ حل صحیح ہو یا غلط، انسان گریز نہیں کر سکتا۔

کیا آپ چاہتے ہیں کہ اُن کا حل ہم جیسے امی اور جاہل کریں جنہیں نہ قرآن کریم پر عبور ہے نہ احادیث نبوی پر، آپ جیسے علمائے کرام جنہوں نے اپنی زندگیاں اُنہیں کے مطالعہ کے لیے وقف کر دی ہیں، میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ اس قسم کے اجتہاد سے اجتناب ہی نے ہماری آج یہ حالت کر دی ہے کہ ہم عہدِ حاضرہ کے فتنوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اور جوں جوں اُن سے نکلنا چاہتے ہیں، اَور اُن میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ جس فلسفی شاعر نے ملتِ اسلامیہ کو رمز حیات سکھایا ہے، اُس کے یہ بھی شعر ہیں:

برزم اقوام کہن برہم ازو
شاخسارِ زندگی بے نم ازو
جلوہ اش مارا ز ما بیگانہ کرد
ساز مارا از نوا بیگانہ کرد
از دلِ ما آتش دیرینہ برد
نور و نارِ لا الہ از سینہ برد

اگر ہم نے عہدِ حاضرہ کے فتنوں کا نور و نارِ لا الٰہ سے مقابلہ کیا ہوتا اور اجتہاد و جہاد دونوں کو جاری رکھا ہوتا تو آج ہم اِس زمانہ انحطاط تک نہ پہنچے ہوتے۔"

❀❀❀

باب ۴۸

لاہور کا قومی ہفتہ

کانپور کی علماء کانفرنس کے بعد آخر دسمبر 1929ء میں محمد علی نے لاہور کا رخ کیا جہاں قومی ہفتہ منایا جا رہا تھا اور کانگریس و خلافت کے سالانہ اجلاس ہو رہے تھے۔

گاندھی جی سے گفتگو:

کانگریس کا یہ سالانہ جلسہ نہایت اہم تھا۔ کلکتہ میں گاندھی جی نے وائسرائے اور برطانیہ کو ایک سال کی جو ''مہلت'' دی تھی، وہ ختم ہوگئی تھی اور اب دریائے راوی کے کنارہ آزادیٔ کامل کا پرچم لہرایا جانے والا تھا، اس لیے کہ اس مہلت سے گورنمنٹ نے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھایا اور ہندوستان کو درجۂ مستعمرات نہیں دیا۔

لیکن محمد علی نے کانگریس کے فیصلہ اور خلافت کی آئندہ پالیسی متعین کرنے سے پیشتر گاندھی جی سے آخری گفتگو کر لینا ضروری خیال فرمایا۔ چنانچہ وہ گاندھی جی سے ملے اور اُن کو سمجھایا کہ اگر اب بھی آپ عام مسلمانوں کے مطالبات منظور کرلیں اور شکایات رفع کر دیں تو ہمارا اشتراکِ عمل حاصل کر سکتے ہیں اور پھر نہایت ہم آہنگی سے مسلمان آپ کا ساتھ دیں گے اور دونوں ساتھ ہی ساتھ منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔

گاندھی جی کا جواب:

لیکن گاندھی جی اُس وقت ''کامل آزادی'' کے خیال میں تھے، وہ اپنی راہِ عمل میں کسی قسم کی

پابندیاں حائل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے انکار کردیا اور کہہ دیا کہ اب تو ہم آزادیٔ کامل کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز کرنے والے ہیں، لہٰذا اس وقت تو آپ غیر مشروط طور سے ہمارا ساتھ دیجیے، پھر آزادی حاصل کرنے کے بعد آپ کے مطالبات پر غور کیا جائے گا اور حقوق کی تقسیم ہوتی رہے گی، لیکن ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔

محمد علی پر اثر:

اپنی کوششوں کی ناکامی سے محمد علی بہت مایوس ہوئے اور اب اُن کے لیے کوئی چارہ کار نہیں باقی رہ گیا کہ وہ کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرسکیں، اس لیے کہ آزادیٔ کامل و ناقص کے متعدد دَور اُن کے سامنے تھے اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ

بہ مرگش گیر تابہ تپ راضی شود

کے ہمہ گیر اصول کے مطابق صرف درجہ مستعمرات لینے کی تیاریاں ہیں، اس لیے وہ تصفیہ حقوق پر مصر رہے اور آخر مجبوراً اُنہیں اپنی راہِ عمل الگ متعین کرنی پڑی۔

خلیج اختلاف:

لاہور کے قومی ہفتہ سے جو آگ سلگ رہی تھی، بھڑ اٹھی اور مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کانگریس سے اپنا رشتہ منقطع کر کے خود اپنے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کرے اور اس کے بعد اپنی منزلِ مقصود کی طرف رجعت کرے۔

اجلاس کے اختتام کے بعد بھی اور اس سے پہلے بھی محمد علی پر بہت زور ڈالا گیا کہ وہ ''غیر مشروط'' طور پر ہتھیار ڈال دیں، مگر اُنہوں نے انکار کردیا۔

مسلمانوں میں اختلاف:

جو مسلمان کانگریس کے ہم نوا تھے، وہ خلافت کانفرنس کے اس فیصلہ کے بعد اور کانگریس سے علیحدگی کے بعد بہت برہم ہوئے اور آپس کے یہ اختلافات روز بروز بڑھتے گئے، محمد علی پر رجعت پسندی

کا الزام بھی لگایا گیا۔

مگر وہ ان چیزوں سے متاثر نہیں ہوئے، مسلمانوں کے دِلوں میں آزادی کا بیج محمد علی نے بویا تھا، مسلمانوں کو گورنمنٹ کے خلاف محمد علی ہی نے صف آراء کیا تھا اور مسلمانوں میں ایثار و قربانی کے جذبات محمد علی ہی نے پیدا کیے تھے۔ اگر وہ اپنے ضمیر کی پیروی میں کانگریس سے علیحدہ ہوئے تھے تو اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ رجعت پسند ہو جاتے یا حکومت کے دام فریب میں پھنس جاتے۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جھٹکے میں
جسے غرور ہو، آئے! کرے شکار مجھے

باب ۴۹

گول میز کانفرنس

کانگریس کے متعلق محمد علی کے تاثرات و خیالات اور محسوسات و جذبات کا ذکر ہو چکا ہے، یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے اُنہیں بالآخر کانگریس سے دل برداشتہ کر دیا۔

دعوت کیوں قبول کی:

محمد علی نے اپنی خطرناک علالت کے باوجود یہ طول طویل زحمتِ سفر کیوں برداشت کی اور کیوں نہ جانے سے معذوری ظاہر کر دی، یہ ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے لیکن محمد علی کے لیے اِس کے سوا چارہ کار کیا تھا؟ کانگرس کی جو روش تھی اس سے وہ مایوس ہو چکے تھے۔ گول میز کانفرنس کے لیے جن مندوبین کا انتخاب عمل میں آیا تھا، اُن میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو محمد علی کی طرح قوم کا درد اپنے دل میں رکھتا ہو یا محمد علی کے خیالات و معتقدات سے اتفاق رکھتا ہو، اس لیے بجا طور سے اُنہیں خیال تھا کہ گول میز کانفرنس میں بغیر اُن کے گئے ہوئے مسلمانوں کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکتی۔

اپنے ان خیالات کا اظہار اُنہوں نے اپنے مکتوب بنام مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی میں بھی کیا تھا۔ لوگوں نے لاکھ لاکھ سمجھایا، نشیب و فراز کی طرف رہنمائی کی، صحت کے خطرات سے آگاہ کیا، سب جتن کیے مگر محمد علی جو عزم کر چکے تھے اُس سے اُنہوں نے رجوع نہیں کیا۔ اُن کا تو اس پر عمل تھا:

ناصح! کہے سنے پہ ہمارا نہیں عمل
جو دِل میں آ گیا، وہ کیا کوئی کچھ کہے

مظاہرہ کا اندیشہ:

محمد علی کی خبر روانگی جب مشہور ہوئی تو بمبئی کے بعض مدعیانِ حریت نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ مندوبین گول میز کانفرنس کو سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ الوداع کہیں گے اور اس کے انتظامات بھی مکمل ہو رہے تھے اور اعلان کر دیا گیا تھا کہ مندوبین کی روانگی کے روز مظاہرہ کیا جائے گا۔

مسلمانانِ بمبئی اس خبر سے سخت مشتعل ہوئے۔ وہ اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اُن کے محترم رہنما کو سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ الوداع کہا جائے۔ اُنہوں نے بھی پورے طور سے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے اس سردار کو پھولوں اور ہاروں اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ الوداع کہیں گے خواہ اس میں تصادم ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اس ''خبر وحشت اثر'' نے مخالفین کے کیمپ میں تہلکہ ڈال دیا اور مجبوراً یہ ارادہ فسخ کر دینا پڑا، محمد علی بجائے سیاہ جھنڈیوں کے اپنے بہت سے مخلصوں اور عقیدت کیشوں کی دِل سے نکلی ہوئی دعاؤں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ مشتاقانِ زیارت اُس وقت تک جہاز کی طرف ٹکٹکی لگائے رہے جب تک جہاز آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

تبادلہ خیالات:

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ محمد علی کس حالِ زار کے ساتھ لندن پہنچے تھے، لیکن چونکہ دِل سے کام کی لو لگی ہوئی تھی اس لیے اُنہوں نے اپنی صحت سے بے نیاز ہو کر مستعدی اور کارگزاری کی انتہا کر دی۔ وزراء اور امراء اور مدیرانِ جرائد سے مسلسل تبادلہ خیالات کیا۔ اُنہیں ہندوستان کے حالات بتائے، سیاسی پیچیدگیاں سمجھائیں، ہندو مسلم اختلافات کی سیاسی اہمیت بتلائی، غرض تمام حالات آئینہ کر کے رکھ دیئے۔

مکتوب بنام مولانا عرفان:

اپنے ایک خط میں جو مولانا عرفان صاحب کو لکھا گیا تھا، پہلے تو اپنی علالت کا مفصل تذکرہ کیا ہے،

پھر فرمایا ہے:

''اس پر بھی وہ کام کر رہا ہوں جو نہ کسی سے ہوسکتا ہے نہ کرتا ہے۔ بااثر لوگوں پر گفتگو سے اثر ڈالتا ہوں، ٹیلی فون پر رات دن گھنٹوں باتیں ہوا کرتی ہیں، خواہ ٹائمز کا فارن ایڈیٹر ہو، خواہ برنارڈ شا۔

وزیر ہند نے نہایت شرافت سے خود ہی دوبارہ یہاں آنے پر اصرار کیا، اس طرح گھنٹہ بھر (گفتگو کی)۔ (وزیر ہند نے) مجھ سے اعتراف کیا کہ تم نے جو باتیں بتائیں وہ تو عجیب وغریب ہیں، پیچیدہ ترین مسائل پر جو سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے، آج ''ایک روشنی کا سیلاب ٹوٹ پڑا''۔ اسی طرح اخبار ''اسپیکٹیٹر'' کے ایڈیٹر سے دو گھنٹہ باتیں ہوا کیں اور اس پر پورا پورا اثر پڑا۔ اسی طرح ٹائمز کے فارن ایڈیٹر سے ساڑھے دس بجے سے شب کے بارہ بجے تک ٹیلی فون پر گفتگو ہو چکی تھی، خود ہی اُس نے ملنے کے لیے درخواست کی، پھر سوا گھنٹہ اُس سے ہندوستان کے متعلق گفتگو ہوئی، یہ بھی گرویدہ ہو کر گیا ہے۔''

غرض جب تک محمد علی میں سکت رہی، وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے ٹیلیفون کرتے رہے۔ معاملہ اہم ہوا تو اپنے ''غم خانہ'' میں کبھی لارڈ سینکے سے شوکت صاحب کی مخالفت کے باوجود گفتگو ہو رہی ہے، کبھی مسٹر بن، وزیر ہند سے... کبھی سر اکبر حیدری سے اور کبھی سر احمد سعید سے، تا آنکہ ''بیماریٔ دل'' نے کام تمام کر دیا اور ملتِ اسلامیہ اپنے عظیم المرتبت پیشوا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

❀❀❀

باب ۵۰

تقریر

نامناسب نہ ہوگا اگر محمد علی کی اس تاریخی تقریر کے چند اہم اقتباسات بھی پیش کر دیئے جائیں جو اُنھوں نے گول میز کانفرنس میں علالت اور نقاہت کے سبب بیٹھے بیٹھے کی تھی۔

اب بزم میں حاضر جو کوئی پیر و جواں ہے — دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرتِ سودؔا کو سنا بولتے یارو — اللہ رے اللہ! کیا زور بیاں ہے

ڈیلی ہیرالڈ کا جواب:

''جب میں اِس ملک میں پہنچا تو یہاں کے ایک اخبار ''ڈیلی ہیرالڈ'' نے جس کے استحکام میں مَیں نے بھی حصہ لیا تھا، میری تصویر شائع کی اور میری نسبت لکھا کہ میں نے اپنا عقیدہ تبدیل کرلیا ہے۔

میری رگوں میں وہی خون ہے جس سے لارڈ ریڈنگ کی رگیں معمور ہیں جنھوں نے مجھے قید کیا تھا، میں سامی نسل سے تعلق رکھتا ہوں اور اگر لارڈ ڈ ریڈنگ نے صیہونیت سے برگشتگی اختیار نہیں کی... (قہقہہ) تو میں نے بھی اسلام کو ترک نہیں کیا۔ میں جہاں پہلے تھا، وہیں اِس وقت تک ہوں۔''

نمائندگی کا معیار:

''اپنی جماعت کا میں ہی ایک فرد ہوں جسے ہزاایکسی لینسی وائسرائے نے یا ملکِ معظم

کی حکومت نے یا کسی دوسری ہیئتِ حاکمہ نے جس کی ہدایت کے ماتحت اِن عجیب و غریب مندوبین کا تقرر عمل میں آیا ہے، منتخب کر کے یہاں بھیجا ہے۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ ہم کس کے مندوب ہیں؟ (قہقہہ) میں کسی جماعت کی نمائندگی کا دعویدار نہیں۔"

لارڈ پیل پر تنقید:

"ٹینی سن نے قدامت پسندی کی تعریف یہ کی ہے کہ بہترین قدامت پسند وہ ہے جو خشک شاخ کو کاٹ ڈالتا ہے۔ لارڈ پیل نے خلوص و صاف گوئی کے ساتھ جن خیالات کا اظہار کیا، وہ سوکھی ہوئی شاخ کے مانند ہیں جسے کاٹ ڈالنا چاہیے۔ (قہقہہ) باقی رہا دوسرا قدامت پسند، یعنی ہمارے والئی ریاست ہزاہائنس مہاراجہ صاحب ریوا... تو میں نہیں سمجھتا کہ اُنہیں قدامت پسند ماننا چاہیے یا نہیں؟ (قہقہہ) ہزاہائنس نے برک کے حوالہ سے کہا تھا کہ "چھوٹے دِلوں اور بڑی سلطنتوں کا کوئی ساتھ نہیں۔"

اگر آپ برک کے بنائے ہوئے راستہ پر چلتے تو امریکہ آپ کے ہاتھ سے نہ جاتا، آج آپ کو جنگی جہازوں کا شور نہ سنائی دیتا، قرضے ادا نہ کرنے پڑتے، یہ پریشانیاں لاحق نہ ہوتیں، تخفیفِ اسلحہ کانفرنس کے لیے راستہ صاف کرنے کی غرض سے آپ کو بار بار جینوا جانا نہ پڑتا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ تیاریاں کب تک جاری رہیں گی؟ (قہقہہ) یہ ساری مصیبتیں آپ کو اس لیے پیش آئیں کہ آپ نے اپنے سب سے بڑے سیاست داں اور سب سے بڑے مدبر کے قول کو پس پشت ڈال دیا۔"

ضرورت ہے اک انسان کی:

"یہ وہی شخص تھا جسے دارالعلوم میں "کھانے کی گھنٹی" کہا کرتے تھے، کیونکہ جب برک تقریر کے لیے اُٹھتا تھا تو آپ سب لوگ کھانے کے کمرے میں چلے جاتے

تھے۔ برک جیسے آدمیوں کے ساتھ آج بھی آپ لوگوں کا سلوک ایسا ہی ہے اور اسی لیے میں دوبارہ برک کے الفاظ کا حوالہ دیتا ہوں کہ ''تجاویز کی ضرورت نہیں، آدمیوں کی ضرورت ہے۔'' میں اِس بات کی پروا نہیں کرتا کہ آپ ہمارے لیے کون سا دستورِ اساسی تیار کرتے ہیں لیکن کاش! آپ کے پاس انگلستان میں ایک آدمی بھی ہو جو درحقیقت انسان ہو اور جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے:

''اے خدا! ایسا انسان دے جو دِل و دماغ اور ہاتھ رکھتا ہو، وہ اُن بعض بڑے آدمیوں کی طرح ہو جو ہمیشہ کے لیے گزر چکے ہیں۔ ایک شور و غوغا سے لبریز سرزمین میں ایک طاقتور آدمی کی ضرورت ہے۔ وہ خواہ امیر ہو، خودمختار ہو، جمہوریت پسند ہو، کچھ بھی ہو مگر ایسا ہونا چاہیے جو حکومت کر سکے اور جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرے۔''

مجھے اُمید ہے کہ میرے قدیم دوست مسٹر میکڈانلڈ کم سے کم اپنے تئیں اس حکمران آدمی کو ثابت کر دکھائیں گے اور وہ اپنی جماعت، اپنے ضمیر، اپنی مردہ بیوی کی روح اور اپنے زندہ ملک سے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کریں گے۔

ہندوستان کے والیانِ ریاست کی حیرت انگیز حب الوطنی کو دیکھ کر جو ہندوستان کا قدامت پسند عنصر ہے، میرا ایمان زیادہ مستحکم ہو گیا ہے (نعرۂ تحسین)۔ لارڈ پیل اور لارڈ ریڈنگ کے لیے یہ نئی بات ہو گی لیکن میرے لیے نئی بات نہیں ہے۔ ڈیلی ہیرالڈ نے کہا ہے کہ میں نے اپنا سیاسی عقیدہ تبدیل کر لیا ہے، اب میں گورنمنٹ کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ میں شیطان کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہوں، میں کہتا ہوں کہ میں شیطان کے ساتھ مل کر بھی کام کر سکتا ہوں، بشرطیکہ خدا کے راستہ میں کام کرنا ہو۔''

آزادی یا موت:

''آج جس ایک مقصد کے لیے میں یہاں آیا ہوں، وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو

اِسی حالت میں واپس جاؤں جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو، میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ہے، مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔ (نعرۂ تحسین)

مجھے امید ہے کہ ہم یہ تمام چیزیں لے کر واپس جائیں گے، اگر ہمیں یہ چیزیں نہ ملیں تو ہم ملک کی لڑائی لڑنے والوں کی صفوں میں وہیں چلے جائیں گے جہاں ہم دس سال پہلے موجود تھے۔ وہ آج ہمیں ملک کا غدار کہتے ہیں، اُس وقت آپ ہمیں باغی کہہ لیجیے گا۔

لارڈ پیل نے کہا ہے کہ جب آپ اپنے ملک کو دستورِ اساسی لے کر واپس جائیں گے تو وہ لوگ جو آپ سے تعاون نہیں کر رہے ہیں، دستور کو آپ کے ہاتھ سے چھین لیں گے! چھین لیں گے؟ یاد رکھئے کہ جب میں انگریزوں سے لڑ سکتا ہوں تو ہندوستانیوں سے بھی لڑ سکتا ہوں، لیکن پہلے مجھے کوئی ایسی چیز تو دیجیے جس کی خاطر میں لڑ سکوں۔ یہ نہ ہو کہ میں یہاں سے غلامی کی سند لے کر جاؤں، پھر آپ مجھ سے یہ توقع رکھیں کہ میں اپنے ہی لوگوں سے لڑوں گا (نعرۂ تحسین)۔ میں یہ نہیں کر سکتا!

میں اور میرا بھائی پہلے اشخاص تھے جنہیں لارڈ ریڈنگ نے جیل بھیجا، مجھے اس معاملہ میں اُن سے کوئی شکایت نہیں (چیرز)۔ لیکن میں بھی وہی اختیار چاہتا ہوں کہ جب لارڈ ریڈنگ ہندوستان میں کسی جرم کے مرتکب ہوں تو میں بھی اُنہیں جیل بھیج سکوں۔ میں آپ سے درجۂ مستعمرات لینے کے لیے نہیں آیا ہوں، ڈومینین اسٹیٹس کا قائل نہیں ہوں، میں کامل آزادی کے عقیدہ کا پابند ہوں۔''

کھوئی ہوئی ڈومینین:

''ہندوستان کی رفتار بے حد تیز ہو چکی ہے، ہم منزلِ مقصود کے لیے کوچ کر رہے

ہیں۔ ہم اُس وقت تک ہندوستان واپس نہ جائیں گے تاوقتیکہ برطانیہ میں ایک نئی ڈومینین نہ پیدا ہو جائے۔ ہم اگر اس نئی ڈومینین کی پیدائش کے بغیر ہندوستان واپس چلے گئے تو میرا خیال ہے کہ ہم ایک کھوئی ہوئی ڈومینین میں جائیں گے۔ ہم ایک نئے امریکہ کو جائیں گے، اُس وقت آپ دیکھیں گے کہ برطانیہ کی دولِ متحدہ یا سلطنتِ برطانیہ کے اندر نہیں... بلکہ اس کے بالکل باہر ریاست ہائے ہند کا ایک آزاد نظام ہوگا۔''

ہندوستان کا نامرد بنا دیا:

''پھر فوج کا سوال ہے، فرمایئے! اُس کی بابت آپ کیا کہیں گے؟ برطانیہ کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ آج ہندوستان کی فوج اپنی نہیں ہے، اور اگر آپ خود ہی فوج کا عذر پیش کریں گے تو اپنے ہی منہ سے اپنے آپ کو قابلِ ملامت قرار دیں گے۔ میں آپ کو صفائی اور ایمانداری سے کہے دیتا ہوں کہ آپ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آپ نے ہندوستان کو مردانہ اوصاف سے محروم کر دیا (اظہارِ مسرت)۔ ہمارے پاس بتیس کروڑ آدمی ہیں، جب وہ قحط اور پلیگ سے لاکھوں کی تعداد میں مرنا جانتے ہیں تو وہ یقیناً برطانوی گولی سے جان دینے کی بھی توفیق رکھتے ہیں۔ یہی سبق ہے جو گاندھی جی نے ہمیں سکھلانا چاہا، اور یہی وہ سبق ہے جسے ہمیشہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔

جب گاندھی جی نے جنوبی افریقہ کا علم بلند کر رکھا تھا تو میں انگلستان میں تھا، لیکس ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اُس میں مجھے تقریر کرنے کے لیے کہا گیا، میں نے یہ کہا تھا کہ خواہ یہ فلسفہ گاندھی جی کا ہے یا ٹالسٹائی کا، یسوع مسیح علیہ السلام کا ہے یا میرا، لیکن ہے وہی عالمگیر انسانی فلسفہ... کہ کوئی شخص لڑائی میں کامیاب نہیں ہو سکتا، اگر اُس کے دِل میں محض مار ڈالنے کا ارادہ موجود ہے۔ دوسرے کی جان لینے سے پہلے اپنے دِل میں

مرنے کی خواہش پیدا کرنی چاہیے۔ ہندوستان میں مار ڈالنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، لیکن جب ہمارے دِل میں مرنے کا شوق پیدا ہو جائے گا تو اُس وقت اعداد و شمار اِس امر کی شہادت دیں گے کہ 32 کروڑ انسانوں کو ہلاک نہیں کیا جا سکتا۔ دُنیا میں کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جس سے آپ 32 کروڑ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کا سامان مہیا کر سکیں۔ اگر آپ کے پاس کوئی ایسی مشین ہو اور سامان بھی ہو تو پھر آپ کے پاس وہ اخلاقی طاقت یا بداخلاقی نہیں کہ آپ 32 کروڑ انسانوں کو ہلاک کرنے کی جرأت کر سکیں۔

ہم میں ایک آزاد اور متحدہ قوم کی حیثیت سے ہندوستان کی زندگی کے لیے مرنے کی خواہش ہونی چاہیے اور یہ خواہش ہم میں بڑی تیزی سے پیدا ہو رہی ہے، جب یہ خواہش ایک مصمم ارادہ کی صورت اختیار کر لے گی تو پھر آپ کیا کر سکیں گے؟ میں ایک لمحہ کے لیے بھی اِس خیال کو اپنے دِل میں جگہ نہیں دے سکتا کہ آپ کو سارے انگلستان میں ایک سو بھی ایسے شقی القلب آدمی مل سکیں گے جو اُن نہتے اور غیر متشدد لوگوں پر فائر کرنے کے لیے تیار ہو جائیں جو اپنے ملک کی آزادی کی خاطر مرنے مارنے پر آمادہ ہیں۔ نہیں! میں انگریز سپاہیوں کو ایسا برا نہیں سمجھتا!''

لڑاؤ اور حکومت کرو:

''اصل مسئلہ جس نے ہم کو پریشان کر رکھا ہے، وہ ہندو مسلم مسئلہ ہے، لیکن درحقیقت یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں۔ ہندو مسلم مسئلہ بھی آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے (ڈاکٹر مونجے ہیر ہیر) لیکن معاملہ صرف اسی قدر نہیں ہے۔ یہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کا پرانا اصول ہے، لیکن یہاں تقسیم عمل بھی ہے۔ پھوٹ اپنے آپ میں ہم ڈالتے ہیں اور حکومت آپ کرتے ہیں۔ جس وقت ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم اپنے آپ میں پھوٹ نہیں پڑنے دیں گے، آپ ہم پر اس طرح حکومت نہیں کر سکیں گے، یہاں ہم اس مصمم

ارادے کے ساتھ آئے ہیں کہ ہم میں پھوٹ نہیں پڑے گی۔''

ہندو مسلم مسئلہ:

''اگر مسلمان ہر جگہ 25 فی صد کے حساب سے اقلیت میں اور ہندو ہر جگہ 66 فی صد کے اعتبار سے اکثریت میں ہوتے تو آج مجھے اُمید کی کوئی کرن نہ دکھائی دیتی، لیکن بھلا ہو ہمارے اولیاء اور مجاہدین کا... کہ اگر ایک طرف ہندوستان میں ایسے صوبے ہیں جیسے ہمارے دوست ڈاکٹر مونجے کا صوبہ ہے جس میں ہم صرف 4 فی صدی ہیں تو دوسری طرف ایسے صوبے بھی ہیں جن میں ہم 93 فی صدی ہیں، جیسا کہ میرے نواب سر عبدالقیوم کا صوبہ ہے۔

سندھ کے پرانے صوبے کو لیجیے جہاں اِن کی تعداد 73 فی صدی ہے، پنجاب میں وہ 56 فی صدی ہیں اور بنگال میں 54 فی صدی! اِن اعداد و شمار سے ہمارے حقوق کے تحفظ کی صورت پیدا ہوتی ہے، کیونکہ ہم ہندوؤں سے یرغمالوں کا مطالبہ کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے اپنی رضامندی سے ہندوؤں کو اُن صوبوں میں یرغمال دے رکھا ہے جہاں اُن کی بہت بڑی اکثریت ہے۔''

فیڈرل نظام حکومت:

''ترکیبی طرز کی حکومت جو ہندوستان کے لیے نہ صرف ہندو مسلم سوال کو حل کرنے کے لیے موزوں ہو بلکہ والیانِ ریاست کے لیے بھی ضروری ہے، ہمارے حق میں ہے۔ ہندوستان میں ترکیبی اور وحدتی رجحانات کا توازن ایسا صحیح واقع ہوا ہے کہ فیڈرل گورنمنٹ کے نظام کو کوئی دُور دراز یا بعید نصب العین نہیں قرار دے سکتے جیسا گورنمنٹ ہند کہتی ہے، بلکہ ہم اس نصب العین کو آج دیکھنا چاہتے ہیں اور ابھی... اسی لمحے میں! (نعرۂ تحسین)''

یہ تھی شیرِ اسلام کی آخری گرج! یہ تھا دیوانۂ ملت کا نعرۂ مستانہ... اور یہ تھی اُس ''ٹوڈی'' کی تقریر

جسے مہاراجہ اَلور نے ''خرید'' لیا تھا، نواب بھوپال نے ''خرید'' لیا تھا، وائسرائے نے اپنا سرجن بھیج کر ''اسیر دام'' کرلیا تھا...! یہ سب کچھ صحیح ہوگا مگر پھر بھی اُس نے یہ ثابت کردکھایا۔

داغ آزاد منش وہ ہے کہ اے بندہ نواز
آپ کا بندہ رہے اور پھر آزاد رہے

اُس کی زبان کوئی کبھی نہیں خرید سکا۔

❁❁❁

باب ۵۱

خراجِ تحسین

محمد علی نے جب گول میز کانفرنس میں شرکت کا ارادہ کیا تو کانگریسی رفقاء نے اُن کی سخت مخالفت کی اور اُنہیں غدار وقوم فروش ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن جب اُن کی وہ معرکتہ الآرا تقریر شائع ہوئی تو ہر شخص انگشت بدنداں تھا اور بے ساختہ مخالف سے مخالف کی زبان سے یہی نکلا:

"کیوں نہ ہو! آخر محمد علی تھا نا؟"

ملک کے ہر طبقہ نے اس تقریرِ دل پذیر کی تعریف وتوصیف کا حق ادا کر دیا۔

ایک خط:

چنانچہ ایک ریاست کے ایک اعلیٰ عہدیدار اِس تقریر سے اتنے متاثر ہوئے کہ بے ساختہ اُنہوں نے اپنے جذبات یوں ظاہر کیے:

"گول میز کانفرنس والی تقریر پڑھ کر دِل باغ باغ اور ایمان تازہ ہو گیا۔ جو کچھ کہا خوب کہا اور سب کچھ کہا، اور لاجواب کہا۔ بس جو کچھ کہہ دیا، وہ بالکل کافی اور کافی سے زیادہ ہے۔ اب زیادہ تقریریں کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ آرام اور خاموشی، صبر اور استقلال سے مخالفین کی بکواس سنیے اور اِس کے بعد سوسنار کی اور ایک لوہار کی پھر کسی وقت موقع ومحل دیکھ کر ہو جائے۔"

ایک نظر:

واقعہ بھی یہی ہے... ہندوستان کی، مسلمانوں کی، ہندوؤں کی اور کانگریس کی اِس سے بڑھ کر ترجمانی اور کیا ہو سکتی تھی؟

محمد علی نے وہ کہا جتنا وہ 1920ء کے پُر آشوب اور پُر از جوش وخروش زمانہ میں کہہ سکتے تھے۔ اس وقت بھی اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا تھا جتنا محمد علی نے اپنا ''سیاسی عقیدہ تبدیل'' کر دینے کے بعد کہا۔

محمد علی اپنے سینہ میں ایک آزاد دِل رکھتا تھا، آزادی کی تڑپ رکھتا تھا، ہندوستان سے محبت رکھتا تھا، اسلام سے عشق رکھتا تھا، کانگریس سے ہمدردی رکھتا تھا، انگریزوں کو برسرِ ظلم سمجھتا تھا... پھر اُس کی زبان گنگ کیوں ہو جاتی؟

اُس نے وہ کہا جو گول میز کانفرنس کے کسی اجلاس میں کوئی نہ کہہ سکا، نہ 1930ء میں نہ 1931ء میں! واضح رہے کہ 1930ء کی گول میز کانفرنس کا کانگریس نے بائیکاٹ کیا تھا اور 1930ء میں گاندھی ہی کانگرس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔

❁❁❁

باب ۵۲

محمد علی بہ حیثیت قائد کے

حیاتِ محمد علی کا ایک مختصر سا مرقع اگر چہ وہ کتنا ہی نا تمام کیوں نہ ہو، آپ کی نظر سے گزر چکا۔ محبت پھر طویل ہوتی جاتی ہے، لیکن آیئے! تھوڑا سا وقت اور صرف کریں اور محمد علی کی قیادتِ عامہ پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال لیں۔

منفلوطی کا نظریۂ عظمت:

مصر کے ایک با کمال انشاء پرداز مصطفیٰ منفلوطی کا خیال یہ ہے کہ:

''اگر تم یہ دیکھو کہ کسی شاعر، کسی عالم، کسی قائدِ ملت یا زعیم وطن کے باب میں ایک اختلافِ عظیم رونما ہے، محبت و عقیدت کی نظروں میں وہ ایک پیکرِ ملکوتی ہے، اور چشم بد بیں میں تمثالِ شیطان... تو سمجھ لو کہ وہ ایک بہت ''بڑی'' شخصیت ہے، ''عظمت'' کا تاج اُس کے سر پر ہے، اور کبریائی کی آغوش اُسی کے لیے کھلی ہوئی ہے۔

دیکھو! حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک جماعت نے محبت کی اور دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی، دوسرے گروہ نے آپ رضی اللہ عنہ سے بغض و نفرت کا اظہار کیا اور اتنا غلو کیا کہ کفر کے درجے میں آ گیا۔ حضرات ابو بکر و عمر و رضی اللہ عنہما کو اُمت کا ایک فرقہ ''شیخین'' کہتا ہے، اور دوسرا اُن کی صداقت و اخلاص کو بھی مشتبہ سمجھتا ہے۔ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک دُنیا سرتاجِ گروہِ صوفیاء اور قطب الاولیاء سمجھتی ہے، لیکن دوسری ''دُنیا'' اُن کو زندیقوں اور ملحدوں کا پیشوا مانتی ہے۔ ابن رشد کو ایک زمانہ نے ''فیلسوفِ اسلام'' کا

خطاب دیا، لیکن ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے برسرِ عام مسجد جامع کے اندر اُن کے منہ پر تھوکا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک خلقت نے ''حجۃ الاسلام'' کہا اور دوسری مخلوق نے اُن کی ''احیاء العلوم'' کو پُرزے پُرزے کر ڈالا۔ ابو العلاء معریٰ کے ایک جماعت قدم چومتی رہی، دوسری ٹولی نے سرِ بازار اُن پر تبرا بھیجا۔ سقراط کے جامِ زہر پی لینے پر بھی بعض زبانیں سبّ وشتم میں مصروف رہیں۔ متنبّی کو بہت نے سیّد الشعراء کہا اور بہت سے ایسے بھی تھے جو اُس کے کلام کو آورد اور تصنع کا نمونہ سمجھتے رہے۔ شیکسپیئر کو ایک جماعت نے اِتنا بڑھایا کہ اسے نہ معلوم کیا سمجھا، اور دوسری نے اتنا گرایا کہ پناہ بخدا۔ نپولین کو بعض لوگ انبیاء کی صف میں رکھتے ہیں، بعض اُسے پرلے درجے کا احمق اور بد باطن سمجھتے ہیں۔ گلیلو، نطشے، ٹالسٹائی وغیرہ نے بھی ''قوم'' کی خوشی اور ناخوشی کے بڑے بڑے مزے اٹھائے ہیں۔

''یاد رکھئے! یہ افتراقِ عظیم، آراء وافکار کا یہ تصادم، خیالات وجذبات کا یہ اختلاف، اُسی رائے کے بارے میں ہوسکتا ہے جس کی ''عظمت'' باج گزار ہو، ہر کہ ومہ کو یہ ''رتبۂ بلند'' کہاں ملتا ہے؟''

تطابق:

منفلوطی کے اس نظریۂ عظمت کی روشنی میں محمد علی کی سیرت کا مطالعہ کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک جماعت اُسے غدارِ ملک، قوم دشمن، ضمیر فروش اور نہ معلوم کن کن خطاباتِ گراں مایہ سے سرفراز فرماتی ہے... اِسی کے برعکس ایک دوسری جماعت ہے جو اُسے آیت من آیات اللہ سمجھتی ہے، قوم کا قائد اور ملت کا رہنما سمجھتی ہے۔ ناخدائی اور سرداری کا تاجِ زرّیں عقیدت ومحبت کے پھولوں سے سجا کر اُس کے فرقِ گرامی پر رکھتی ہے۔ اپنے دُکھ درد، اپنی مصیبت اور اپنے تمام افکار کو اُن کے حضور میں پیش کرتی ہے اور اُس سے مداوا چاہتی ہے۔

وہ ایک حکم دیتا ہے تو ایک گروہ سبّ وشتم، گالی گلوچ، تمسخر واستہزاء اور طنز وطعن کے ساتھ اُس کا حکم

سنتا ہے اور ٹال دیتا ہے۔ دوسری جماعت ہے جو اُس کے حکم کو سر آنکھوں پر رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے چندہ دو تو اُس کی جماعت کی جیبیں خالی ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے راہِ خدا میں مصائب ونوائب کا مقابلہ کرو، تو اس کے پیر وقید و بند کے مصائب خوشی خوشی جھیلتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کانگریس سے تعاون کرو تو ہندو مسلم اتحاد کا وہ دِل افروز نظارہ پیش نظر ہوتا ہے کہ اس کی نظیر مشکل سے پیش کی جا سکتی ہے۔ وہ کہتا ہے تبلیغ و تنظیم کی بلند بانگ اور در باطن ہیچ تحریکوں سے الگ رہو، تو اُس کے معتقدین سکون وخاموشی، صبر وضبط اور عزم و استقلال کے ساتھ ''تبلیغ کے علمبر دار'' کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے ابن سعود کو ابھی برامت کہو، حالات کا انتظار کرو تو اُس کے متبعین سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اپنے جذبات پر قابو حاصل کرتے ہیں، عزیزوں اور دوستوں سے قطع تعلق کرتے ہیں، ڈنڈے کھاتے ہیں، گالیاں کھاتے ہیں، مگر جادۂ استقامت سے نہیں ہٹتے۔

وہ کہتا ہے دلیپ سنگھ سے استعفیٰ مت لو، قانون بدلواؤ، اُس کے مریدین پھر اپنے جذبات دباتے ہیں اور حکم بجالاتے ہیں اور دلیپ سنگھ کے بجائے قانون کے بدلوانے پر اپنی پوری کوشش صرف کر دیتے ہیں۔ پھر حالات میں تغیر ہوتا ہے، بہت سے چہرے بے نقاب ہوتے ہیں، قوم پرستی اور قوم پروری کی ردائے زرکار کے پیچھے سیوا جی اور بندہ بیراگی کے چہرے ظاہر ہوتے ہیں، تو وہ حکم دیتا ہے، اپنی فوج کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے، اب آگے قدم مت بڑھاؤ، کانگریس سے تعاون مت کرو...تو پھر اگر چہ دلوں میں آزادی کے لیے مر مٹنے کی تمنا موجود ہے، سروں میں اگر چہ جان دینے کا سودا موجود ہے، مگر قائد کا حکم ٹل کیسے سکتا ہے؟ سر جھک جاتے ہیں زبان اظہارِ اطاعت کرتی ہے اور عمل اس کی توثیق وتصدیق!

محمد علی کی شخصیت:

محمد علی نے جب میدانِ سیاست میں قدم رکھا تو اسے میدان خالی نہیں ملا، قبل و بعد ہر زمانہ میں رقیبوں اور حریفوں کی گرم بازاری رہی۔ مخالفوں اور دشمنوں کی جماعت کی جماعت اُسے تمام سامانِ اسلحہ سے مسلح ملی، لیکن جب وہ آسمانِ سیاست وصحافت سے طلوع ہوا تو اُس کی ضیاباریوں سے ایک عالم جگمگا اٹھا اور دوسرے ستارے ماند پڑ گئے! گلشن وطن میں اُس کی نکہت بیزیوں نے باغ و چمن کے ہر

گوشہ کو معطر بنا دیا پر دوسرے پھولوں کی خوشبو جاتی رہی۔ نیستانِ سیاست و قیادت میں وہ جب ایک شیر کی طرح دھاڑا تو شغالِ و روباہ نے بھٹ تلاش کرنے کر دیئے۔ اس کے سامنے کوئی بھی پیش نہ پا سکا۔ یہ داغ بڑا سخت تھا اور اِسی داغ نے محمد علی کے سیکڑوں دشمن پیدا کر دیئے۔

ہمہ گیر اختلاف:

ان دشمنوں نے اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ وہ اگر دِن کو دِن کہتا تو یارانِ بزم اُسے شبِ بلا ثابت کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دیتے تھے۔ جب وہ کہتا تھا کانگریس سے تعاون کرو تو ایوانِ تبلیغ سے صدا بلند ہوتی تھی کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور اسلام کے ساتھ غداری ہے۔ کانگرس میں شریک ہونا اپنے مذہب اور اپنی قوم کے ساتھ دشمنی کرنا ہے، پر جب اُس نے کانگریس سے تعاون ممنوع قرار دیا تو پھر اُسی ایوانِ تبلیغ سے صدا بلند ہوئی کہ ''کانگریس سے علیحدگی مسلمانوں کی سیاسی خود کشی ہے۔''

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا!

جب اُس نے ابن سعود کی حمایت کی تو ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور جب اُس نے اپنی تحقیقات کے بعد مخالفت کی تو اُس کے مخالف پھر اُس کے مخالف ہو گئے، جو اُس نے کہا دوسروں نے اُس کی تردید کی۔

غرض وہ جب تک زندہ رہا اُس کی مخالفت کے لیے ایک جماعت تیار رہی۔ اُس کو ذلیل کرنے کے لیے ایک گروہ ہمہ تن مستعد رہا اور جب وہ مر گیا تو آج وہ اُنہیں مخالفین کی نظروں سے ''رئیس الاحرار'' ہے، سیّدِ قوم ہے، مخدوم ملت ہے، شہیدِ راہِ حریت ہے، وفا کیش و وفا پرست ہے، رہنما ہے، قائد ہے، ولی ہے، سب کچھ ہے مگر آج سے ایک سال پہلے وہ غدار کے سوا کچھ نہ تھا، **فیا للعجب!**

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ!

مسلسل پروپیگنڈا:

محمد علی کے خلاف جتنا پروپیگنڈا ہوا شاید دُنیا میں کم کسی کے لیے ہوا ہوگا۔ مسلم اخبارات نے اس پر ''النباء العظیم''، ''حدیث الغاشیہ'' اور طرح طرح کے مقالاتِ افتتاحیہ سپردِ قلم کیے اور ہر طرح اس کی

قبائے قیادت کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بزعم خود اُڑائیں اور ہندو اخبارات نے اُس پر اپنی مشق قلم کی انتہا کر دی۔ قوم فروش، غدارِ ملک، بد عقل، بد دماغ، بدزبان، دیوانہ مُلّا اور اس طرح بیسیوں خطابات و القاب سے یاد کیا۔

جب وہ کانگریس کا حامی تھا تو مسلم اخبارات اُس پر زبانِ طعن دراز کر رہے تھے، اُس پر سب وشتم کی بوچھار کر رہے تھے اور اُسے اسلام و ملتِ اسلامیہ کا اعدا عدو بلکہ الدالخصام ثابت کر رہے تھے اور بڑے فخر سے اظہار فرماتے تھے کہ ہم نے محمد علی کی قیادت کا خاتمہ کر دیا اور جب اُس نے کانگریس سے اختلاف کیا تو سارا ہندو پریس اُس کا مخالف ہو گیا، کانگریسی مسلمان اخبارات اُس کے دشمن ہو گئے، حتیٰ کہ ایسوسی ایٹیڈ پریس اور فری پریس تک نے اُس کے متعلق وہ وہ انکشافات کیے کہ دُنیا انگشت بدنداں رہ گئی، مگر نہ اُن خبر رساں ایجنسیوں کو اِس کذبِ مبین کی نشر و اشاعت سے شرم آئی اور نہ ان اخبارات کو جنھوں نے ان خبروں کی نشر و تبلیغ بڑی بڑی ''سنسنی خیز'' سرخیوں کے ساتھ چار چار اور پانچ پانچ سطروں کے عنوانات کے ساتھ کی، ان خبر رساں ایجنسیوں کا وظیفہ حیات محمد علی کے متعلق بے سر و پا خبروں کا اجراء تھا اور ان اخبارات کا مشغلہ تفریح ان کی اشاعت۔

ہر شخص خوش تھا کہ اس نے محمد علی کا خوب مقابلہ کیا اور ہر اخبار اعلان کرتا تھا کہ محمد علی کی زندگی پر جیسی روشنی ''کتاب وسنت'' کی روشنی میں وہ ڈال سکتا ہے، اور کوئی اس کارِ اہم کو اس حسن وخوبی کے ساتھ نہیں انجام دے سکتا! اور پھر صرف ہندوستان ہی میں نہیں، ممالک غیر میں اس کے خلاف پمفلٹ شائع کیے گئے، مضامین لکھے گئے اور طرح طرح کے عجیب وغریب الزامات لگا کر اسے ہر طرح سے دشمن ''انسانیت'' ثابت کیا گیا اور نہایت اطمینان و مسرت سے بغیر دِل کی دھڑک اور قلب کے اضطراب کے!

تہمت تراشیاں:

پھر اِسی پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ اُس کے اوپر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے ہوں اور خاموشی اختیار کر لی گئی ہو، اُس کو گالیاں دی گئی ہوں اور صبر کر لیا گیا ہو، اُس کو غدارِ قوم و ملک ثابت کیا ہو اور

اطمینان حاصل ہو گیا ہو۔ اُسے دشمن کانگریس یعنی دشمن اسلام مشہور کیا گیا ہو اور اِس پر قناعت بھی کر لی گئی ہو بلکہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا۔ اُس پر ہر قسم کے جائز و ناجائز، مناسب اور غیر مناسب، صحیح اور غلط اتہامات لگائے گئے، تہمتیں لگائی گئیں۔

کبھی یہ مشہور کیا گیا کہ وہ امیر افغانستان سے ساز باز کر رہا ہے اور عنقریب ہندوستان پر حملہ کرانے والا ہے، اور اس شبہ کو اتنی تقویت دی گئی کہ سر سپرو اور مالوی جی نے گاندھی جی کو پوری شدومد سے یقین دلایا چاہا اور جب اُنہیں باور نہیں آیا تو پھر اُس زمانہ کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کے مشکوئے معلٰی تک یہ خبر وحشت اثر پہنچا کر اپنی مظلومیت اور وفاداری کی داد چاہی گئی اور اس خطرہ کے انسداد کے لیے ہز ایکسی لینسی کی توجہ مبذول کرائی گئی۔

کبھی یہ الزام لگایا کہ محمد علی صوبہ سرحد، سندھ اور پنجاب وغیرہ کے اتنے حامی کیوں ہیں؟ ہو نہ ہو اس میں کوئی اہم بات پوشیدہ ہے اور وہ سوا اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اتحادِ اسلامی کوشش کر رہے ہیں اور اس طرح جب وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر ہندوستان پر کسی اسلامی حکومت کا قبضہ کرا دیں گے اور اگر بہ فرضِ محال ایسا نہ ہو سکا تو یہ ضرور ہے کہ وہ مسلم راج قائم کریں گے اور ہندوستان کی ''مرکزی حکومت'' کو سخت نقصان پہنچائیں گے۔ کبھی از راہِ غایتِ محبت و شفقت نہایت ہمدردی اور افسوس کے لہجہ میں یہ شائع کیا گیا کہ محمد علی مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلر شپ کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں اور عنقریب ملت اُن کی ''رہنمائی'' سے محروم ہو جائے گی، وہ تو تردید کر رہے ہیں لیکن اخبارات ہیں کہ تردید کے بجائے اصل ''افواہ'' مزے لے لے کر شائع کر رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ بڑی قومی خدمت ہم سے انجام پا رہی ہے۔

قیادت کا اعتراف:

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس سخت ترین افتراق و اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی محمد علی کی قیادت کا ہمیشہ سب کو اعتراف رہا۔ کسی نے بھی ان کی خصوصیات قیادت سے انکار نہیں کیا، منکر سب رہے لیکن جب کوئی وقت پڑا تو اسی آبرو باختہ، بد دماغ، بدزبان لیڈر کو بلایا گیا۔ اُسی کے دامن تدبر

لیکن اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ آخر وقت تک زعیم رہا، گو اُس کے خلاف سارا جہان صف آراء رہا۔ اُس نے اپنی قوم کو جو حکم دیا، قوم نے اُس کی اطاعت کی۔ گزشتہ تحریک کے متعلق چاہے جتنے اعداد و شمار پیش کیے جائیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمان من حیث القوم نہیں شریک ہوئے۔

ان تمام حقیقتوں پر غور کرنے کے بعد عقل اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ محمد علی سب سے زیادہ کامیاب لیڈر تھا، لیکن سب سے زیادہ بدنصیب! اُس نے جو چاہا وہ ہوا، لیکن جو کہا اُس کی مخالفت ہوئی۔ اُس نے جب اپنی قوم کو مصروفِ عمل کیا وہ مصروفِ عمل ہوئی، لیکن مخالفین کا گروہ اُسے گالیاں دیتا رہا۔

یہ ہے محمد علی کی چند سالہ جدوجہد کا ایک مرقع!

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

❀❀❀